تعلیم و تعلم

۱۵ شمارہ ۱ — لاهور — جولائی ۶۲

اس شمارہ میں

آموزش
لاہور

جولائی ۱۹۶۲ء
جلد ــــــــــ ۱۵
شمارہ ــــــــــ ۱

سالانہ چندہ
پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

پبلشرز
یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی۔ خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۱۹۴، انارکلی لاہور سے شائع کیا

اداریہ

تعلیم ایک اثر آفریں عمل ہے جو قوم کو بدلتی ہوئی ضروریات کا پورا کرنا سکھاتا ہے۔ بدلنا اور پیہم بدلتے رہنا، یہی زندگی کا معمول ہے اور یہی تعلیم کا اُصول۔ چناں چہ وقت کے ساتھ ساتھ جب زندگی اور اُس کی ضروریات بدلتی ہیں تو تعلیم اور طریقہ ہائے تعلیم میں تبدیلیاں ناگزیر ہو جاتی ہیں اور یہی تبدیلیاں تحریکِ تعلیم کو زندہ رکھتی اور روح تازہ بخشتی ہیں، اِس لیے معلّمین اور تعلیم کے منتظمین کے لیے ضروری ہے کہ دورانِ ملازمت اپنے پیشہ ورانہ علم کو تازہ رکھیں۔ میدانِ تعلیم کے جدید انکشافات سے استفادہ کرتے رہیں اور صرف اُس تربیت پر جو ملازمت سے قبل حاصل کی تھی ہرگز اکتفا نہ کریں۔ یہی روشِ علمی پس ماندگی سے بچا کر ترقی یافتہ اقوام کے دوش بدوش چلنے کی صلاحیت پیدا کر سکتی ہے۔ کیوں کہ علوم کی حدود روز بروز وسیع ہوتی جاتی ہیں اور حیات و کائنات کے رُموز و اَسرار کو نئے معانی پہنائے جا رہے ہیں۔ دوسرے علوم و فنون کی طرح تعلیم میں بھی جدید اندازِ فکر اور سائنسی طریقہ ہائے تدریس وضع ہوئے ہیں، جن کا جاننا ہر قابلِ ذکر معلّم کے لیے نہایت ضروری ہے۔

معلّمی کی مؤثر اور معیاری تربیت، تعلّم و ترقی کا ایک مستقل ذوق پیدا کر دیتی ہے جس کی بدولت معلّم ہمیشہ طالب علم بنا رہتا ہے اور زریعۂ معلّمی سے بطریقِ احسن عُہدہ برآ ہوتا ہے۔ قومی تعلیم کمیشن نے بھی تجدیدِ علم کی تدابیر پر بہت زور دیا ہے۔

دورانِ ملازمت میں توسیعِ علم کے متعدد ذرائع موجود ہیں۔ مثلاً ایسی کتابوں اور رسالوں کا

مطالعہ میں تعلیمی مسائل کا نفسیاتی حل پیش کیا گیا ہو۔ ذہنی ترقی اور تشویق کار میں ممد ہو سکتا ہے۔ معلم کی مؤثر اور مشفقانہ رہنمائی بھی نوجوان معلموں کو ان کی تدریسی خامیوں کے سمجھنے اور طریق تدریس میں ضروری ترمیم و اصلاح کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔ علاوہ ازیں حکومتِ پاکستان نے ملک کے دونوں حصوں میں ایک ایجوکیشن ایکسٹنشن سروس سنٹر قائم کر کے ماسٹروں اور انسپکٹروں کے لیے تجدید تربیت کی سہولتوں کا مستقل انتظام کر دیا ہے۔ ملک کے تمام تربیتی ادارے بھی تعطیلات موسم گرما میں تعلیمی کارگاہ (EDUCATIONAL WORKSHOP) کا اہتمام کرتی ہیں۔ چنانچہ انہی تعطیلات میں ایجوکیشن ایکسٹینشن سنٹر، سنٹرل ٹریننگ کالج، لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج اور انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن لاہور کے باہمی تعاون سے ابتدائی مدارس کے معلمین و معلمات کے لیے ایک تعلیمی گاہ برپا ہے۔ اور اس سے قبل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں یکے بعد دیگرے دو ورک شاپ جو علی الترتیب افسرانِ نظارت اور معلمینِ السنہ و سائنس کے لیے مختص تھے قائم کیے جا چکے ہیں۔

توسیع معلومات اور تجدید تربیت کے لیے اس قسم کی تعلیمی کارگاہوں کا انعقاد، اپنے محدود ہونے کے باوجود، نہایت امید افزا ہے اور میدانِ تعلیم میں کامیابی و کامرانی کی پیش قیاسی کرتا ہے۔

✣

خطبۂ اختتامیہ

ورکشاپ موسم گرما

مسز سعیدہ ملک (پرنسپل لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صدر محترم و معزز حاضرین

یہ میرا نہایت خوشگوار فرض ہے کہ میں اپنی نوعیت کی اس منفرد تعلیمی ورکشاپ کے منتظمین کا شکریہ ادا کروں کہ انھوں نے اس انعقاد کے لیے لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور کو بھی اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا محور بنایا اور یہ امتیاز اس کالج کی تاریخ میں اسے پہلی مرتبہ حاصل ہوا۔

میں اس شخصی اعزاز کے لیے ممنونِ احسان ہوں کہ اس ورکشاپ کے افتتاح کے لیے مجھے کہا گیا تھا۔ اور اب اس کے دس روزہ کامیاب تعلیمی تجربات پر تبصرہ کرنے کی سعادت بھی مجھے حاصل ہو رہی ہے۔

حاضرین میں نے اس تعلیمی ورکشاپ کو اپنی نوعیت میں منفرد اس لیے کہا ہے کہ عام تعلیمی کانفرنسوں کی طرح اس میں محض تقریریں اور مباحثے ہی نہیں ہوئے، بلکہ ایم۔ای ڈی کے طلباء کی باشعور شمولیت اور منتظمین کی منظم مساعی نے ایک نہایت سنجیدہ علمی اور تعلیمی فضا پیدا کی اور ابتدائی اور ثانوی مدارس میں اردو، ریاضی، سائنس اور تربیت جسمانی کی تدریس میں تحقیق و جستجو کی نئی نئی شمعیں روشن کر دیں۔ اس کام کی افادیت کا ایک سرسری اندازہ ان مطبوعہ تحقیقاتی منصوبوں اور تعلیمی نمائش گاہ میں معلمین کے تیار کردہ معاوناتِ تدریس سے ہو سکتا ہے۔ جو اس موقع پر خاص طور سے تیار کیے گئے ہیں۔ یہ ورکشاپ ہمیں دعوتِ فکر دیتی ہے۔

کہ ہم اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔ تجربات کے لیے وسیع سے وسیع تر خوش گوار ماحول پیدا کریں تاکہ نئی پود کی تربیت کے مقدس فرض کو کما حقہٗ سرانجام دیا جا سکے۔

یہ ورک شاپ ہمارے خیر خواہ مالک کے ماہرین تعلیم کے تعاون سے منعقد ہو رہا ہے۔ اس خصوص میں وہ ہمارے دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ البتہ مجھے خدشہ ہے کہ شاید اس مفید کام کا تسلسل زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں کے اساتذہ ماہرین تعلیم اپنی اقتصادی اور معاشرتی الجھنوں کی وجہ سے ان سہولتوں کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر آئندہ نہ کر سکیں جو اس وقت مہیا کی جا چکی ہیں۔

میرا یہ دیانت دارانہ تاثر ہے کہ تعلیمی اور تدریسی ماحول میں کوئی واقعی انقلاب صرف اُس وقت برپا کیا جا سکے گا، جبکہ ملکی اساتذہ و ماہرین تعلیم اس ماحول میں عملی طور پر کام کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع پائیں گے، اس مشین کو خود چلائیں گے۔ اور معاشرہ ملک کی طرف سے اُنھیں ہر ممکن سہولت ہمت افزائی اور سرپرستی حاصل ہو گی۔

مجھے اس تعلیمی ورک شاپ میں پرائمری مدرسین کا کام دیکھنے کا خاص طور پر موقع ملا ہے۔ اور جہاں میں ان کے خلوص، فنی صلاحیتوں اور خوش سلیقگی سے متاثر ہوئی، وہاں مجھے ان کی اقتصادی بدحالی اور ذہنی پریشانی کا بھی تکلیف دہ احساس ہوا۔ یہ لوگ ہمارے قومی نظام تعلیم کی بنیاد ہیں۔ قومی تعلیمی کمیشن نے ان کے کام کی اہمیت کا پورا پورا اعتراف کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو، اگر ہم ان جفاکش معماروں کا معیار زندگی بلند کر سکیں۔ تاکہ نئی پود کی صحیح تربیت میں وہ بیش از بیش محنت اور تندہی سے کام کر سکیں۔

اسی طرح میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ابتدائی درجوں کی تدریس میں جس شفقت بُردباری اور ہمدردی سے عورتیں کام کر سکتی ہیں اس کے پیش نظر نامناسب نہ ہو گا، اگر ہم اپنے ملک کی ابتدائی تعلیم کا انتظام کلیتہً استانیوں کے ہاتھوں میں سونپ دیں: تاکہ اس عمر کے بچوں کی روحانی جسمانی اور ذہنی تربیت کے لیے زیادہ سے زیادہ سازگار ماحول پیدا کیا جا سکے۔

حاضرین ہمارے قومی تعلیمی منصوبے میں بچوں کی متوازن شخصیت پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ان کی زندگیوں میں اسلامی اقدارِ حیات عکس ریز ہوں۔

ہمارے مدارس میں قومی ترانے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا طریق بھی رائج ہو رہا ہے۔ لیکن اس کام کو بچوں کی ذہنی سطح کے قریب لانے کی بے حد ضرورت ہے۔ اس کے لیے مناسب ہوگا کہ آیاتِ قرآنی کے ایسے ٹکڑے منتخب کیے جائیں جو مختلف جماعتوں کے طلبہ سمجھ سکیں۔ بچوں کے ترانوں اور نظموں (NURSERY RHYMES) میں بھی یہ التزام رکھا جانا ضروری ہے کہ ان میں اس پاکیزہ تعلیمات کی جھلک ہو جو ہماری قومی زندگی کا اوڑھنا اور بچھونا ہیں۔

مثلاً:- ALLAH IS ONE THIS I KNOW

اللہ تعالےٰ ایک ہے اور یہ بات مجھے یقینی طور پر معلوم ہے

FOR THE QURAN TELLS ME SO

کیوں کہ قرآن مجید کا یہی ارشاد ہے۔

LITTLE ONES TO HIM BELONG

ننھے منے بچے اس کی امانت ہیں

THEY ARE WEAK BUT HE IS STRONG

وہ ناتواں ہیں لیکن اللہ تعالےٰ قوی (قوت والا) ہے۔

خواتین و حضرات! مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری گفتگو طویل نہ ہو رہی ہو۔ میں صدر محترم آپ کی اس ادارے میں تشریف آوری پر آپ کا خیر مقدم کرتی ہوں۔ آپ جس انہماک سے اس صوبے کی تعلیمی زندگی میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے آپ ہم سب معلموں کے شکریے کے مستحق ہیں۔ خدا کرے آپ کی مساعی سے ملک و ملت کو فائدہ پہنچے۔ آمین

آخر میں میں انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ پنجاب یونیورسٹی۔ توسیعی تعلیمی مرکز۔ سنٹرل ٹریننگ کالج اور نظامت و نظارت تعلیمات لاہور کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کے مفید اور نتیجہ خیز تعاون سے ایسی مفید تعلیمی ورکشاپ کا انعقاد ممکن ہو سکا۔ یہ ادارے آئندہ بھی اساتذہ کے تعلیمی و تدریسی مسائل کے حل

[illegible]

اُردو گنتی کے نام سیکھنے میں مشکلات

غلام کریم مرغوب (ایم۔ ایڈ سٹوڈنٹ)

تعارف: - پہلی جماعت کو تعلیم دینے والے ایک تربیت یافتہ استاد بتا رہے تھے کہ ان کی ماہوار تنخواہ باون روپے تھی اور اگر تیس روپے کی سالانہ ترقی اور مل جاتی تو بیالیس روپے ہو جاتی۔

اسی سال پیرس یونیورسٹی کے ماہر لسانیات پروفیسر پیری سیلی لاہور تشریف لائے۔ ان کی اپنی زبان فرانسیسی تھی۔ اردو میں وہ اسی آسانی سے اظہار خیال کر سکتے تھے جس طرح انگریزی میں۔ ہم نے ان سے دریافت کیا کہ لاہور میں کس جگہ قیام رکھتے ہیں، اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ وہ فلیٹی ہوٹل کے کمرہ نمبر ۷۰ میں مقیم تھے۔ وہ ستر میں مقیم تھے۔

اردو گنتی کے ناموں میں اس قسم کی غلطیاں بچوں میں تو بہت عام ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص بھی ایسی غلطیاں اکثر کر جاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالحق صاحب سنٹرل ٹریننگ کالج کے زمانے کے مطابق جب یونیورسٹی کے نتائج مرتب کیے جاتے ہیں تو نمبروں کی پڑتال کے وقت اس قسم کی اغلاط سے بچنے کے لیے انگریزی گنتی سے مدد لی جاتی ہے۔ ہم میں سے سب نہیں تو اکثر سے ضرور اس قسم کی غلطیاں ہوتی رہی ہیں اور شاید اب بھی ہو جاتی ہیں۔

باوجود اس قدر اہم ہونے کے یہ مسئلہ ہماری خاص توجہ حاصل نہ کر سکا۔ اگر ہم سے کسی نے اسے محسوس بھی کیا تو اس کے حل کی کوشش نہیں کی۔ موجودہ تحقیق اس مسئلہ کے حل کی طرف پہلی کوشش ہے۔ اس تحقیق کی ابتدا مندرجہ ذیل مفروضات پر کی گئی ہے۔

۱۔ انگریزی، فارسی اور عربی میں پندرہ بیس نام یاد کرنے کے بعد سو تک گنتی سیکھی جا سکتی ہے بخلاف اس کے اردو گنتی سیکھنے کے لیے ایک سے سو تک مختلف نام یاد کرنے کی ضرورت ہے۔

۲- اردو میں اعداد کے لیے مستقل صوتی علامات مقرر نہیں۔ ساٹھ کے نام سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس میں چھ دہائیاں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح بارہ۔ بائیس تبیس بھی دو کی شمولیت کا اظہار نہیں کرتے۔

۳- اردو گنتی کے کچھ نام ایسے ہیں جن کا تلفظ مشکل ہے۔ مثلاً غیر اہل زبان سڑسٹھ کا نام آسانی سے ادا نہیں کر سکتے۔

۴- وہ اعداد جن کے درجہ اکائی میں نو موجود ہے۔ مثلاً ۱۹، ۲۹، ۳۹ وغیرہم اپنے ناموں سے خاصی الجھن پیدا کرتے ہیں۔ اور اپنے نام سے تعداد کا صحیح تصور نہیں دیتے۔

۵- اردو میں دھائی کے مقامات ظاہر کرنے والے اعداد کے نام مثلاً بیس تیس۔ چالیس، پچاس ساٹھ۔ ستر، اسّی۔ نوے کسی گُر یا ترتیب کے تحت نہیں بنائے گئے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کو علٰحدہ علٰحدہ طور پر یاد کرنا پڑتا ہے۔ اور بعض ناموں میں تو اصلی یا بنیادی عدد کی آواز کا کوئی حصہ بھی موجود نہیں۔ مثلاً ساٹھ یا اسّی وغیرہ۔

۶- مرکب اعداد یعنی اکائی اور دہائی کے ہندسوں کے ناموں کو ملانے کا کوئی خاص مقررہ طریقہ موجود نہیں۔ کبھی کسی طرح ملائے جاتے ہیں اور کبھی کسی طرح۔

تحقیق: ـ مندرجہ بالا مفروضات کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے لیے جو شہادت حاصل کی گئی وہ مندرجہ ذیل ہے۔

۱- ہمارے ہاں چار زبانیں عام طور پر سمجھی جاتی ہیں۔ انگریزی۔ فارسی۔ عربی، اردو۔ ان چار زبانوں میں گنتی کے ناموں کا تجزیہ اور مقابلہ کرنے سے اردو ناموں کی خصوصیات کی پڑتال کی گئی۔

۲- پچاس اساتذہ حصہ پرائمری سے۔ پچیس ماہرین تعلیم۔ پندرہ اساتذہ نارمل سکول سے۔ دس تعلیم یافتہ اشخاص کے علاوہ ۸۵ طلبہ جماعت دہم۔ ۴۳ طلبا جماعت نہم۔ ۲۹ طلبہ جماعت ہشتم۔ ۹۲ طلبہ جماعت ہفتم۔ یعنی کل دو صد اشخاص سے ان نکات پر رائے لی گئی۔

۲۔ ۵۰ طلبہ جماعت اوّل ۳۰ طلبہ جماعت دوم ۲۰ طلبہ سوئم کل تنتو طلبہ کو مندرجہ ذیل چھ ٹسٹ دیئے گئے

ا۔ عدد کا نام بولا گیا اور ہندسہ لکھنے کے لیے کہا گیا۔

ب۔ ہندسہ لکھا ہوا دکھایا گیا اور نام پوچھا گیا۔

ج۔ عدد کا نام بولا گیا اور چیزوں کی اتنی تعداد دکھانے کے لیے کہا گیا۔

د۔ چیزوں کی تعداد دکھائی گئی اور نام عدد پوچھا گیا۔

ہ۔ چیزوں کی تعداد دکھائی گئی اور ہندسہ لکھنے کے لیے کہا گیا۔

و۔ لکھا ہوا ہندسہ دکھایا گیا اور اتنی تعداد چیزوں کی دکھانے کو کہا گیا۔

ہر طالب علم نے چھ سو سوالات کے جوابات دیئے۔ یعنی ایک سے سو تک بے ترتیب گنتی پر چھ سوالات ہر طالب علم سے کئے گئے۔

نتائج:۔ مذکورہ بالا شہادت سے جن مفروضات کا ثبوت مہیا ہوا، وہ درج ذیل ہے

۱۔ ۱۷، ۳۸، ۴۳، ۴۹، ۵۳، ۵۹، ۶۷، ۶۸، ۸۹، ۹۹ کے ناموں کا تلفظ مشکل ہے۔

۲۔ انگریزی، فارسی اور عربی کے مقابلہ میں اردو گنتی سیکھنے میں سب سے زیادہ نام یاد کرنے پڑتے ہیں۔

۳۔ گنتی کے زیادہ نام یاد کرنے کی وجہ سے کافی مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔

۴۔ گنتی کے ہر دس کے گروپ میں اردو گنتی کے ناموں میں کوئی صوتی یکسانیت نہ ہونے کی وجہ سے سیکھنے والے کو کافی دقت پیش آتی ہے۔

۵۔ اردو گنتی میں مندرجہ ذیل اعداد کے نام اپنے عدد کا صحیح تصور نہیں دیتے۔

۱۹ - ۲۹ - ۳۲ - ۳۸ - ۳۹ - ۴۹ - ۵۲ - ۵۵ - ۵۹ - ۶۷، ۶۸

۶۹ - ۷۹ - ۸۹

۶ - جن اعداد کے اکائی کے مقام میں ۹ آتا ہے۔ ان کے اردو نام دماغی الجھن پیدا کرتے ہیں۔
۷ - جن ٹسٹوں میں گنتی کے نام شامل نہ تھے یعنی ٹسٹ ہ۔ و ان میں طلبا نے کم غلطیاں کیں۔ بلحاظ ٹسٹ فی طالب علم اوسط اغلاط درج ذیل ہیں۔

ٹسٹ ا ۴۰ء۴ ٹسٹ ب ۳۲ء۴ ٹسٹ ج ۰۸ء۳
ٹسٹ د ۳۴ء۳ ٹسٹ ہ ۱۹ء۱ ٹسٹ و ۹۹ء۰

سفارشات

۱ - مندرجہ ذیل اعداد کے نام تبدیل کر کے کچھ اس طرح بنا دیئے جائیں کہ ان میں پہلے دس بنیادی اعداد کی آواز کا کوئی حصہ آ جائے تاکہ اس کی مدد سے صحیح تعداد کا تصور ذہن میں آ سکے۔

۱۶ ، ۵۰ تا ۵۹ ، ۶۰ ، ۸۰

۲ - دو کا نام تبدیل کر کے "با" رکھ دیا جائے تاکہ ۱۲ - ۲۰ ، ۲۲ ، ۳۲۰ ، ۴۲ ، ۵۲ ، ۶۲ ، ۷۲ ، ۸۲ ، ۹۲ کے نام اپنے اندر دو کی شمولیت پر دلالت کر سکیں۔ واضح ہو کہ سندھی میں ۲ کو "با" کہتے ہیں۔ ملتانی زبان میں دوسرے کو بیا اور پشتو میں دوسرے کو "بلا" کہتے ہیں۔

۳ - اس وقت استاد گنتی کے نام سکھاتے وقت دس اک گیارہ - بیس دو بائیس (علیٰ ہٰذا القیاس) پڑھاتے ہیں۔ اگر اس کی بجائے تیسرا نام ختم کر دیا جائے اور گیارہ کو دس ایک - تیئس ۲۳ کو بیس تین (علیٰ ہٰذا القیاس) کہا جائے اور یہی گنتی کے نام رکھ دیئے جائیں تو بیشتر مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ پڑھنا آسان ہو جائے گا۔ اردو گنتی سیکھنے میں کم وقت لگے گا اور کافی الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔

۴ - دہائی کے مقامات والے اعداد کچھ اس طرح بنا دیئے جائیں کہ بنیادی دس ناموں سے بنائے جا سکیں جس طرح عربی یا انگریزی میں۔

مزید تحقیقات جن کی ضرورت ہے :- نمبر ۱ :- اگرچہ اردو گنتی کے سب اعداد کے

معیاری نام موجود ہیں۔ مگر اہل زبان کے علاوہ تمام لوگ ان کو مختلف طریقوں پر لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مثلاً :-

۳۸ کو اٹھتیس یا اڑتالیس — ۴۱ کو اکتالیس یا اکیالیس

۴۲ کو تبالیس یا بیالیس — ۴۳ کو تینتالیس تتالیس، ترتالیس

۴۴ کو چوالیس، چوتالیس، چتالیس — ۴۶ کو چھتالیس، چھیالیس۔

۴۸ کو اڑتالیس، اٹھتالیس — ۵۱ کو اکاون، اکیاون

۶۷ کو سڑسٹھ، ستاسٹھ — ۶۸ کو اڑسٹھ۔ اٹھاسٹھ

۸۱ کو اکاسی، اکیاسی وغیرہ ہم۔

اس امر کی تحقیق ضروری ہے کہ پاکستان کے مختلف حصوں میں کون سا نام کس طرح معروف ہے۔

۲ - سفارشات کے تحت جن تبدیلیوں کی تجویز کی گئی ہے۔ ان تبدیلیوں کو عمل میں لاکر بچوں کی ایک جماعت کو اس طرح گنتی سکھائی جائے اور نتائج کا دوسری جماعتوں کا تقابلہ کرکے دیکھا جائے کہ یہ تبدیلیاں کہاں تک مشکلات دور کر سکتی ہیں۔

۳ - مشکلات جو اس تحقیق کے نتیجہ پر واضح ہو چکی ہیں ان کا حل تلاش کرنے کے لیے عوام سے رائے طلب کی جائے اور گنتی کے ناموں میں تبدیلی کے امکانات پر غور کیا جائے ؛

——— یہ گرانقدر مقالہ تعلیمی ورک شاپ منعقدہ جون ۱۹۷۶ء کے موقع پر لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج میں پڑھا گیا
(مدیر)

تدریس املا اور صحت تلفظ

——— زبان و ادب میں نئی تحقیقی سوچ اور ہماری زبان

سیّد شبیر بخاری ڈپٹی انسپکٹرہ لاہور

ہر زبان کا ادب اِس کی موزونیتِ الفاظ حُسنِ تراکیب، وسعتِ بیان کے ساتھ ساتھ اِس کی صوتی ہم آہنگی اور صحتِ تلفظ کا بھی نمائندہ ہوتا ہے۔ اِس لیے جب ہم کسی زبان کی تدریس پر بحث کرتے ہیں تو جہاں اِس کے ادب LITERATURE کو موضوعِ فکر بناتے ہیں۔ اس کے PHONETICS اور لسانی پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کر پاتے۔

زبان و ادب کا تدریسی اور تعلیمی ربط باہمی اٹھارھویں صدی میں یورپ نے عملی طور پر پہلی دفعہ محسوس کیا اور انگلستان میں سر ولیم جونز اور جرمنی میں فرانز بوپ FRANZ BAPP، جیکب گرم JACOB. GRIMM اور بعد ازاں میکس مولر MAX HOLLAR نے اپنی تحقیقات سے ادبیات کی لسانی تاریخ کا نیا ورق الٹا اور رفتہ رفتہ (PHILOLOGY) علم الالسنہ، میں (PHONO·LOGY) (صوتی تغیر) (MORPHOLOGY) (صُوری تغیر) میں نئے نئے تجربات کا آغاز ہُوا۔

اِن تجربات سے معلوم ہوا کہ انگریزی زبان جو ہند اور یائی زبانوں میں ایک جانا بوجھا مقام رکھتی ہے صوتیاتی اعتبار سے متوازن اور مکمل نہیں ہے اس میں ۲۲ فیصد الفاظ NON PHONETIC ہیں۔ بجا ہیں تبدیلیوں نے جو مسلسل تجربات ہوئے ہیں ان کی مثالیں دلچسپی سے خالی نہیں ہیں مثلاً ICE کے ہجا، EES تھے HOUSE کے HOOS اور NAME کے NAHM الفاظ کی تاریخی حیثیت پر نظر ڈالنے سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ اُردو زبان کی طرح انگریزی زبان کا ذخیرہ الفاظ بھی مختلف

زبانوں کے مستعار الفاظ پر مشتمل ہے۔ مثلاً GOOD . RECEIVED . TELEGRAM . MOTHER میں

MOTHER قدیم ہند اردو یائی زبان کا لفظ ہے۔

RECEIVED لاطینی الاصل ہے

GOOD تیوتانک ہے

TELEGRAM یونانی ہے۔

ان الفاظ کا اپنی اپنی زبانوں میں تلفظ مختلف تھا۔ لیکن بتدریج انگریزی زبان نے انھیں اپنے اندر اس طرح سمولیا ہے کہ انھوں نے اس زبان کا مزاج کلیتہً اختیار کرلیا ہے۔ ہماری زبان میں عربی فارسی۔ ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کا ایک قابل قدر ذخیرہ موجود ہے۔ اور ان الفاظ کے ساتھ صَوری اور صَوتی تغیرات کے سلسلہ تجربات ہو رہے ہیں جن کا مطالعہ اُردو زبان کے مدرسین کے لیے خاص طور پر مفید ثابت ہوگا۔ مغربی پاکستان میں رائج الوقت اردو زبان رفتہ رفتہ دلی اور لکھنؤ کی اردو سے مختلف ہوتی جائے گی۔ اور یہ بھی سندھی۔ پنجابی۔ سرائیکی، پشتو اور کشمیری اور دیگر زبانوں اور بولیوں کے رواں، عام فہم اور کثیر الاستعمال الفاظ جوں جوں اِس میں شامل ہوتے جائیں گے۔ اس کی مقبولیت اور ہمہ گیری میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

البتہ یہ امر ضرور قابلِ لحاظ ہے کہ اردو لسانیات کو کسی مستحکم اساس پر قائم کرنے کے لیے عربی جیسی اُمّ الالسنہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی ضرورت کا احساس بھی ساتھ ساتھ بڑھتا جائے گا۔ اُردو زبان کے حروف تہجی کی تعداد ۵۳ ہے۔ جن میں مندرجہ ذیل ۲۸ یا بشمول ہ ۲۹ حروف عربی زبان کے ہیں ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن و ہ ء ی (۲۹) (پ، چ، گ، ژ، ے) فارسی زبان کے اور ٹ، ڈ، ڑ ہندی زبان کے، ان حروف کے صحیح مخارج کے لیے ہمیں عربی زبان کے فن تجوید سے مدد لینا ہوگی، جو اپنی صحت اور افادیت کے پیشِ نظر اس وقت بھی ایک الگ فن تھا جب کہ آج کے تہذیب یافتہ ممالک میں سرے سے اس کا صحیح شعور ہی نہیں ابھرا تھا۔ یہ فن حروف و الفاظ کے مخارج اور صفات سے بحث

کرتا ہے اور اپنی تکمیل کے لیے علم ادقاف۔ علم قرأت اور علم رسم خط کا محتاج ہے۔

کسی حرف کا مخرج معلوم کرنے کے لیے اسے ساکن کر دینا چاہیے۔ اور اس سے ماقبل ہمزہ متحرک لے آنا چاہیے۔ اس کی آواز جس جگہ ختم ہو گی وہی اس کا مخرج ہو گا۔

اس لحاظ سے اُردو حروفِ ہجا کے مخارج مندرجہ ذیل ہیں (اعضاء الصوت کا نقشہ بھی شامل ہے۔ تاکہ صحیح مخارج سمجھنے میں مدد ملے)

۱۔ خیشوم (ناک کا بانسہ) غُنّہ

۲۔ حروفِ دہن (منہ کے اندر کا خلا) واؤ ساکن ماقبل مضموم
ی ساکن ماقبل مکسور
ا ساکن ماقبل مفتوح
} حروفِ ہوائیہ

۳۔ اقصیٰ حلق (حلق کا انتہائی حصہ) (i) ء (ii) ہ
۴۔ وسطِ حلق (حلق کا وسطی حصہ) (i) ع (ii) ح
۵۔ ادنیٰ حلق (حلق کا ابتدائی حصہ) (i) غ (ii) خ
} حروفِ حلقی

۶۔ لسانیہ (کوّے سے متصل آغاز زبان) ق
(" " منہ کی جانب ذرا نیچے) ک

(۷) شجریہ (وسطِ زبان اوپر کا بالمقابل تالو) ج
ش
ی

۸۔ حافہ لسان (کروٹ دہنی (اضراس علیا کی جڑ سے لگے) ض

۹۔ طرفیہ یا ذلقیہ

(i) زبان کا کنارہ کچھ حصہ حافہ۔ ثنایا رباعی، انیاب۔
ضاحک کے مسوڑوں سے تالو کو چھوئے } ل

(ii) زبان کا کنارہ لام کے مخرج سے ذرا کم چھوٹے (ضاحک شریک نہ ہو) ل

(iii) نون کے مخرج کے قریب پشت زبان کا بھی دخل ن

۱۰۔ نطعیہ

زبان کی نوک ثنایا علیا کی جڑ ط د ت

۱۱۔ لثویہ

زبان کی نوک ثنایا علیا کا سرا ظ ذ ث

۱۲۔ صفیر

زبان کا سرا۔ ثنایا سفلی کا اتصال ثنایا علیا ص ز س

۱۳۔ شفویہ

(i) نچلے ہونٹ کا شکم۔ ثنایا علیا کا کنارہ ف ب

(ii) دونوں ہونٹ م و

۱۴۔ اپ، چ، گ، ژ، ے، ٹ، ڈ، ڑ کے صحیح مخارج کا تعین شرکاء کے تعاون سے کیا جائے گا۔

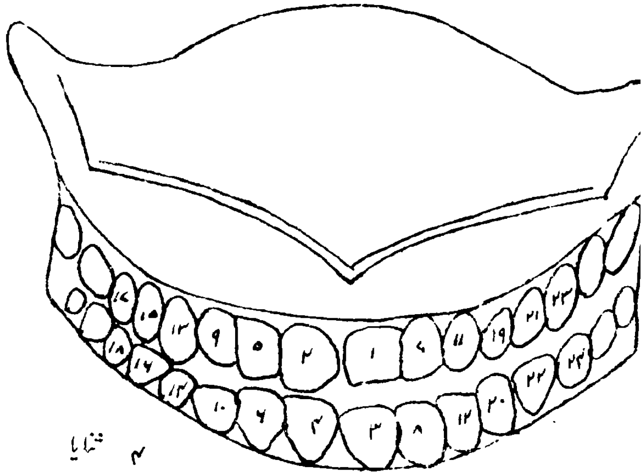
حروف کے مخارج کی صحت کے بعد ان الفاظ کا صحیح تلفظ محل نظر ہے۔ جواب پانچویں درجے تک بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ اس خصوص میں ایک کتابچہ الگ تقسیم کیا جا رہا ہے۔

ابتدائی عمر میں ضروری ہے کہ بچوں کو حروف و الفاظ کا ربط نہایت واضح طور پر سمجھایا جائے اور تختۂ سیاہ کی مدد سے اس تعارف و ربط کو پوری طرح ذہن نشین کرایا جائے۔ منسلک نقشہ ج میں مشاہدہ سے اظہار تک کے ذہنی عمل کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آپ معلم اور معلمات اس ضمن میں نہایت کارآمد منصوبے مرتب کر رہے ہیں جن کے ذریعے سے مختلف علاقائی زبانیں بولنے والے مغربی پاکستان کے بچوں سے وہ مشترک الفاظ اخذ کیے جائیں جن کی امداد سے اردو زبان کی تدریس ابتدائی درجوں میں مفید تر بنائی جا سکے۔ اس میں

ان الفاظ کو اہمیت دی جائے گی جو اردو میں رچ بس گئے ہیں۔ یا علاقائی زبانوں نے اردو زبان سے قبول کیے ہیں ان کے تلفظ کا مسئلہ طے کرنا پھر ایک مشاورتی کمیٹی کا کام ہوگا جو ان افراد پر مشتمل ہونی چاہیے جو اردو زبان کی ترویج و توسیع میں کوشاں ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اس کورس میں شرکت کرنے والے حضرات اور خواتین تدریس اردو میں صحت الفاظ کی اہمیت محسوس کریں گے اور اس میں کوئی عملی تجربہ آغاز کریں گے۔

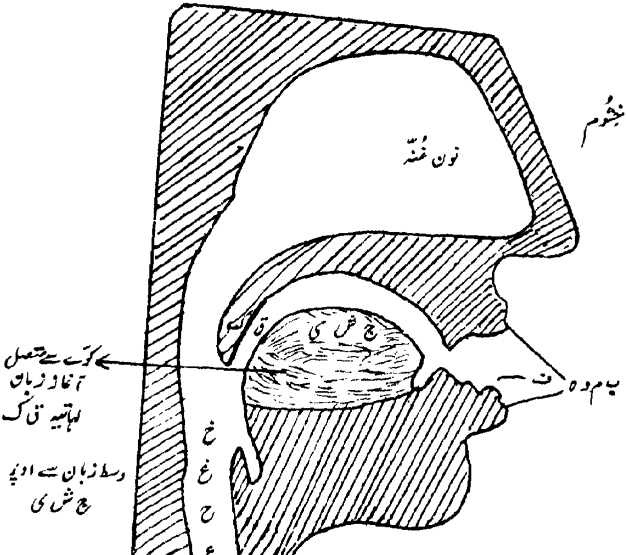


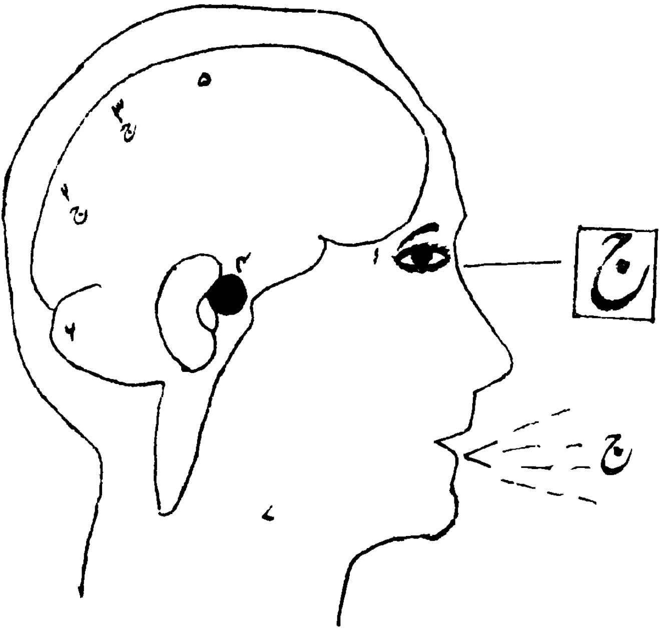
٤ ثنایا

٤ رباعیات

٤ انیاب

اضراس:
- ٤ ضواحک
- ١٢ طواحن
- ٢٠ نواجذ


خیشوم
نون غنّہ
ق ک
ج ش ی
ف
ب م و ہ
کوّے سے متصل
آغازِ زبان
لہاتیہ ق ک
وسط زبان سے اوپر
ج ش ی
حلقیہ
خ
غ
ح
ع
ہ
ع



۔ مشاہدہ

۱۔ تحریری حرف کا بصری تصور

۱۔ سابقہ تجربات کی روشنی میں تعارف

۴۔ تصور و تعارف میں ربط

۵۔ تحریکِ نطق

۶۔ عضلاتی تعامل

۷۔ اظہار

ننھے طلبہ کے اہم مسائل کا حل

ڈاکٹر عبدالرؤف (ڈائرکٹر بیورو آف ایجوکیشن ویسٹ پاکستان)

طلبہ کے مسائل سمجھنے کی اہمیت

بڑوں کی طرح بچے بھی اپنی زندگی میں طرح طرح کے مسائل اور الجھنوں سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ کھانے پینے، لکھنے، پڑھنے، کھیلنے، کودنے۔ غرضیکہ زندگی کے ہر مرحلہ پر بچے یہ دشواریاں اور الجھنیں محسوس کرتے رہتے ہیں۔

ان مسائل کو سمجھنے اور ان کے مناسب حل ڈھونڈنے میں طلبہ کی رہنمائی کے کام کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس سمت میں والدین اور اساتذہ عموماً مندرجہ ذیل طریقے اختیار کرتے ہیں۔

(۱) ان مسائل کو قطعی نظر انداز کر دینا۔

(۲) ان کے غلط سلط اور اوٹ پٹانگ حل آزمانا۔

(۳) ٹھوس اور سائنسی حل تلاش کرنا۔

ظاہر ہے کہ پہلا اور دوسرا طریقہ قرین مصلحت نہیں۔ اس قسم کے طریقے اکثر اوقات بچوں کی نشوونما پر بہت ناگوار اور مستقل طور پر مضر اثر ڈالتے ہیں۔ بہترین اور موزوں ترین طریق یہی ہے کہ بچوں کی الجھنوں اور روزمرہ مشکلوں کے ٹھوس اور سائنسی حل ڈھونڈے جائیں۔

مکتبی مسائل کی اقسام اور ان کے حل

مدرسہ کی زندگی میں بچے جن مسائل سے دوچار ہوتے ہیں انہیں تین گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ (۱) تعلیمی مسائل

(۲) شخصی مسائل

(۳) معاشرتی مسائل

تعلیمی مسائل

اکثر بچوں کے لیے مدرسہ میں داخلہ ہی متعدد متنوع الجھنوں کا باعث بن جاتا ہے۔ مدرسہ کا ماحول گھر کی فضا سے کہیں مختلف دکھائی دیتا ہے۔ لکھائی پڑھائی کا کام مشکل معلوم ہوتا ہے معلم کی کئی باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ پڑھائی میں عدم دلچسپی کمرۂ جماعت میں شرارتیں کرنے اور مدرسے سے بھاگ جانے پر اکساتی رہتی ہے

معلم کے لیے اس قسم کی صورتِ حال سے نپٹنے کا ایک نیر بہدف طریقہ یہ ہے کہ وہ تعلیم و تدریس کے کام کو اس قدر دلچسپ بنا دے کہ یہ کام کھیل معلوم ہو۔ منصوبی طریقہ۔ انکشافی طریقہ۔ ڈالٹن پلان۔ مانٹسوری طریقہ وغیرہ۔ تعلیم بذریعہ کھیل کے دلچسپ طریقوں سے استفادہ کیا جائے تو ننھے بچوں کی مکتبی الجھنوں کا علاج ہو جاتا ہے

سزا اور جزا کے بارے میں معلم کو بہت احتیاط اور فراست سے کام لینا چاہیے۔ بچوں کے انفرادی اختلافات کا علم اس سمت میں بہت آڑے آتا ہے بشکل نکتے۔ پھسڈی۔ لنگوڑے۔ متوسط ذہین اور مجرم بچوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی بجائے ہر ایک سے اس کی ذہنی استعداد کے مطابق انفرادی سلوک روا رکھنا چاہیے۔

شخصی مسائل

ننھے طلباء کے مسائل کی اس نوع میں وہ تمام الجھنیں شامل ہیں جو ان کی ذات سے متعلق ہوں ایسے شخصی مسائل کی دو بڑی اقسام یہ ہیں۔

ا۔ جسمانی صحت کے مسائل

ب۔ ذہنی صحت کے مسائل

ظاہر ہے کہ جسمانی صحت کے بغیر تحصیل علم ناممکن ہے۔ اس لیے مدرسہ میں بچوں کے باقاعدہ طبی معائنہ کا اہتمام ہونا اشد ضروری ہے۔ طبی معائنہ کے علاوہ مدرسہ میں حفظانِ صحت کے اصولوں پر بھی سختی سے عمل ہونا چاہیے۔ کیوں کہ تدارک علاج سے بدرجہا بہتر اور سستا ہے۔

اسی طرح بچوں کی ذہنی الجھنوں اور بیماریوں کے علاج کا بھی معقول اہتمام ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ مدرسہ کے ماحول میں ذہنی حفظانِ صحت کے اصولوں پر عملی اطلاق کے وافر سامان ہونے چاہئیں خوف، مایوسی اور یبوست کی بجائے مدرسہ کا عمومی ماحول محبت، امید، مسرت اور دلچسپی سے بھرپور ہو تو بچے اکثر ذہنی الجھنوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

معاشرتی مسائل

بچوں میں معاشرتی شدھ بدھ کی تخلیق کا اہتمام ابتدائی مدارج ہی میں ہونا چاہیے۔ معاشرتی سلیقہ اور اطوار و کردار کی تربیت نصابی تعلیم سے بھی زیادہ اہم ہے۔ معاشرتی تربیت کا بہترین طریقہ تفریح اور کھیل کود کی تنظیم ہے۔

معاشرتی تنظیم کا ایک اہم شعبہ بچوں کو ذاتی حفاظت کی تربیت دینا ہے۔ ٹریفک، روزمرہ خطرات گندگی وغیرہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی تربیت کو ہر مدرسہ میں متقدم مقام ملنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ہاں ٹریفک کے حادثات اور بچوں کی اتفاقی اموات کی ارزانی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے گھروں اور مدرسوں میں بچوں کی تربیت کے اس اہم پہلو کو نظر انداز کرتے ہیں۔

اساتذہ کے فرائض

اگر تعلیم کا مقصد بچوں کی صحت مند زندگی کی تیاری کرانا ہے تو ان کی زندگی کے ان بنیادی مسائل سے غفلت برتنا بے حد خطرناک ہے۔ عصرِ رواں میں زندگی یوں بھی پیچیدہ تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ بچوں کی ان پیچیدگیوں اور الجھنوں کو نظر انداز کر کے معلم بچوں اور سارے معاشرہ پر بہت بڑے ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔

تعلیم و تدریس اور بچوں کی تربیت کے فرائض سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونے کے لیے معلم کو مندرجہ ذیل باتوں کو بطور ذاتی رہنمائی ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔

(۱) بچوں کے مسائل کو سمجھنے اور ان کی رہنمائی کے کام میں کامیابی کا بیشتر دارومدار ان مسائل کے اسباب سمجھنے پر ہے۔ اس لیے معلم کو بچوں کی الجھنوں اور روزمرہ مسائل کے اسباب سمجھنے کی بصیرت

پیدا کرنی چاہیے۔

(۲) بچوں کی نفسیات اور رہ نمائی کے باضابطہ اصول جو مشاہدوں اور تجربوں کی بنا پر تشکیل کیے گئے ہیں معلم کو چاہیے کہ ان اصولوں سے عملی طور پر استفادہ کرے۔

(۳) معلم اپنے کام کو زیادہ مؤثر بنانے اور اِس میں والدین کو شریک کرنے کے لیے مدرسہ میں اساتذہ اور والدین کی انجمنیں قائم کرے۔

(۴) معلم اپنے فرائض کو نصابی کتب ختم کرنے اور بچوں کو امتحان پاس کروانے تک ہی محدود نہ سمجھے بلکہ بچوں کی تعلیمی، معاشرتی اور شخصی الجھنوں میں رہ نمائی کے کام کو بھی نصابی فرائض جتنی اہمیت دے۔

حوالہ جات

(۱) بچوں کی رہ نمائی (۲) بچوں کی نفسیات (۳) بچوں کی تربیت

تعلیمی سیر

اِنسانی تمدن کی تاریخ میں سیر و سیاحت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ دنیا کی عظیم ترین ایجادیں اسی کی بدولت منظرِ عام پر آئیں۔ قدیم زمانے میں جب حصولِ علم کے لیے سہولتیں میسر نہیں تھیں تشنگانِ علم طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے اپنی پیاس بجھاتے تھے اور علم کی روشنی کے ساتھ تہذیب اور ثقافت کی کرنیں دنیا کے کونے کونے میں پہنچاتے تھے۔

اسلامی سلطنت کے عروج کے زمانے میں سیر و سیاحت کو بہت وقیع سمجھا جاتا تھا۔ سلاطین اِسلام سیاحوں کو نہ صرف بہ نگاہِ احترام دیکھتے تھے بلکہ انھیں انعام و اکرام سے نوازنا باعثِ عزت و شرف سمجھتے تھے۔ ابن بطوطہ نے آخر وسط افریقہ کے شہر ٹمبکٹو سے دہلی تک کا سفر کیا، اور اپنا سفر نامہ لکھ کر تاریخ انسانی میں ایک قیمتی باب کا اضافہ کیا۔ ابوریحان البیرونی کا شوقِ تحقیق اسے ہندو پاکستان میں لایا۔ اس کی تصنیف "کتاب الہند" کتب سیاحت میں آج بھی وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔

موجودہ زمانے میں جبکہ سفر کی سہولتیں حاصل ہیں، سیر و سیاحت کی اہمیت زیادہ ہو گئی ہے EDGAR DALE نے جو سمعی و بصری اعانات کا مشہور امریکن ماہر ہے تعلیمی سیر کو سمعی و بصری اعانات میں ایک مرکزی حیثیت دی ہے۔ یوں تو تمام مضامین کی تدریس میں تعلیمی سیر کی ضرورت ہے، لیکن معاشرتی علوم یعنی جغرافیہ، تاریخ اور شہریت کی تدریس میں تعلیمی سیر کی افادیت بہت زیادہ ہے تدریس جغرافیہ کے لیے تعلیمی سیر نہایت مفید ذریعہ تعلیم ہے۔ اس طرح بچے اپنی آنکھوں سے دریا، پہاڑ، وادیاں اور مختلف قسم کے درخت وغیرہ دیکھتے ہیں، اور ذاتی تجربے کے ذریعے سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر طلبہ کو اسکول کے گرد و نواح اور قرب و جوار میں تاریخی مقامات اور

آثار قدیمہ کی سیر کرائی جائے تو تاریخ کی تدریس کو نہایت دلچسپ اور موثر بنایا جا سکتا ہے۔ بچوں کو عجائب گھر میں پرانے سکے اور پرانی چیزیں دکھا کر جس طرح تاریخ کی اہمیت سمجھائی جا سکتی ہے اس طرح جماعت کے کمرے میں ممکن نہیں ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ شہریت جبکہ وہ زندگی کی تجربہ گاہ میں موجود ہے اسے کتاب کے اوراق کے مطالعہ تک محدود کر دینا بے وقوفی ہے۔ ایک بچہ ڈسٹرکٹ کونسل یا میونسپل کمیٹی کے جلسے میں جو کچھ سیکھ اور سمجھ سکتا ہے وہ جماعت کے کمرے میں زبانی لکچر کے ذریعے نہیں سیکھ سکتا۔ جو چیز بچے اپنے ذاتی تجربے سے حاصل کریں گے اُس کا نقش بہت دیر پا ہوگا۔ ذاتی تجربہ حاصل کرنے کے لیے تعلیمی سیر ایک بہت بڑا ذریعہ ہے جس سے بچے براہِ راست تجربہ حاصل کر سکتے ہیں۔

لیکن تعلیمی سیر، تدریس میں اسی وقت مفید ہو سکتی ہے۔ جبکہ اُس کو ایک منظم طریق سے کیا جائے اور اُس کے بارے میں پوری واقفیت حاصل ہو۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ تعلیمی سفر (TRIP) سے مراد ایسی سیاحت ہے جو ایک طے شدہ پروگرام اور منفرد منصوبے کے تحت کمرۂ جماعت سے باہر علمی تحقیق و تفتیش کی غرض سے ترتیب دی جائے۔ خواہ یہ سیاحت ٹاؤن ہال تک ہو یا کسی کارخانے تک۔ ریلوے سٹیشن تک ہو یا عمارت مدرسہ سے چند قدم کے فاصلے پر کسی آگ بجھانے کے دفتر تک ہو۔ جماعت کے بچے صحن مدرسہ میں درختوں کا مشاہدہ کر رہے ہوں یا دیہات میں سیم زدہ کھیتوں کا معائنہ کر رہے ہوں۔ تعلیمی سیر اور دوسرے تعلیمی مشاہدوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں بچے عینی مشاہدے کے ذریعے ا[illegible]وں دیکھ کر علم حاصل کرتے ہیں۔ اور جیتی جاگتی دنیا کے ٹھوس حقائق سے براہِ راست متعارف [illegible]تے ہیں۔ ایسے مشاہدات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طالب علم بغیر کسی درمیانی کڑی یا واسطے کے براہِ راست حقائق سے روشناس ہو جائے۔ تاکہ اُس کا علم زیادہ پائیدار اور زیادہ ٹھوس بن جائے۔

تعلیمی سیر (SCHOOL TRIP) کی متعدد قسمیں ہیں۔ عام طور پر اساتذہ صبح یا شام کے وقت بچوں کو کسی قریبی فیکٹری یا ریڈیو سٹیشن یا عجائب گھر یا مشہور عمارت میں لے جاتے ہیں۔ اور

تشریح و توضیح کے ذریعے حالات سمجھائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ذیل کے چند اقسام قابل ذکر ہیں۔

(۱) مقامی سکول ٹرپ:۔ یہ سادہ ترین قسم ہے۔ اس میں جماعت اپنے ہی سکول کے مختلف حصوں کا مثلاً اس کی عمارت، میدان، باغیچہ وغیرہ کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس سے دو مقصد حاصل ہوتے ہیں (i) پیمائش سکھائی جا سکتی ہے اور (ii) فٹ بال اور دوسری کھیلوں کے میدان کی LAYOUT کی جا سکتی ہے۔ درختوں اور پودوں وغیرہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز ٹریفک کے قوانین اور سڑکوں پر آمدورفت کے اصول سمجھائے جا سکتے ہیں۔ اس کے لیے مدرسے کا ایک پیریڈ کافی ہے۔

(۲) جماعتی سفر (COMMUNITY TRIP) یہ سفر تربیتی کھیت کے مشاہدے یا کسی شہر کے کنارے، ریلوے سٹیشن، لائبریری، دریا، ڈاک خانہ یا کسی دوسرے قابل دید مقام کی سیر کی غرض سے کیا جاتا ہے۔

ہمارے اکثر مدارس اس قسم کے سفر ترتیب دے سکتے ہیں۔ اور اس کے لیے تعطیل کا دن یا کوئی دوسرا دن مقرر کر سکتے ہیں۔

(۳) طویل سفر:۔ یہ سیاحت کئی دن کی ہوتی ہے۔ اور دور دراز کے مقامات کی سیر کے لیے ترتیب دی جاتی ہے۔ ایسی سیاحت کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ خرچ بھی نسبتاً زیادہ ہے۔ اور اس کا پروگرام طے کرنا، منصوبہ بنانا، اور اسے منظم کرنا بھی کسی قدر زیادہ پیچیدہ ہے لیکن معمولی سی سوچ بچار سے دشواریوں پر عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بہتر ہے کہ پہلے آسان اور مختصر یک روزہ سفر کیے جائیں۔ جن پر خرچ زیادہ نہ ہو۔ مدرسے یا شہر کے نواحی علاقے میں سیاحت کی جائے اور دور دراز کے شہروں مثلاً مری یا ٹیکسلا کا سفر نہ کیا جائے۔ کیونکہ ایسے سفروں میں صرف چند ایک مالدار طلبا ہی حصہ لے سکتے ہیں

مقاصد

تعلیمی سیر کے مقاصد حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ تعلیمی سیر کے ذریعے اشیاء کا براہ راست مطالعہ کیا جا سکے۔ اور ایسے حالات، واقعات

اور تعلقات کا مبنی مشاہدہ ہو سکے، جو کمرۂ جماعت میں پیش نہیں کیے جا سکتے۔ مطالعۂ قدرت میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ اور جغرافیہ، زراعت اور سائنس کی تدریس بھی بآسانی ہو سکتی ہے۔

۲۔ ان سے ایسا علم جمع کیا جا سکتا ہے۔ جو کتابوں میں نہیں پایا جاتا۔

۳۔ ان سے بچے کی سمجھ بوجھ میں اضافہ ہوتا ہے، اور بچہ حقائق کے پس منظر میں علم کو زیادہ گہرائی کے ساتھ اپنے ذہن میں اتار سکتا ہے۔ مثلاً طلبہ نہروں اور نہروں کے بندوں کے متعلق کتابوں میں بہت کچھ پڑھتے ہیں۔ لیکن جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہروں اور بندوں کا مشاہدہ نہ کریں۔ وہ اسے پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح تسخیر فطرت کے سینکڑوں واقعات کتابوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن جب تک بچہ کسی کان کو یا سوئی گیس کے مرکز کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لے اس کا علم پختہ نہیں ہو سکتا۔

۴۔ ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ بچہ اپنے ماحول سے واقفیت پیدا کرے۔ سیاحت کے بغیر اسکی واقفیت محض سطحی اور بے معنی ہوتی ہے۔ مشاہدے سے اس کی واقفیت میں معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔

۵۔ بچوں کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ زندہ اور جیتی جاگتی دنیا کی اشیاء میں زندہ تجربات کے ذریعے دلچسپی لیں۔

۶۔ تاریخی مقامات کی سیر حب الوطن کے جذبے کو ابھارتی ہے اور صوبائی عصبیت کا قلع قمع کرتی ہے۔

۷۔ تعلیمی سیر کے ذریعے ہم کمرۂ جماعت کو قوم میں لے جاتے ہیں اور قومی مسائل کو کمرۂ جماعت میں لے آتے ہیں۔

تعلیمی سیر صرف اس وقت مفید ہو سکتی ہے جب اس کا مقصد پہلے سے متعین کر لیا جائے دوران تدریس جو مشکلات پیش آئی ہوں، تعلیمی سیر اُن کا حل پیش کرے۔ ایسی سیاحت کامیاب نہیں ہو سکتی جس کا کوئی پہلے سے طے شدہ مقصد نہ ہو، یا جس کی افادیت کے متعلق مدرس عین

موقع پر سوچنے لگے۔ حال ہی میں ایک مدرس نے سیاحت کے لیے اجازت طلب کی ہے۔ اور درخواست تاریخ روانگی سے صرف دو دن پہلے بھیجی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس مدرس نے کوئی (PLANNING) نہیں کی۔ ایسی سیاحت کا کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ اس میں جو روپیہ، وقت اور طاقت صرف ہوتی ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ تمام تفاصیل پہلے طے کر لی جائیں اور کوئی چیز محض اتفاق پر نہ چھوڑی جائے۔ اس لیے ذیل کا طریق کار مفید ثابت ہوتا ہے۔

(۱) انتخاب مقام :- اساتذہ کو چاہیے کہ ملک کے اہم مقامات کا بغور مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان میں سے کون سا مقام ایسا ہے جو زیادہ سے زیادہ مشاہدہ پیش کر سکتا ہے۔ اگر ذہن سے کام لیا جائے تو سینکڑوں قابل دید مقامات مدرسے کے قریب ہی مل جائیں گے۔

(۲) طلبہ کی تیاری :- عام اسباق کے دوران یا کسی کہانی یا تصویر یا نظم کی تشریح و توضیح سے بچوں میں از خود جذبہ پیدا کیا جائے۔ تاکہ ان میں سیاحت سے استفادہ کرنے کا شوق پیدا ہو جائے۔

(۳) تنظیم :- اس ضمن میں ذیل کے امور ملحوظ رکھے جائیں۔

(ا) افسران بالا کی اجازت

(ب) مقام سیاحت کے منتظم سے وقت اور تاریخ کا تعین۔ طلبہ کی تعداد، اساتذہ کی تعداد اور مقصد سیاحت کی اطلاع۔

(ج) طلبہ کے والدین کی تحریری اجازت

(د) رہائش اور طعام کا معقول انتظام۔

(ہ) ذریعۂ سفر

(و) ہر بچے کو اچھی طرح علم ہو کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔

(ز) گاڑیاں مہیا کی جائیں۔ یا واضح طور پر بتا دیا جائے کہ طلبہ کہاں جمع ہوں گے۔

(ح) (GUIDE SHEET) (رہنمائی کا نقشہ) جو ہر طالب علم کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ اس میں

ہر وہ نکتہ درج ہونا چاہیے جس کی وضاحت کی جاتی ہے، یا جس کی پابندی طالب علم کو کرنی ہے اس میں یہ باتیں ہوں :-

جن مقامات کی سیر کی جاتی ہے، ان کے نام، محل وقوع، تاریخ، وقت، رہنما کا نام، سیر کا مقصد

(۳) **اخراجات** :- بہتر ہے کہ اخراجات کم سے کم ہوں، تاکہ طلبہ کی زیادہ سے زیادہ تعداد مستفید ہو سکے۔ اگر طلبہ سے سیاحت کے نصف اخراجات لے لیے جائیں تو کوئی ہرج نہیں باقی نصف سکول کی یونین فنڈ سے ادا کیے جائیں، سمعی و بصری معاونات کا فنڈ بھی اس مقصد کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ اخراجات بہت تھوڑے ہونے چاہئیں۔ اور اگر ہو سکے، تو روزمرہ کے استعمال کی چیزیں پارٹی اپنے ساتھ لے جائے اور رہائش کا انتظام کسی مدرسے کی عمارت میں کر لیا جائے۔

اگر پہلے سے پروگرام طے کر لیا گیا ہے تو پارٹی کو موقع پر پہنچ کر کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ ذیل کے امور کا خیال رکھیں

(i) طلبہ اپنا کام سلیقے اور صفائی سے آپ کریں۔

(ii) وہ ہر ممکن الحصول چیز کا بہترین استعمال کر سکیں۔

(iii) پارٹی کے ہر شخص کو ہر چیز اور ہر بات کے دیکھنے اور سننے کا پورا پورا موقع ملتا رہے۔

(iv) سوالات پوچھنے، بحث و تمحیص کرنے، اور دریافت طلب امور کے لیے پوری آزادی ہو۔

(v) طلبہ یادداشتیں رکھیں، تصویریں لیں اور فائلیں بنائیں۔

اعادہ :- سیاحت کے بعد حاصل شدہ مشاہدے اور علم کا اعادہ بہت ضروری ہے۔ جماعت کے کمرے میں بحث اور مذاکرہ کے ذریعے اعادہ کیا جائے۔ اگر بچے کو پہلے سے معلوم ہو کہ سیاحت کے نتائج سے متعلق اُس سے پوچھا جائے گا تو وہ اس سے دلچسپی لیں گے۔ اعادہ کے بہت سے طریقے ہیں۔ جو آئندہ شمارے میں پیش کیے جا سکیں گے ⁂

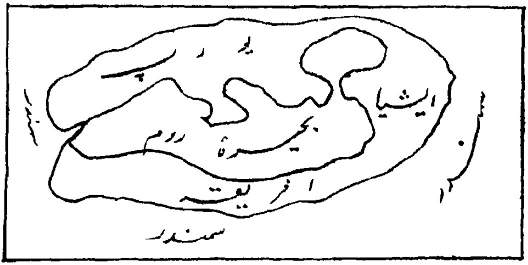
نئے جغرافیائی رجحانات

تاریخ جغرافیہ

پروفیسر فرحت اللہ خاں نیو مسلم کالج لاہور

علم جغرافیہ کی ابتدا

جس طرح پودے یا انسان تدریجاً نشوونما پاتے ہیں، علوم و فنون بھی زمانہ اور وقت کے تقاضوں کے مطابق آہستہ آہستہ بدلتے رہتے ہیں۔ علم جغرافیہ کی ابتدا آج سے تین ہزار سال پہلے یونانی دور سے شروع ہوتی ہے۔ اہل یونان کی تمام دنیا بحیرۂ روم اور اسکی گردونواح کے علاقے تھے۔ یہاں ایک شخص ہیروڈوٹس (HERODOTUS) رہتا تھا جس کو موجودہ دور میں جغرافیہ اور تاریخ کا موجد یا باپ (FATHAR OF GEGRAPHY & HESTORY) کہتے ہیں۔ ہیروڈوٹس کی دنیا ایک چھوٹی سی دنیا تھی۔ اس کا مرکز جیسا کہ شکل سے ظاہر ہے بحیرۂ روم تھا۔ اس کے شمال میں یوریا یا یورپ۔ مشرق میں آسیا یا ایشیا اور جنوب میں افریقہ تھا۔



ہیروڈوٹس کی معلومات کی انتہا صرف اتنی تھی کہ یورپ کے لوگ سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ ایشیا کے بھورے، اور افریقہ کے کالے رنگ کے۔ مسلمان جغرافیہ دان البیرونی کی طرح ہیروڈوٹس کو

لوگوں کے حالات قلم بند کرنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ بندرگاہ میں بیٹھ جاتا اور جو اجنبی دوسرے ملکوں سے آتے ان کے حالات پوچھ پوچھ کر درج کرتا رہتا۔ اسی واسطے اس کو تاریخ کا موجد بھی کہتے ہیں۔

یونانیوں نے فلسفی اور ہیئت دان بھی چوٹی کے پیدا کیے۔ مثلاً افلاطون کے شاگرد جو اکثر اپنے استاد کے ساتھ علم کی تشنگی بجھانے کے لیے ساتھ ساتھ پھرتے تھے۔ وہ اکثر اپنے استاد سے سوال کرتے اور استاد غور و فکر کے بعد ان کے استفسارات کے جواب دیتے رہتے تھے۔ ایک دن ایک شاگرد نے افلاطون سے پوچھا کہ یہ چاند اور سورج ہمیں گول نظر آتے ہیں۔ بتائیں ہماری زمین کی شکل کیسی ہے۔ افلاطون نے جواب دیا۔ چاند اور سورج کی طرح ہماری زمین بھی قدرت کا ایک کرشمہ ہے، اس لیے گول ہو گی۔

یونانی عالموں میں فیثاغورث نے زمین کی پیمائش اور سکندر اعظم نے ملکوں کے حالات معلوم کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ اور اس طرح دن بدن دنیا کے چہرے پر سے تاریکی کا پردہ ہٹتا چلا گیا۔

رومی جغرافیہ دان

یونانیوں کے بعد روم تہذیب اور تمدن کا مرکز بنا۔ رومی بڑے بہادر اور جرار سپاہی ہوتے تھے جنھوں نے جلد ہی شمال میں انگلستان تک اور مشرق میں ایشیائے کوچک تک کے علاقے فتح کر ڈالے۔ رسل و رسائل کا سلسلہ قائم کرنے کے لیے انھوں نے دور دور تک سڑکیں بنائیں اور تجارت کو فروغ دیا۔ ان کے آخری دور میں مارکوپولو نے ایشیا کا سفر کیا۔ بطلیموس اور پینی اس دور کے مشہور جغرافیہ دان تھے۔ رومی دور میں ایشیا اور یورپ کے بہت سے ملکوں سے تاریکی کا پردہ ہٹ گیا، اور جغرافیہ دان پرانی دنیا کے ملکوں کے حالات سے آگاہ ہوتے گئے۔

عرب جغرافیہ دان

سرزمین عرب میں جب ہمارے ہادئ برحق پیغمبر آخرالزماں رسول مقبول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو ان کی تعلیم سے وہ عرب جو جہالت، تباہی اور تنزل کا شکار تھا۔ دنیا میں ایک بہترین ترقی یافتہ ملک بن گیا۔ مولانا حالی نے اس کا ذکر یوں کیا ہے ۔

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا ٭ پلٹ دی بس اک آن میں اُس کی کایا

مسلمان پہلی ہی صدی میں جبرالٹر سے لے کر چین تک چھا گئے۔ ان کی لائبریریاں اور علمی مراکز دنیا میں بلند پایہ یونیورسٹیوں کی شکل اختیار کر گئے۔ جہاں لاکھوں طلبا علمی دریافت میں مصروف رہتے تھے۔ انہوں نے دور دراز ملکوں کے سفر کیے۔ نئی نئی ایجادات کیں۔ اور ایک ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالی جس میں اخلاقی اور روحانی اقدار ہی زندگی کی اساس بنیں اور جہاں تجسس اور دریافت نے ان لوگوں کو الجبرا۔ الکیمیا۔ الحساب۔ الہندسہ۔ علم ہیئت، علم جغرافیہ۔ علم تاریخ کی بنیادیں استوار کرنے کا موقع دیا۔ مسلمان جغرافیہ دانوں پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ابن خرداذبہ الادریسی۔ المسعودی۔ ابن بطوطہ۔ علامہ ابن خلدون اور البیرونی جیسے بلند پایہ جغرافیہ دان شامل تھے۔ ان کی کتابوں کے نام سے ہی ان کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ اپنی کتابوں کا نام المسالک والممالک فی الارض یعنی دنیا کے ملک اور اُن کے راستے وغیرہ رکھتے تھے۔

عربوں نے چار چیزوں میں نمایاں ترقی کی۔

۱۔ عربوں میں اسلام نے ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ ایسے واحد خدا پہ ایمان رکھتے تھے جو اللہ خالق السمٰوٰت والارض (اس کائنات کا خالق اور موجد) ہے۔ اور جس نے پوری کائنات کو انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے۔ جا بجا اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ سورج قمر، دریاؤں، پہاڑوں اور میدانوں کو تمہاری خدمت کے لیے مامور کر رکھا ہے۔ پس تم اس خدا سے کیسے انکار کر سکتے ہو جس نے زمین کی تمام اشیا، تمہاری خاطر پیدا کیں۔ ان حالات کے پیش نظر تم سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایسے رحیم اور کریم خدا کے شکر گزار بننے کی بجائے تم اس کا انکار کر دو۔ اس خیال نے عرب اور ہر مسلمان میں ایک جذبہ پیدا کر دیا تھا جس کے ماتحت وہ اکثر دعویٰ کرتا تھا کہ "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست"۔

۲۔ پرانی دنیا یعنی ایشیا۔ افریقہ۔ اور یورپ کے ملکوں کے حالات با تفصیل لکھے۔

۳۔ دور دراز ملکوں میں سفر کر کے ان کے چشم دید حالات قلم بند کیے۔ ابن بطوطہ کا سفر نامہ اس دور کی مشہور یادگار ہے۔

۴۔ نئے سائنسی آلات جاری کیے۔ اصطرلاب کا استعمال عام ہوا۔ مقناطیس کو بھی سمندری سفروں کے لیے عام طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ عرب کشتیاں، اور چھوٹے جہاز دور دور سمندر میں جاتے تھے، اور افریقہ کے ساحل کے ساتھ ساتھ جبرالٹر اور مڈغاسکر تک اور ایشیا کے جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ، عرب چین تک تجارت کرتے تھے۔ انھوں نے ارتفاعات [illegible] عرض بلد اور طول بلد کی ٹھیک ٹھیک پیمائش بھی کی

عرب جغرافیہ داں اور تدریس جغرافیہ

عربوں نے بہت سی کتابیں لکھیں، جنھیں اپنے زمانے کی مستند کتابیں مانا جاتا ہے۔ البیرونی کی کتاب (ہندوستان) ہماری سب لائبریریوں میں موجود ہے۔ لیکن عرب اکثر شہروں کے نام۔ دریاؤں اور پہاڑوں کے نام۔ جھیلوں اور سمندروں کے نام۔ راسوں اور خلیجوں کے نام تفصیل سے درج کرتے تھے۔ تدریس جغرافیہ میں اسے (COPE AND BAY GEOGROPHY) یعنی راسوں اور خلیجوں کا جغرافیہ کہتے ہیں۔ اس جغرافیہ میں ناموں پر زور دیا جاتا تھا۔ اسی لیے عربوں کی کتابوں کو (GAZETTEER) بھی کہتے تھے۔ یہ نظریہ ہمارے ملک میں تقریباً سنہ ۱۹۰۰ء تک رہا اس نظریہ کے مطابق طلبا جھیلوں۔ دریاؤں، خلیجوں اور شہروں کے نام رٹ لیا کرتے تھے۔ اس لیے یہ ایک خشک اور غیر دلچسپ مضمون تھا۔ اور اس کا مفاد صرف اسی قدر تھا۔ کہ سیاحوں اور جنگجو فاتحین کی جہاں پیمائی کے وقت کام آسکے۔ ہمارے سکولوں میں صوبہ کے ضلعوں کے نام۔ پہاڑوں کے نام۔ دریاؤں کے نام۔ شہروں کے نام وغیرہ وغیرہ پر زور دیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے طلبا اکثر یہ کہا کرتے تھے۔ "تاریخ جغرافیہ بڑا بے وفا۔ راتوں گھوٹا صبح ہی صفا۔"

جغرافیائی دریافت کا دور

عربوں کے زوال کے بعد بہت کم لوگوں نے جغرافیہ کی طرف توجہ دی۔ سنہ ۱۴۵۶ء میں عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر ڈالا۔ اور یونانی علماء اور مذہبی رہنما دوڑ کر سارے یورپ میں پھیل گئے۔ جگہ جگہ مدارس قائم ہوئے اور لوگوں نے علوم کو ترقی دی اور مذہب کی اصلاح کی۔

یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارت کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ چناں چہ ہندوستان کا نیا راستہ معلوم کرنے کے لیے واسکوڈی گاما اور کولمبس میدان میں کود پڑے۔ واسکوڈی گاما نے افریقہ کا چکر لگا کر ایک عرب مسلمان عبدالماجد کی مدد سے کلکتہ پہنچ کر تجارت کا نیا راستہ کھول دیا۔

ادھر کولمبس اگرچہ ہندوستان تو نہ پہنچ سکا۔ لیکن اس نے جزائر غرب الہند پہنچکر شمالی اور جنوبی امریکہ کو دریافت کر ڈالا۔ علامہ اقبال نے کولمبس کی دریافت کی جانب اشارہ کیا ہے -

تم جو خواہاں ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

آبادکاری کا دور

نئی دنیا معلوم ہوئی۔ یورپ کے گنجان آباد علاقوں سے لوگ نکلے اور شمالی امریکہ۔ جنوبی امریکہ آسٹریلیا۔ نیوزی لینڈ اور افریقہ کو آباد کر دیا۔ ان ملکوں کے سادہ لوح اصلی باشندے اتنی سادہ اور قدرتی زندگی بسر کرتے تھے کہ تہذیب کے علم برداروں نے عمدہ ہتھیاروں سے ان کا صفایا کر دیا آج صرف ہزاروں اور چند لاکھوں کی تعداد میں وہ ان ملکوں کے دور افتادہ کونوں میں زندگی کے سانس پورے کر رہے ہیں۔

ایشیا بھی ان کے چنگل سے بچ نہ سکا۔ یورپی اقوام سمندر کی راہ مدراس اور کلکتہ سے داخل ہوئیں۔ اور آہستہ آہستہ سارے ہندوستان پر قابض ہو گئیں۔ لیکن ہندوستان کے لوگوں کو جو پہلے ہی اعلیٰ تمدن اور تہذیب کے مالک تھے۔ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود نہ کر سکیں۔

ہندوستان میں پہلے تاجر آئے۔ پھر مشنری آئے اور پھر فوجیں جنھوں نے اپنے بہترین ہتھیاروں سے بڑے بڑے سورماؤں کو نیچا دکھایا۔

معلومات اور آبادکاری کے دور کا جغرافیہ پر اثر

معلومات اور آبادکاری کے دور نے ایک دفعہ اور جغرافیہ کی اہمیت کو بڑھا دیا۔ ذرائع وسل و رسائل، سمندر، زمین اور ہوا میں قائم ہو گئے۔ دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ (۱) صنعتی ملک

) زرعی یا خام اشیا ، مہیا کرنے والے ملک۔

معلومات اور آبادکاری کے دور نے دنیا کے اوپر سے تاریکی کا پردہ اٹھا دیا۔ اور یورپی اقوام سائنس کے علوم سے آگاہ تھیں اپنے ہر نئے ماحول کا احتیاط سے مطالعہ کرنے لگیں۔

من جغرافیہ دانوں کا نظریہ

اہل جرمنی دنیا میں سب سے اعلیٰ سائنسدان اور عالم مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے جغرافیہ کو ئنس بنانے میں سب سے پہلا قدم اٹھایا۔ ایک جغرافیہ دان (HUMBOLT) نے جنوبی امریکہ جنوب سے شمال تک سفر کیا۔ اس نے اپنے تجربات کا یوں ذکر کیا ہے۔ جنوبی امریکہ کے جنوب ں ہمارے ملک سے ملتی جلتی آب وہوا ہے۔ جب میں شمال کی طرف بڑھا تو مجھے یہ دیکھکر برت ہوئی کہ امریکہ کے لوگ بڑے لانبے تھے۔ وہ بہت تیز دوڑتے تھے۔ ان کے قدم بھی بڑے نبے تھے۔ یہ جانوروں کے پیچھے دوڑ کر ان کا شکار کرتے تھے۔ امریکہ میں یہ جنوبی گھاس کے میدان تھے جنھیں آج پمپاس کہتے ہیں۔"

ہمبولٹ آگے بڑھ کر اونچی گھاس کے میدانوں میں داخل ہوا۔ یہاں لوگ گھوڑوں پر بیٹھے انوروں کا شکار کر رہے تھے۔ آج بھی اس علاقے کے گھوڑ سوار (SOWBOYS) دنیا بھر میں شہور ہیں۔ اور امریکہ کے اس علاقے میں لاتعداد مویشی اور بھیڑیں پالی جاتی ہیں۔ ہمبولٹ نے آگے بڑھ کر استوائی جنگلات کا سفر کیا۔ وہ کہتا ہے کہ اس علاقے کے لوگ درختوں میں گھر بناتے ہیں۔ پھل کھاتے ہیں۔ اور اگر موقع ملے تو بندروں اور پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔

الغرض جس طرح کا ماحول ہو اسی طرح کی انسانی زندگی بن جاتی ہے۔ اور ماحول اس کے لباس، خوراک، اور طرز رہائش پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ جرمنی میں اس وقت ایک بڑا قابل استاد تھا۔ وہ ہمبولٹ کے نظریات پڑھ کر اتنا متاثر ہوا کہ گاؤں گاؤں جاکر طلبا کو ان حالات سے آگاہ کیا۔ یس جرمن جغرافیہ داں نے دنیا کو بتایا کہ ہماری زمین پر آب وہوا اور نباتات کے خطے ہیں اور وہ انسانی زندگی پر اتنا گہرا اثر ڈالتے ہیں کہ انسان اسی قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ہمبولٹ ان خطوں کو قدرتی خطے کہتا تھا۔ اور اکثر کہا کرتا تھا کہ ماحول انسان سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

فرانسیسی جغرافیہ دانوں کا نظریہ

فرانسیسی انجینئروں نے انیسویں ۱۸۶۹ء میں نہر سویز بنا کر یورپ اور ایشیا کے درمیان نیا سمندری راستہ قائم کیا، جسے اس صدی کی سب سے بڑی فتح مانا جاتا تھا۔ اتفاق سے اہل فرانس کے قبضے میں افریقہ کا صحرا آیا۔ لق و دق صحرا کو فرانسیسی دیکھ کر گھبرا گئے لیکن سائنسی ترقی نے فرانسیسی جغرافیہ دانوں میں ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ نپولین کے الفاظ میں اکثر یہ کہتے تھے کہ ناممکن وہ لفظ ہے جو صرف بیوقوفوں کی ڈکشنری میں لکھا ہوا ہے۔

"IMPOSSIBL IS THE WORD THAT CAN BE FOUND IN THE DICTIONARY OF FOOLS"

چنانچہ فرنچ یونین قائم کر کے انھوں نے صحرا پر قبضہ جما لیا۔ وہ اکثر یہ کہتے تھے کہ علم، سائنس، اور موجودہ ہتھیاروں سے لیس ہوا ہوا انسان اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول پر قابو پا سکتا ہے چناں چہ انھوں نے جغرافیہ کی بنیاد رکھی ہے۔ اور اُس کی یوں تعریف کی ہے "انسان دنیا کی بہت بڑی طاقت ہے۔ اور اپنے ماحول کو حتی القدور بدل سکتا ہے"۔

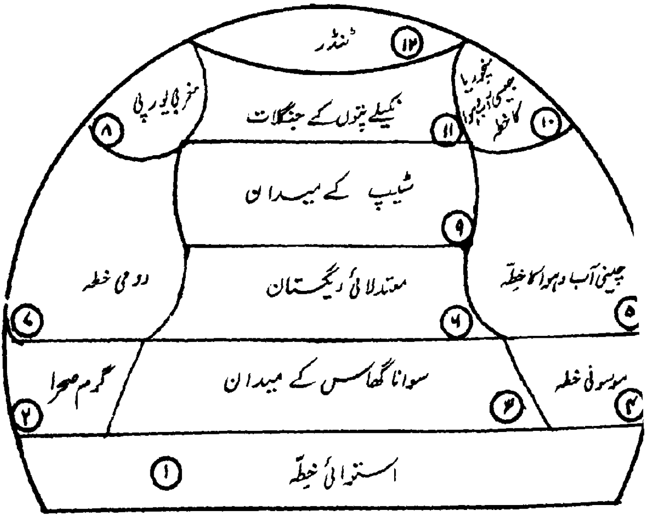
پاکستان کے لیے سبق

پاکستان کی موجودہ ترقیاتی سکیموں کا منشا سائنس کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر اپنے ماحول پر فتوحات حاصل کرنا ہے۔ ہمارے محبوب صدر ایوب خان جو اپنی طالب علمی کے زمانے میں جغرافیہ پڑھتے رہے ہیں۔ بار بار یہ کہتے ہیں کہ اے سیاست دانوں متحد ہو کر اپنے ملک کی طرف غور کرو۔ تمہارا کام اپنی زراعت، تجارت، صنعت و حرفت کو ترقی دینا ہے۔ تمہارا جذبہ بجائے باہمی کشمکش کے کشمیر کے حصول پر صرف ہونا چاہیے۔ تاکہ تمہاری جدو جہد سے تمہارے اسی فیصد کشمیری بھائی آزادی حاصل کریں اور کشمیر جو جغرافیائی اور قدرتی طور پر تمہارا حصہ ہونا چاہیے (کیوں کہ تمہارے دریاؤں اور تمہارے رسل و رسائل کے ذرائع اُس سے وابستہ ہیں) ہمیشہ تمہارا ہو جائے۔ ذرا

لر کے دیکھیں کہ اس غیر قدرتی الحاق سے چین بالکل نہیں متاثر ہوتا۔ اور وہ حصہ جو تبت کا
و ہونا چاہیے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ تمہاری ترقی تمہاری زرعی اصلاحات
، بجلی اور معدنیات سے وابستہ ہے۔ آؤ عہد کریں کہ بحیثیت پاکستانی باشندے ہونے کے
م دیانتداری سے انسانی وقار کو قائم رکھتے ہوئے اپنی قدرتی دولت کو بڑھائیں گے

پروفیسر ہربرٹسن اور انگریز جغرافیہ داں

پروفیسر ہربرٹسن آکسفورڈ یونیورسٹی میں ۱۹۰۵ء میں جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ جرمن اور فرانسیسی نظریات سے متاثر ہو کر انہوں نے دنیا کو بارہ خطوں میں تقسیم کیا جو مندرجہ ذیل شکل سے ظاہر ہیں۔



ہند اور پاکستان میں تدریس جغرافیہ پر اثر

چونکہ ہم برصغیر ہندو پاک میں ۱۹۴۷ء تک انگریزوں کے ماتحت رہے۔ اس لیے ہمارے ہاں

ٔا طریقہ جس کے حامی پروفیسر ہربرٹسن تھے مروّج رہا۔ ۱۹۱۰ء کے قریب ہم نے عرب جغرافیہ ٔان کے نظریات کو ترک کیا۔

سب سے پہلے لنکا میں مسٹر السن (ڈائرکٹر محکمہ تعلیم) نے جغرافیہ کی اہمیت کو بڑھایا۔ ان کی کتاب (FOOD - CLOTHNIG AND SHELTI) لنکا اور مدراس کے سکولوں میں بڑی دلچسپی سے ھائی جاتی تھی۔

سابق صوبہ پنجاب میں مسٹر نولٹن (MR. KNOWLTON) نے جغرافیہ عالم کو یہاں کے سکولوں لیے تجویز کیا۔ مسٹر نولٹن پنجاب کے ڈائرکٹر بھی تھے۔ اس لیے پنجاب نے ۱۹۲۳ء کے لگ بھگ جغرافیائی تعلیم کو بہت اہمیت دی۔

لالہ سوہن لال جو ٹریننگ کالج کے پروفیسر تھے مسٹر نولٹن کی تمام کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لالہ سوہن لال نے پنجاب میں جغرافیائی تعلیم کو بہت فروغ دیا اور ان کی کتابیں نہ صرف پنجاب میں بلکہ اضلاع متحدہ۔ بمبئی اور راجپوتانہ میں بھی پڑھائی جانے لگیں۔

مسٹر محمد ناظر جو انگلستان سے جغرافیہ پڑھ کر آئے تھے، لالہ سوہن لال کے بعد جغرافیائی معلومات کو بڑھانے کے علمبردار ہوئے۔ انہوں نے خطائی جغرافیہ پر بہت زور دیا اور کچھ حد تک جغرافیائی تدریس کو دلچسپ بنانے میں کامیاب رہے۔ ان کے ساتھ لالہ دودھا دام (جنھوں نے سرتاج جغرافیہ لکھا) اور میاں عبدالحکیم۔ میاں نذر محمد رسالی کتابوں کے لکھنے میں حصہ لیتے رہے۔ ہمارے سکول میں ۱۹۳۴ء تک خطائی جغرافیہ پڑھایا گیا۔ یہ تدریس جغرافیہ میں ایک بہت بڑا اقدام ہے جو ہماری جغرافیائی تعلیم میں سنگ میل کا کام دے گا۔ (باقی)

بچوں کے حقوق

صوفی گلزار احمد

جس طرح ہر ملک کے شہریوں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں جو اس ملک کی حکومت پر عاید ہوتے ہیں اور جن کی تکمیل اس حکومت کا فرض اولین بن جاتا ہے۔ اسی طرح بچے کے بھی کچھ ایسے حقوق ہیں جن کا پورا کرنا اور جن کی نگہداشت کرنا والدین کا اہم فریضہ ہے۔ ہمارے پس ماندہ طبقے میں اکثر والدین یہ خیال کرتے ہیں کہ بچے کے اپنے حقوق کچھ بھی نہیں اور اسے جس طرح بھی چلایا جائے بہتر ہے۔ انہیں اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ ہر شہری فرد کی طرح وہ بھی ایک فرد ہے۔ وہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے حقوق کو ملحوظ رکھا جائے اور جس طرح ہو سکے ان حقوق کو بڑی خوش اسلوبی سے منوائے۔ یہ حقوق دراصل بچے کی فطری ضروریات پر مبنی ہیں جن کی تسکین تقاضائے فطرت ہے۔

آئیے ہم بچوں کی ان فطری ضروریات پر نظر ڈالیں جو والدین کے لیے ان کے حقوق کا روپ بھر لیتی ہیں اور جن کی تسکین کرنا والدین کا اہم فریضہ بن جاتا ہے۔

سب سے اہم فریضہ جو والدین پر عاید ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بچے کو والدین کی محبت سے محروم نہ کیا جائے۔ بلکہ اس کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آیا جائے۔ یہی وہ خواہش اور ضرورت ہے جسے بچہ فطرتاً لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس اہم ضرورت کو نظر انداز کرنا بچے کی فطرت کے منافی ہے۔ آپ ذرا کسی بچے سے ہمدردی اور شفقت کا برتاؤ کرنا چھوڑ دیں اور پھر دیکھیں کہ اس کا طرز عمل کیا ہوتا ہے اور وہ آپ کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔ یہ ایک فطری حق ہے جسے چھیننا اور یکسر نظر انداز کرنا خود بچے کی تعمیر کے لیے بلکہ والدین کے لیے بھی پریشان کن ہے۔ بچہ نازک جذبات اور احساسات کا مالک ہوتا ہے۔ اگر ان نازک جذبات اور احساسات کی قدر

نہ کی جائے تو وہ مایوس اور افسردہ دل ہو جاتا ہے۔ وہ والدین کو اپنا ہمدرد اور مونس خیال کرنے کی بجائے انہیں جابر اور ظالم تصور کرتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دل میں نفرت اور کینے کو محفوظ کر لے جو اس کی آئندہ زندگی پر بھی اثر انداز ہو۔ آپ اکثر ماؤں کو اس قسم کے جملے کستے ہوئے سنتے ہیں۔ تم گندے لڑکے ہو۔ روز بروز شرارتی بنتے جا رہے ہو۔ میں تم سے محبت نہیں کرتی ہوں۔ خصوصاً نئے بچے کی پیدائش پر تو پہلے بچے کے ساتھ ذرا سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ اور اس کے نازک جذبات اور احساسات کی بالکل پروا نہیں کی جاتی۔ ذرا کہیں پہلے بچے نے کام کر دیا جو والدین کی منشا کے خلاف ہو تو وہ فوراً اس کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگتے ہیں۔ اس قسم کا طرز عمل بچوں کو فوراً ناگوار گزرتا ہے۔ اکثر مائیں تو بچے کو یہاں تک کہہ دیتی ہیں کہ تم میرے بیٹے نہیں بلکہ وہ میرا بیٹا ہے اور میں اس کی امی ہوں۔ تمہاری نہیں۔ ایسے الفاظ بچے کے دل پر نشتر کا کام کرتے ہیں۔ وہ والدین کے رویے میں یکایک ایسی تبدیلی دیکھ کر بڑا حیران ہوتا ہے۔ اور نووارد کے ساتھ ان کی قربت کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتا لیکن والدین کو اس بات کی بالکل خبر نہیں ہوتی کہ ان کا یہ طرز عمل بچے کے ذہن پر کتنی بری طرح اثر انداز ہو گا اور ان کی ذہنی اور جذباتی نشوونما میں مضر ثابت ہو گا۔ اکثر دیکھا جائے تو بچے کے ساتھ محبت و شفقت کا برتاؤ ہی ہر حال میں بہتر رہتا ہے خصوصاً ایک نووارد کی آمد سے والدین کا محتاط ہونا اور ضروری ہے، ورنہ اکثر اوقات تو نووارد کے ساتھ ماں کی قربت ہی بچوں میں یہ احساس پیدا کر دیتی ہے کہ اب ماں ان کی محبت اور شفقت کا مرکز نہیں رہی اور ان کی زندگی کا سہارا چھن گیا ہے۔ اگر والدین بچے کو نووارد کی آمد پر یہ بتا دیا کریں کہ نووارد ایک اجنبی ہے اور اس کا ہنسی خوشی استقبال کرنا ہم سب کے لیے ضروری ہے۔ اس کی آمد سے ان کی محبت میں کوئی فرق نہ آنے پائے گا تو یہ باتیں مفید ثابت ہوں۔ اور بچوں کے ذہنی اور جذبات کو پڑھنے اور پھولنے کا اچھا خاصا موقع ملے۔

بچہ ہر لمحہ اس بات کا متمنی ہوتا ہے کہ والدین اسے محبت اور شفقت کی نگاہوں سے دیکھیں یہاں تک کہ وہ کسی خواہش کو پورا کرنے اور کسی بات کو منوانے میں اسی چیز کو ملحوظ رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں والدین کی ضرورت سے زیادہ سختی اُسے مضطرب کر دیتی ہے اور وہ پریشان رہنے لگتا ہے۔

اکثر ایسی لگاتار پریشانی بچوں کو گھر سے بیزار بھی کر دیتی ہے۔ اور وہ والدین کی محبت کے متلاشی رہنے لگتے ہیں۔ چناں چہ گھر سے باہر اکثر افراد والدین کا بدل بن جاتے ہیں اور یہ عادت بدستور بڑھتے بڑھتے آوارگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

محبت اور شفقت کی کمی کا احساس بچوں میں اپنی ذات کا شدید احساس بھی پیدا کر دیتا ہے وہ یہ چاہنے لگتے ہیں کہ اپنی ذات کی حفاظت کریں۔ چناں چہ اس چیز کے پیش نظر وہ کسی قدر ضدی اور ہٹ دھرم بن جاتے ہیں۔ بعض والدین تو بچوں کی تربیت کے معاملے میں اس قدر سختی سے کام لیتے ہیں کہ وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ بچہ محبت اور شفقت کا دلدادہ ہوتا ہے۔ انھیں اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ سختی اسی حد تک صحیح اور مناسب ہے، جس حد تک بچوں کی تربیت کے لیے ضروری ہو، ورنہ ضرورت سے زیادہ سختی بچوں کو سنوارنے کی بجائے اور بگاڑ دیتی ہے۔ والدین بچوں کی تربیت کا حق ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن وہ گھر میں ایک حاکم کی حیثیت نہیں رکھتے۔ والدین کے لیے یہ خیال کرنا کہ وہ حاکم ہیں اور بچہ محکوم صرف بچوں کے لیے نقصان دہ بات نہیں بلکہ والدین کے لیے بھی پریشان کن امر ہے۔

بچے اس بات کے متمنی ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کو نمایاں کریں اور دوسرے لوگوں کے روبرو اسے منظر عام پر لائیں۔ لیکن اکثر اوقات والدین اس کی اس خواہش کی قدر نہیں کرتے اور ان کے احساس ذات کو دبا کر رکھتے ہیں۔ ذرا کسی بچے نے اپنی مرضی سے کوئی کام کر دیا، یا کسی معاملے میں رائے دیدی تو جھٹ اس کا منہ بند کر دیا اور اسے دو تین سنا دیں۔ اکثر اوقات والدین تو بچوں کو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ تم ابھی ناپختہ اور ناتجربہ کار ہو۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم منہ بند رکھا کرو ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے میں شدید احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ وہ دوسرے افراد کے مقابلے میں حقیر اور کم تر ہے۔ ایسے بچے سوسائٹی یا مجلس میں اپنے آپ کو اجنبی خیال کرتے ہیں اور کمتری کے شدید احساس کے باعث چپ سادھ لیتے ہیں۔ یہی احساس ان کی آئندہ زندگی میں اکثر ذہنی الجھنوں کا باعث بنتا ہے۔ والدین اگر بچے کے احساسات کی

قدر کریں تو اس میں کبھی ایسی چیز پیدا نہ ہو جس سے انھیں پریشان ہونا پڑے۔ بچے والدین سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ والدین ان کی ضروریات اور خواہشات کو مدّ نظر رکھیں اور جہاں تک ہو سکے ان کی تسکین کر دیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر والدین ایسی باتوں میں دل چسپی لیتے ہیں اور ان ضروریات کا خیال رکھتے ہیں جو ان کی اپنی ذات سے وابستہ ہوں اور بچوں کی ضروریات اور ان کی دل چسپیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چناں چہ والدین کو آپ نے اکثر ایسی باتیں کرتے سنا ہو گا۔ تمھیں معلوم ہے کہ تمہاری تعلیم پر کتنا خرچ ہو رہا ہے۔ اب تمھیں زیادہ سے زیادہ محنت کرنی چاہیے۔ یا یہ کہ تم نے پردے خراب کر دیئے ہیں تمھیں معلوم ہے کہ ان پر کتنا روپیہ خرچ ہوا ہے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کا بچے کی زندگی سے بہت کم سروکار ہے۔ اس لیے ایسا کرنا بچوں کو محض اس بات سے خبردار کرنا ہے جو بڑوں کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے سوا بچوں کی زندگی میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ بچے کی زندگی میں جن چیزوں کی اہمیت ہے وہ اس کی اپنی ضروریات اور خواہشات ہیں۔ والدین بچوں کو ایک خوش گوار ماحول اسی صورت میں مہیا کر سکتے ہیں جبکہ وہ ان کی خواہشات کا خیال رکھیں۔ تاکہ ان کی مسرتوں میں اضافہ کیا جا سکے۔ بچوں کی سیر و تفریح اور ان کے مشاغل کے متعلق تبادلۂ خیالات کرنا اور کسی نہ کسی معاملہ میں ان کی رائے بھی لے لینا بہتر رہتا ہے۔ تاکہ ان میں اپنی ذات کا احساس بھی قائم رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی ضرورت کی وضاحت بھی کر سکیں۔

بچوں کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ والدین ان کا احترام کریں اور ان کی ذات کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔ چناں چہ ان کی اس خواہش کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ بھی والدین کو تعظیم کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور ان کی قدر نہیں کرتے۔ خصوصاً ہمارے ملک میں بچوں کے اس جذبے کی قدر نہیں کی جاتی۔ بچے ایسے حالات میں پروان چڑھتے ہیں جن سے اُن کی عزت افزائی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بچے والدین کا احترام کرنا نہیں جانتے۔ آج کل عموماً یہ شکایت کی جاتی ہے کہ بچے والدین کا احترام کرنا نہیں جانتے۔ اگر دیکھا جائے تو ایسی شکایت نامناسب ہے جس طرح والدین

اپنا احترام واجب تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح انھیں اس بات کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ یہ چیز بچوں کا بھی فطری حق ہے کاش والدین یہ بات سمجھ لیں اور اِس اصول کو یاد رکھیں کہ اگر اپنی عزت کروانا چاہتے ہیں تو دوسروں کی عزت کرنا سیکھیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جسے والدین بچوں کو سونپ کر ان کی صحیح تربیت کر سکتے ہیں۔ دوسروں کی عزت و احترام کرنا نہایت ضروری اور اہم ہے۔ ایک فرد خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا اس کا احترام ان پہ لازم ہی نہیں بلکہ فطری طور پہ واجب ہے۔

÷

زبانوں کی تدریس اور مطالعہ

محمد صدیق احمد

طالب علمی کے ابتدائی مرحلے پر کسی زبان کے سیکھنے کے لیے سب سے بنیادی مہارت اس کا صحیح مطالعہ ہے۔ دوسری قابلیتیں اور مہارتیں جو زبان کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہیں مشق کے فقدان کے باعث جلد ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن مطالعہ کی قابلیت اور مہارت اگر ایک مرتبہ حاصل ہو جائے تو تا زندگی قائم رہتی ہے۔ اس کی قدر و قیمت دیرپا اور مستقل ہوتی ہے۔ کیونکہ جب اور جہاں بھی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں اس مہارت کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔

مطالعہ کی مہارت کے سلسلے میں مختلف اقسام کے مطالعہ کی نگرانی اور ہدایت کے لیے چند تجویزیں پیش کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

گہرا مطالعہ

گہرے مطالعہ کا اولین مقصد یہ ہے کہ تحریر شدہ خیال کو سمجھ لیا جائے۔ لیکن یہ کافی نہیں۔ آج کی تیز رفتار دنیا میں مطالعہ کی تیز رفتاری بھی بے حد ضروری ہے۔ جہاں تک سرسری مطالعہ کا تعلق ہے کسی خاص قسم کے چھپے ہوئے صفحہ کو پڑھ کر فوراً سمجھ لینا ہی کافی ہے۔ لیکن تحسینِ ادب و زبان کے لیے یہ ناکافی ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک طرف تو زبان کو خاص آواز، تلفظ، مناسب زیروبم کے لیے تربیت دینی پڑتی ہے اور دوسری طرف گوش ہائے سماعت کو ان آوازوں اور زیروبم کو سمجھنے کی تربیت بھی دینا ہوتی ہے۔ اسی کو گہرا مطالعہ کہتے ہیں۔

جماعت میں ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن کے ذریعہ گہرا مطالعہ کرتے وقت طلبہ عبارت کو صحیح طور پر روانی کے ساتھ اس طرح پڑھ سکیں کہ بین السطور خیالات بھی ان پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتے

چلے جائیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اوّل تو کانوں کو ایسی تربیت دی جائے کہ وہ زیر مطالعہ عبارت کو سُن کر اس کا مفہوم مکمل طور پر سمجھ جائیں اور دوم زبان کو ایسی تربیت دی جائے کہ وہ عبارت کو صحیح لب و لہجہ و تلفظ اور دل نشین انداز میں روانی کے ساتھ ادا کر سکیں، اس سلسلے میں مندرجہ ذیل لائحہ عمل مفید ثابت ہو سکتا ہے :۔

۱۔ استاد کو چاہیے کہ وہ .....

زیر مطالعہ عبارت کو نمونہ کے طور پر پہلے خود پڑھ کر سنائے اور مشکل الفاظ کی وضاحت کر دے۔ اس میں متضاد و مترادف الفاظ، تعریفات اور الفاظ کے صحیح مخرج بتانا بھی شامل ہے۔

۲۔ اس کے بعد طلبہ سے مطالعہ کرنے کو کہے۔

۳۔ مشقی سوالات کے طور پر طلبہ سے زبان زیر مطالعہ میں عبارت سے متعلق معلومات ا[illegible] سوالات دریافت کرے۔

۴۔ طلبہ سے کہے کہ وہ مختصر الفاظ میں پڑھی ہوئی عبارت کا مادری زبان میں یا اگر ہو سکے تو زیر مطالعہ زبان میں خلاصہ بیان کریں۔

۵۔ آخر میں وہ طلبہ سے عبارت کو زبانی پڑھوائے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ وہ اسے صحیح لب و لہجہ و تلفظ کے ساتھ دل کش انداز میں سمجھ کر پڑھ سکتے ہیں، یا نہیں۔

خاموش مطالعہ

خاموش مطالعہ چاہے جماعت میں کرایا جائے چاہے گھر پر کرنے کو کہا جائے، دراصل گھر سے مطالعہ کی ہی مشق ہوتی ہے۔ مطالعہ کے واسطے منتخب کردہ تحریر چند سطروں اور صفحات پر مشتمل ہونے کی بجائے ایک یا ایک سے زیادہ دو حرفوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ کہانی یا عبارت کے مناسب انتخاب کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس میں پہلے سے سیکھے ہوئے الفاظ کے علاوہ چند دیگر مشکل الفاظ اور محاورات بھی موجود ہوں ۔

طلبہ اگر جماعت میں استاد کے زیر نگرانی خاموش مطالعہ کر رہے ہوں تو اس کے لیے وقت کا تعین ضروری ہے۔ بصورت دیگر وہ مطالعہ اکتا دینے والا ثابت ہو کر محض تضیع اوقات ہوگا۔ خاموش مطالعہ کے بعد طلبہ کا مادری یا زیر مطالعہ زبان میں مناسب سوالات کے ذریعہ امتحان لیا جائے جس میں مواد زیر مطالعہ کے مطالب ومفہوم کی افہام وتفہیم پر زور دیا جائے۔ اس معاملہ میں مندرجہ ذیل طریق کار پر عمل کرنا غیر مناسب نہ ہوگا:۔

۱۔ دار المطالعہ شروع کرانے سے پہلے استاد طلبہ کو عبارت زیر مطالعہ سے متعلق سوالات لکھوائے اور کہے کہ مطالعہ کے بعد وہ ان کے جوابات لکھ کر لائیں۔

۲۔ خاموش مطالعہ کے بعد استاد عبارت زیر مطالعہ سے متعلق چند سوالات طلبہ سے دریافت کرے۔

۳۔ طلبہ سے خود سوالات تیار کروائے جائیں۔ وہ اپنے ساتھیوں سے ان سوالات کے جوابات دریافت کریں۔

۴۔ طلبہ سے کہا جائے کہ وہ چند کلیدی الفاظ کی مدد سے عبارت کو دوبارہ زبانی پڑھ کر سنائیں۔

۵۔ طلبہ جو کچھ پڑھ چکے ہیں اس کا خلاصہ خود ان سے اخذ کرایا جائے۔

۶۔ طلبہ مطالعہ کردہ عبارت کے ہر پیراگراف کے لیے عنوان تجویز کریں۔ اور کہانی کے لیے مناسب عنوان تجویز کرکے بتائیں۔

۷۔ استاد تختۂ سیاہ پر چند جملے لکھ دے، اور طلبہ سے دریافت کرے کہ وہ پڑھی ہوئی عبارت میں کہاں سے لیے گئے ہیں۔

۸۔ استاد تختۂ سیاہ پر پڑھی ہوئی عبارت سے لیے ہوئے بے ترتیب جملوں کو لکھ کر طلبہ سے کہے کہ وہ انھیں ترتیب سے لکھیں۔

۹۔ ایسے سوالات دریافت کیے جائیں جن کا جواب صرف "جی ہاں" یا "جی نہیں" پر مشتمل نہ ہو۔

۱۰۔ نامکمل جملے لکھ کر ان کو طلبہ سے مکمل کرایا جائے۔
۱۱۔ بہت سے جوابات لکھ کر کوئی سوال کیا جائے اور پوچھا جائے کہ ان جوابات میں سے اس سوال کا کونسا جواب مناسب و موزوں ہوگا۔

اضافی مطالعہ

اس قسم کا مطالعہ اگر جماعت سے باہر مناسب نگرانی میں کرایا جائے تو غیر ملک اور اس کے عوام (جس ملک کی زبان کا مطالعہ مقصود ہے) میں طلبہ کی دل چسپی کا موجب بنتا ہے۔ اور ان کے دلوں میں اس زبان کو پڑھنے اور سیکھنے کا جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ اس قسم کے اضافی مطالعہ سے ہمارے بنیادی مقصد (یعنی غیر زبان کو شوق و تجسس اور ولولے کے ساتھ سمجھ کر پڑھنا آجائے) کی بھی تکمیل ہو جاتی ہے۔

اس قسم کا مطالعہ مبتدیوں کے لیے بھی تدریس زبان کو مفید اور خوش گوار بنانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس طرح طلبہ میں اس ملک کو۔ اس کے باشندوں کو اور اس کے ادب، تہذیب و تمدن کو اپنے طور پر سمجھنے کا شوق بھی پیدا ہوتا ہے۔ جو بہرحال ایک صحت مند جذبہ ہے۔ اس کی قدر کرتے ہوئے طلبہ کے لیے اس کے مناسب مواقع مہیا کرنا استاد کا ایک اہم فریضہ ہے۔

اضافی مطالعہ ابتدا میں مادری زبان تک ہی محدود رکھا جائے۔ جب طلبہ میں اتنی مہارت اور اہلیت پیدا ہو جائے کہ وہ جماعت میں گہرا اور خاموش مطالعہ کامیابی کے ساتھ کرنے پر قادر ہو جائیں تو غیر زبان میں اضافی مطالعہ کی ابتدا کی جاسکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ غیر زبان کا خاموش مطالعہ بالکل ہی نہ کریں اور دونوں کی یکساں طور پر حوصلہ افزائی کی جائے لیکن آگے چل کر جب مادری زبان میں مشق ہو

اضافی مطالعہ کرانے کے لیے چند مفید ہدایات درج ذیل ہیں :۔

۱۔ مدرسہ کے کتب خانہ میں کافی تعداد میں کتابیں موجود ہوں اور ہر طالب علم کی ان تک رسائی ہو۔
۲۔ تمام کورس کے دوران اضافی مطالعہ کو نصاب کا لازمی جز قرار دیکر ایک خالص پروگرام کے تحت خاموش مطالعہ کو جاری رکھا جائے۔

۳۔ اضافی مطالعہ کی عادت پیدا کرنے کے لیے طلبہ کی ہمت افزائی کی جائے۔

۴۔ اضافی مطالعہ کے واسطے مناسب کتابوں کا انتخاب کیا جائے خصوصاً غیر ملکی زبان کے مطالعہ کے سلسلہ میں ایسی آسان کتابوں سے ابتدا کی جائے جو کورس میں شامل نہ ہوں۔

۵۔ جماعتی نصاب کے دیگر مضامین سے اس کا ربط قائم رکھا جائے۔

۶۔ تمام کورس کے دوران انفرادی طور پر ہر طالب علم کے اضافی مطالعہ کا ریکارڈ رکھا جائے۔

۷۔ اضافی مطالعہ کا کام چیک کرنے کے لیے :-

(الف) مادری زبان میں زبانی بحث و مباحثہ کیا جائے۔ اور جب طالب علم کو غیر زبان پر عبور حاصل ہو جائے تو یہ مباحثہ غیر ملکی زبان میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

(ب) طلبہ سے مضامین خاکے اور خلاصے لکھوائے جائیں۔

(ج) ایسے سوالات جن کے جوابات مخصوص ہوں دریافت کیے جائیں۔

(۸) طلبہ کی ہمت بڑھائی جائے کہ وہ احتیاط سے ذخیرۂ الفاظ کی فہرست بنائیں جس میں وہ ان الفاظ کو لکھ لیں، جن سے ان کا واسطہ پہلی مرتبہ پڑا ہو۔ توجہ کے بغیر ذخیرۂ الفاظ کا بڑھنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے شعوری کوشش، شوق و جذبۂ تجسس کی ضرورت ہے۔ اضافی مطالعہ کے لیے یہ جذبہ پیدا کرنا لازمی ہے۔ ورنہ اضافی مطالعہ بے مقصد اور بے کار بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

مطالعہ پر ایک طویل مضمون بھی تحریر کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال ان تجاویز کا ذکر کیا گیا ہے جن کو اختیار کر کے مطالعہ مفید اور با مقصد بنایا جا سکتا ہے۔

پائلٹ سکولوں کے صدر معلّمین اور صدر معلمات
کے لیے
تعلیمی کارگاہ

ڈاکٹر فضل محمد خاں

(i) تعارف :- مغربی پاکستان کے ایجوکیشن ایکسٹینشن سروس سنٹر نے پائلٹ سکولوں کے صدر معلمین و صدر معلمات کے لیے ایک تعلیمی کارگاہ (EDUCATIONAL WORK SHOP) کا اہتمام کیا تھا تاکہ پائلٹ سکولوں کو موثر طریق سے چلانے کے ذرائع و وسائل پر تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ یہ تعلیمی کارگاہ مرکز توسیع تعلیمات کے احاطے میں ۱۵ جنوری سے ۲۰ جنوری ۱۹۶۳ء تک قائم رہی۔

(ii) شرکاء:- اس تعلیمی کارگاہ میں مندرجہ ذیل ثانوی مدارس سے (جو اب پائلٹ سکولوں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں) صدر معلمین و صدر معلمات نے شرکت کی۔

(۱) ہیڈ مسٹرس لیڈی گرفتھ گرلز ہائی سکول پشاور۔
(۲) ہیڈ مسٹرس گورنمنٹ گرلز ہائی سکول ہری پور۔
(۳) ہیڈ مسٹرس گورنمنٹ گرلز ہائی سکول سرگودھا۔
(۴) ہیڈ مسٹرس گورنمنٹ گرلز ہائی سکول وحدت کالونی لاہور۔
(۵) ہیڈ مسٹرس گورنمنٹ گرلز ہائی سکول منٹگمری۔
(۶) ہیڈ مسٹرس گورنمنٹ گرلز ہائی سکول، حیدر آباد۔
(۷) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول سرائے نورنگ (بنوں)
(۸) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کٹلانگ (مردان)

(۹) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول پھالیہ (گجرات)

(۱۰) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول شرقپور (شیخوپورہ)

(۱۱) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول، رحیم یار خان۔

(۱۲) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول، ستونگ (قلات)

(۱۳) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول۔ خانپور۔

(۱۴) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول۔ دادو۔

(۱۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول، کیمبل پور۔

(۱۶) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول، وحدت کالونی (لاہور)

(۱۷) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول، سیالکوٹ

(۱۸) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول، ملتان

(۱۹) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول، سبی۔

(۲۰) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول، لڑکانہ

(iii) **افتتاح** :- ۱۵ جنوری ۱۹۶۲ء کو صبح کے ۱۰ بجے انور عادل صاحب سی، ایس پی سکرٹری محکمۂ تعلیم حکومت مغربی پاکستان نے اس تعلیمی کارگاہ کی رسم افتتاح ادا کی اور اپنی افتتاحی تقریر میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر کیا۔

اوّلاً صاحب موصوف نے اس بات پر زور دیا کہ صدر معلمین (بعد صدر معلمات) بچوں کی تعلیم کے کام کو ایک قومی فریضہ کے طور پر اختیار کریں۔

دوم انھوں نے بتایا کہ بچوں کی سیرت کی نشو و نما معلمین کا اوّلین فرض ہے جس کے لیے انھیں ایک مبلغ یا داعی کی طرح سرگرم عمل رہنے کی ضرورت ہے۔

سوم انھوں نے کہا کہ مذہبی تعلیم پر زور دیا جائے کیوں کہ ایسی ہی تعلیم تمام اخلاقی اقدار کی بنیاد ہے۔

چہارم انھوں نے صنعتی و حرفتی تعلیم کی سب سے اہم ضرورت جتائی اور مختلف سکیموں کا حوالہ جو حکومت نے ترقی و اصلاح حال کے لیے جاری کر رکھی ہیں۔

سب سے آخر میں سکرٹری صاحب موصوف نے ان پائلٹ ٹیچرز کی تربیت کا ذکر کیا جو (باری باری) دوسرے معلمین کی تربیت میں حکومت کو مدد دیں گے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس تربیت کے پروگرام کو پائلٹ سکولوں میں عملی شکل دی جائے گی۔

(iv) پروگرام :۔ تعلیمی کارگاہ کا پروگرام مندرجہ ذیل امور پر مشتمل تھا۔

پائلٹ سکولوں کی نوعیت اور کام، پائلٹ سکولوں میں خصوصی مضامین وار تجربہ خانے یا (لیبارٹریز) بنانا۔ پائلٹ سکولوں میں زبان کے پروگرام کی اصلاح و ترقی، پائلٹ سکولوں میں رہنمائی (GUIDANCE) کے کام کی تنظیم، پائلٹ سکولوں میں انجمن والدین و معلمین کی تنظیم۔ پائلٹ سکولوں میں لائبریری کے کام اور ہاتھ کے کام کی تنظیم۔

کارگاہ کے مباحثوں میں ایجوکیشن ایکسٹینشن سروس سنٹر کے اراکین شعبۂ تعلیم اور مشیروں نے شرکت کی، اور ڈبلیو سور جنرل چیئرمین تنگاگو یونیورسٹی ایڈوائزری گروپ، ڈاکٹر ایچ پوریٹر ایڈوائزر ٹیکنیکل ایجوکیشن گورنمنٹ آف ویسٹ پاکستان اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے تجربہ کار فاضل لائبریرین محمد اسحاق چغتائی نے ان کی معاونت کی۔ پائلٹ سکولوں سے متعلق تمام مسائل مفصل طور پر زیر بحث آئے۔

(v) اہم سفارشات :۔ تعلیمی کارگاہ کی اہم سفارشات مندرجہ ذیل ہیں :۔

(۱) اہم مسائل پر کتابچوں کی تیاری

سفارش کی گئی کہ ایکسٹینشن سنٹر "ٹاؤٹوڈو سیریز" کے طریق پر ۱۲ سے ۱۶ صفحات کے مختصر رسالے (یا پمفلٹ) تیار کرے جو پائلٹ سکولوں سے متعلق تمام اہم مسائل پر مشتمل ہوں۔ یہ مختصر رسالے فروری ۱۹۶۲ء کے اختتام سے قبل تیار کر لیے جائیں اور حسب ذیل موضوعات پر حاوی ہوں۔

۱- پائلٹ سکول کے کام۔

۲۔ سائنس، ریاضی، معاشرتی علوم، گھریلو اقتصادیات، صنعتی فنون، زراعت اور کورس کے تجربہ خانوں
(یا لیبارٹریوں کا قیام)
۳۔ پائلٹ سکول کا صدر معلم۔
۴۔ پائلٹ سکول کا معلم۔
۵۔ سمعی و بصری اعانتوں کا استعمال
۶۔ پائلٹ سکولوں میں ہاتھ کے کام کی تعلیم۔
۷۔ زبانوں کی تعلیم و تعلّم۔
۸۔ غیر ملکی افراد کو انگریزی سکھانا۔

(یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ ایکسٹینشن سینٹر پہلے ہی ان موضوعات پر درجن بھر مختصر
سالے تیار کر چکا ہے۔ یہ رسالے عنقریب شائع کر دیے جائیں گے)

معلمین کے لیے دوران ملازمت تعلیمی کورس

سفارش کی گئی کہ پائلٹ سکولوں کے معلمین کے لیے تعلیمی نصاب مرتب کیا جائے۔ رہنمائی کا کام
نے والے، انتخابی ریاضی پڑھانے والے، صنعتی فنون سکھانے والے اور زراعت، روزمرہ سائنس
معاشرتی علوم پڑھانے والے معلمین کے لیے کورس مقرر کیے جائیں۔

یہ کورس، مضامین و طریقہ ہائے تدریس اور ان مضامین کے پڑھانے کی تکنیک پر مشتمل ہونے
ہئیں۔ یہ بات اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ ریاضی، سائنس، معاشرتی علوم اور دوسرے
رہ بالا مضامین میں چند ایسے موضوعات کو شامل کیا گیا ہے جو بالکل نئے ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اُس وقت سے اب تک (یعنی مارچ ۱۹۶۳ء تک)
ینشن سینٹر دو سلسلۂ اسباق (یا COURSES) کا انتظام کر چکا ہے جن میں سے ایک
ن انگریزی سے متعلق تھا اور دوسرا رہنمائی (GUIDANCE) سے۔ یہ دونوں وحدت کاری
سلے دو پائلٹ سکولوں میں انجام پائے۔

(ج) تدریس زبان کو بہتر بنانے کے پروگرام

تمام پائلٹ سکولوں کے صدر معلمین نے تدریس زبان بالخصوص تدریس انگریزی کی واردو کو بہتر بنانے کی فوری ضرورت پر زور دیا۔ تدریس زبان کے اُس سیمینار میں جس میں انور نسیم صاحب عادل لینگویج سپیشلسٹ ایجوکیشن ایکسٹنشن سینٹر نے خطاب کیا تھا، حاضرین نے بڑی دلچسپی لی اور ثانوی زبان سکھانے کے سلسلے میں زبانی طریق تحصیل کو بہت سراہا۔ زبانی طریق تحصیل کا منشا یہ ہے کہ زبان کے بنیادی نمونوں پر حقیقی قابو حاصل کرنے میں طلبہ کی تبدریج رہنمائی کی جائے تاکہ وہ اپنی روزانہ زندگی میں عادت کے طور پر ان نمونوں کا مقررہ جواب دے سکیں۔ طالب علم کو زبان کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کا روائتی طریق ترک کر دینا چاہیے۔ اور اس کی جگہ زبان پر عملی قابو حاصل کرنے پر طالب علم کی مدد کرنا چاہیے۔ زبان کے معلم اور معلموں کو تربیت دینے والوں کے لیے تربیتی پروگرام بنانے کی فوری ضرورت کو اِس اجتماع میں بڑی اہمیت دی گئی۔ کیونکہ معلمین زبان اور بالخصوص معلمین انگریزی کو خود اِس بات کی ضرورت ہے کہ زبان پر زیادہ قابو حاصل کریں، تاکہ وہ طلبہ کے لیے اچھے نمونے بن سکیں۔ سیمینار میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ (LANGUAGE SECTION) ایسا سامان تیار کرے جو روزانہ ترتیب اسباق میں، نصابی کتب اور ٹیچر گائیڈ کا مکمل ثابت ہو مثلاً "معلّم و متعلّم" اور "متعلم و متعلم" قسم کے مکالمات تیار کرانا جو زبانی طریق تحصیل میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ جائزہ لینے کے لیے کہ طلبہ کو زبان کی تراکیب اور تلفظ پر کتنا عبور حاصل ہے۔ نئی قسم کی آزمائشیں وضع کرنے کی اہمیت پر بھی زور دیا گیا۔ اس ضمن میں لینگویج سیکشن دو کتابچے شائع کرے گا۔

(د) ہاتھ کا کام

یہ سفارش کی گئی کہ لڑکیوں کے پائلٹ سکولوں میں ایسے کام کرنے کی ترغیب دی جائے جیسے ڈیسکوں اور میزوں پر پالش کرنا، کمروں اور صحن مدرسہ کو صاف کرنا اور سکول کے باغ کی دیکھ بھال کرنا۔ دیہاتی علاقوں کے پائلٹ سکولوں میں طلبہ کو کھیتوں میں ہل چلانے اور کسانوں کے

ساتھ تخم ریزی و آبیاری کے کاموں میں مدد دینے کا شوق دلایا جائے۔ انھیں سکول میں باغ لگانے اور مدرسے کے گرد احاطہ بنانے کے لیے کہا جائے (یہ بات انتہائی حوصلہ افزا ہے۔ کہ گورنمنٹ ہائی سکول شیر قبپور کے طلبہ نے مدرسے کے احاطہ کی دیواریں خود تعمیر کی ہیں اور گورنمنٹ ہائی سکول کٹلانگ (مردان) نے اپنے کھیل کے میدان اور زراعتی قطعات کو خود ہموار کیا ہے۔

(ہ) رہنمائی کا کام

سفارش کی گئی کہ پائلٹ سکولوں میں رہنمائی کا کام کرنے والے تمام طلبہ کے (COMULATIVE RECORD CARDS) تیار کریں انھیں یہ بھی چاہیے کہ مضامین کے انتخاب میں اور مسائل کے حل کرنے میں طلبہ کی مدد کریں۔

(و) انجمن والدین و معلمین

سفارش کی گئی کہ آئندہ سے تمام پائلٹ سکولوں میں انجمن والدین و معلمین کی تشکیل کی جائے یہ انجمنیں بہت سے مدرسی مسائل کے کامیابی سے حل کرنے میں مدد دیں گی۔ قومی وسائل کو بچوں کے مفید مطلب کام میں لانے کے لیے یہ انجمنیں بہت مفید ثابت ہوں گی۔

(ز) لائبریری کے کام کی تنظیم

سفارش کی گئی کہ ہر سکول میں لائبریری کے کام کی باقاعدہ تنظیم کی جائے (بالخصوص م۔ ا۔ چغتائی صاحب کی تجاویز کے پیش نظر جنھوں نے مدارس میں لائبریری کی تنظیم پر ایک مقالہ پڑھا) ہر جماعت کے لیے ٹائم ٹیبل میں باقاعدہ لائبریری پیریڈ رکھا جائے۔ اور طلبہ کو زیادہ سے زیادہ لائبریری کی کتابیں پڑھنے کی ترغیب دی جائے۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجسال —————— شعبہ سکول

۴۹۷۵ رانا چراغ الدین میٹرک، پی ٹی آئی گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ کو تاریخ حاضری سے
۱۱ مئی ۱۹۶۲ء م۔ عبدالکریم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پہ پی، ٹی، آئی گورنمنٹ ہائی سکول
اکال گڑھ مقرر کیا گیا

ایضاً م۔ عبدالکریم جے، ڈی، پی، اے ۔ پی، ٹی، آئی، گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ کو تاریخ
حاضری سے رانا چراغ الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پہ پی، ٹی، آئی۔
گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ مقرر کیا گیا۔

۴۹۷۹ م محمد جہاں گیر ایف، اے، ایس، وی۔ ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پسرور کو تاریخ حاضری
۱۱ مئی ۱۹۶۲ء سے میاں محمد خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پہ ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ
ہائی سکول باغبانپورہ مقرر کیا گیا۔

" میاں محمد خاں۔ ایم، ایس، وی، ایچ پی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ کو
تاریخ حاضری سے م۔ محمد جہاں گیر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پہ
ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پسرور مقرر کیا گیا۔

۳۰۳۴ م۔ محمد حمید اللہ بی۔ اے۔ بی، ایڈ سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول
۷ جون ۱۹۶۲ء مظفر گڑھ کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد سعید اللہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
اپنی تنخواہ پہ سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول علی پور مقرر کیا گیا۔

" م۔ محمد سعید اللہ۔ بی اے۔ بی، ایڈ۔ سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول علی پور کو
تاریخ حاضری سے م۔ محمد حمید اللہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پہ سینئر
انگلش ماسٹر ہائی سکول مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

ای ۱۵،۸۵۵ م۔ نور خاں ایم اے۔ ایس اے، وی۔ انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول حضرو کو
۹ رجون ۱۹۶۲ء تاریخ حاضری سے م۔ غلام سرور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر
انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی گھیب مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ غلام سرور بی اے۔ بی ٹی۔ انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی گھیپ کو
تاریخ حاضری سے م۔ عبدالرحمٰن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگلش ماسٹر
گورنمنٹ ہائی سکول تلہ گنگ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبدالرحمن ایم اے۔ بی ٹی۔ انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول تلہ گنگ کو تاریخ
حاضری سے ایک نئی آسامی پر اپنی تنخواہ پر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول
کیمبل پور مقرر کیا گیا۔

اے ڈی ایم این م۔ عبدالمجید۔ سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ جنہیں گورنمنٹ
۳۸۵ ہائی سکول رینالہ خورد کے تبادلہ کا حکم ہوا تھا۔ ایک اضافی معلم کے طور پر
۹ رجون ۱۹۶۲ء اپنی تنخواہ پر سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ غلام حسین۔ سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ کو تاریخ حاضری سے
م۔ عبدالمجید کی جگہ جنہیں گورنمنٹ ہائی شیخوپورہ بھیجا گیا، اپنی تنخواہ پر سینئر انگلش ماسٹر
گورنمنٹ ہائی سکول رینالہ خورد مقرر کیا گیا۔

نوٹ :- گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ سے ایک سینئر انگلش ماسٹر کی آسامی گورنمنٹ
ہائی سکول شیخوپورہ میں منتقل کر دی گئی ہے۔

ای بی ۱۹،۲۱ م۔ مولا بخش۔ میٹرک جے اے، وی۔ جونیئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ مڈل سکول چک الف ۸۸
۲۹ جون ۱۹۶۲ء ضلع بہاول پور کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد شریف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی
تنخواہ پر جونیئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ مڈل سکول چک الف ۹۵ مقرر کیا گیا۔

۲۱۸۱ م۔ محمد شریف میٹرک جے۔ اے۔ وی۔ جونیئر انگلش ماسٹر مڈل سکول چک ۲/ الف ۱۰ ضلع
۱۰-۷-۱۹۶۲ بہاول نگر کو تاریخ حاضری سے م۔ مولا بخش کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پہ
جونیئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ مڈل سکول چک ۴/ الف ۲ ضلع بہاولپور مقرر کیا گیا۔

۲۱۸۳ م۔ عبدالرحمن شاہ میٹرک جے۔ اے۔ وی۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ مڈل سکول جان پور کو
۱۹۶۲ تاریخ حاضری سے م۔ اللہ بخش بھٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پہ ہیڈ ماسٹر
گورنمنٹ مڈل سکول مہدی دیوال مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ اللہ بخش بھٹی۔ ایف۔ اے۔ جے۔ اے۔ وی۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ مڈل سکول مراد پور سیال
کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد شفیع کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پہ ہیڈ ماسٹر
گورنمنٹ مڈل سکول امین آباد مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد شفیع پی۔ ٹی۔ جے۔ اے۔ وی۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ مڈل سکول امین آباد کو تاریخ
حاضری سے م۔ عبدالرحمن شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پہ ہیڈ ماسٹر
گورنمنٹ مڈل سکول جان پور مقرر کیا گیا۔

ایضاً صاحبزادہ عطا محمد میٹرک جے۔ اے۔ وی۔ ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول جان پور کو تاریخ
حاضری سے م۔ محمد شفیع ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ مڈل سکول جان پور کی جگہ جنہوں نے
استعفیٰ پیش کیا ہے اپنی تنخواہ پہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ سکول جان پور مقرر کیا گیا۔

۱۶۶۷ م۔ بشیر افضل بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ نور خاں کی جگہ جن کا
[illegible] ۱۹۶۲ تبادلہ ہو چکا ہے (بچاہرہ ۱۲۰ روپے عام پیمانہ تنخواہ حسب معمول الاؤنس اس کے
علاوہ) عارضی انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول حضرو مقرر کیا گیا۔

نوٹ:۔ ان کا تقرر محض عارضی ہے، جو نوٹس کے بغیر کسی وقت بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔
نیز یہ مشاہرہ اور ملازمت کے ان قواعد کے تحت رہیں گے جو حکومت مغربی پاکستان نے
مقرر کئے ہیں۔

اے ڈی ایم این م۔ خورشید عالم بخاری اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول خکاد صاحب کو تاریخ حاضری سے
۱۳۶۲ ایک اضافی اسامی کے طور پر (یہ اپنی آسامی اپنے ساتھ لے جائیں گے) اپنی تنخواہ پر اورینٹل ٹیچر
۲۰ جون ۱۹۶۲ء گورنمنٹ نارمل سکول پسرور مقرر کیا گیا۔

ای ۱۷۲۳۲۶ راجہ عبد القیوم بی اے۔ بی ٹی۔ انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول مری کو تاریخ حاضری سے
۲۵ جون ۱۹۶۲ء م۔ غلام عباس کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول
کہوٹہ مقرر ہوئے۔

ایضاً م۔ غلام عباس بی۔ اے۔ بی ایڈ۔ قائم مقام انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کہوٹہ کو تاریخ
حاضری سے راجہ عبد القیوم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائمقام انگلش ماسٹر
گورنمنٹ ہائی سکول مری مقرر کیا گیا۔

ای ۱۷۲۳۲۲ راجہ سجاد حسین بی اے۔ بی ایڈ۔ قائم مقام انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کھیوڑہ کو
۲۵ جون ۱۹۶۲ء تاریخ حاضری (یکم جولائی ۱۹۶۲ء) سے ایک نئی آسامی پر اپنی تنخواہ پر قائم مقام
انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کھگوال مقرر کیا گیا۔

اے ڈی ایم این م۔ محمد اشرف قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ کو تاریخ حاضری سے
I ۲۰۷۹ م۔ رحمت اللہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر قائم مقام اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ
۲۶ جون ۱۹۶۲ء ہائی سکول فیروزہ (ضلع رحیم یار خاں) مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ رحمت اللہ۔ قائم مقام اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول فیروزہ کو تاریخ حاضری سے
م۔ محمد اشرف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ
ہائی سکول جھنگ مقرر کیا گیا۔

اے ڈی ایم این م۔ محمد شریف۔ جے ڈی پی ای۔ قائم مقام پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ نارمل سکول چختیاں کو
I ۲۳۴۹ تاریخ حاضری سے م۔ محمد فاکر احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام پی
۲۹ جون ۱۹۶۲ء ٹی آئی گورنمنٹ ہائی سکول چک ۲۷۴ ای۔ بی مقرر کیا گیا۔

ڈی ایم ای ای م۔ ظاہر احمد جے۔ ڈی، پی ٹی آئی۔ پی۔ ٹی آئی گورنمنٹ ہائی سکول چک نمبر ۲۲۴ ای بی کو
۲۳۴۹ تاریخ حاضری سے م۔ محمد شریف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر پی۔ ٹی آئی
۲۱ جون ۱۹۶۲ء گورنمنٹ نارمل سکول چشتیاں مقرر کیا گیا۔

ای ڈی ۲۲۲۹۲ م۔ عبدالرحیم۔ میٹرک جے اے وی ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول محمد پور سنارن تاریخ حاضری
۳۰ جون ۱۹۶۲ء سے اپنی تنخواہ پر باہمی تبادلہ کے ذریعہ م۔ فقیر محمد میٹرک جے اے وی ٹیچر
گورنمنٹ مڈل سکول ہبیکہ کی جگہ تبدیل ہوئے۔

ای ڈی ۲۲۵۱۲ م۔ نذر محمد بی اے۔ بی ٹی۔ انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول دہڑانوالہ کو تاریخ
۵ جولائی ۱۹۶۲ء حاضری سے م۔ غلام حسین جاز کی خالی اسامی پر اپنی تنخواہ پر اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ
انسپکٹر آف سکولز چشتیاں مقرر کیا گیا۔

ای ۵۱۹۲ م۔ محمد مسعود ایف ایس سی۔ بی اے۔ بی ایڈ۔ سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول
۷ جولائی ۱۹۶۲ء خانیوال کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد اشرف کی جگہ جن کا ملتان تبادلہ ہو چکا ہے
اپنی تنخواہ پر سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول جلال پور پیروالا مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد عمر۔ بی ایس سی۔ بی ایڈ۔ سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کسووال کو
تاریخ حاضری سے م۔ مسعود کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر سینئر انگلش ماسٹر
گورنمنٹ ہائی سکول خانیوال مقرر کیا گیا۔

ای ۵۱۹۴ م۔ الطاف احمد ایف اے۔ سی ٹی جونیئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ عدو
۷ جولائی ۱۹۶۲ء کو تاریخ حاضری سے سی۔ ٹی کی ایک نئی آسامی پر جو ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کے حکم سے
منظور ہوئی۔ اپنی تنخواہ پر جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول تونسہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ کریم اللہ خان ایف اے۔ سی۔ ٹی۔ جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول مظفرگڑھ
کو تاریخ حاضری سے م۔ الطاف احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر جونیئر
انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ عدو مقرر کیا گیا۔

ای ۱۹۲۱۲ م۔ امیر محمد بی اے ایس سی۔ بی ایڈ قائمقام انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول للیہ کو۔
۱۳ جون ۱۹۶۲ء م۔ سجاد حسین جعفری کے استحقاق منصب کے تحت یکم ستمبر ۱۹۶۲ء سے ایک نئی اسامی پر بمشاہرہ خود قائمقام انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول تلہ گنگ مقرر کیا گیا

ایضاً م۔ عابد حسین نقوی بی اے۔ بی ایڈ۔ انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور کو یکم ستمبر ۱۹۶۲ء سے م۔ امیر محمد خان کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول للہ مقرر کیا گیا۔

ای ۵۳۸۰ م۔ محمد عمر بی ایس سی۔ بی ٹی سینئر انگلش ماسٹر کا تبادلہ جو حکم نامہ نمبر ای ۵۱۹۷
۱۴ جولائی ۱۹۶۲ء مورخہ ۷ جولائی ۱۹۶۲ء کے مطابق گورنمنٹ ہائی سکول کستووال سے گورنمنٹ ہائی سکول خانیوال ہوا تھا۔ اس نئے حکم کی رو سے منسوخ ہو گیا ہے۔

اے ڈی ایم این م۔ محمد شفیع ایف اے سی ٹی۔ قائمقام جونیئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ مڈل
I ۴۳۸۸ سکول جیجا عباسیاں قسمت بہاولپور کو تاریخ حاضری سے ایک نئی اسامی پر
۱۴ جولائی ۱۹۶۲ء بمشاہرہ خود قائمقام انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ عدو قسمت ملتان مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ غلام مصطفےٰ سلہریا۔ ایف ایس سی ٹی۔ قائمقام جونیئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ قسمت لاہور کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد شفیع کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائمقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول جیجا عباسیاں قسمت بہاولپور مقرر کیا گیا۔

ای ۵۳۷۸ نذیر احمد بی اے۔ بی ایڈ۔ سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارمز
۱۴ جولائی ۱۹۶۲ء اوکاڑہ کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد عمر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائمقام سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کستووال مقرر کیا گیا۔

ای-۵۳۷۸ — ۱۴ جولائی ۱۹۶۲ء
م۔ محمد عمر۔ بی ایس سی۔ بی ٹی سینیئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کسووال کو تاریخ حاضری سے م۔ مختار کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر سینیئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ایضاً
م۔ مختار بی اے۔ بی ایڈ۔ سینیئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول منٹگمری کو تاریخ حاضری سے م۔ نذیر احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر سینیئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

صیغۂ رجال ——— شعبۂ دفاتر

ای-۱۶۱۳۸ — ۱۲ جون ۱۹۶۲ء
م۔ فضل رحیم میٹرک۔ قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول تلہ گنگ کو تاریخ حاضری سے م عبدالغفور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول پنڈ دادن خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً
م۔ عبدالغفور میٹرک قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول پنڈ دادن خاں کو تاریخ حاضری سے م۔ فضل رحیم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول تلہ گنگ مقرر کیا گیا۔

ای-۲۲۴۶ — ۲۸ جون ۱۹۶۳ء
م۔ رفیق احمد۔ جونیئر کلرک گورنمنٹ کالج لاہور (تا ۳۰ جون رخصت پر) کو ۳۰ جون ۱۹۶۲ء بعد دوپہر سے م۔ منظور الحق جونیئر کلرک کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول فار گرلز لاہور مقرر کیا گیا۔

ای-۱۷۳۲۹ — ۲۵ جون ۱۹۶۳ء
م۔ شفیع احمد میٹرک۔ عارضی جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول للہ (جو حافظ محمد شریف کے رخصت پر ہونے کی وجہ سے اس آسامی پر کام کر رہے ہیں) کو یکم جولائی ۱۹۶۲ء سے ایک نئی آسامی پر بحیثیت خود عارضی جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول کھگوال مقرر کیا گیا۔

ای - ۲۵۸۶ م۔محمد خالد (مستقل) جونیئر کلرک گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول مظفر گڑھ۔
۱۳ جون ۱۹۶۲ء (رخصت پر) کو یکم جولائی ۱۹۶۲ء یا اس کے بعد ایک نئی آسامی پر جو سرکاری چٹھی نمبر ۶۲ — ۹/۸ IX-E.O. مورخہ ۶۲/۴/۱۳ کے مطابق منظور ہوئی تھی اپنی تنخواہ پر جونیئر کلرک لیڈی میکلیگن گرلز ہائی سکول لاہور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔تصور علی خان میٹرک۔ ایک امیدوار جن کا تقرر سابقہ احکام کے مطابق لیڈی میکلیگن گورنمنٹ گرلز ہائی سکول لاہور میں ہونا تھا کو، جونیئر کلرک محمد خالد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (پیمانہ مشاہرہ ۶۰ — ۲ — ۱۰۰ — ۵ — ۱۲۰ حسب معمول الاؤنس اس کے علاوہ) قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

ای آر ۲۸۹۵ م۔الطاف حسین ہاشمی (مستقل) ہیڈ کلرک سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو تاریخ
۱۳ جولائی ۱۹۶۲ء حاضری سے شیخ نذر الٰہی کی جگہ (جن کے کالج آف ہوم اینڈ سوشل سائنسز لاہور میں تبدیل کیے جانے کا حکم ہوا تھا، لیکن وہ حاضر نہیں ہوئے) اپنی تنخواہ پر ہیڈ کلرک کالج آف ہوم اینڈ سوشل سائنسز لاہور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔نور الٰہی (مستقل) سینئر کلرک دفتر انسپکٹر آف یوروپین سکولز لاہور کو تاریخ حاضری سے م۔الطاف حسین ہاشمی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (پیمانہ تنخواہ ۱۲۰ — ۱۰ — ۲۰۰ — ۱۰ — ۲۵۰ پر) عارضی ہیڈ کلرک سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور مقرر کیا گیا۔

نوٹ:۔بحیثیت ہیڈ کلرک م۔نور الٰہی کا تقرر اور ترقی محض عارضی ہے۔ اور مستقل عہدیدار کے حاضر ہونے یا آئندہ احکام صادر ہونے پر کسی وقت رجعت ممکن ہے۔

ای آر ۳۰۴۴ م۔مہربان خان جونیئر کلرک دفتر انسپکٹر آف سکولز سرگودھا کا تبادلہ جو بطور قائم مقام
۱۶ جولائی ۱۹۶۲ء سٹینو ٹائپسٹ کالج آف ہوم اینڈ سوشل سائنسز گلبرگ لاہور ہوا تھا، اس نئے حکم کے مطابق منسوخ کیا جاتا ہے۔

ای.آر- ۳۱۳۰۶ م. تصور علی خاں میٹرک (II) ایک امیدوار (جن کو اس سے پہلے بحیثیت جونیئر کلرک
۰ جولائی ۱۹۶۲ء گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول مظفرگڑھ حاضر ہونے کا حکم ہوا تھا) کو تاریخ
حاضری سے ایک نئی اسامی پر جو بمطابق چٹھی نمبر ۵۲ — ۸/۶ - S.O.IX مورخہ
۱۳/۷/۶۲ منظور ہوئی (پیمانہ تنخواہ ۶۰ — ۴ — ۱۰۰، ۵ — ۱۲۰ حسب معمول
الاؤنس اس کے علاوہ پر) قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ
لاہور مقرر کیا گیا۔

نوٹ:- م تصور علی خاں کا تقرر محض عارضی ہے اور ان کی خدمات کسی وقت بھی
بغیر نوٹس دیئے یا وجہ بتائے ختم کی جاسکتی ہیں۔

ای.آر ۴۲۶۸ م. رفیق احمد جونیئر کلرک گورنمنٹ کالج لاہور (جن کو گورنمنٹ ہائر سیکنڈری
۱۳ جولائی ۱۹۶۲ء سکول (گرلز) لاہور حاضر ہونے کا حکم ہوا تھا) کو تاریخ حاضری سے ایک نئی
اسامی پر جو سرکاری چٹھی نمبر ۶۱ — ۱۱/۶ - S.O.IX مورخہ ۲۶/۶/۶۲
کے بموجب منظور ہوئی اپنی تنخواہ پر جونیئر کلرک لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور
مقرر کیا گیا۔

ایضاً م. رحمت الٰہی۔ قائم مقام جونیئر کلرک دفتر انسپکٹر آف سکولز لاہور (جن کو
گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول (گرلز) لاہور تبادلہ کا حکم ہوا تھا) کو تاریخ حاضری
سے قاضی احمد یار جونیئر کلرک کی جگہ جو سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں ڈی پی ای
مقرر ہو گئے ہیں اور م. مظہر الحق جونیئر کلرک کی جگہ جن کا تبادلہ اور تقرر ہوا لیکن
وہ حاضر نہیں ہوئے (پیمانہ تنخواہ ۶۰ — ۴ — ۱۰۰ — ۵ — ۱۲۰ پر)
قائم مقام جونیئر کلرک ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن لاہور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م. غلام حسین میٹرک (II) ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے ایک نئی آسامی پر جو
سرکاری چٹھی نمبر ۶۱ — ۲/۶ - S.O.IX مورخہ ۱۳/۷/۶۲ کے بموجب منظور ہوئی

آموزش

اللہ م تصور علی خاں کی جگہ جن کا تقرر ہوا لیکن وہ حاضر نہیں ہوئے (پیمانہ تنخواہ ۷۰ - ۴ - ۱۰۰ - ۵ - ۱۲۰) پر عارضی جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول باغبان پورہ مقرر کیا گیا۔

ای۔آر ۴۲۶۸ — ۱۳ جولائی ۱۹۶۲ء — م۔ تصور علی خاں میٹرک (II) ایک امیدوار جن کا تقرر اس نے فیصل گورنمنٹ ہائی سکول باغبان پورہ میں ہوا تھا۔ تاریخ حاضری سے م۔ محمد یونس جونیئر کلرک کی جگہ جن کو ۲۹ اگست ۱۹۶۲ء تک رخصت دی گئی ہے۔ بشاہرہ ۷۰ روپے (پیمانہ تنخواہ ۷۰ - ۴ - ۱۰۰ - ۵ - ۱۲۰) پہ عارضی جونیئر کلرک ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن لاہور ریجن مقرر کیا گیا (حسب معمول الاؤنس اس کے علاوہ)

نوٹ:- (۱) م۔ مظہر الحق، محمد صدیق، م رحمت الٰہی اور م رفیق احمد خاں جونیئر کلرکوں کے تبادلے اور تقرر نمبر ای ۱۰۲۰ مورخہ ۱۸ جون ۱۹۶۲ء اور نمبر ای ۲۰۵۲۶/۴۲ — ۶۰۵/۴ مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۶۲ء اور نمبر ای ۲۲۴۶/۱/د - ۶۹/۴ مورخہ ۲۸ جون ۱۹۶۲ء اس حکم کے بموجب منسوخ کیے جاتے ہیں۔

(۲) م۔ تصور علی خاں کا تقرر نمبر ای۔آر ۱۳۵/۶۲ - ۵۶/۴ مورخہ ۵ جولائی ۱۹۶۲ء اس حکم کے بموجب منسوخ کیا جاتا ہے۔

(۳) م غلام حسین اور م تصور علی خاں کے تقرر بحیثیت جونیئر کلرک محض عارضی ہیں اور ختم ہو جائیں گے سرکاری محکموں کے فاضل عملے کی دستیابی یا مستقل عہدیداروں کی واپسی یا انتظامی وجوہات کے باعث ان کی خدمات کا اختتام ناگزیر ہے۔

(۴) ملازمت میں تقدم اور افضلیت کے لحاظ سے م۔ رحمت الٰہی کو جس تاریخ سے وہ حاضر ہوں گے ہیڈ کوارٹرز کیڈر میں سب سے آخر میں جگہ دی جائے گی۔ ان کا استحقاق منصب "سب آفس کیڈر" میں متصور ہو گا۔ جو گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ میں رہے گا۔ تاوقتیکہ وہ ہیڈکوارٹرز میں کوئی حق حاصل نہ کر لیں۔

آموزش

شمارہ ۲ — لاہور — اگست ۱۹۶

اس شمارہ میں

مدیر { پروفیسر سراج الدین
پرنسپل اے جی بٹ }

معاونین { شیخ عبدالحق
سید کوثر حسین }

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش لاہور

اگست سنہ ۱۹۶۲ء

جلد ۱۵

شمارہ ۲

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

پبلشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی سی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۱۹۴ انارکلی لاہور سے جاری کیا

اداریہ

ہمارے مدرسوں میں تعلیم اور جمہوریت کے رابطہ کا پوری طرح لحاظ نہیں رکھا جاتا جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ نہ صرف تعلیمی اقدامات کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے بلکہ تعلیم کی حقیقی افادیت بھی معرض شک میں پڑ جاتی ہے۔ جب بچہ عرصے تک روزانہ مدرسے جائے اور کچھ نہ سیکھے، یا کچھ سیکھ لینے کے باوجود جاہلوں اور نیم وحشیوں کا سا کردار پیش کرے تو ظاہر ہے کہ تعلیم کے سلسلے میں کچھ زیادہ خوش فہمی یا خوش اعتقادی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

دراصل تحصیل علم اور تشکیل سیرت کے معاملے میں مدرسے کے طریق تعلیم اور قواعد و قوانین، معلموں کو بہت کچھ دخل ہے، جب بچے کی دلچسپی، پسند اور شوق کو پس پشت ڈال کر مدرسے کے سبقوں اور درسی مشقوں کو مقصود بالذات بنا لیا جائے تو بچے کے پلّے کچھ نہیں پڑتا اور اگر کچھ پڑتا ہے تو محض امتحان میں الٹ دینے کے لیے یہ سطحی معلومات جو معلمین کے وسیلے سے حاصل ہو جاتی ہے زیادہ سے زیادہ وقتی طور پر امتحان پاس کر لینے کے کام آتی ہے۔ نہ ذاتی تجربے اور مشاہدے سے تعلق رکھتی ہے۔ نہ سیرت کا جزو بنتی ہے۔

مدرسے میں آمرانہ رجحانات کا انسداد یوں بھی ضروری ہے کہ یہ رجحانات زندگی کے تمام شعبوں میں جمہوری طرز حیات کے دشمن ہیں۔ ان کی وجہ سے زندگی میں دوستوں کے ساتھ "اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" کے زریں اصول پر عمل درآمد نہیں ہو پاتا۔ کیا گھر اور کیا مدرسہ غیر جمہوری میلانات کیے سلئے میں

خود خواہی دونوں ہاتھوں سے اس طرح راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے کہ ہمدردی و خیر خواہی کو داخلہ نہیں ملتا۔ آگے چل کر خود غرضیاں کھل کھیلتی ہیں اور معاشرہ تعفن میں جا گرتا ہے۔ ایک کامیاب اور قابل رشک زندگی کے لیے رواداری، طریق معاشرت کے آداب اور اختلاف رائے کی صورت میں اہم ہستیوں کے جذبات کا پاس و لحاظ، ضروری اوصاف ہیں جو ہر قابل ذکر جمہوری معاشرہ کے بنیادی اصولوں میں شامل ہیں۔ ضرورت ہے کہ مدرسوں میں اساتذہ شعوری طور پر ان اقدار حیات کی نشوونما پر زور دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جمہوری انداز فکر کی ابتدا اور حیات اجتماعی کا آغاز مدرسے کے تدریسی کمروں اور کھیل کے میدانوں ہی میں ہو جاتا ہے۔ مدرسے کا فرض ہے کہ اپنے طلبہ کو ان جمہوری اقدار کا استحسان سکھائے جو معاشرے میں سربلندی کا باعث ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد محض تقریروں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مدرسے میں ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں جن میں ان اوصاف کو بروئے کار لانے کی عملی صورت پیدا ہو۔ تاکہ طلبہ ان سے پوری طرح باخبر ہو جائیں۔

مدرسی زندگی کے بعد طلبہ کو جس معاشرے سے واسطہ پڑنے والا ہے وہ مدرسے کے معاشرے سے وسیع تر ہوگا اور اس کے نظم و نسق اور اصول عمل کا سمجھنا بدرجہا مشکل۔ اس لیے بہتر ہے کہ مدرسی زندگی میں بیرون مدرسہ زندگی کی تربیت کا موقع مل جائے۔ اس سلسلے میں منظم کھیل، ادبی انجمنیں، مختلف کلب اور ہم نصاب مشاغل، قابل قدر تجربات مہیا کرتے ہیں، جن کے ذریعے سے جمہوری اصول حیات کے تحت، مدرسی زندگی کو مفید سے مفید تر بنایا جا سکتا ہے۔

امتحانات میں ناکام ہونے والوں کی تعداد میں روزافزوں اضافہ اس کی وجہ — اور — علاج

صوفی محمد جمال اللہ

یاد کس بخیر! سید اکبر الہ آبادی نے تعلیم کی فراوانی، طلبہ کی کامیابی و کامرانی اور حصولِ ملازمت میں ناکامی کا طویل مضمون ایک شعر میں کس حُسن و خوبی سے ادا کر دیا تھا ۔

کالج سے آ رہی ہے صدا پاس پاس کی
عہدوں سے آ رہی ہے صدا دُور دُور کی

لیکن پاس پاس کی صدا کا زمانہ بھی رفت و گذشت ہوگیا۔ اور اب تو گردشِ ایام نے ایسا پلٹا کھایا اور یہ روزِ بد دکھایا کہ کالج کے در و دیوار سے اور سکول کے اندر باہر سے پاس پاس کی بجائے فیل فیل کی صدائے جگر خراش بلند ہونے لگی ۔

یقین جانیے کہ سکولوں اور کالجوں کے امتحانات میں فیل ہونے والے طلبہ کی تعداد روز بروز اس قدر ترقی پذیر ہے کہ اگر یہ ترقیٔ معکوس یوں ہی جاری رہی تو ڈر ہے کہ اس دورِ تہذیب اور عہدِ جاہلیت کے ڈانڈے نہ مل جائیں۔ فی الحقیقت فیل ہونے والوں کی تعداد اب افسوس ناک حد تک بڑھ چکی ہے اور یہ ایسا نقصانِ عظیم اور خسرانِ مبین ہے کہ اس سے بے اعتنائی اختیار کرنا قوم کے خون میں ہاتھ رنگنے کے مترادف ہے۔ اگر اربابِ اختیار نے قوم کے اس مرضِ مہلک کی تشخیص کر کے اس کے اسباب و علل پر غور کرتے ہوئے مناسب اور شفا بخش علاج نہ کیا تو ڈر ہے کہ ؎

ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

دلِ دردآشنا کی قیادت اور چشمِ حقیقت بیں کی رہنمائی میں اگر اس مرضِ مہلک کے اسبابِ وجوہ

ناکامی کا جائزہ لیں، تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ قومی خسران کسی ایک فریق کے تغافل اور تساہل کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کی ذمہ داری طلبہ پر بھی ہے، اساتذہ پر بھی، اور طلبہ کے والدین اور معاشرے پر بھی۔

اب ہم اس کے اسباب و علل کا تجزیہ کرتے ہیں:۔

استاد اور شاگرد کے مابین رابطے کا فقدان

تجربہ شاہد ہے کہ اساتذہ کے مابین قلبی روابط اور دلی تعلقات کا جو روحانی سلسلہ کسی گذشتہ زمانے میں استوار تھا، آج بالکل کالعدم ہے اور اس کی ذمہ داری کلیتہً کسی ایک فریق پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ اگر استادوں کے دلوں میں طلبہ کی فلاح و بہبود کی فکر نہیں۔ ان کے دماغ شاگردوں کی مصلحتوں کی خاطر سوچ بچار کرنے کے لیے تیار نہیں اور شاگردوں کی تالیف قلوب کے لیے ان کے احساسات میں جنبش و حرکت نہیں ہوتی۔ شاگردوں میں بھی کوئی ایسا جوہر قابل نظر نہیں آتا جو استاد کے حکیمانہ اور مشفقانہ پندونصائح پر سر تسلیم خم کرے۔ اور استاد کی ہدایت کاری کو خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے لبیک کہے۔ "جور استاد بہ زمہر پدر" کہنے والے گزشتہ لحد میں جا سوئے اور

بہ خُردی بخورد از بزرگاں قفا ؛ خدا دادش اندر بزرگی صفا

کے دعویداروں کا گلستان پُر بہار بھی نذر خزاں ہو گیا۔ اب ان مقولوں کا قائل کوئی سفید ریش خمیدہ کمر، پیر کہن سال ہو تو ہو، عصر نو تو نظری اور عملی طور پر ان عقاید کے خلاف سینہ تان کر نبرد آزما ہے۔ غرض وہ روحانی تعلق جو استاد اور شاگرد کے مابین قائم ہو کر طالب علم کی فلاح و بہبود اور ارتقائے علم کا ضامن ہے اور استاد کی قدر و منزلت اور عقیدت و مودت کا موجب بن سکتا ہے، ناپید ہے۔ اور اس کا فقدان ہی طلبہ کی تعلیمی پستی اور ناکامی کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔

استاد کی قابلیت اور شوق میں انحطاط

میاں عبدالحی مرحوم وزیر تعلیمات نے ایک دفعہ اساتذہ کے ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:۔ دنیا میں ایسے حاتموں کی کمی نہیں، جنھوں نے خلق خدا پر زر و جواہر کی بارش کی۔ لیکن یہ لوگ

علم کے موتی برسانے والوں سے باز ہی نہ لے جا سکے"۔

اس سے قطعاً انکار نہیں کہ علم ایک بے بہا دولت ہے اور دولت بھی ایسی جسے فنا کا خدشہ نہیں اور دولت دنیا کے مقابلے میں یہ واقعی ابدی اور غیر فانی ہے۔ جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا

رَضِیْنَا قِسْمَةَ الْجَبَّارِ فِیْنَا ۔۔۔ لَنَا عِلْمٌ وَّ لِلْاَعْدَاءِ مَالٗ

لِاَنَّ الْمَالَ یَفْنیٰ عَنْ قَرِیْبٍ ۔۔۔ وَعِلْمُ اللّٰهِ بَاقٍ لَّا یَزَالٗ

لیکن آج اساتذہ میں سے کتنے ہیں جن کی علمی استعداد دوں کو دولت اور خزانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ علمی تبحر تو واقعی ایک دولت لازوال ہے اور سیم و زر کے کوہ گراں سے بیش قیمت اور دواہر و دانائیں کے تو دۂ عظیم سے گراں قدر۔ لیکن مدارس کے عام استادوں کے مبلغ علم کے متعلق تو ع

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے

ہمارے اساتذہ کی علمی بے مائگی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اگر زبان و ادب کی ان غلطیوں اور خامیوں کو منضبط شہود پر جلوہ گر کیا جائے، جو اساتذہ کرام سے آئے دن سرزد ہوتی رہتی ہیں تو ڈر لگتا ہے کہ ع ۔۔۔ نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

علوم معاشرہ میں عام اساتذہ کی واقفیت کا جائزہ لینے نہ بیٹھ جائیے۔ کہیں اصفہان کو قلمرو دارالحکومت۔ جنرل ناصر کو ایران کا جلیل القدر حکمران۔ ڈینیوب کو امریکہ کا دریائے تندموج اور اہرام کو فراعنۂ مصر کی شاندار عمارت نہ کہہ دیں۔

شاید آپ باور نہ کریں لیکن میں نے اپنی آنکھوں دیکھا اور اپنے کانوں سنا ہے کہ ایک استاد نظم پڑھا رہے تھے سے

راوی نے ہے اس طرح خبر دی ۔۔۔ اک شب لگی بندروں کو سردی

اور تشریح اس کی یوں کی :-

"دریا کے راوی پہ ایک رات بہت سے بندر جمع تھے اور انہیں سردی لگ رہی تھی"۔

ایک صاحب نے اس مصرعہ کی شرح عجیب و غریب کی :

کتنے ہیں خـدّام ماموں کے بہت گستاخ تھے

شاعر کہتا ہے میرے ماموں کے نوکر بڑے گستاخ تھے"۔

راوی (روایت کنندہ) کو دریا کے راوی سمجھ لینا، اور خلیفہ مامون الرشید کو، شاعر کا ماموں تصور کر لینا، استاد کی علمی بے بضاعتی کی بیّن دلیل ہے سہ

قلقلہائے مضامین مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

یہاں اساتذہ کی کم علمی کو بے نقاب کرنا، یا کسی فرقے کی تضحیک کرنا مقصود نہیں تھا نعوذ باللہ من ذالک، اساتذہ سے استہزا کرنا اپنے ساتھ استہزا کرنا ہے۔ مدعا صرف اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اساتذہ کی اکثریت محض تنخواہ دار ملازم ہے، صحیح معنوں میں استاد نہیں، یعنی انھوں نے یہ پیشہ صرف روٹی کمانے اور تنو پیش کرکے پیٹ ایندھن فراہم کرنے کی خاطر اختیار کیا ہے۔ ذوقِ علم اور شوقِ ادب سے ان کا دامن یکسر تہی ہے اور جب اساتذہ کی علمی سطح اتنی پست اور شوقِ علم بھی کالعدوم ہو تو پھر امتحانات میں خوش کن نتائج کی امید، امیدِ موہوم سے زیادہ نہیں۔

یہ تو رہی سرمایۂ ادب کی کیفیت اور بضاعتِ علم کی کمیت۔ اب ذرا ان کے شوقِ تدریس کا بھی جائزہ لیں۔ آپ پر بڑی آسانی سے یہ حقیقت المنشرح ہو جائے گی کہ اپنے اسباق کو مفید اور مؤثر بنانے کے لیے اساتذہ کچھ بھی تردد نہیں کرتے اور ان میں سے اکثر اس فکر و احساس سے بھی بے نیاز ہیں کہ طلبہ کی امتحانات میں ناکامی نہ صرف افراد کا نقصان ہے بلکہ ایک بہت بڑا قومی نقصان ہے۔ متاع کارواں لٹنے کے بعد اگر احساسِ زیاں ہی قائم رہے تو بھی تلافیٔ مافات کی توقع ہو سکتی ہے۔ لیکن افسوس کہ احساسِ زیاں بھی موجود نہیں۔

طلبہ میں احترامِ استاد کا فقدان

علامہ اقبال مرحوم کا ایک قطعہ سنیئے جس میں استاد کے عدمِ احترام کا مضمون ایک خاص انداز سے پیش کیا گیا ہے سہ

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض جی چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پسِ از سبق کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

مادیت کے اِس دور میں بعض پرانی قدریں تو بالکل بدل چکی ہیں۔ اور بعض آہستہ آہستہ بدلتی جا رہی ہیں۔ تعلیم و احترام کا پرانا اور مقدس جذبہ جس کا تعلق دلی عقیدت مندی سے تھا، وہ تو کبھی کا رخصت ہو چکا۔ معمولی ظاہرداری کی رسمی اقامت در خاست البتہ باقی ہے۔ اور بعض جگہ اِس ظاہرداری سے بھی گریز ہو رہا ہے۔ جب طلبہ کے دلوں میں احترامِ استاد کی یہ کیفیت ہو تو ظاہر ہے کہ اِس کے احکام کی تعمیل کس درجے تک اور اِس کی ہدایت پر عمل درآمد کس حد تک ہو گا۔ مکتب کی کرامت بھی جب ہی نتیجہ خیز ہو سکتی ہے کہ اِس میں استاد کا فیضانِ نظر بھی شامل ہو۔ اور فیضِ نظر حاصل کرنے کے لیے عقیدت و احترام کا نذرانہ پیش کرنا ہوتا ہے اور جب یہ جنسِ عقیدت ہی جیب و دامن میں نہیں تو پھر حصولِ ثمرہ کی امید عبث ہے۔

جماعت میں تعدادِ طلبہ کی زیادتی

بعض مدارس میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اور ایک استاد کے ذمے طلبہ کی اتنی بھرپور جماعت ہوتی ہے کہ وہ ان کو کماحقہٗ سنبھال بھی نہیں سکتا۔ چہ جائیکہ انھیں اچھی طرح تعلیم دے سکے اِس ہجومِ اطفال میں استاد طلبہ کی طرف انفرادی توجہ نہیں دے سکتا اور کمزور طلبہ جو خصوصی توجہ اور مدد کے محتاج ہیں۔ استاد کی خاص توجہ سے محروم رہ جاتے ہیں اور جماعت کے دوسرے طلبہ کے ساتھ پوری رفتار سے میدانِ تعلیم میں چل نہیں سکتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بددل ہو کر تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیتے ہیں۔ یا اگر جماعت کے ساتھ افتاں و خیزاں چلتے رہیں تو آخری امتحان میں ناکام رہ جاتے ہیں۔ اِس لیے ہر جماعت میں طلبہ کی تعداد مناسب ہونی چاہیے۔ جسے استاد پورے طور پر ضبط میں رکھ سکے۔ ان کے تعلیمی کام کی صحیح طور پر جانچ کر سکے اور تعلیمی امور میں ان کی پوری پوری رہنمائی کر سکے نیز کمزور طلبہ کی طرف انفرادی اور خصوصی توجہ دے سکے۔

نصاب سے اخلاقیات کا اخراج یوں تو نصابِ تعلیم درجن بھر متنوع اور رنگارنگ ——

مضامین سے دامانِ باغبان وکفِ گل فروش بنا ہوا ہے۔ لیکن افسوس کہ ان میں اخلاقیات کا کہیں بھی سراغ نہیں ملتا۔ اخلاقیات سے بے رخی اور بے اعتنائی نے ہی طالب علموں میں صد ہا قسم کی اخلاقی کمزوریاں پیدا کر دی ہیں۔ نہ ان کی سیرت قابلِ تعریف ہے اور نہ ان کا کردار مستحقِ تحسین۔

آپ ذرا اوٹ میں ہو کر دو طالب علموں کی آزادانہ گفتگو تو سن دیکھیں۔ اس میں دشنام طرازی کذب بیانی، فریب دہی، ایذا رسانی، شیخی بازی اور پستیِ اخلاق کے تمام پہلو آپ کو ملیں گے۔ ان قواحش کے ہوتے ہوئے ان طالب علموں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے تعلیمی ساعی کو بروئے کار لائیں گے؟ اور اپنے سود و زیاں سے باخبر ہو کر اپنے تعلیمی مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے آمادۂ کار رہیں گے

ع این خیال است و محال است و جنوں

اساتذہ کی کم یابی

نتائج کی پستیِ معیار کا ایک سبب اچھے اساتذہ کی کم یابی بھی ہے۔ یہ بالکل ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اچھے محنتی اور لائق اساتذہ بہت کم یاب ہیں۔

اگر کسی کم کوشش اور تغافل شعار استاد کو اس کی نااہلیت کی پاداش میں سبکدوش کر دیا جائے تو اسکی جگہ دوسرا اچھا استاد ملنا ناممکن ہے اور خود اس استاد کو بھی معلوم ہے کہ اساتذہ کی قلت کے پیشِ نظر اسے علیحدہ نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے وہ برطرفی کے خوف سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے اور تغافل ــــــ کو چھوڑ کر کوشش و عمل کی طرف قدم اٹھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔ اور اساتذہ کی کم کوشی نتائج کی پستی کی ذمہ دار ہے۔

ان حالات میں تعلیم کے اربابِ اختیار پر لازم ہے کہ وہ تعلیمی تربیت گاہوں کے لیے اچھے سے اچھے امیدوار انتخاب کریں اور انہیں بہتر سے بہتر تربیت دلائی جائے اور کافی تعداد میں اساتذہ مہیا کیے جائیں تاکہ نااہل اور کم ہمت اساتذہ کو احساس ہو جائے کہ اگر انہوں نے فرائضِ منصبی کے ادا کرنے میں کوتاہی برتی تو ان کے بجائے دوسرے اساتذہ رکھے جا سکیں گے۔ اور ان کا ٹھکانہ

بجائے مدارس کے کسی اور جگہ ہوگا۔

انگریزی بہ حیثیت لازمی مضمون

مملکتِ خداداد پاکستان میں انگریزی لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل ہے اور حالاً واقعات بتاتے ہیں کہ امتحانات میں فیل ہونے والے بھی صرف اس لیے فیل ہوتے ہیں کہ وہ انگریزی کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں اور دوسرے مضامین کی پروا نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ انگریزی میں کامیاب، نہ دوسرے مضامین میں پاس۔ گویا انگریزی کی وجہ سے دوسرے مضامین بھی کمزور رہ جاتے ہیں۔

اس ساری تکلیف کا ازالہ یوں ہو سکتا ہے کہ مدارس میں انگریزی کو اختیاری مضمون کی حیثیت دے دی جائے جس طرح مڈل سکول امتحان میں صرف انگریزی میں ناکام رہنے والوں کو پاس تصور کر لیا جاتا ہے اور انہیں اسناد بھی جاری کر دی جاتی ہیں، البتہ سند پر اس امر کی وضاحت کر دی جاتی ہے کہ امیدوار نے اینگلو ورنیکلر نہیں بلکہ ورنیکلر مڈل کا امتحان پاس کیا ہے

اسی طرح سیکنڈری یا ہائر سیکنڈری کے امتحانات میں بھی انگریزی میں ناکام رہنے والوں کو پاس کر دیا جائے اور سندات دے دی جائیں اور انہیں ماسوائے انگریزی دوسرے مضامین کا میٹرک یا ایف اے سمجھا جائے۔

شاید دنیا کے کسی مہذب ملک میں یہ دستور نہیں کہ وہاں کی ملکی زبان کی بجائے کسی دوسری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا لیا گیا ہو۔ اور اپنی وطنی زبان سے بے رخی اختیار کر کے اس کا اقتدار دوسری بدیسی زبان کے حوالے کر دیا گیا ہو۔

یہ افسوس ناک طرزِ عمل صرف پاکستان ہی میں ہے۔ خدا کرے کہ اربابِ حکومت اس بات کو محسوس کریں اور قوم کے نونہالوں کی گردنیں انگریزی زبان کے جوئے سے آزاد کر کے انھیں پروان چڑھنے کے مواقع عطا کریں، اصل میں یہ ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے جو حصولِ تعلیم میں حائل اور ترقیٔ نتائجِ امتحان میں مانع ہے۔

خرابِ معاشرہ | سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ معائب سے پُر اور مفاسد سے

لبریز ہے۔ طالب علموں کا ماحول ایسا صحت مند اور بااخلاق نہیں جو اپنے اچھے اثرات ان کے دلوں میں بٹھائے اور اپنے پاکیزہ نقوش ان کے اذہان پر مرتسم کرے

طالب علم اپنی عمر عزیز کا بیشتر وقت جس ماحول میں گذارتے ہیں، اخلاقی پستی، بدتہذیبی بے تمیزی، آوارگی، بیہودگی، ہرزہ سرائی، غیر ذمہ داری، اور عیش کوشی اس کے عناصر ترکیبی ہیں۔ اب ایسی فضا میں رہ کر کوئی طالب علم صحیح معنوں میں طالب علم کیسے بنے؟

عیش پسندی

عصر جدید اس وقت عیش کوشیوں سے معمور اور عشرت سامانیوں سے لبریز ہے۔ ہر ہر قدم پر ایسے سامان تعیش میسر ہیں۔ چپے چپے پر ایسی دل کشائیاں موجود ہیں کہ عام قسم کا انسان باوجود اجتناب و احتراز کرنے کے ان میں گرفتار ہو جانے کا خدشہ محسوس کرتا ہے اور نوجوان طالب علموں کے لیے تو ؎

قدم قدم پہ ہیں ڈاکے متاع دل کے لیے

ریڈیو اور سینما

گھر میں ریڈیو چل رہا ہو اور بیسیوں قسم کے سازوں کی ہمنوائی میں نیز سروں کے جلو میں جب کوئی مغنیہ اپنے لحنِ ملائک فریب سے نغمہ ریزی کرتے ہوئے دل و دماغ پر چھائے جا رہی ہو تو ایسے میں کوئی طالب علم کیا خاک مطالعہ کر سکتا ہے؟

پھر اپنے ہی شہر میں دو ایک چھوڑ متعدد سینما گھر ہوں اور ہر ایک میں بہتر سے بہتر پکچر چل رہی ہو اور آتش شوق بھڑکا رہی ہو کہ ٹکٹ بلیک سے ملنے بھی مشکل ہو جائیں تو پھر ایسا کون "کور ذوق" اور "مردہ دل" طالب علم ہو گا جو اس جنت نگاہ اور فردوس گوش سے بے رخی اختیار کر کے حساب کی مشقوں، الجبرے کی مشاقوں، جیومیٹری کی شکلوں اور سائنس کے تجربوں سے سر کھپائے۔

عریاں تصاویر

غرض ریڈیو، سینما اور سینما گھروں کی عریاں اور نیم عریاں تصاویر نے طالب علم کے دل سے طالب علم کا جذبہ کشید کر کے اس کی بجائے جنسی جذبات کو بھڑکا کر آوارگی اور بے راہ روی کی خوئے بد

داخل کر دی ہے اور بے حیائی کا ایسا زہریلا انجکشن کر دیا ہے کہ جس کے مہلک نتائج ہر چشمِ بینا کو نظر آ رہے ہیں اور غیور و حساس لوگ ایسے حالات و واقعات کو دیکھ اور سن کر لرزہ بر اندام ہو رہے ہیں۔ بعض سینما گھروں کی کوکھ آتشک و ان جنم دے رہی ہے۔

مخلوط تعلیم

بعض اعلیٰ درسگاہوں میں ذکور و اناث کی مخلوط تعلیم رائج ہے۔ نوجوان لڑکیاں اور نوخیز لڑکے دوش بدوش تعلیم حاصل کرتے ہیں اور تعلیم جدید کی برکات سے متمتع ہوتے ہیں اور یہ باہمی اختلاط تعلیمی انہماک میں ایک زبردست رکاوٹ ہے اور طالب علموں کو تعلیمی کاوشوں کا خوگر بنانے سے مانع ہے اور اس کا ناپاک اثر طلبہ کے نتائج امتحانات پر پڑتا ہے۔

فحش لٹریچر

آپ کسی بک سٹال پر چند ثانیے کے لیے کھڑے ہو جائیے، جہاں مختلف ماہنامے اور ہفت روزہ رسالے اور مختلف النوع کتابیں قرینے اور ترتیب سے سجا کر رکھی گئی ہیں۔ ان رسالوں میں اکثر رسالے فلمی ہوں گے۔ جن کے صفحات عورتوں کی رنگین اور نیم برہنہ تصویروں سے بھرپور ہوں گے اور ان رسالوں کے مضامین ان تصاویر سے بھی عریاں تر اور فحش قسم کے ہوں گے اور خریداری اپنی قوم میں انہی رسالوں کی زیادہ ہے۔ کیونکہ مملکت اسلامیہ کے نوجوانوں کا دل پسند مطالعہ یہی رسائل و صحائف ہیں۔ اِنا لِلّٰہِ و انا الیہِ راجعُون۔

کوئی ایک آدھ رسالہ شاید ادبی بھی نظر آ جائے لیکن اس کی حیثیت النادر کالمعدوم کی سی ہوگی۔ کتابوں پر سرسری نظر ڈالیں تو وہ بھی اسی قسم کی ہیں۔ گندہ قسم کے ناول، عریاں افسانے نوجوانوں کی اکثریت سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے ادب کی گرویدہ ہے۔ جنھوں نے معاشرے کے گھناؤنے کردار اور سماج کے ناپاک پہلو کو جلوہ گاہِ عام پر ظاہر کر دیا ہے۔ ان مصنفوں کا تو یہ خیال ہوگا کہ شاید اس طرح عوام کو ان افعال قبیحہ اور حرکاتِ شنیعہ سے گھن آئے گی اور وہ ان سے متنفر ہو کر تائب ہو جائیں گے۔ لیکن نتیجہ اس کے برعکس مرتب ہو رہا ہے۔ یہ تمام فحش لٹریچر اور

ناپاک ادب نوجوانانِ قوم بالخصوص طالب علموں میں اپنے زہریلے جراثیم داخل کر رہا ہے جس سے تعلیم گاہیں بہت زیادہ متاثر ہو رہی ہیں اور طالب علموں کا طبعی رجحان علم و ادب سے ہٹ کر فحاشی کی طرف منعطف ہو رہا ہے جس کی زد لا محالہ امتحانات کے نتائج پر پڑتی ہے۔

کامیابی کے لئے ناجائز وسائل

امتحانات کے سلسلہ میں ہمارے معاشرے میں ایک بہت بڑی خرابی بد دیانتی کی ہے ہر طالب علم یہ چاہتا ہے کہ وہ تعلیمی کد و کاوش اور سعی پیہم کے بغیر امتحان پاس کرے اور ڈویژن بھی اچھی حاصل کر لے۔ حالاں کہ

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

محنت کے بغیر ثمر کامیابی حاصل کرنے کے آرزومند اس سلسلے میں جائز و ناجائز کی پرواہ نہیں کرتے۔ کئی طالب علم ایسے منچلے ہوتے ہیں کہ امتحان گاہ میں نقل کرنے اور ناجائز کاغذات اندر لے جانے کا منظم پروگرام مرتب کر کے آتے ہیں اور بعض دفعہ تو نگران اور منتظم کو مرعوب کرنے کی ناپاک جسارت بھی کر بیٹھتے ہیں۔

اس کے بعد ممتحنوں کے پتے دریافت کر کے ان کا تعاقب بھی کرتے ہیں۔ امتحانات کے ایام میں سفارشات کے ذریعے ممتحنوں تک رسائی حاصل کرنا اور ان کو ناجائز ذرائع سے متاثر کر کے مقصد براری کے لیے کوشش کرنا بہت عام ہو چکا ہے۔ اس مجرمانہ فعل سے ان کا مقصد حاصل ہو یا نہ ہو لیکن وہ امید تو رکھتے ہیں کہ ان کا یہ اقدام کامیابی میں معاون ہے۔ ان ناجائز طریق سے کامیاب ہو جانے کی موہوم توقع پر وہ سارا سال مست رہتے ہیں۔ انہیں یہ امید ہوتی ہے کہ وہ موقع پر اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر کے، نگران اور منتظم سے مل ملا کر اور ممتحنوں پر اثر و رسوخ استعمال کر کے کامیابی حاصل کر لیں گے۔ اور اسی امید پر وہ سارا سال پڑھنے لکھنے سے غافل اور بے نیاز رہتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امتحانات میں فیل ہونے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا

غیر مسلموں کا انحطاط | امتحانات میں طلبہ کی ناکامی کے اسباب و علل کی ٹوہ لگاتے ہوئے یہ بات بھ

شکتی ہے کہ تقسیم ملک سے پیشتر نتائج کی کیفیت اتنی ناگفتہ بہ نہیں تھی۔ متحدہ ملک کے وقت مسلم اور غیر مسلم تعلیمی اداروں میں رشک و مسابقت کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔ اس وقت مسلم تعلیمی ادارے ہمیشہ اس کوشش میں مصروف اور اس تگ و دو میں منہمک رہتے کہ طالب علموں پر زیادہ سے زیادہ محنت کر کے اور انہیں زیادہ سے زیادہ وقت دے کر اپنے نتائج امتحان غیر مسلم اقوام کے مقابلے میں بہتر سے بہتر دکھائیں اور اس میں وہ اپنا قومی تفاخر محسوس کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی انہیں یہ خدشات بھی لاحق رہتے تھے کہ اگر انھوں نے محنت کر کے غیر مسلم اداروں کے مقابلے میں شاندار نتائج نہ دکھائے تو قوم ان پر نفرین کریگی پھبتی آوازے کسیں گے اور فریق مخالف کے طنز و ملامت کے تیر سینوں کو زخمی کر دیں گے۔ اپنی قوم کی باز پرس اور ہمسایہ قوم کی شماتت سے بچنے کے لیے نیز جذبات رشک و مسابقت کی تسکین کی خاطر مسلم ادارے، مسلم طلبہ اور مسلم اساتذہ، اس طرح محنت کرتے تھے گویا یہ ایک قومی جہاد ہے اور حق و باطل کی ٹکر ہے اور اس مقابلے میں وہ جان کی بازی لگانے پر بھی اتر آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان ایام میں مسلمان طلبہ کی تعلیمی حالت آج سے بدرجہا بہتر تھی۔ اور ان کے اس وقت کے نتائج امتحان، نتائج امروزہ سے بہت زیادہ اچھے تھے اور اس سے انکار کرنا بھی محال ہے کہ غیر مسلم اقوام بالخصوص ہندو قوم کے طلبہ بہت محنتی اور فرض شناس تھے۔ وہ مسلمان طالب علموں کی طرح آوارہ مزاج بھی اتنے نہیں تھے۔ اس لیے مدارس میں ان کی معیت ہمارے مسلمان طلبہ کے لیے بہت حد تک مفید تھی۔ یا یوں کہیے کہ ان کے اثر صحبت اور جذبۂ رشک اور مقابلہ کی وجہ سے مسلمان طلبہ میں بھی کچھ احساس ذمہ داری موجود تھا، جو ان کے چلے جانے سے روز بروز انحطاط پذیر ہے۔ کاش کہ ہمارے طلبہ کا تعلیمی معیار پہلے سے بلند تر ہوتا اور حصول آزادی کے بعد وہ اپنی تعلیمی رفعتوں کی بنا پر فخر سے اپنا سر بلند کر سکتے۔

علاج

منطقی اعتبار سے تو نتائج میں انحطاط کے اسباب کا ازالہ ہی اس بیماری کا علاج ہونا چاہیے۔ مگر طلبہ کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں استاد کو جو مرکزیت حاصل ہے۔ اس کے پیش نظر بلاخوف تردید

کہا جا سکتا ہے کہ استاد کی اصلاح میں نتائج کی بہتری مُضمر ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور وہ دل ہے (اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ) انسانی جسم میں جو مقام دل کو حاصل ہے وہی حیثیت تعلیم میں استاد کی ہے۔ اگر استاد صحیح ہے تو تعلیم لا محالہ صحیح ہو گی۔ استاد اگر شوق سے درس و تدریس کے فرائض سرانجام دے۔ اس کے دل میں طلبہ کی فلاح و بہبود کا خیال اور ان کے مستقبل کو تابناک اور درخشندہ بنانے کی فکر ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی ساعی مشکور نہ ہوں اور اس کی محنت ثمر بخش نہ ہو۔

استاد اگر صحیح طور پر کام کرے تو طلبہ کی اکثریت اس کا اثر قبول کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ استاد کی شفقت و رافت ان بچوں کے دلوں میں بھی شوقِ علم پیدا کر سکتی ہے۔ جو مدرسے کے نام سے گریزاں اور مکتب کے نام سے ترساں ہیں۔ نظیری نیشاپوری نے سچ کہا ہے ؎

درسِ ادیب گر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفلِ گریز پائے را

استاد کو دیانت داری سے کام پر آمادہ کرنے اور اس کو حلال کی روزی کمانے کی ترغیب دلانے والی ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے تعلق بہ خدا اور خشیت الٰہی۔ اگر استاد کے دل میں خدا کا صحیح تصور قائم ہو جائے اور اسے یقین ہو جائے کہ ایک قادر مطلق فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ۔ علیم و خبیر اور حساب گیر ہستی میرے اعمال و افعال کو ہر دم دیکھ رہی ہے۔ اور حبل الورید سے قریب تر ہے۔ اس کی گرفت سخت ہے۔ اس کی بطشِ شدید سے مفر محال ہے۔ اس کے سامنے ایک نہ ایک دن مجھے حساب دینا ہے اور وہ دن دور نہیں ـــــ تو کوئی وجہ نہیں کہ استاد اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں کوتاہی سے کام لے اور اپنے کام میں لیت و لعل کرے۔

بفرضِ محال اگر اس مادی دور میں خدا کے صحیح تصور کی جانب کسی کو مائل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو تو استاد کی ملازمت میں جاذبیت پیدا کرنا تو کسی طرح ناممکن نہیں کہا جا سکتا۔ محکمہ تعلیم کے

مقابلے میں دوسرے سرکاری محکموں میں تنخواہوں کے معیار اسقدر اونچے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان سب کے سب انہی محکموں میں ملازم ہونے کے لیے بے چین ہوتے ہیں اور محکمہ تعلیم کے حصے میں آ جاتے وہی ملازم رہ جاتے ہیں جنہیں دوسرے محکموں میں جگہ نہیں ملتی۔ یعنی اس ملازمت کے حلقے میں وہ طوعاً نہیں کرہاً داخل ہوتے ہیں۔

اگر محکمہ تعلیم اساتذہ کی تنخواہوں کا معیار دوسرے محکموں کی تنخواہوں کے برابر کر دے اور اساتذہ کو بھی وہ مراعات حاصل ہوں جو دیگر اعلیٰ ملازمین کو ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ محکمہ تعلیم بلند معیاری اساتذہ سے محروم رہے جب تنخواہ اچھی ملے گی تو اچھے آدمی بھی ادھر کھچے چلے آئیں گے۔ اور اس قسم کے اساتذہ کا محکمہ تعلیم میں آنا اس امر کی ضمانت ہوگی کہ موجودہ خرابیاں آہستہ آہستہ رفع ہو جائینگی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مدارس میں طلبہ کے نتائج امتحان کے انحطاط کا مرکزی باعث اساتذہ کی کمزوری اور ان کا تغافل ہے۔ اس لیے اساتذہ کی اصلاح لازمی ہے۔ اور اساتذہ کی اصلاح اُسی وقت ممکن ہے کہ ان کے معاوضۂ محنت اور صلۂ کد و کاوش کو بڑھایا جائے تاکہ وہ پورے شوق دل سے کام کریں۔ نیز شاہرے کے معیار کا اضافہ قابل قدر اور بلند معیار اساتذہ کی کشش کا باعث ہوگا، جس سے مدارس کا تعلیمی معیار یقیناً بلند ہو جائے گا۔ اور خرابیٔ نتائج کی شکایت پیدا نہ ہوگی۔ ؎

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
ممکن ہے اتر جائے ترے دل میں مری بات

❖

شروع میں اُردو کیسے پڑھائیں

سید کوثر حسین

تمہید۔ کسی زبان کا بولنا، لکھنا، اور سن کر یا پڑھ کر سمجھنا۔ یہ ہیں تحصیل زبان کے چہارگانہ مقاصد۔ دراصل یہ وہ بنیادی مہارتیں ہیں جن کی بدولت خیالات کا اخذ و اظہار بخیر و خوبی سرانجام پاتا ہے۔ یہ لسانی صلاحیتیں یا مہارتیں باہم مربوط ہیں اور ایک دوسرے کے حصول میں اعانت کرتی ہیں۔

اس وقت "پڑھ کر سمجھنا" یعنی پڑھنے کی مہارت رکھنا زیر بحث ہے۔ پڑھنا زباندانی کا ایک اہم جزو ہے۔ کیونکہ کسی زبان کو پڑھ سکنا اس زبان کے علوم و فنون تک رسائی حاصل کر لینے کے مترادف ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایک سرچشمۂ کیف و سرور کے مماثل ہے جس سے ذہن کو آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ زندگی کا ہر پہلو بالخصوص معاشی و معاشرتی پہلو مطالعے کی بدولت سنورتا اور ترقی کرتا ہے اور چونکہ غیر زبانوں کے مقابلے میں قومی زبان کی ضرورت اور اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس لیے قومی زبان میں پڑھنے کی صلاحیت اور بھی زیادہ توجہ کی طالب ہے۔ مغربی پاکستان کی ملکی و قومی زبان اردو ہے۔ جو یہاں کے اکثر باشندوں کی مادری زبان نہیں۔ اسی وجہ سے قومی تعلیمی کمیشن نے اردو کی خاطر خواہ ترویج و ترقی کے لیے سخت جدوجہد کی سفارش کی ہے۔ چنانچہ دوسرے تعلیمی مسائل کی طرح اردو پڑھنا سکھانے کے مختلف طریقے بھی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔

اردو پڑھانے کا بہترین طریقہ دریافت کرنے کے لیے ان تمام طریقہ ہائے تدریس پر غور کرنا ہوگا جو نہ صرف اردو میں رائج ہیں بلکہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ تاکہ اردو کے سلسلے میں پڑھنا سکھانے کے رائج الوقت طریقوں کی اضافی قدر و قیمت واضح ہو سکے۔

ڑھنا سکھانے کے طریقے

پڑھنا سکھانے کے جو طریقے مختلف زبانوں میں استعمال ہو رہے ہیں انہیں تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱- ترکیبی SYNTHETIC

۲- تحلیلی ANALYTIC

۳- مخلوط COMPOSITE

ترکیبی طریقوں سے ایسے طریقے مراد ہیں جن میں اول تو اجزا کے کلمہ (یعنی حروف ہجا) کے نام اور انکی آوازیں سکھائی جاتی ہیں اور پھر ان حروف کو ملا کر الفاظ اور جملوں کا پڑھنا سکھایا جاتا ہے، اس کے برعکس تحلیلی طریقوں میں کُل سے جزو کی طرف اقدام ہوتا ہے۔ جب بچہ حروف کے مرکبات یعنی الفاظ یا پورے جملوں کو پہچاننے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر ان الفاظ کی تحلیل کر کے حروف کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ مخلوط طریقوں سے وہ طریقے مراد ہیں جو نہ خالص ترکیبی ہیں نہ خالص تحلیلی بلکہ ان دونوں کا مرکب اور آج کل یہی رجحان بڑھ رہا ہے۔ حال ہی میں انٹرنیشنل بیورو آف ایجوکیشن جنیوا نے ایک عام سوالنامہ کے ذریعے مختلف ممالک سے تعلیمی مسائل پر مواد حاصل کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ دنیا کے قابل ذکر ملکوں میں پڑھنا سکھانے کے کون کون سے طریقے رائج ہیں۔ سوالنامہ کا جواب دینے والے پینتالیس ملکوں نے پڑھنا سکھانے کے سلسلے میں اپنی ترقی پسندی کا اظہار اس طرح کیا ہے

"ہم کسی مخصوص طریقے کے استعمال پر زور نہیں دیتے۔ بہترین طریقہ وہ ہوگا جس کے نتائج سب سے زیادہ سہل الحصول اور انتہائی دیرپا ہوں۔ ہم یہاں آمیزی طریقے، ترکیبی یا ہجائی طریقے اور جملہ واری طریقے کا نام لکھے دیتے ہیں۔ لیکن ہم کسی مخصوص طریق کے استعمال پر اصرار نہیں"

مشہور ترکیبی طریقوں کی تفصیل

پڑھنا سکھانے میں تین طریقے مقبول رہے ہیں:-

(ا) الف بائی طریقہ ALPHABETIC METHOD

(ب) صوتی طریقہ PHONIC METHOD

(ج) صوتیاتی طریقہ PHONETIC METHOD

<u>الف بائی طریقہ</u> اہل یونان و اہل روم کے ابتدائی ایام سے عہدِ وسطیٰ تک عالمگیر حیثیت رکھتا تھا اور بیشتر مشرقی ممالک میں آج بھی رائج ہے۔ اِس طریقے کو ہجی طریقہ بھی کہتے ہیں کیوں کہ اِس میں بچہ کسی لفظ کے تلفظ سے قبل اُس کے حروف ہجا کے نام لیتا ہے۔ مثلاً اردو میں بے زیر "بِ" لام پیش "لُ" لام زیر ہے "لِی" بِلّی یا انگریزی میں سی۔ اے۔ ٹی۔ کیٹ (C A T) خیال ہے کہ ان ہجوں کے بار بار دہرانے سے بچہ لفظ کا صحیح تلفظ سیکھ جاتا ہے۔ گویا یہ ہجے لفظ کی صحیح آواز پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ لیکن اس کے برعکس، اگر غور کیا جائے تو ان ہجوں سے اصل آواز سے بالکل مختلف آواز نکلتی ہے۔ مثلاً آواز بے زیر لام، لام زیر یہ ہے نہ کہ "بِلّی"۔ اگرچہ اس طرح بار بار دہرانے سے الفاظ کی شکل مع ہجا ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ لیکن لفظ کا صحیح تلفظ سیکھنے میں ان ہجوں سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس طریقے سے پڑھنا سکھانے میں وقتاً فوقتاً مفید تبدیلیاں بھی ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً آج کل ابتدا میں تصاویر کے ذریعہ حروف تہجی کے نام سکھائے جاتے ہیں۔ مثلاً ا انڈا ب بلّی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد سیکھے ہوئے حروف پر اعراب لگا کر حروف کی آواز نکالی جاتی ہے۔ اور اس کی مشق کرائی جاتی ہے۔ مثلاً بے زبر بَ، تے زبر تَ، اسی طرح اِ بِ تِ اور اُ بُ تُ۔ پھر دو دو حروف ملا کر مشق کرائی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ بامعنی لفظوں کے ہجوں تک پہنچتا ہے۔ آخر میں جملے بنائے جاتے ہیں اور ایک ایک لفظ کے ہجے کر کے جملہ پڑھایا جاتا ہے۔ ابتدا میں جملے بے ربط ہوتے ہیں۔ آخر میں تسلسل پیدا کر کے عبارت بنائی جاتی ہے۔ اِس طریقے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ قدرتی طریقہ ہے جس میں جزو سے کُل کی طرف اقدام کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آسان سے مشکل کی طرف چلتے ہیں اور اِس طرح پڑھنا سیکھنے سے نئے الفاظ پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ زبان سیکھنے میں جزو سے کُل کی طرف جانے کا طریق خلافِ فطرت ہے۔ چنانچہ بچہ روزمرہ کی گفتگو ہجوں کے ذریعہ سے نہیں سیکھتا بلکہ

ول کے ذریعہ سے سیکھتا ہے۔ ابتدا میں توجہ لفظ کی پوری شکل کی طرف ہونی چاہیے نہ کہ لفظ کی ترکیب کی
ب۔ بچہ جس طرح بلی کا خاکہ دیکھ کر سمجھ لیتا ہے کہ یہ بلی ہے۔ اسی طرح لفظ بلی دیکھ کر اس
مت سے تعبیر ہونے والی چیز کو سمجھے۔

تہجی طریقہ ایک مشکل اور غیر دلچسپ طریقہ ہے جس کی بے کیفی بچے کو پڑھنے سے متنفر کر دیتی
۔ بچہ ہرگز اس صورت حال سے مطمئن نہیں ہو سکتا کہ جب اس کے والدین پڑھنے بیٹھیں تو مربوط جملے
ھیں، اور با معنی دلچسپ کہانیاں یا واقعات پڑھ کر سنائیں اور بچہ جب پڑھنے کے نام ت کوئی کوشش
ے تو مدتوں غیر دلچسپ اور بے معنی مرکبات (مثلاً الف۔ بے۔ پے) یا (اَ بَ پَ) یا
ب۔ بَب۔ پَپ وغیرہ) رٹنے پڑیں۔ علاوہ ازیں یہ طریقہ اپنے مختلف اور طویل مدارج د
اصل کی وجہ سے بہت وقت چاہتا ہے۔

صوتی طریقہ (PHONIC METHOD)

طریق ابجد یا تہجی طریق کی خامیوں کے سدباب کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اس طریق سے پڑھنا سکھانے
یں حروف کے ناموں کی بجائے ان کی آوازیں سکھاتے ہیں۔ حرف کی شکل کے ساتھ اس کی آواز کو
ربوط کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اب پ سے شناسائی Aa Ba, Pa کے نام سے کرائی
جائے گی نہ کہ الف بے پے کے نام سے۔ کیونکہ اس طرح تو ہر حرف کے نام میں اصل حرف کے
علاوہ دوسرے حروف کی آواز بھی نکلتی ہے۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ بچہ حروف کی آوازوں پر حاوی ہو جائے
روف کی آوازوں کو ملانے سے لفظ کی آواز بن جاتی ہے۔ اور اس طرح لفظ کے ہجوں اور ان سے
پیدا ہونے والی آوازوں میں بے ربطی قائم نہیں رہتی۔ "بے زیر لام۔ لام زیر لے بلی" کے چکر
سے نجات مل جاتی ہے۔ اس قاعدے سے پڑھنا سکھانے میں ابتدا ہی سے صحت تلفظ کی جانب توجہ
ہو جاتی ہے۔ مگر اس طریقۂ تدریس میں بہت سی خامیاں ہیں۔ کسی لفظ کا تلفظ بیک نظر نہیں ہو پاتا
مثلاً ابتداء میں اس قاعدہ سے اختر (اَ خ تَ رَ) پڑھا جائے گا اور تجربہ شاہد ہے کہ صوتی طریق
سے پڑھا ہوا بچہ اسی طرح پڑھتا بھی ہے۔ جب وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ بول چال میں اس طرح نہیں

کتے تب صحیح تلفظ کرنا سیکھتا ہے۔ علاوہ ازیں صوتی طریقہ مواد قرأت (یعنی جو الفاظ پڑھے جائیں) کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتا۔ اس کے قاعدے کے نقاد DUNVILLE سے سالہا سال گذرے یہ کہا تھا کہ صوتی طریق کے ابتدائی مراحل میں جب ہر لفظ کو عملاً بہ دقت پڑھنا پڑتا ہے تو بچے کی توجہ اس عمل میں اتنی مصروف ہوتی ہے کہ فہم کے اعتبار سے اسے پڑھنا نہیں کہہ سکتے یہی سبب ہے کہ اس طریقے سے لفظ خواں تیار ہوتے ہیں نہ کہ قاری۔ علاوہ ازیں اردو صوتی زبان نہیں ہے۔ اس میں بعض ملتی جلتی آوازوں کے لیے ایک سے زیادہ حروف ہیں، جن میں فرق کرنا آسان نہیں۔ مثلاً ث۔ س۔ص یا ذ ز ض ظ وغیرہ صوتی زبانوں میں ایک حرف کی ایک ہی آواز ہوتی ہے۔ اور ہر مفرد آواز کے لیے محض ایک حرف ہوا کرتا ہے۔ اردو میں جہاں ایک آواز کے لیے کئی کئی حروف ہیں۔ وہاں ایک حرف کی کئی کئی آوازیں بھی ہیں مثلاً حروف علّت وٓ اور یؔ کی آوازیں جیسے دُور اور دَور میں وٓ کی آواز یا چِین، چَین اور چین (chain) میں یؔ کی آواز مختلف ہے۔ اس طریق پر ایک یہ اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ صوتی کام بہت پیچیدہ ہے۔ عام اساتذہ اس سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ علاوہ ازیں صحت تلفظ کی دُھن میں ہونٹوں کے مختلف حصوں کی حرکت پر خاص توجہ دینے اور مشقیں کرنے سے بچوں کو ہکلانے کی عادت پڑ جانے کا احتمال ہے۔

صوتیاتی طریقہ (PHONETIC METHOD)

بعض معلمین اردو کے نزدیک پڑھنا سکھانے کا یہ طریق دراصل صوتی طریقے کی ایک ترمیم شدہ صورت ہے جس میں ایک سے زیادہ آوازیں دینے والے حروفِ علّت کی مخصوص علامتیں مقرر کر دی جاتی ہیں، تاکہ ہر ایسی آواز کے لیے ایک علامت مختص ہو جائے۔ اس طرح صوتیاتی طریقہ گویا رائج الوقت صوتی طریقے کی ایک توسیعی شکل بن جاتا ہے جس میں انگریزی کی طرح کوئی جداگانہ رسم الخط اختیار نہیں کیا جاتا۔ جب طلبہ صوتی طریق سے پڑھنا سیکھ جاتے ہیں تو انھیں ایک سے زیادہ آوازیں رکھنے والے حروف علت (و۔ی) اور "ہ" کی مختلف آوازوں کے لیے مختلف نئی علامتوں کا استعمال سکھایا جاتا ہے۔

مثلاً خوِشس { یعنی جو واؤ پڑھا نہ جائے اُس کے نیچے کھڑا }
نُوْر { واؤ معروف پر پیش (ُ) علامت ہو تو واؤ کھینچکر پڑھا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ }

لیکن مذکورۂ بالا صورت میں وہ تمام اعتراضات وارد ہوتے ہیں جو اُردو کے غیر صوتی زبان ہونے کی وجہ سے صوتی طریقۂ تدریس کے استعمال پر عائد کیے جاتے ہیں۔

اُردو میں صوتیاتی طریقے کی مکمل صورت یہ ہے کہ جس طرح انگریزی میں صوتیاتی طریقہ استعمال ہوتا ہے) تمام مفرد حروف کی آوازیں مخصوص علامات کے ذریعے سکھائی جائیں اور اس کے بعد اصلی حروف کی پہچان کرائی جائے۔ دراصل تمام زبانوں کے مفرد حروف کی آوازیں ملتی جلتی ہیں۔ اس لیے حروف کی بجائے آوازوں کے ذریعے سے مختلف زبانوں کا سیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ آوازیں سیکھنے کے بعد حروف کی شناخت کرائی جاتی ہے مگر اس طریق میں بھی دشواریاں ہیں۔ پہلے صرف آوازیں سکھائی جاتی ہیں اور پھر حروف جس سے کام دُگنا ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ دقت ہے کہ عام کتابوں کا رسم الخط صوتیاتی نہیں۔ پھر صوتیاتی رسم الخط سیکھ کر چھوڑ دینا اور مروجہ رسم الخط اختیار کرنا بے سود اور دقت طلب معلوم ہوتا ہے۔

مشہور تحلیلی طریقوں کی تفصیل

پڑھنا سکھانے کے تحلیلی طریق کا مشہور نام دیکھو اور بولو Look . and . say . Method ہے، جس کی کئی صورتیں رائج ہیں مثلاً لفظ واری، جملہ واری، قصہ واری لیکن ان سب میں ایک ہی اصول جاری وساری ہے یعنی کُل سے جُزو کی جانب اقدام۔ تاکہ پڑھنا سکھانے کا آغاز زبان کی بامعنی اکائیوں سے کیا جاسکے۔

دیکھو اور بولو کے استعمال کی یہ صورت ہے کہ بچے کو مقررہ چیز دکھا کر اس چیز کا نام دریافت کرتے ہیں۔ پھر وہ لفظ (یعنی اس چیز کا نام) تختۂ تحریر پر لکھدیا جاتا ہے۔ بچہ لفظ کی شکل دیکھتا اور استاد کی آواز دہراتا ہے۔ یہ عمل متعدد بار کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ لفظ کا تلفظ بالکل صاف ہو جاتا ہے بچہ لفظ کا مفہوم بھی جانتا ہے۔ اس طرح کئی بامعنی لفظ سیکھ کر بچہ اُن الفاظ سے بنے ہوئے جملے پڑھنے

لگتا ہے۔ اِس طرح کچھ ایسے دو حرفی الفاظ پڑھ کر جن کا حرف دوم مشترک ہو (جیسے اب، جب، رب) ب کا استخراج کیا جاتا ہے اور اسی طرح دوسرے حرف کا استخراج عمل میں آتا ہے۔ اب جن حروف کا استخراج کیا گیا ہے ان کے نام سے بچے کو شناسا کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ خواہ پڑھنا سکھانے کا کوئی طریقہ استعمال کیا جائے۔ کسی نہ کسی مرحلے پر حروف تہجی کے نام بتانے ضروری ہیں۔

دیکھو اور بولو کا جملہ واری طریق بھی لفظ واری طریق کی طرح ہے۔ لیکن اس میں لفظ کی بجائے ایک سادہ جملہ لیا جاتا ہے۔ یہ جملہ کسی تصویر کے نیچے لکھا ہوتا ہے۔ اب ہر لفظ کو دیکھو اور بولو کے طریق سے دکھایا اور کہلوایا جاتا ہے۔ پھر وہی جملہ کاغذ یا کتاب میں لکھا ہوا دکھایا جاتا ہے؛ اور بچے اسے بہت شوق سے پڑھتے ہیں؛ اور الفاظ کی شکل ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ کئی جملے اسی طرح پڑھا دیئے جاتے ہیں یہ لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ان جملوں میں سیکھے ہوئے الفاظ بار بار آئیں تاکہ ان کی شکلیں ذہن نشین ہو جائیں اس کے بعد سیکھے ہوئے جملوں کو الفاظ میں اور الفاظ کو حروف میں تحلیل کر کے حرف شناسی کرائی جاتی ہے قصہ واری طریق میں چند مربوط جملوں سے شروع کر کے یہی عمل کیا جاتا ہے۔

دیکھو اور بولو کے طریق کو یہ نفسیاتی حمایت حاصل ہے کہ اس طرح بچے کو پڑھنے کا شوق ہو جاتا ہے، وہ پہلے ہی سبق میں محسوس کرتا ہے کہ پڑھنا آگیا۔ ترکیبی طریقوں میں یہ بات ممکن نہیں۔ لیکن اس کے باوجود "دیکھو اور بولو" کے طریق میں کچھ خامیاں بھی ہیں جن سے طرح طرح کی دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ حافظہ پر بہت بار پڑتا ہے کیوں کہ اس میں سینکڑوں آوازوں کا سیکھنا اور انہیں یاد رکھنا لازم آتا ہے، متشابہ الفاظ کے تلفظ میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ ہجے کمزور رہ جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اردو ایک ایسی زبان ہے جس کے حروف انگریزی حروف کے برعکس پورے پورے نہیں لکھے جاتے ترکیب کی صورت میں ان کی انفرادی شکلیں قائم نہیں رہتیں۔ جیسا کہ "ب" کی مختلف شکلوں (اب۔ بر یا۔ بم۔ بحر۔ سبیل۔) سے ظاہر ہے اس لیے الفاظ کے تجزیہ کے ذریعہ اردو کے تمام حروف ابجد کی شناسائی ممکن نہیں۔ صرف سوا حروف جن کی صورت ترکیب میں قائم رہتی ہے اس طرح پڑھائے جا سکتے ہیں! غرضکہ پڑھنا سکھانے کے مندرجہ بالا طریقوں میں سے کوئی طریقہ بھی ایسا نہیں جو نقائص سے بالکل پاک

پڑھنا سکھانے کے بہترین طریقے کی تلاش

مغربی ممالک کے ماہرین تعلیم کی تحقیقات شاہد ہے کہ سنہ ۱۹۱۰ء سے آج تک بہت سے تجربے کیے جا چکے ہیں لیکن پھر بھی قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مروجہ طریقوں میں سے کونسا طریقہ بہترین ہے۔ کیونکہ اول تو صرف چند طریقوں کو آزمایا گیا ہے۔ دوسرے اس قدر احتیاط نہ ہو سکی کہ وثوق کے ساتھ صرف طریقہ تدریس ہی کو نتائج کے اختلاف کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے۔

انتخاب کے اصول

———— اگرچہ مذکورہ تحقیقات کے نتائج قطعیت کے ساتھ یہ نہیں بتاتے کہ پڑھنا سکھانے کے طریقوں میں سے کونسا بہتر ہے۔ لیکن بقول ولیم گرے چند حقائق و اصول ضرور ہم پہنچتے ہیں۔

۱۔ پڑھنا سکھانے کے مخصوص طریقے کسی جماعت کے تمام طلبہ پر یکساں اثر مرتب نہیں کرتے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پڑھنا سکھانے کا طریقہ ہی سب کچھ اور عوامل بھی ہیں، جن کا لحاظ پڑھنے کا پروگرام بناتے وقت ضروری ہے۔

۲۔ پڑھنا سکھانے کے مخصوص طریقے طلبہ کو پختگی و مطالعہ کی مختلف راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ یعنی یہ بات کہ پڑھنا سیکھنے کا آغاز کس طرح کیا گیا اہمیت سے خالی نہیں۔ جہاں ایک طریقہ کچھ مخصوص رجحانات اور مخصوص مہارتیں پیدا کرتا ہے۔ وہاں وہ کچھ ایسی خصوصیات پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے جو اتنی ہی اہم ہیں۔ اس طرح دنیا میں ہزاروں بچے اور بالغ جنھوں نے پڑھنے میں اچھی تربیت حاصل کی ہے مؤثر مطالعہ کی تمام بنیادی مہارتیں اور رجحانات پیدا نہیں کر سکے۔

۳۔ اگر معانی اور الفاظ دونوں کی شناخت پر زور دیا جائے تو پڑھنا سیکھنے میں خاطر خواہ ترقی ممکن ہے۔ جبکہ ترکیبی طریقے الفاظ کی شناخت پر اور تحلیلی طریقے محض معانی کی شناخت پر زور دیتے ہیں۔

عوامل و شرائط جو پڑھنا سیکھنے میں کامیابی کے ضامن ہیں۔

۱۔ ثقافت اور ماحول کے اثرات: ۔ ہر قوم یا گروہ کے پڑھنے کا میلان اپنی ثقافت سے متاثر ہوتا ہے۔ بعض پڑھنے کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ جب موقع ملتا ہے اسے خالی نہیں

— جانے دیتے۔ بعض اپنے آپ کو پڑھنے سے بے نیاز جانتے ہیں۔

جو بچے ایسے گھرانوں سے آتے ہیں جہاں پڑھنے لکھنے کا چرچا ہو۔ وہ مدرسے آنے سے پہلے مصوّر رسالے اور تصاویر دیکھ چکے ہوتے ہیں اور اپنے بزرگوں کی بدولت یہ بھی جانتے ہیں کہ کہانیاں پڑھنے میں کیا مزہ آتا ہے۔ ایسے بچے پڑھنا سیکھنے میں بڑے شوق کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف جاہل والدین کے بچے اس لطف سے واقف نہیں ہوتے اس لیے انہیں زیادہ تشویق و ترغیب کی ضرورت پڑتی ہے۔

۲۔ **زبان کی وضع** :- تدریس کے طریقے رسم الخط کو منافی نہیں کر سکتے۔ اس لیے جاپانی یا چینی زبان کا پڑھنا سیکھنے میں الف بائی طریقہ کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اسی طرح اردو جس کے حروف کی انفرادی شکلیں مختلف الفاظ کی صورت میں بدلتی رہتی ہیں تحلیلی طریق سے پوری طرح نہیں پڑھائی جا سکتی۔

۳۔ **معلّمین کے اکتسابات** :- تدریس کے جدید طریقوں کا استعمال اکثر اوقات ناممکن ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ معلّمین پوری طرح تربیت یافتہ نہیں ہوتے وہ صرف اسی طریقہ تدریس سے واقف ہوتے ہیں جس کے ذریعے انہوں نے خود پڑھنا سیکھا تھا۔ اس لیے اگر انہیں کسی جدید طریقہ تدریس کا مشورہ دیا جائے تو وہ قبول نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات ملازمت سے مستعفی ہونے پر کمر باندھ لیتے ہیں۔ راقم کو اس مضمون کے سلسلے میں تیرہ پرائمری سکولوں کے دیکھنے اور اردو پڑھانے کی کیفیت معلوم کرنے کا موقع ملا معلوم ہوا کہ پہلی اور دوسری جماعت کے معلّمین اکثر و بیشتر غیر تربیت یافتہ ہیں۔ تربیت دراصل بہت ضروری ہے تا اردو کی کوئی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ جدید طریقہ ہائے تدریس کے جاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ صرف الف بائی یا ہجی طریق جانتے ہیں۔ محکمہ تعلیم کے منظور کردہ اردو قاعدہ برائے جماعت اوّل کی خوبیوں اور خامیوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ بچوں کو پڑھنے کی رغبت دلانے کے لیے قاعدے کے ابتدائی حصے میں جو تصاویر رکھی گئی ہیں ان سے مصرف نہیں لیتے۔ معلّمین کے گزارشات کے عنوان سے جو ہدایات درج کی گئی ہیں انہیں ضروری نہیں سمجھتے۔ قاعدے میں جو الفاظ "دیکھو اور بولو" طریق سے پڑھائے گئے تھے۔

انہیں بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اکثر مدارس میں قاعدے کے سترہ صفحات چھوڑ کر اٹھارویں صفحے سے جہاں حروف تہجی دیے ہوئے ہیں، پڑھانے کا آغاز ہوا ہے۔ کسی دلچسپی اعانت اور کھیل کھیل میں اردو پڑھانے کے طریقوں کی طرف کوئی قابلِ ذکر توجہ نہیں دی گئی۔

۴۔ **مقاصد تدریس** :- اگر تدریس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کی ہمہ گیر نشوونما ہو جائے تو مطالعہ کا پروگرام بھی اسی مقصد کے تابع ہونا چاہیے۔ غرضیکہ تمام مواد تعلیم کا بچوں کے رجحانات اور ان کی روزمرہ فعالیتوں اور دلچسپیوں پر مبنی ہونا ضروری ہے۔ پڑھنا سکھانے کے طریقے بھی تعلیم کے اصل مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہونے چاہئیں۔

۵۔ **تدریس کی مدت** :- طریقہ ہائے تدریس کا مقدارِ وقت سے متاثر ہونا ایک لازمی امر ہے اگر مدرسے میں مطالعۂ اردو کو بہت تھوڑا وقت دیا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ طلبا کو مطالعے کے دوران بری طرح گھسٹنا پڑے گا۔

مندرجہ امور سے براہِ راست دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ تدریس کے کچھ حقائق و اصول ایسے ہیں جن کا ہر جگہ اطلاق ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ اکثر طریقہ ہائے تدریس کو مختلف تقاضوں، زبانوں اور قوموں کی حسب منشا تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ ان دونوں باتوں کے پیشِ نظر اردو پڑھانے کا مندرجہ ذیل طریقہ ایک موزوں طریقہ کہلا سکتا ہے۔

اُردو پڑھنا سکھانے کا موزوں طریقہ

بچوں کو پڑھنا سکھانے سے پہلے اُردو بولنا سکھانے پر پوری توجہ مبذول کی جائے۔ شوق افزا ماحول۔ سامانِ ترغیب و تشویق اور معلم کی جانب سے ملائم سلوک ضروری ہے۔ تاکہ مغائرت دور ہو اور بچے اردو کے محاورہ اور لب و لہجہ سے مانوس ہو جائیں۔ بولنا سکھانے کے سلسلہ میں جن تدابیر کی ضرورت ہے اُن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ دو یا پونے دو مہینے صرف زبانی تعلیم ہونی چاہیے۔

پڑھنا سکھانے کے ساتھ ساتھ بچوں کو یہ احساس دلانا چاہیے کہ پڑھنا سیکھنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔

پہلے دیکھو اور بولو کے طریقے سے وہ حروف پڑھائے جائیں جو الفاظ کے تجزیہ کی صورت میں پوری طرح پہچانے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ا ۔ د ۔ ر ۔ و وغیرہ۔ جو دارا، دادا وغیرہ الفاظ کے تجزیہ سے حاصل ہوسکتے ہیں یہ حروف سکھانے کے بعد اُن کے یاد رہنے کی تدبیریں کی جائیں۔ تعلیمی کھیلوں کے ذریعے پڑھے ہوئے الفاظ کا تجزیہ اور پہچانے ہوئے حروف سے الفاظ بنانے کی مشق کرائی جائے۔ مثال کے طور پر بچوں کو حروف کے تاش دیئے جائیں اور تختہ تحریر پر ایک پڑھا ہوا لفظ جس کے حروف سہا سہا ہوں لکھا جائے طلبہ حروف کے تاش ایک دوسرے کے متصل رکھ کر وہ لفظ بنائیں وغیرہ وغیرہ۔ تختۂ تحریر پر کچھ سیکھے ہوئے حروف لکھ کر اُن سے مختلف الفاظ بنوائے جائیں۔ اِس قسم کے بے شمار تعلیمی کھیل ہیں جن سے معرف لیا جاسکتا ہے۔ اِس طرح بچوں کو جہاں تعلیم کے پُرلطف ہونے کا احساس ہوگا۔ وہاں یہ خیال بھی ہوگا کہ ہمیں پڑھنا آگیا ہے جو تعلیم میں آگے پڑھنے کا ولولہ پیدا کرے گا (دو رکنی الفاظ کے دو حرفی اجزا (دارا - باجا) وغیرہ کی مختلف تکرار سے بے شمار لفظ بن جاتے ہیں۔ جنھیں بچہ سہولت سے پڑھنا اور مسرت حاصل کرتا ہے)

اُردو کے باقی حروف الفبائی طریق سے پڑھائے جائیں۔ لیکن اس طرح کہ مشابہ حروف کی گروہ بندی کرلی جائے مثلاً ایک سبق میں ب پ ت ٹ ث، دوسرے میں ج چ ح خ وغیرہ تاکہ متشابہ حروف کا باریک فرق واضح ہوتا رہے اور آئندہ شناخت کرنے میں غلطی نہ ہو۔ پڑھاتے ہوئے نئے حروف کو ایسے الفاظ سے ربط دیدیا جائے جنھیں طلبہ پہلے سے جانتے ہوں (مثلاً ب سے بلی بہتر ہوگا۔ اگر اس کے ساتھ ہی بلی کی تصویر بھی دکھائی جائے)

معروف حروف سکھانے کے بعد اُن پر اعراب لگا کر الفبائی طریقہ سے آوازیں بتائی جائیں (مثلاً اَ بَ پَ اِس کے بعد اگلی مشقیں مثلاً اِ بِ پِ ۔ اُ بُ پُ پھر آ اِ اُ ۔ بَ بِ بُ وغیرہ) اگرچہ اِس قسم کی مشقوں میں بے معنیٰ آوازوں اور بعض مہمل لفظوں سے واسطہ پڑتا ہے، لیکن اس کا چنداں فکر نہ ہونا چاہیے۔ طلبہ اِس سے صوتی حظ حاصل کرتے ہیں، بشرطیکہ یہ صورت کبھی کبھی ہو، جیسا کہ پڑھنا سیکھنے کی اِس اسکیم میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اب دو حرفی الفاظ پڑھوانے کی منزل آجاتی ہے۔لیکن اس موقع پر بچوں کو حروف کے سروں کی پہچان کرا دی جائے ایک معلم نے اس کی یہ تدبیر بتائی ہے:۔معلم طلبہ سے سوال کرتا ہے۔ بچے جواب دیتے ہیں:۔

معلّم:۔ دیکھو بچو تمہارے سامنے یہ تختہ کھڑا ہے۔ میں نے اس کے پیچھے ایک لڑکے کو چھپا دیا ہے۔ میں اب تالی بجاؤں گا۔ تالی بجتے ہی یہ بتانا کہ تختے کے پیچھے کون لڑکا ہے۔معلّم تماشہ گروں کی طرح ایک دو تین کہہ کر تالی بجاتا ہے۔ تختے کے پیچھے جو لڑکا چھپا ہوا تھا، کھڑا ہو جاتا ہے اور تختے کے اوپر سے لڑکے کا سر اور چہرہ صاف نظر آتا ہے۔معلم پوچھتا ہے، بتاؤ یہ کون ہے۔سب طلبہ ایک دم اُس کا نام لیتے ہیں۔معلم پوچھتا ہے تم نے کیسے جانا کہ یہ نام ہے جب کہ یہ تختے کے پیچھے چُھپا ہوا ہے۔طلبہ بتاتے ہیں کہ ہم نے اس کا سر یا چہرہ پہچان لیا ہے۔معلّم شاباش دیتا ہے اور کہتا ہے کہ بے شک ہم کسی آدمی کا چہرہ دیکھ کر اُسے پہچان لیتے ہیں۔یہی حرفوں کا حال ہے۔ بتاؤ یہاں (جب) ب کے شروع میں کس حرف کا چہرہ نظر آرہا ہے۔بشرطِ ضرورت معلّم مدد کرتا ہے، اور اس طرح جب لکھ کر دکھاتا ہے اور ج کے چہرے کی شناخت کراتا ہے۔اب ایک حرف میں دوسرے حرف کے چہرے جوڑنے کے کھیل شروع ہو جاتے ہیں۔

دو حرفی کے بعد، سہ حرفی اور چہار حرفی الفاظ کا پڑھنا سکھایا جائے اور پھر جملے اور عبارتیں پڑھوائیں ہجوں سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔اردو زبان جس میں ہم آواز حروف مثلاً ث س ص یا ذ ز ض ظ وغیرہ موجود ہیں۔تدریس میں ہجوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔یہ کہ "سمندر" س" سے ہے اور صندوق "ص" سے۔صرف سنجیدہ مشاہدے کے ذریعہ اور بار بار ہجے کرکے ہی یاد ہو سکتا ہے اور ہجوں ہی کی مدد سے نئے الفاظ پڑھنے میں مدد مل سکتی ہے۔اردو پڑھنا سیکھنے کے تین مدارج ہیں۔اول حرف شناسی یا ابجد خوانی، دوم عبارت خوانی اور سوم مطالعہ۔تیسری منزل کی کامیابی بہت کچھ دوسری منزل پر منحصر ہے لیکن دوسری منزل کی کامیابی تمام تر پہلی منزل کی پختگی پر مبنی ہے۔الف بائی طریقے سے پڑھنا سکھانے سے پڑھائی کی بنیاد مستحکم ہو جاتی ہے۔البتہ شروع میں جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔"دیکھو اور بولو"

استعمال سے ترغیب و تشویق کا سامان کر لیا جائے اور نئے الفاظ و مرکبات کو مناسب تدابیر و تصاویر سے مرغوب خاطر بنا لیا جائے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا مختلف زبانوں کی تدریس کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ اردو زبان کے لیے مغربی زبانوں کا پسندیدہ طریقہ دیکھو اور بولو کافی نہیں۔ اس کی وجوہ اپنے مقام پر بیان کی جا چکی ہیں البتہ الف بائی طریق سے پہلے ایک حد تک دیکھو اور بولو کا استعمال مفید ہو سکتا ہے ۔

بچوں کی رہ نمائی کے کام کی تنظیم

ڈاکٹر عبدالرؤف اڈاریکٹر ویسٹ پاکستان بیوریو آف ایجوکیشن لاہور

رہ نمائی کے کام کی تنظیم کی ضرورت

بچوں کی بے شمار اقسام ایسی ہیں جن کی روزمرہ الجھنوں کی سمجھ بوجھ اور روک تھام کے بارے میں عام والدین اور معلمین کی مدد نہیں کر سکتے۔ اس قسم کے بچوں کی چند قابل غور انواع یہ ہیں :-
مشکل بچے۔ پسماندہ بچے۔ نکمے بچے۔ مجرم بچے۔ بگڑے بچے۔ آوارہ بچے۔ تشدد پسند بچے وغیرہ وغیرہ
اس لیے معلم کو یا تو اس قسم کے بچوں کی رہ نمائی کے اصولوں کی خود تربیت حاصل کرنی چاہیے یا پھر ماہرین رہ نمائی کی خدمات سے استفادہ کرنا چاہیے۔

قومی تعلیمی کمیشن نے بچوں کی رہ نمائی کے کام کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ کمیشن نے بچوں کی جذباتی معاشرتی اور تعلیمی رہ نمائی سے متعلق بہت سے منصوبے پیش کیے ہیں

بچوں کی رہ نمائی کا ادارہ

رہ نمائی کے کام کی تنظیم کا بہترین طریق مدارس میں بچوں کی رہ نمائی کے ادارہ کا قیام ہے۔ جسے انگریزی میں چائلڈ گائیڈنس کلینک یا سنٹر کہتے ہیں۔

ادارے کا عملہ :- رہ نمائی کے اس ادارے کا عملہ بچوں کی رہ نمائی اور ان کی روزمرہ الجھنوں کے علاج میں خصوصی طور پر تربیت یافتہ ہوتا ہے۔ کسی منظم ادارے میں عموماً مندرجہ ذیل ماہرین کام کرتے ہیں۔

۱۔ ماہر نفسیات
۲۔ معالج امراض دماغی
۳۔ معاشرتی کارکن اور ۴۔ چند خصوصی ماہرین۔

ماہرِ نفسیات اِس ادارے کا روحِ رواں ہوتا ہے۔ اسے معالجاتی نفسیات، بچوں کی رہنمائی کے اصولوں اور ذہانت ناپنے کے فن پر عبور حاصل ہوتا ہے۔ ماہرِ نفسیات کلینک میں آنے والے بچوں کی تکلیف کی تشخیص کرتا ہے اور ان کی رہنمائی اور علاج کے مناسب پروگرام وضع کرتا ہے۔

معالجِ امراضِ دماغی سند یافتہ طبیب ہوتا ہے جسے طب میں دسترس کے علاوہ ذہنی بیماریوں کے علاج کا عملی تجربہ بھی ہوتا ہے۔ معالجِ امراضِ دماغی اِس بات کا کھوج لگاتا ہے کہ بچے کی تکلیف میں جسمانی عناصر کس حد تک ذمہ دار ہیں۔ وہ ان جسمانی عناصر کی تشخیص اور علاج کرتا ہے۔

معاشرتی کارکن ان تمام ماحولی اور معاشرتی عناصر کا گہرا جائزہ لیتا ہے جو بچے کی الجھن میں حصے لے رہے ہوں۔ وہ بچے کے گھر جاتا ہے۔ والدین سے ملاقات کرتا ہے۔ اور تمام ممکن عناصر کی چھان پھٹک کرتا ہے اپنا جائزہ مکمل کر کے معاشرتی کارکن کلینک کو ان سب باتوں کی مفصل رپورٹ دیتا ہے۔ بچے کی الجھن اور اِس کے معاشرتی پس منظر کو سمجھنے کے لیے ماہرِ نفسیات اِس رپورٹ سے بہت استفادہ کرتا ہے۔

اکثر مغربی کلینکوں میں مذکورہ بالا عملے کے علاوہ چند خصوصی ماہرینِ فن بھی کام کرتے ہیں۔

اِس کے دو خصوصی ماہرینِ فن یہ ہیں :-

ا۔ نقائصِ نطق کا معالج

ب۔ علاج بذریعہ کھیل کا ماہر

بچپن میں گونگا پن۔ ہکلا پن۔ تتلا پن اور نطق کے دیگر نقائص عام رونما ہوتے رہتے ہیں ایسے نقائصِ نطق کا معالج کلینک کے بہت کام آتا ہے۔ اِس ماہر کو نطق کے تمام نقائص اور بیماریوں کی تشخیص اور علاج پر پورا عبور ہوتا ہے۔

اسی طرح علاج بذریعہ کھیل کا ماہر کھیل ہی کھیل میں بچوں کی الجھنوں اور بیماریوں کا علاج کر دیتا ہے۔ اسے رہنمائی کے اِس نفسیاتی طریق میں خصوصی تربیت حاصل ہوتی ہے۔

ادارے کے عملے کے ان تمام ماہرین میں سے ماہرِ نفسیات اہم ترین رکن ہوتا ہے۔ مالی مشکلات کے پیشِ نظر اگر ادارے کا سارا عملہ ملازم نہ رکھا جا سکے تو وقتی طور پر ماہرِ نفسیات پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔

ادارے کی عمارت

رہنمائی کے ادارے کی کامیابی کا انحصار کافی حد تک اس کی عمارت کی موزونیت پر بھی ہے۔ ایک معقول ادارے کی عمارت میں مندرجہ ذیل کمرے ہونے ضروری ہیں۔

۱۔ ماہرین فن رہنمائی کا دفتر
۲۔ ملاقات اور تشخیص کا کمرہ
۳۔ انتظار کا کمرہ
۴۔ کتب خانہ اور دارالمطالعہ
۵۔ کھیل کا کمرہ
۶۔ دفتر

یہاں بھی مختلف مالی حالات کے پیش نظر اس مجوزہ عمارت میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے مثلاً ایک ہی کمرہ کو انتظار، دارالمطالعہ اور کتب خانہ وغیرہ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ادارے کا سامان

بچوں کی رہنمائی اور علاج کے فرائض کو کامیابی سے ادا کرنے کے لیے اس ادارے کو طرح طرح کے ساز و سامان کی ضرورت پڑتی ہے۔ عام دفتری سامان کے علاوہ بچوں کے اعمال نامے، نفسیاتی آزمائشیں، یک طرفہ پردہ، کھلونے، پالتو جانور وغیرہ کسی ادارے کے ساز و سامان کے چند ضروری اجزا ہیں۔

ادارے کے سامان کا سب سے اہم حصہ فنی کتابیں اور رسالے ہیں۔ کسی معقول ادارے میں مندرجہ مضامین پر کتابوں اور رسالوں کا موجود ہونا بہت ضروری ہے۔

۱۔ بچوں کی نفسیات
۲۔ فنِ پیمائش
۳۔ ذہنی آزمائشیں۔

آموزش

۴۔ بچوں کی نشوونما

۵۔ فنی رہنمائی کے اصول اور طریقے

۶۔ دماغی امراض کی تشخیص اور علاج

۷۔ معالجاتی تعلیم

۸۔ خصوصی تعلیم

۹۔ معاشرتی کام کے اصول اور طریقے۔

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ہر ادارے میں مذکورہ بالا سامان میں سے ہر شے کا لازمی طور پر موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔ مالی دقتوں کی وجہ سے سامان کی اس طویل فہرست میں حسب ضرورت ترمیم و تخفیف کی جا سکتی ہے۔

ادارے کا کام

رہنمائی کے ادارے کے کام کے دو بنیادی پہلو مندرجہ ذیل ہیں:۔

ا۔ تشخیصی پہلو

ب۔ معالجاتی پہلو

فرض کیجیے کہ اس ادارے میں ایک ایسا بچہ آتا ہے جس نے شرارتوں سے گھر اور مدرسہ میں ہر ایک کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ وہ ہر ایک سے خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا ہو۔ جماعت میں شرارتی سرگرمیوں میں ہر دم مصروف رہتا ہو۔ گھر کے سب افراد اس سے نالاں ہوں وغیرہ۔ جب اس قسم کا شرارتی بچہ کلینک میں لایا جاتا ہے تو عملہ اس کی تکلیف کے اسباب و علل سمجھنے کی کوشش میں منہمک ہو جاتا ہے۔ معالج امراض دماغی اس بات کا پتہ لگاتا ہے کہ بچے کی تکلیف میں اس کی جسمانی حالت کہاں تک دخل ہے۔ معاشرتی کارکن بچے کے گھر اور متعلقہ حالات کا مکمل جائزہ مرتب کرنا شروع کرتا ہے۔ وہ اس بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے کہ مختلف گھریلو حالات کو بچے کی مشکل کر... میں کہاں تک دخل ہے۔ ماہر نفسیات اپنے خصوصی فنی طریقوں اور مذکورہ بالا ماہرین فن کے فر...

کو انفی کی مدد سے بچے کی ذہنی کائنات کا مکمل خاکہ تیار کرتا ہے۔

تشخیص کا کام مکمل ہو جانے کے بعد معالجہ کا کام شروع ہوتا ہے۔ اگر بچے کی الجھنوں میں جسمانی یا جذباتی عناصر کام کر رہے ہوں تو ان کا مناسب علاج کیا جاتا ہے۔ معالج امراض دماغی جسمانی عناصر کا علاج کرتا ہے۔ علاج بذریعہ کھیل کا ماہر طرح طرح کے کھیلوں کے ذریعہ بچے کا جذباتی توازن بحال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ناساز گار گھریلو حالات کی شدت میں تخفیف کے لیے والدین کا تعاون حاصل کیا جاتا ہے۔ بسا اوقات ادارے میں ایک رہنمائی کانفرنس بھی منعقد کی جاتی ہے جس میں بچے کے والدین، اساتذہ، ماہر نفسیات، اور کلینک کا متعلقہ عملہ شامل ہوتے ہیں۔ ان سب افراد نے اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے بچے کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی ہے۔ رہنمائی کانفرنس میں یہ لوگ بچے سے متعلق اپنے مشاہدوں، تجربوں اور خیالوں کا باہمی تبادلہ کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے تعاون کر کے بچے کی رہنمائی کے مؤثر ذرائع تجویز کرتے ہیں۔ بچے کی رہنمائی کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ اپنی الجھن سے مکمل طور پر نجات حاصل نہیں کر پاتا۔

مالی دقتیں اور چند متبادل تجاویز

مالی دشواریوں کے پیش نظر ہر مدرسہ میں بچوں کی رہنمائی کے اس باضابطہ ادارے کا قیام اگر مشکل نظر آتا ہو تو درج ذیل متبادل تجاویز پر غور کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ بہت سے مدرسے متحد ہو کر ایک ادارہ قائم کریں جس کی خدمات سے ان تمام مدارس کے بچے استفادہ کریں۔

۲۔ مدرسہ کے آس پاس اگر رہنمائی کا کوئی ادارہ ہے تو اس کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

۳۔ والدین اور اساتذہ خود رہنمائی کے کام کی باضابطہ تربیت حاصل کریں اور اپنے آپ کو بچوں کی رہنمائی کا اہل بنائیں۔

بچوں کی رہنمائی کا خواہ کوئی بھی لائحہ عمل اختیار کیا جائے اس حقیقت سے کبھی بھی غفلت نہ برتنی چاہیے کہ رہنمائی کی تنظیم پر سرمایہ اور محنت صرف نہ کرنے سے بچوں کے بگڑنے کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔ اس صورت میں اساتذہ، والدین اور ساری قوم کو بعد میں کئی گنا زیادہ محنت اور سرمایہ صرف کرنا پڑتا ہے۔

کتب حوالہ:۔ جدید تعلیمی نفسیات۔ بچوں کی رہنمائی۔ بچوں کی تربیت۔ بچوں کی نفسیات"

امتحانی مسائل اور ان کا حل

محمد صدیق احمد لیکچرر۔ گورنمنٹ ایوملیوٹرز کالج۔ لائل پور

بزرگوں سے سنا تھا کہ کسی کو امتحان میں نہ ڈالئے" لیکن اس دنیا میں قدم قدم پر امتحانات سے واسطہ پڑا۔ اور یہ چکر ایسا چلا کہ اب تک اس سے چھٹکارا نہ مل سکا۔ چھوٹے تھے تو یہ مصرع اکثر بچوں کو گاتے ہوئے سنا کرتے تھے۔ ؏

ہے امتحاں سر پہ کھڑا محنت کرو محنت کرو

جب بڑے ہوئے تو اکبر الہ آبادی کا یہ شعر پڑھتے اور سر دھنتے رہے ؎

بے پاس کے تو سانس کی بھی اب نہیں ہے آس
موقوف شادیاں بھی ہیں اب امتحان پر

آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ امتحانات سے مفر نہیں۔ اس کو لازمی قباحت کے طور پر طوعاً و کرہاً قبول کرنا ہی پڑا۔

برصغیر ہندو پاکستان کے نظامِ تعلیم میں امتحانات کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہاں پر امتحانات کا مقصد چند سندات اور ڈگریاں حاصل کر کے ان کو ملازمت کا وسیلہ بنانا ہی ہے۔ تعلیم اور امتحانات کی افادیت کو محض تحصیل معاش تک محدود کر دینے کا انجام ان تمام خرابیوں اور برائیوں کی صورت میں رونما ہوا، جو اس وقت ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔

آج کل صورت حال یہ ہے کہ امتحانات کا ایک نا ختم سلسلہ جاری ہے۔ ابتدائی جماعتوں سے لے کر اعلیٰ ثانوی اور ڈگری کی جماعتوں کے امتحانات ہر سال ہوتے رہتے ہیں جن میں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ ناکام ہوتے ہیں۔ ان کی جو حالت ہوتی ہے وہ تو ظاہر ہے۔

سب سے خراب حالت اُن طلبہ کی ہوتی ہے جو تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوتے ہیں۔ وہ گھر گھاٹ کہیں کے نہیں رہتے۔ ان کا امتحان پاس کرنا نہ کرنے کے برابر ہو جاتا ہے۔ نہ وہ کسی کالج میں داخل ہو سکتے ہیں نہ انھیں کوئی ملازمت مل سکتی ہے۔

امتحانات اور درس و تدریس کے درمیان دوعملی کا مظاہرہ جاری ہے۔ کچھ امتحانات درسی ادارے لیتے ہیں، دیگر امتحانات ثانوی بورڈ اور یونیورسٹیاں لیتی ہیں۔ اس ردعمل کے نتیجے میں امیدوار بیچارے چکّی کے پاٹوں کے درمیان پسے جا رہے ہیں۔ ان کا وقت اور روپیہ دونوں ضائع ہو جاتے ہیں۔ امتحانات اور نتائج کے اعلانات کا درمیانی وقت بے کار ضائع ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں طلبہ کو کئی مضامین میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اگر کوئی امیدوار ان میں سے کسی ایک میں فیل ہو جائے تو اس کا سال خراب ہو جاتا ہے اگلے سال اگر وہ اس مضمون میں پاس ہو جائے اور کسی دوسرے میں فیل ہو جائے تو بھی وہ ناکام کہلاتا ہے۔ بقول پطرس۔ یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ وہاں ہر مضمون میں بیک وقت پاس ہونا لازمی ہے؟

ان امتحانات کا معاشی پہلو بھی غور کے قابل ہے۔ کیا غریب والدین ان تمام اخراجات کے متحمل ہو سکتے ہیں جو امتحانات کی بڑی بڑی فیسوں اور کتابوں کی قیمت کے سلسلے میں انھیں برداشت کرنا پڑتے ہیں؟ کیا یہ قومی دولت کا ضائع کرنا نہیں ہے؟ نویں جماعت سے لے کر دسویں، فرسٹ ایئر سیکنڈ ایئر، انٹرمیڈیٹ اور پھر بی اے کے تینوں سالوں کے امتحانات کی فیسوں اور کتابوں کی قیمتوں کا بار غریب تو غریب امیر بھی آسانی سے برداشت نہیں کر سکتے۔ اس طرح کوئی غریب مگر ذہین و محنتی طالب علم کس طرح تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکتا ہے؟ کیا یہ ظلم اور ناانصافی نہیں ہے۔

اب رہا امتحانات میں پرچے مرتب کرنے اور کاپیاں جانچنے کا طریقہ یہ بھی مختلف قسم کی خامیوں سے بھرا ہوا ہے۔ پرچے طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کا خیال رکھے بغیر مرتب کیے جاتے ہیں کچھ اہم سوالات بار بار دہرائے جانے کی وجہ سے طلبہ میں گیس پیپرز اور نوٹس وغیرہ کی بدعت

شروع ہو جاتی ہے اور سمجھنے کی بجائے رٹنے پر انحصار کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح تعلیم کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور طلبہ کی ذہنی اور دماغی نشو و نما میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ سوالات لمبے ہونے کی وجہ سے اور کچھ مندرجہ بالا خرابیوں کی بنا پر طلبہ نقل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ نگرانی اور سزا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ نوخیز طلبہ کو اوائل عمر میں ہی جرائم کی طرف مائل کرنا پھر انھیں سزا دیکر جرائم کا عادی بنا دینا نہ تو اخلاقاً ہی درست ہے نہ انصاف ہی پر مبنی ہے۔

کاپیاں جانچنے کے لیے یونیورسٹی یا ثانوی بورڈ کچھ ممتحن مقرر کرتا ہے۔ درسی اداروں میں اساتذہ یہ کام سرانجام دیتے ہیں۔ یہاں پر بھی طلبہ سے انصاف نہیں ہوتا۔ جہاں تک درسی اداروں کے اساتذہ کا تعلق ہے ان کے خیال میں چند طلبہ باقی تمام طلبہ سے بہتر ہوتے ہیں، وہ ہر مرتبہ انھی طلبہ کو اچھے سے اچھے نمبر دیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تب بھی مختلف اساتذہ ایک ہی سوال کے جواب پر اپنے اپنے خیال کے مطابق نمبر دیتے ہیں۔ کچھ ممتحن فطرتاً نرم دل ہوتے ہیں۔ وہ جی کھول کر نمبر دیتے ہیں۔ اور کچھ سخت قسم کے ممتحن بڑی کاٹ چھانٹ کے بعد تھوڑے سے نمبر ملا پڑھا دیتے ہیں۔ یونیورسٹی یا بورڈ کے امتحان میں یکساں معیار قائم رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ نمبر دیتے وقت ممتحن کا اپنا مزاج اور اس ماحول اور صورت حال کا اثر بھی پڑتا ہے جن سے کوئی ممتحن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ مثلاً ایک ممتحن اپنی بیوی سے لڑ کر کاپیوں پر نمبر لگاتا ہے تو عین ممکن ہے کہ وہ اپنا غصہ امیدواروں پر اتارے۔ یہ بات تمام ماہرین نفسیات تسلیم کرتے ہیں کہ ممتحن چاہے کتنی ہی کوشش کریں امیدواروں کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں، میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں ۱۹۵۰-۵۱ء میں بی۔ٹی کلاس میں زیر تربیت تھا۔ششماہی امتحانات میں تاریخ کے پرچے میں مجھے ایک پروفیسر صاحب نے سو میں سے پینسٹھ نمبر دیے۔ اسی پرچے کو جب دوسرے پروفیسر صاحب نے دیکھا تو فرمانے لگے یہ چالیس نمبروں سے زیادہ کا نہیں تھا۔ اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ کاپیاں جانچنے کا یہ طریقہ کہاں تک درست ہے۔

ہمارے یہاں ایک رسم چل نکلی ہے اور وہ ہے اہل مغرب کی اندھی تقلید۔ یہ رسم اگر ایک طرف مفید ہے تو دوسری طرف ضرر رساں بھی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مغرب کے تمام افکار غلط ہیں۔ بلکہ یہاں سوال صرف سوجھ بوجھ کا ہے۔ ظاہر ہے کہ امریکہ اور یورپ جیسے حالات ہمارے ملک کے نہیں۔ ہماری کچھ روایات ہیں، ان سے بیک وقت دست بردار ہو جانے سے نہ ہم دین کے رہیں گے نہ دنیا کے۔ اسی اہل مغرب کی اندھی تقلید اور غلامانہ ذہنیت نے ہمیں پستی کے گہرے گڑھے کے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم سنبھل جائیں۔ ہمیں آزادی حاصل کیے چند سال گزر چکے ہیں لیکن غلامانہ ذہنیت جوں کی توں قائم ہے۔ امتحانات کا موجودہ نظام ہمیں انگریزوں کی میراث کے طور پر ملا ہے۔ اب ہم اپنے نظام تعلیم و امتحانات میں مفید تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں اور ایسا نظام تعلیم ترتیب دینا چاہتے ہیں جو ہماری قومی امنگوں کے عین مطابق ہو اور جو ہمیں ترقی کی منزل کی طرف گامزن کرنے میں مدد دے سکے۔

امتحانات کے نظام میں اب تک کوئی قابل ذکر اصلاح نہیں ہو سکی ہے۔ صرف اتنا کیا گیا ہے کہ بی۔ اے تک بجائے تین امتحانات کے سات امتحانات پاس کرنے لازمی قرار دے دیئے گئے ہیں۔ اس طرح مسئلہ سلجھنے کی بجائے اور الجھ کر رہ گیا ہے۔ اساتذہ غیر ممالک سے برآمد کیے جا رہے ہیں۔ نئی قسم کے امتحانات جو امریکہ اور یورپ میں رائج ہیں۔ ملک میں ان کا تجربہ کیا جا رہا ہے کیا یہ اندھی تقلید نہیں؟ میرے خیال میں اس طریقہ پر عمل کرنے سے نہ صرف وقت ضائع ہوگا، بلکہ قومی دولت بھی بے کار ہوگی۔ میری رائے میں امتحانات کا سلسلہ ہی سرے سے ختم کر دینا چاہئے۔ اور اس کام کو پڑھانے والے اساتذہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ پڑھانے والے اساتذہ کا تعلق براہ راست طلبہ سے ہوتا ہے۔ وہ ان کی خامیوں سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ وہ تمام سال ان کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ وہ ان کی مشکلات کو جانتے ہیں۔ اس لیے یہ جاننا کہ طالب علم کا علمی معیار کیا ہے اساتذہ کا کام ہے۔

سب سے پہلے طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کا نفسیاتی تجزیہ کسی ماہر نفسیات سے کرانا چاہیے۔

اور اس کی رپورٹ کی روشنی میں طلبہ کو مختلف شعبوں میں تربیت دی جانی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے مختلف شعبوں کے سکول الگ الگ کھولے جانے چاہئیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی طالب علم انجینئرنگ سے شغف رکھتا ہے تو اس کے لیے انجینئرنگ کی تعلیم کا انتظام ابتدا سے ہی کرنا چاہیے۔ اسی طرح ڈاکٹری، آرٹ اور دیگر فنون کے لیے جدا جدا سکول ہونے چاہئیں۔ جہاں بہترین اور ماہر فن اساتذہ کا تقرر ہونا چاہیے تاکہ وہ طلبہ کی صحیح طور پر نگرانی اور رہنمائی کر سکیں۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلبہ کو تمام سال فرداً فرداً نظر میں رکھیں، ان کے مسائل کو سمجھیں اور ان مسائل کے حل میں طلبہ کی مدد کریں۔ جب انھیں یقین ہو جائے کہ طالب علم مطلوبہ معیار تک پہنچ چکے ہیں تو انہیں اگلی جماعت میں ترقی دیدیں۔

جہاں تک پرائیویٹ تعلیم کا تعلق ہے اس کا موجودہ شکل میں بالکل بند ہو جانا بہتر ہے اس کے بجائے گورنمنٹ کی نگرانی میں شبینہ سکول اور کالج کھولے جائیں۔ جہاں پر بالکل انہی بنیادوں پر تعلیم دی جائے جیسی کہ دن کے سکولوں میں دی جاتی ہو۔ یہاں پر بھی امتحانات کا نہ ہونا بہتر ہے۔

اب رہے NEW TYPE TEST تو عرض ہے کہ یہ صرف ابتدا میں داخلے کے وقت طلبہ کے ذہنی معیار کے جانچنے میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان کو ہر درجے اور ہر جماعت میں بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ ثانوی یا اعلیٰ جماعتوں میں تو یہ آزمائشیں محض مذاق بن کر رہ جاتی ہیں۔ ایم۔ ایڈ کے دوران میں نے اکثر ساتھیوں کو ایسا امتحان دے کر ان کا مذاق اڑاتے ہوئے سنا ہے جس امتحان کا طلبہ خود مذاق اڑائیں اس کی افادیت معلوم۔ غرض کہ اگر ایک طرف قدامت پرستی اور تعصب کو لپیٹ دینا ضروری ہے تو دوسری طرف یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ ہم آنکھیں بند کر کے غیروں کے بنائے ہوئے راستے پر چل پڑیں۔ ہمیں ہر کام سوچ سمجھ کر اور اس کے نتائج پر غور کر کے کرنا چاہیے۔

میں جانتا ہوں کہ یہ عبوری دور ہے۔ اتنی بڑی انقلابی سکیم پر عمل کرنے کے لیے بڑے سرمائے، وقت اور تحمل کی ضرورت ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ روم ایک دن میں تیار نہیں ہوا تھا تو یہ بھی اتنا ہی

بست ہے کہ روم کی تعمیر میں وقت اور سرمایہ دونوں ہی خرچ ہوئے تھے۔ اور اِس کے باشندوں کی ان تھک کوششوں اور محنت کی بدولت وہ روم عالمِ وجود میں آیا جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ حکومت کے مالی وسائل یقیناً محدود ہیں۔ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کی بھی خواہشمند ہے۔ وہ ایک ساتھ ایسے سکول اور کالج تعمیر نہیں کر سکتی جیسے اوپر بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ بھی مناسب نہیں کہ طلبہ کی مشکلات میں کمی کرنے کی بجائے انھیں اور بڑھا دیا جائے۔ اور تین سال کی بجائے سات سال تک مسلسل ہر سال امتحان دے کر قوم کے نونہالوں اور اِن کے والدین کو ان گنت مشکلات میں مبتلا کر دیا جائے۔ اِس طریقۂ امتحان اور اِس اصلاح سے تو وہی پرانا نظامِ امتحانات بہتر تھا جس میں تمام خامیوں کے باوجود قومی سرمایہ اور وقت کا ضیاع تو اتنا نہیں ہوتا تھا جتنا اب ہو گا۔

ممکن ہے کہ کسی کو میرے خیالات سے اتفاق نہ ہو۔ بہر حال میں دعوتِ فکر دے رہا ہوں۔ امید ہے کہ ماہرینِ تعلیم اور حکومت ان مسائل و مشکلات کا (جن کا میں نے ذکر کیا) کوئی مناسب حل نکالنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ میں آخر میں اپنے بے باکانہ طرزِ بیاں اور تلخ باتوں کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔ امید ہے کہ اربابِ نظر چشم پوشی سے کام لیں گے اور فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے معاف فرمائیں گے۔ میں یہ امید کرتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی صاحب میرے اِس چھوٹے سے مضمون میں جو مسائل اور مشکلات بتائی گئی ہیں ان کے واسطے کچھ مناسب تجاویز سے مجھے اور قوم کو مستفید فرمائیں گے۔

بچے کا سکول سے رابطہ اور اس کے نتائج

چوہدری بشیر احمد

مدرسہ ایک ایسی جگہ ہے جس میں بچے کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور جمالیاتی نشوونما ہوتی ہے۔ لیکن یہ مقصود اس وقت ہی حاصل ہو سکتا ہے جبکہ بچے میں ایسا رجحان پیدا کیا جائے جس سے بچہ مدرسہ کو "اپنا" خیال کرنے لگے اور مدرسہ کے دوسرے بچوں سے پوری طرح مانوس ہو جائے۔ مندرجہ ذیل باتیں ہیں جو بچے میں یہ رجحان پیدا کرتی ہیں۔

(۱) عمدہ تدریسی کام

اسکول سے دلچسپی اور لگاؤ پیدا کرنے کا سب سے اہم ذریعہ تدریسی کام ہے۔ جب تک مدرسے میں تدریس عمدہ نہیں ہوگی طلبہ کا سکول سے رابطہ استوار نہ ہوگا۔ مدرس کو چاہیے کہ وہ اپنی تدریس کے دوران میں ایسے موثر انداز سے کام لے جس سے طلبہ پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر اساتذہ محنت اور مستعدی سے اسباق پڑھانے لگے تو بچوں میں ایسا ذوق پیدا ہوگا اور کوئی بچہ اپنے مدرسین کی محنت اور اپنے سکول کو کبھی بھولنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

۲۔ اساتذہ کا تعاون

اسکول میں اساتذہ کا آپس میں تعاون نہایت ضروری ہے۔ اساتذہ کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک ٹیم کی طرح کام کریں۔ ایک دوسرے کی ذمہ داریوں اور حقوق کا خیال رکھیں۔ ان کا یہ عملی نمونہ سکول سے دلچسپی پیدا کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔ اساتذہ کا طلبہ کے ساتھ بھی میل ملاپ ضروری ہے۔ تاکہ طلبہ

یہ سمجھنے لگیں کہ اساتذہ اور ہم دونوں ایک ہی معاشرے کے فرد ہیں۔

۳۔ تدریسی زندگی

سکول میں تدریسی پروگرام ایسا ہو جس سے طلبہ خوش ہوں۔ ہر طالب علم کو اس کے ذوق کے مطابق کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ ہنر سے دلچسپی رکھنے والوں کو اپنے فنونِ عملی میں کام کرنے کے مواقع ملیں اور مطالعہ کے شوقین طلبہ کو مطالعہ کے مواقع ملیں۔ اس لیے سکول میں لائبریری کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا جائے۔ کبھی کبھی مدرسہ سے باہر تعلیمی سیر کا پروگرام بھی ہو۔ سکول کا ماحول بہتر ہو تاکہ طلبہ اسے قید خانہ نہ خیال کریں۔

۴۔ سکول کے معاملات میں بچوں کا حصّہ

بچے کو سکول کے معاملات میں حصّہ لینے کے مواقع دینے چاہئیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اگر وہ کوئی اچھا کام کریں تو اس کی داد دینی چاہیے۔ ان کو انعامات دیئے جائیں۔ انعام سرٹیفکیٹ کی صورت میں ہوں تو بہتر ہوگا۔ ایسے حالات میں جبکہ بچے کو سکول کے معاملات میں حصّہ لینے دیا جائے گا تو وہ خود بخود سکول سے دلچسپی لیں گے اور اس پر فخر و ناز کریں گے۔

۵۔ اساتذہ اور طلبہ کا مشترکہ کام

سکول میں ایسے مشاغل اور منصوبے بھی ہونے چاہئیں جن میں اساتذہ اور طلبہ مل کر حصّہ لے سکیں، مثلاً کھیل کے میدان میں، سکول کی صفائی، تعلیم بالغاں وغیرہ۔ کام میں کامیابی اس وقت ہی ہوگی جب استاد کام میں پوری دلچسپی لے اور بحیثیت دوست کام کرے۔ اس طرح سے سکول کی یاد طلبہ کے دلوں میں ہمیشہ رہے گی۔

۶۔ باہمی تعاون والے مشاغل کا اجراء

سکول میں ایسے مشاغل کو فروغ دیا جائے جس سے تعاون باہمی اور اتحاد پیدا ہو۔ مثلاً سکول کا اپنا رسالہ جاری کیا جائے۔ اس رسالہ میں اساتذہ اور طلبہ کے مضامین شائع کیے جائیں علاوہ ازیں اس میں سکول کی کارکردگی کا ذکر کیا جائے۔ میرے خیال میں چند مدارس میں رسالے

جاری کیے گئے ہیں۔ ان میں گورنمنٹ سنٹرل ماڈل ہائی سکول لاہور قابل ذکر ہے۔ میں دوسرے مدارس کے ہیڈ ماسٹر صاحبان سے درخواست کروں گا کہ وہ بھی اپنے اپنے سکول میں رسالہ جاری کرائیں۔ اور ان میں ایسے مضامین شائع ہوں جن سے طلبہ میں ثقافتی روح بیدار ہو۔

۷۔ مدرسے کا اجتماع

مدرسے کا اجتماع ضروری ہے۔ روزانہ یا ہفتہ میں ایک بار اجتماع کا ہونا لازمی ہے جس میں طلبہ کو تقاریر کرنے کا موقع دیا جائے۔ صدر معلم کو چاہیے کہ وہ اجتماع کے دوران میں اسکول کی کارگزاری کا ذکر کرے۔ ذہین بچوں اور اعلیٰ کھلاڑیوں اور سکول کے دیگر کاموں میں حصہ لینے والے بچوں کی ہمت افزائی کرے۔ اور سکول میں نئے طلبہ کو خوش آمدید کہے۔

۸۔ ظاہری علامتیں

سکول کی ایک مقررہ یونی فارم ہو اور ایک ایسا امتیازی نشان جسے بچہ اپنے کوٹ پر لگا سکے۔ سکول کا اپنا ترانہ ہو۔ کاپیوں وغیرہ کا سرورق (COVER) مخصوص رنگ کا ہو۔

۹۔ خصوصی منصوبے

اسکول میں ایسے مواقع مہیا کیے جائیں جن میں طلبہ مل جل کر کام کریں۔ مثلاً ڈراما۔ فوری طبی امداد۔ اسکاؤٹنگ۔ اسکول کا بینڈ۔ مکالمے۔ طلبہ ایسے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور ان میں سچی سکول سپرٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۰۔ اسکول کی آرائش

مدرسہ کی عمارت عمدہ ہو۔ کمرے صاف ستھرے اور ہوادار ہوں۔ کمروں میں فرنیچر موزوں ہو اور کمروں کی دیواریں، چارٹس اور نقشہ جات سے مزین ہوں۔ سکول میں مختلف قسم کے ماڈل رکھے جائیں سکول میں باغیچہ بھی ہو۔ یہ چیزیں سکول کو دلآویز اور طلبہ کے لیے یادگار بنا دیتی ہیں۔

نتائج

سکول کے لگاؤ سے بہت سے نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ اس میں جس قسم کا ماحول ہوتا ہے بچہ

جلد ہی اپنالیتا ہے کیوں کہ شروع عمر میں بچہ نقال ہوتا ہے۔ دراصل بچہ ایک ننھے سے پیڑ کی طرح ہے جسے جس طرف چاہا جھکالیا۔ لیکن بعد ازاں یہی پیڑ بڑا ہوکر ایسا سخت ہو جاتا ہے کہ اگر اس کی ٹہنیوں کو جھکانے کی کوشش کی جائے تو وہ ٹوٹ جاتی ہیں۔ بعینہٖ یہی مثال بچے کی ہے۔ اگر شروع میں اس کی تربیت اچھی ہوگی اور بہتر ماحول میں رکھا جائے گا تو وہ آئندہ زندگی میں کامیاب رہے گا۔ محکمہ تعلیم کے قابل افسران معائنہ کے وقت ننھے ننھے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دیتے ہیں۔ اور سکول میں خوش گوار ماحول پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اگر سکول کی فضا صفیدا اور خوش گوار بنادی گئی تو یقین ہے کہ طلبہ ہمیشہ اساتذہ اور سکول کو یاد کریں گے وہ اپنے مدرسہ پر فخر کریں گے اور اس کی شہرت کو چار چاند لگائیں گے، کمرۂ تعلیم ہو یا کھیل کا میدان ہو۔ وہ اپنے ساتھیوں کو داد دیں گے۔ علاوہ ازیں وہ سکول کے جلسوں میں شرکت کریں گے اور سکول کی شہرت کا باعث بنیں گے۔ استاد اور طالب علم میں گہرا رشتہ قائم ہو جائے گا۔ طلبہ سکول میں اور اس کے باہر بھی استاد کو اپنا راہ نما سمجھیں گے اور اس کی عزت کریں گے۔ علاوہ ازیں استاد اور طلبہ کے مل جل کر کام کرنے سے یک جہتی پیدا ہوتی ہے۔ مدرسہ کے زمانے میں یہ عادت پختہ ہو جاتی ہے اور آخر بڑے ہو کر ملک و قوم کی خدمت پر منتج ہوتی ہے۔

ضبط پر اثر

ان تدابیر کا ضبط پر کافی اثر پڑتا ہے۔ اسکول میں بدنظمی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اگر بچے مدرسے کی عمارت پر فخر کریں گے تو وہ اس کی دیواروں، دروازوں، کھڑکیوں اور روشندانوں کو خراب کرنے سے باز رہیں گے اور ان کی حفاظت کریں گے۔ کھیل کے میدان میں گندگی وغیرہ نہیں پھیلائیں گے۔ وہ کھیل کے سامان کی حفاظت کو اپنا فرض جانیں گے۔ لائبریری میں دوران مطالعہ کتابوں کو ضائع کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ سائنس لیبارٹری میں سائنس کے سامان کو توڑنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ وہ سکول کے باہر سکول کے بارے میں نکتہ چینی برداشت نہیں کریں گے اور بہ وقت اس کی شہرت کے خواہاں ہوں گے۔ اور اپنی بیرونی زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کریں گے۔

جس سے مدرسہ کی بدنامی ہو۔

سکول سپرٹ کا طلبہ پر ایک یہ اثر بھی ہوتا ہے کہ وہ سکول کی عزت کی خاطر محنت و مستعدی سے تعلیم حاصل کرتے ہیں تاکہ وہ مختلف امتحانات میں وظائف حاصل کریں اور سکول کا نام روشن ہو۔ علاوہ ازیں وہ کھیل کے میدان میں مدرسے کی ناموری کی خاطر جان لڑا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس سکول کے طلبہ میں مندرجہ بالا دونوں صفات پائی جاتی ہوں وہ تعلیم اور کھیل دونوں میں عزت اور شہرت حاصل کرے گا۔ لیکن یہ سکول سپرٹ اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ سکول کا ماحول خوشگوار ہو۔ میں اساتذہ کرام اور ان صاحبان سے جو ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں درخواست کروں گا کہ وہ طلبہ کے لیے مدارس میں اعلیٰ ماحول پیدا کریں تاکہ وہ اساتذہ اور سکول کی عزت کا باعث بن سکیں۔

⁂

بچوں کے احساسات

صوفی گلزار احمد

پیدائش کے فوراً بعد بچے میں احساسات کی ابتدا ہوتی ہے اور پھر یہ بدستور پھیلتے پھولتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ احساسات ہی ہمارے تمام تجربات اور علم کی بنیاد ہیں۔ ان احساسات کی مدد سے ہم خارجی دنیا کا تمام علم حاصل کرتے ہیں۔ اور اپنے گردوپیش کے حالات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اگر بچے کو فطرت کی طرف سے حواس خمسہ عطا نہ ہوتے تو وہ ان احساسات سے محروم رہتا۔ اور اس کے علم میں کبھی اضافہ نہ ہوتا۔ ان احساسات کی پختگی کے ساتھ ساتھ شخصیت میں بھی پختگی پیدا ہوتی ہے۔ چناں چہ شخصیت کی تعمیر میں احساسات کی اہمیت نمایاں اور واضح ہے یہی وجہ ہے کہ نفسیات اور تعلیمات کے ماہرین نے احساسات کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے جہاں تک بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی شخصیت کی متوازن اور صحیح پرورش کا تعلق ہے احساسات کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہی وہ بنیاد ہے جس پر شخصیت کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ آیئے ہم اس ضمن میں بچوں کے احساسات کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ تعلیم و تربیت کے سلسلے میں احساسات کتنے ضروری ہیں اور شخصیت کی تعمیر میں ہمارا کتنا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں پیدائش کے فوراً ہی بعد بچے میں احساسات کی ابتدا ہوتی ہے سب سے اول بچے میں بھوک کا احساس بڑی شدت سے رونما ہوتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی کھانے پینے کی خواہش کرتا ہے اور اس کے اظہار کے لیے چیخنا چلانا شروع کر دیتا ہے اور جب تک اس کے اس احساس کی تسکین نہ ہو جائے وہ چیختا چلاتا اور مضطرب رہتا ہے۔ بھوک کے احساس کے علاوہ بچے میں مختلف احساسات کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً بصری۔ صوتی۔ لمسی اور حرکی احساسات وغیرہ۔

لمس کے احساسات اگرچہ پیدائش کے وقت بچے میں موجود نہیں ہوتے۔ لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ پیدائش کے کچھ دن بعد یہ احساس نمایاں اور واضح صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بچے کا سر اور ہونٹ اس لحاظ سے بڑے حساس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مائیں یا دایہ بچوں کو آرام اور سہولت پہنچانے کی خاطر ان کے سر کو تھپکتی رہتی ہیں۔ اس طرح کرنے سے ننھے بچوں میں یہ احساس جلد بیدار کیا جا سکتا ہے اسی حس کی مدد سے ماں بچے کو ہمدردی اور الفت کی دولت بخشتی ہے

بصری احساسات بچے میں پیدائش کے فوراً بعد شروع ہو جاتے ہیں۔ بچہ گردوپیش کی اشیا کو دیکھتا اور ان سے مانوس ہونے لگتا ہے۔ اگرچہ بچہ اشیا کو دیکھتا ہے اور روشنی سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن اسے مختلف اشیا کے قرب و بعد کے متعلق بالکل علم نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ دو ڈھائی سال تک یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ فلاں چیز قریب ہے یا دور۔ چنانچہ اکثر بچوں کو چاند پکڑتے دیکھا گیا ہے۔ اسی طرح وہ دیگر اشیا کو بھی پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں، دیکھنے بھالنے کی قوت میں پختگی ذرا دیر کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ جہاں تک روشنی کا تعلق ہے۔ بچہ روشنی سے متاثر ہوتا ہے۔ تیز اور چمکدار روشنی اس کی توجہ بڑی جلد اپنی طرف منعطف کر لیتی ہے اور وہ اسے دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے۔

بصری احساسات کی مانند صوتی احساسات بھی بچوں کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ آپ اس واقعہ سے لگا سکتے ہیں کہ بچہ مختلف قسم کی آوازوں سے بہت جلد متاثر ہوتا ہے۔ جس طرف سے آواز آ رہی ہو فوراً اس طرف کان کھڑے کر لیتا ہے اور چوکنا ہو جاتا ہے۔ بڑی چستی اور بیداری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مشاہدہ سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ بچہ روشنی کی نسبت آواز سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ اکثر اوقات اونچی آوازوں سے خوف زدہ بھی ہو جاتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے بچوں کو اس قسم کے ہیجانات سے بچانا چاہیے۔ ورنہ یہ ڈر ہے کہ کہیں خوف ان کے لاشعور میں نہ دب کر رہ جائے۔ اکثر والدین بچوں کو اونچی آوازوں سے ڈراتے دھمکاتے ہیں ایسا کرنا بچوں کو ڈرپوک اور بزدل بناتا ہے جو ان کی آئندہ زندگی کے لیے مہلک ہے۔

بچوں میں حرکی احساسات بھی بیدار رہتے ہیں۔ حرکی احساسات سے بچہ جسمانی اعضا کی

حرکات و سکنات کا علم حاصل کرتا ہے اور اسے ہر لمحہ اپنی معمولی سی حرکت کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ وہ جگہ کی ہمواری اور ناہمواری کو بڑی ہی جلدی محسوس کرتا ہے۔ آپ ذرا کسی بچے کو ناہموار جگہ پر بٹھا دیں تو پھر دیکھیے کہ وہ ان احساسات سے کتنی جلد آگاہی حاصل کرتا ہے۔ وہ جلد ہی گرنے کے خوف سے مضطرب ہو جاتا ہے اور چیخنا چلانا شروع کر دیتا ہے۔ اکثر والدین اپنی بے علمی اور بے سمجھی کے باعث ایسا کرتے رہتے ہیں۔ وہ اسے کھیل تماشہ خیال کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کی بالکل خبر نہیں ہوتی کہ ایسا کرنا بچوں کی فطرت کے عین منافی ہے۔ بچے بہت جلد خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ خوف کے علاوہ ان میں غیر محفوظی کا احساس بھی ابھرتا ہے۔ یہ احساس ان میں خود اعتمادی کو ہمیشہ کے لیے زائل کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ بچہ دوسروں کا دست نگر ہو کر رہ جائے۔ جو آئندہ زندگی کی کش مکش کے پیش نظر نہایت ضرر رساں ہے۔

بچہ اور ماحول

جیسا کہ مذکورہ بالا امور سے ظاہر ہے کہ والدین ہی ننھے بچے کے ماحول کی تشکیل کرتے ہیں کیونکہ وہی اس کے قریب ہوتے ہیں۔ جوں جوں بچہ عمر میں بڑھتا ہے اس کے ماحول میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ اسکول پہنچتا ہے تو والدین کے علاوہ استاد بھی اسکی زندگی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ بچے کے احساسات اور جذبات کی نشوونما میں ماحول کا بہت حصہ ہے ماحول کا معمولی سا واقعہ یا تاثر ان کے ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر والدین بچے کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھیں اور اس کے ساتھ نرمی اور مروت سے پیش آئیں تو اس میں بھی نرمی اور ہمدردی کے احساسات ابھرتے ہیں اور وہ والدین کے ساتھ ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے۔ اس کے برعکس اگر والدین بچے کے ساتھ بے جا سختی کا رویہ روا رکھیں تو وہ ان کی ہر خواہش کو ٹھکرانے کا عادی بن جاتا ہے اور ان کے کسی حکم کی بھی تعمیل نہیں کرتا۔ بچے کے ساتھ ہمیشہ نرمی اور مروت کا برتاؤ ہی بہتر رہتا ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ آپس میں بھی خوش خلقی اور مروت کا برتاؤ روا رکھیں۔ اخلاق و آداب کا اعلیٰ معیار پیش کریں۔ اگر وہ بچے کے ساتھ غیر شستہ طور طریقے روا رکھیں گے۔ نرمی اور مروت کا

بتاؤ نہیں کریں گے تو بچے کی شخصیت بھی اسی طرح پروان چڑھے گا ان باتوں کے علاوہ اس کا دل بھی گھر سے اچاٹ رہے گا۔ اور وہ باہر کی دنیا میں ہی رہنا پسند کرے گا۔ اساتذہ کا بھی اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ نرمی اور الفت کا سلوک روا رکھیں تاکہ وہ اپنا وقار بھی قائم رکھ سکیں، اور بچوں کی بھی دل شکنی نہ ہو۔ بچوں کی تعلیمی کمزوریوں کو دور کرنے کا یہی ایک واحد ذریعہ ہے۔

سخت کلامی اور بے جا نکتہ چینی بعض والدین کی عادت بن جاتی ہے۔ بچے نے جو بات کہی اسے رد کر کے رکھ دیا۔ جو کام اس نے کرنا چاہا اُس کی مخالفت کی۔ غرض ایسا رویہ روا رکھا جس سے بچے کی دل شکنی ہو۔ اس رویے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے میں خود اعتمادی مفقود ہو جاتی ہے اور اس میں اپنی ذات کا احساس دب کر رہ جاتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں دوسروں کا دست نگر بن جاتا ہے اور آئندہ زندگی میں بھی یہ چیز کافی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بچے میں تحفظ کا احساس جاتا رہتا ہے اور وہ اپنی ذات کو تنہا خیال کرتا ہے۔ اس تنہائی سے وہ اکثر خوف زدہ بھی رہتا ہے۔ غرض یہ چیز ذہنی اُلجھن کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے جو بچے کی زندگی کو ناکام بنا دیتی ہے۔ والدین کا یہ فرض ہے کہ بچوں کے خیالات اور جذبات کی قدر کریں۔ وہ جو کچھ کہیں اسے غور سے سنیں۔ انہیں کچھ کام کرنے کی آزادی بھی دی جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں تاکہ بچے میں اپنی ذات کا احساس برقرار رہے۔ اور وہ اپنے بل بوتے پر کام کرنے کا عادی بن جائے۔ اگر کبھی کبھار بچوں سے کسی معاملے میں مشورہ بھی لے لیا جائے تو وہ زیادہ مؤثر ثابت ہو۔

بے مروتی اور بے جا سختی کا رویہ بچے میں احساس کمتری کو بھی جنم دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اور لوگوں کے مقابلے میں کم تر اور حقیر خیال کرنے لگتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ احساس کمتری کا بچوں میں پایا جانا ایک فطری امر ہے۔ لیکن کم تری کا شدید احساس ذہنی الجھنوں کا باعث بنتا ہے۔ اور وہ بچوں کی ذہنی نشو و نما کے لیے مضر ہے۔ کم تری کا یہ شدید احساس ان کی آئندہ زندگی پر بُری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہر معاملے میں اپنی ذات کو حقیر خیال کرتے ہیں اور زندگی کی کشمکش کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

دوسرے لوگوں کے روبرو بچوں کو برا بھلا کہنا اور انھیں کوسنا بھی احساس کمتری کو دعوت دینا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ بچوں میں بعض ایسی کمزوریاں بھی ہوتی ہیں جنھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایسی کمزوریوں کو دور کرنے کا یہ طریقہ بھی صحیح نہیں کہ انھیں دوسرے لوگوں کے سامنے منظر عام پر لایا جائے۔ اگر علیحدگی میں ہی بچے کی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ بہتر رہتا ہے اس کے علاوہ اگر موقع محل دیکھتے ہوئے ان کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ اکثر اوقات دوسرے لوگوں کے روبرو بچوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے "میرا بچہ کند ذہن ہے۔ کچھ نہیں جانتا" یا کبھی یہ الفاظ چست کیے جاتے ہیں۔ "ہمارا بچہ تو سب بچوں سے نرالا ہے اتنا شرارتی ہے کہ کبھی نچلا نہیں بیٹھتا اور اس پر کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔" اسی طرح کی اور باتیں ہم اکثر گھروں میں سنتے رہتے ہیں۔ والدین کو اس بات کی بالکل خبر نہیں ہوتی کہ ایسا کرنا بچوں میں کمتری کا شدید احساس ابھارتا ہے جو ان کی ذہنی نشوونما کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس کے علاوہ ان باتوں سے بچہ خود سر اور ضدی بن جاتا ہے اور وہ انتقاماً وہی کام کرتا ہے جس کام سے اسے منع کیا جائے۔ والدین کا فرض یہ ہے کہ وہ بچوں کی کمزوریوں کو موقع محل کے مطابق صحیح کریں تاکہ بچوں کی شخصیت کی متوازن تعمیر ہو سکے اور ان میں بری عادات پیدا نہ ہوں۔ تعلیمی لحاظ سے بھی یہ چیز سودمند ہے۔ اگر اساتذہ بھی بچوں کی تعلیمی کمزوریوں کو منظر عام پر لانے اور انھیں دوسرے بچوں کے روبرو پیش کرنے کی بجائے ان کی علیحدگی میں ہی موقع محل کے مطابق اصلاح کر دیا کریں تو زیادہ بہتر رہے۔ بچوں کی حوصلہ افزائی سے ہی ان کی تعلیم کا اعلیٰ معیار سونپا جا سکتا ہے۔ اگر ہم بچے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تو یہ سمجھ لیجیے کہ بچہ کبھی زندگی میں کامیاب نہیں ہوگا۔

افراد کے ساتھ ساتھ گھر کی چار دیواری کا اثر بھی بچے کے احساسات پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ اگر خوش قسمتی سے بچے کو پاک صاف اور خوب صورت ماحول میں رہنے کا موقع ملے تو بچے کے احساسات بھی اسی طرح متاثر ہوتے ہیں اور اس میں پاکیزگی اور نفاست پسندی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر بچے کو گندے اور غلیظ قسم کے ماحول سے واسطہ پڑے تو اس میں نفاست اور پاکیزگی کا

شائبہ تک بھی نظر نہیں آتا۔ بچے میں نفاست اور پاکیزگی پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب سے اوّل بچے کے گھر کا ماحول صاف ستھرا اور دل کش ہو۔ وہ ایک ایسے ماحول میں پرورش پائے جس میں کسی قسم کی گندگی اور غلاظت کا دخل نہ ہو۔ خود والدین کا بھی صاف ستھرا اور خوش پوش ہونا لازمی ہے۔ گھر میں مختلف قسم کی تصاویر اور مناظر کشی کے نمونے آویزاں کیے جائیں تو بہتر ہے تاکہ مجموعی طور پر ان چیزوں کا خوش گوار اثر پڑے۔ اِس طرح بچے کے سکول کے ماحول کا خوب صورت اور دل کش ہونا بھی ضروری ہے۔ سکول کی خوب صورت عمارت کے علاوہ اس کے اندر پاکیزگی اور صفائی بھی بے حد ضروری ہے۔ اِس کے علاوہ ایسی عمارت میں خوب صورت اشیا کی موجودگی بھی لازمی ہے۔ تاکہ بچہ ان تمام چیزوں کے مجموعی اثرات سے متاثر ہو اور اس میں نفاست اور خوب صورتی کا شوق پیدا ہو۔

احساسات اور تعلیم

مذکورہ بالا حقائق سے ظاہر ہے کہ شخصیت کی تعمیر میں ماحول نمایاں کام سرانجام دیتا ہے۔ جوں جوں بچہ عمر میں بڑھتا ہے۔ ماحول کی وساطت سے احساسات بڑھتے پھولتے ہیں اور شخصیت بھی پروان چڑھتی ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ شخصیت کی بہتر تعمیر میں والدین اور استاد کا بہت بڑا حصہ ہے اگر والدین اور اساتذہ احساسات کی آزمائش سے بچوں کے حسی تفاوت کا پتہ چلا لیں تو یہ بہت بڑا کام ہو کیوں کہ یہ بات مسلّم ہے کہ احساسات کے لحاظ سے بچے مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً بعض بچے رنگوں میں بڑی دل چسپی لیتے ہیں اور مختلف رنگوں میں بہ آسانی تمیز کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک ہی رنگ کے کم و بیش فرق کا بھی پتہ چلا لیتے ہیں۔ اِس طرح بعض بچوں کی حس سامعہ اتنی اچھی ہوتی ہے کہ وہ کسی راگ کی خاص طرز کو بجلدی یاد کر لیتے ہیں۔ اور بعض بچوں کی حس شامہ اتنی اچھی ہوتی ہے کہ وہ اچھی اور بُری خوشبو میں بہ آسانی تمیز کر سکتے ہیں۔ تعلیمی لحاظ سے ان کا یہ تفاوت نہایت اہم اور مفید ہے ایک بچہ جو رنگوں میں با سانی تمیز کر سکتا ہے اور ایک ہی رنگ کے کم و بیش تفاوت کا بھی پتہ چلا لیتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسے بچے میں ایک مصوّر یا نقاش بننے کی قدرتی صلاحیت موجود ہو اگر والدین اور اساتذہ بچے کے اِس احساس کو زیادہ قوی کر دیں تو کوئی عجب نہیں کہ وہ ایک اعلیٰ نقاش

اور معمولی ثابت ہو۔ اسی طرح جس بچے کی حس سامعہ اچھی ہو اس کو مختلف قسم کے سُروں کے زیروبم سمجھانا اور گانے کا ماہر بنا دینا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں۔

مانٹی سوری طریقۂ تعلیم

جیسا کہ ظاہر ہے کہ ہمارے علم کی بنیاد احساسات پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ماہرین تعلیم تعلیم و تدریس کے سلسلے میں احساسات پر زور دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں مانٹی سوری طریقۂ تعلیم خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اس طریقۂ تعلیم کی بانی مبانی مشہور و معروف میڈم مانٹی سوری ہیں۔ اس طریقۂ تعلیم کے پیش نظر بچوں کو مختلف چیزوں کے متعلق پڑھانا کبھی ٹھیک نہیں رہتا کیونکہ اس طرح ان کی معلومات قابلِ اعتماد اور پائدار نہیں ہوتیں بلکہ وہ غیر پائدار اور محدود رہ جاتی ہیں کیونکہ اس میں صرف حس سامعہ کو ہی دخل ہوتا ہے۔ چناں چہ ان کے علم اور معلومات کو قابلِ عمل بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختلف چیزیں بچوں کے ہاتھ میں دی جائیں تاکہ وہ ان کا غائر مطالعہ کریں۔ وہ ان کو دیکھیں، چھوئیں اور چکھیں۔ مثلاً ایک بچے کو آم یا نارنگی کے متعلق پڑھانا ہی صحیح نہیں، بلکہ ایسی چیز کو بچے کے روبرو پیش کرنا فائدہ مند ہے تاکہ وہ اسے ہاتھ میں لے کر دیکھے، چھوئے اور چکھے۔ اسی طرح دیکھو اور بولو کا طریقہ بھی ناکافی ہے کیونکہ اس سے صرف حس باصرہ کی مدد لی جاتی ہے۔ ایک مؤثر اور پائدار تعلیم وہی ہے جس میں ہر حس کا مناسب استعمال عمل میں لایا جائے۔ صحیح تعلیم کا مقصد بھی یہی ہے کہ بچوں کو مختلف رنگوں، مختلف قسم کے درختوں، پھلوں پھولوں، پرندوں اور جانوروں کے متعلق مکمل واقفیت کرائی جائے۔ اور ان کی ذات کو پورے طور پر ان کی طرف رجوع کرایا جائے۔ اس طرح گھر سے باہر خارجی دنیا کی دل چسپی بھی بڑھتی ہے، اور معلومات کے شوق میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

موجودہ زمانے کی تحقیقات سے یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ احساسات کی تربیت نہ صرف ضروری بلکہ از حد مفید ہے۔ ایک ماہر تعلیمات کے تجربے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ مختلف رنگوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت آٹھ دس سال تک ترقی پذیر رہتی ہے اور قدرت نے لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں کو یہ صلاحیت زیادہ عطا فرمائی ہے، اور ایک تجربے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ بارہ سال کی عمر تک حس سامعہ

بدستور بڑھتی ہے اور اس کی تربیت سے مفید نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

دیگر ممالک میں بچوں کے احساسات اور جذبات کی مناسب نشو ونما کے لیے کوشش جاری ہے تاکہ ان کی شخصیت بخوبی پروان چڑھ سکے۔ لیکن ہمارے ملک میں ابھی اس طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ حالاں کہ یہ وہ نازک مسئلہ ہے جس پر ملک کی تعمیر وترقی کا انحصار ہے۔ آج کے بچے ہی کل کے رہنما ہوں گے۔ اگر بچوں کے احساسات کی صحیح پرورش کی جائے اور ان کی مناسب نشو ونما کے بہترین مواقع مہیا کیے جائیں تو اُن کی شخصیت بخوبی پروان چڑھ سکتی ہے۔ جو ہماری آئندہ نسل کی تعمیر وترقی کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

سررشتۂ تعلیم مغربی پاکستان

صیغۂ رجسٹرال ———— شعبۂ دفتر

ای-۳۸۳۴ م۔ محمد رمان قائم مقام سٹینو ٹائپسٹ گورنمنٹ ٹریننگ کالج بہاولپور کو (جو فی الحال عارضی
۲۴ جولائی ۱۹۶۲ء طور پر لیڈی میکلیگن گورنمنٹ گرلز ہائی سکول لاہور میں متعین ہیں) تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر
م۔ انیس الاسلام کی جگہ (جو ۴ مئی ۱۹۶۲ء بعد دوپہر مستعفی ہو گئے اور م۔ مہربان خان
کی جگہ جن کا تقرر ہوا۔ لیکن حاضری کی نوبت نہیں آئی) قائم مقام سٹینو ٹائپسٹ کالج آف ہوم
اینڈ سوشل سائنسز گلبرگ لاہور مقرر کیا گیا۔

ای-۶۰۴۴ م۔ محمد رشید قائم مقام جونیئر کلرک دفتر انسپکٹر آف سکولز سرگودھا (جن کو گورنمنٹ گرلز ہائی
۱۲ جولائی ۱۹۶۲ء سکول چک نمبر آر۔بی ۲۴۲ لائلپور تبادلہ کا حکم ہوا تھا) تاریخ حاضری سے م۔ علی رضا
جعفری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام جونیئر کلرک دفتر انسپکٹرس آف سکولز
بہاولپور مقرر کیے گئے۔

ایضاً م۔ علی رضا جعفری۔ عارضی جونیئر کلرک دفتر انسپکٹرس آف سکولز بہاولپور کو تاریخ حاضری
سے اپنی تنخواہ پر م۔ محمد رمضان جونیئر کلرک کی جگہ (۸ اکتوبر ۱۹۶۲ء تک رخصت پر ہیں)
عارضی جونیئر کلرک گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ ماڈل سکول بہاول نگر مقرر کیا گیا۔

ان ایس ٹی-۲۰۷۰ جی م۔ محمد امین بٹ قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ کالج فار ویمن گجرات کو تاریخ حاضری سے ایک
د ۱۱۵ نئی آسامی پر جو سرکاری چٹھی ۲۱ - ۶/۲ IX .S.O مورخہ ۳۱/۴/۶۲ کے مطابق
۲ جولائی ۱۹۶۲ء ۶/۴۲ سے منظور ہوئی اپنی تنخواہ پر قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ گرلز ہائی سکول گوجرانوالہ
مقرر کیا گیا۔

ای/ایس-ڈی-۵۰/۱۱۰ — م۔ محمد حسین شاہین قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ گرلز ہائی سکول پنڈی بھٹیاں کو تاریخ حاضری
۲۰ جولائی ۱۹۶۲ء — سے ایک نئی آسامی پر جو سرکاری چٹھی نمبر ۶۱ - ۲۷/۶ - S.O.IX مورخہ ۱۱/۶/۶۲ کے
مطابق ۶۲/۶/۱ سے منظور ہوئی۔ اپنی تنخواہ پر۔ قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول تل ونڈی
موسیٰ خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ عبدالغفور کو جو م۔ محمد اکرم چشتی کے رخصت پر ہونے کے باعث ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف
سکولز گوجرانوالہ کے دفتر میں بطور جونیئر کلرک کام کر رہے ہیں ایک نئی آسامی پر جو سرکاری
چٹھی نمبر ۶۱ - ۶/۸ - S.O.IX مورخہ ۲۱/۶/۶۲ کے مطابق ۶۲/۶/۱ سے منظور ہوئی ہے
بشاہرہ -/۶۰ روپے ماہوار علاوہ الاؤنس (بپیمانہ تنخواہ ۶۰ — ۴ — ۱۰۰ —
۵ — ۱۲۰) عارضی جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

نوٹ نمبر۱ م۔ محمد امین بٹ کا نام لاہور ریجن کے جونیئر کلرکوں کی فہرست میں تاریخ حاضری
سے سب کے بعد لکھا جائے گا۔ اور وہ اس سروس کی بنا پر جو انہوں نے راولپنڈی ریجن میں
انجام دی ہے اگلے گریڈ میں ترقی کے مستحق نہیں سمجھے جائیں گے۔

نمبر۲۔ م۔ عبدالغفور کا تقرر محض عارضی ہے اور محدود سرکاری حلقوں کے فاضل عملے کی دستیابی
پر یا انتظامی امور کے پیش نظر ان کی خدمات وجہ بتائے یا نوٹس دیئے کے بغیر کسی وقت بھی
ختم کی جا سکتی ہیں۔

نمبر۳۔ م۔ محمد امین کو سفر الاؤنس نہیں دیا جائے گا۔

نمبر۴۔ یہ عہدیدار اس وجہ سے کہ ایک وقت خالی اسامی پر مقرر ہوئے ہیں۔ ملازمت میں
افضلیت (یا سینیورٹی) کے دعوے کا حق نہیں رکھتے ملازمین کی سینیورٹی کے مطابق ترتیب عمل میں
لائی گئی۔ اور اس طرح ان کی سینیورٹی متصور ہو گی۔

ای/۳۱/۳۵۰ — م۔ ممتاز علی سینئر لیبارٹری اٹینڈنٹ گورنمنٹ ہائی سکول ملتان کو تاریخ حاضری سے
۲۱ جولائی ۱۹۶۲ء — ایک نئی آسامی پر جو سرکاری چٹھی نمبر ۶۱ - ۸/۶ S.O.IX مورخہ ۲۱/۶/۶۲ کے مطابق

۲۲/۱/۲ سے منظور ہوئی ہے بحالہ ہر -/۷۰ روپے (پیمانہ تنخواہ ۷۰ - ۴ - ۱۰۰ - ۵ - ۱۲۰ حسب معمول الاؤنس اس کے علاوہ) گورنمنٹ گرلز ہائی سکول ملتان میں عارضی جونیر کلرک مقرر کیا گیا۔ یہ تقرر محض عارضی ہے جو کسی وقت بھی وجہ بتائے بغیر یا نوٹس دیئے بغیر ختم ہو سکتا ہے۔

ای/۷۰۵۲۰ — ۱۲ جولائی ۱۹۶۲ء — م۔ رب نواز (مستقل) سینئر کلرک دفتر انسپکٹرس آف سکولز بہاولپور ڈویژن کو م فضل حسین سینئر کلرک کی جگہ جنھیں ترقی دیکر ہیڈ کلرک بنادیا اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور بھیجدیا گیا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر سینئر کلرک دفتر انسپکٹر آف ویمن سکولز لاہور مقرر کیا گیا۔

ای/۷۵۹ — ۲۶ جولائی ۱۹۶۲ء — م۔ ظفر الحسن میٹرک۔ ایف۔ اے قائم مقام جونیر کلرک دفتر انسپکٹر آف سکولز سرگودھا ڈویژن کو اپنی تنخواہ پر م۔ بشیر احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے قائم مقام جونیر کلرک دفتر ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز سرگودھا مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ بشیر احمد قائم مقام جونیر کلرک دفتر ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز سرگودھا کو تاریخ حاضری سے اپنے گریڈ اور اپنی تنخواہ پر م ظہور الحسن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے قائم مقام جونیر کلرک دفتر انسپکٹر آف سکولز سرگودھا ڈویژن مقرر کیا گیا۔

ای/۶۳۰۰ — یکم اگست ۱۹۶۲ء — م۔ رفیق احمد خاں جونیر کلرک گورنمنٹ کالج لاہور کو جو ۲۲/۶/۲ تا ۳۰ تک لمبی رخصت پر تھے ۲۲/۱/۲ سے ۳۱ تک ایک نئی آسامی پر (جو لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور کے بجے ۲۲/۱/۲ سے خنلور ہو چکی ہے۔ اور جو اب ۲۲/۱/۲ سے ۳۱ تک کی مدت کے لیے گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول فار گرلز گلبرگ لاہور منتقل کی جا رہی ہے) جونیر کلرک گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول فار گرلز گلبرگ لاہور مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ رفیق احمد خاں جونیر کلرک گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول فار گرلز گلبرگ لاہور کو ۴ جولائی ۱۹۶۲ء سے مذکورہ بالا آسامی کے ساتھ جونیر کلرک لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ رحمت الہٰی قائم مقام جونیر کلرک دفتر انسپکٹر آف سکولز لاہور ڈویژن کو ۲۲/۱/۲ سے

۶/۶۲ ۔ اے سی ایک نئی آسامی پر جو گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ کے لیے منظور ہوئی تھی اور جواب ۶/۶۲ ا سے ۶/۶۲ ۔ اے سی کے لیے گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول گلبرگ لاہور منتقل کی جا رہی ہے اپنی تنخواہ پر ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن لاہور ریجن لاہور میں قائم مقام جونیئر کلرک مقرر کیا گیا ۔

ای/۶۳۰۰ — رحمت الٰہی قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول مارگرلہ گلبرگ لاہور کو قاضی

یکم اگست ۱۹۶۲ء — احمد یار جونیئر کلرک کی جگہ (جو سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں ڈی۔ پی۔ ای مقرر کیے گئے ہیں) ۶/۶۲ ۱۱ سے اپنی تنخواہ پر قائم مقام جونیئر کلرک ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن لاہور مقرر کیا گیا ۔

ایضاً — تصور علی خان میٹرک II (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر جو ۶/۶۲ ۱ سے گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ لاہور کے لیے منظور ہوئی بشاہرہ ۶۰/- روپے (پیمانہ تنخواہ ۶۰ - ۴ - ۱۰۰ - ۵ - ۱۲۰) گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ لاہور میں عارضی جونیئر کلرک مقرر کیا گیا ۔

ایضاً — م. تصور علی خان میٹرک II عارضی جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ لاہور کو ۶/۶۲ ۱۲ سے م۔ محمد یوسف کی جگہ جو ترقی پا کر سینئر کلرک ہو گئے ہیں۔ ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن لاہور ریجن میں اپنی تنخواہ پر عارضی جونیئر کلرک مقرر کیا گیا ۔

ایضاً — م. غلام حسین (ایک امیدوار) کو م تصور علی خان کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے بشاہرہ ۶۰/- روپے (پیمانہ تنخواہ ۶۰ - ۴ - ۱۰۰ / ۵ - ۱۲۰ علاوہ الاؤنس پر) گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ لاہور میں ۶/۶۲ ۱۹ سے عارضی جونیئر کلرک مقرر کیا گیا ۔

نوٹ: —(۱) جونیئر کلرکوں کی نئی آسامیاں جو لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور اور گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ کے لیے منظور ہوئی ہیں۔ گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول مارگرلہ گلبرگ لاہور میں علی الترتیب ۶/۶۲ ۱ سے ۶/۶۲ ۱۳ تک اور ۶/۶۲ ۱ سے ۶/۶۲۔ اے سی منتقل کی جاتی ہیں تاکہ م۔ رفیق احمد خان اور م۔ رحمت الٰہی کا اپنے سابقہ دفتر میں رکھے رہنا قاعدہ کے تحت آ جائے یہ دونوں آسامیاں علی الترتیب ۶/۶۲ ۱۴ اور ۶/۶۲ ۱۱ سے اپنی سابقہ

جگہوں پر بحال کی جاتی ہیں۔

(۲) م۔ تصور علی خاں اور م۔ غلام حسین کے تقرر بحیثیت جونیر کلرک محض عارضی ہیں اور ان کی خدمات معدوم سرکاری دفاتر کے فاضل عملے کی دستیابی پر یا انتظامی امور کے تحت، بغیر نوٹس اور بغیر وجہ بتلائے کسی وقت بھی ختم کی جا سکتی ہیں۔

(۳) م۔ رحمت الٰہی ملازمت میں افضلیت (یا سینیورٹی) کے لحاظ سے ہیڈ کی رائز کیڈر میں سب سے بعد متصور ہوں گے اور ان کا استحقاق منصب سب آفس کیڈر میں سمجھا جائے گا اور جب تک وہ ڈائرکٹوریٹ میں توثیق نہ حاصل کر لیں اُن کا استحقاق منصب گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ میں رہے گا۔

ای/۷۱۰۹
۸ اگست ۱۹۶۲ء

صوفی محمد سلطان (مستقل) ہیڈ کلرک دفتر انسپکٹرس آف سکولز سرگودھا ڈویژن سرگودھا کو تاریخ حاضری سے ایک نئی آسامی پر جو ۶۲/۷/۱ سے منظور ہوئی بشاہرہ خود ہیڈ کلرک گورنمنٹ کالج رحیم یار خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً

شیخ نذر الٰہی قائم مقام ہیڈ کلرک کو (جو ڈیوٹی پر نہیں ہیں اور جن کا استحقاق منصب سنٹرل ٹریننگ کالج میں ہے) شیخ بشارت احمد کی جگہ (جن کا تبادلہ مونٹ موریفسی کالج سرگودھا میں ہو چکا ہے) تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر قائم مقام ہیڈ کلرک دفتر انسپکٹر آف سکولز راولپنڈی مقرر کیا گیا۔

ای/۷۹۵۵
۹ اگست ۱۹۶۳ء

م۔ اعجاز نقی جونیر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ بشیر احمد قائم مقام جونیر کلرک (جن کا تبادلہ ہو چکا ہے) کی جگہ دفتر ڈسٹرکٹ انسپکٹرس آف سکولز منٹگمری میں جونیر کلرک مقرر کیا گیا۔

ایضاً

م۔ بشیر احمد قائم مقام جونیر کلرک دفتر ڈسٹرکٹ انسپکٹرس آف سکولز منٹگمری کو م۔ اعجاز نقی کی جگہ (جن کا تبادلہ ہو چکا ہے) تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر قائم مقام جونیر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ای/۷۰/۷۴۶ نعمت اللہ میٹرک II دفتری گورنمنٹ کالج نارووال سیالکوٹ کو م۔ محمد حسین شاہین جونیئر کلرک
۱۵ اگست ۱۹۶۲ء (جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول تلونڈی موسے خان ہو چکا ہے) کی جگہ بشاہرہ -/۶۰ روپے
۶۰ - ۴ - ۱۰۰/۵ - ۱۲۰ کے پیمانہ تنخواہ میں تاریخ حاضری سے عارضی جونیئر کلرک
گورنمنٹ گرلز ہائی سکول پنڈی بھٹیاں متقرر کیا گیا۔

نوٹ :۔ م۔ نعمت اللہ کا تقرر محض عارضی ہے بمد روم سرکاری دفاتر کے عملے کی دستیابی پر یا
انتظامی امور کے تحت ان کی خدمات بغیر نوٹس اور بغیر وجہ بتائے کسی وقت بھی ختم کی جا سکتی ہیں۔

۸۲۷۸ م۔ محمد حسین شاہین قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ گرلز ہائی سکول پنڈی بھٹیاں کو جن کے گورنمنٹ
۱۵ اگست ۱۹۶۲ء ہائی سکول تلونڈی موسے خاں بھیجے جانے کے احکام جاری ہوئے تھے م۔ عبدالرحیم جونیئر کلرک
کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول
پنڈی بھٹیاں متقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبدالرحیم قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی بھٹیاں کو تاریخ حاضری سے ایک
نئی آسامی پر جس کی منظوری ۶۲-۶۳ سے ہو چکی ہے قائم مقام جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول
تلونڈی موسے خاں متقرر کیا گیا۔

ای/۲/۸۵۵ م۔ محمد ابراہیم سینئر کلرک آفس آف انسپکٹر آف سکولز سرگودھا ڈویژن سرگودھا کو م۔ ظہیر الحسن
۱۸ اگست ۱۹۶۲ء ڈویژنل آڈیٹر کی جگہ جو ۶۲-۸-۹ سے ۶۲-۱۰-۳ تک رخصت پر ہیں ۶۲-۸-۹ سے ۱۲۰ - ۱۰ - ۲۰۰ -
۱۰ - ۲۵۰ روپے کے پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام ڈویژنل آڈیٹر متقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ بشیر احمد جونیئر کلرک دفتر انسپکٹر آف سکولز سرگودھا کو م۔ محمد ابراہیم کی جگہ (جو ترقی پا کر
ڈویژنل آڈیٹر ہو گئے ہیں) ۶۲-۸-۹ سے اسی دفتر میں قائم مقام سینئر کلرک متقرر کیا گیا (پیمانہ تنخواہ
۷۵ - ۴ - ۱۰۰/۵ - ۱۲۵ روپے ماہوار)

نوٹ :۔ مندرجہ بالا عہدہ داروں کی ترقی محض عارضی ہے اور انہیں واپس اپنی آسامیوں پر
بھیجا جا سکتا ہے۔

سی۔ایس۔ٹی ۱۳۸۶ م۔ علی محمد قائم مقام جونیئر کلرک سنٹرل میوزیم لاہور کو جونیئر کلرک کی نئی عارضی آسامی پر تاریخ
۲۰ اگست ۱۹۶۱ء حاضری سے قائم مقام جونیئر کلرک دفتر انسپکٹرس آف سکولز فزیکل ایجوکیشن لاہور ڈویژن
لاہور متقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ رؤف محمود بٹ عارضی جونیئر کلرک دفتر ڈائرکٹر آف ایجوکیشن لاہور ریجن کو م۔ علی محمد۔
(جن کا تبادلہ ہو چکا ہے) کی جگہ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر عارضی جونیئر کلرک سنٹرل میوزیم لاہور متقرر
کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبدالوحید عارضی جونیئر کلرک گورنمنٹ کالج مظفرگڑھ کو رؤف محمود بٹ کی جگہ جن کا تبادلہ
ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر عارضی جونیئر کلرک دفتر ڈائرکٹر آف ایجوکیشن لاہور
ریجن لاہور متقرر کیا گیا۔

(۱) نوٹ:۔ عہدیداران متعلقہ کو اپنے فرائض سے فی الفور سبکدوش کر دیا جائے اور جلد از جلد
اپنی نئی آسامیوں پر حاضر ہونے کی ہدایت کر دی جائے۔

(۲) م۔ عبدالوحید کو ہدایت کی جاتی ہے کہ نئی آسامی پر فوراً حاضر ہو جائیں۔ انھیں سفر الاؤنس
نہیں ملے گا۔

(۳) م۔ رؤف محمود بٹ اور م۔ عبدالوحید علی الترتیب سب آفس اور ہیڈ آفس کیڈر میں بلحاظ
تاریخ حاضری سب سے مؤخر متصور ہوں گے اور انھیں اگلے گریڈ میں ترقی کے لیے اس سروس سے
جو موجودہ کیڈرز میں انجام دی ہے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

۸۶۵۸ م۔ شبیر محمد میٹرک II (ایک امیدوار کو) م۔ بشیر احمد کی جگہ جنھیں عارضی طور پر سینئر کلرک
۲۱ اگست ۱۹۶۲ء بنا دیا گیا ہے۔ تاریخ حاضری سے ۔/۷۰ روپے مشاہرہ پر علاوہ الاؤنس (۔/۶۰ —
۴ — ۱۰۰ / ۵ — ۱۲۰ کے عام پیمانہ تنخواہ میں دفتر انسپکٹر آف سکولز سرگودھا
ڈویژن سرگودھا میں عارضی جونیئر کلرک متقرر کیا گیا۔

نوٹ:۔ م۔ شبیر محمد کا تقرر م۔ ظہیر الحسن ڈویژنل آڈیٹر کی رخصت کے سلسلے میں محض عارضی

طور پر کیا گیا ہے۔ اور کسی نوٹس کے بغیر کسی وقت ۲۱ سے قبل بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔

۸۲۲۵ م۔ محمد اکرم سینئر کلرک گورنمنٹ کالج آف فزیکل ایجوکیشن والٹن لاہور کو بشاہرہ خود سینئر کلرک کی
۲۴ اگست ۱۹۶۲ء ایک نئی عارضی آسامی پر، تاریخ حاضری سے، سینئر کلرک دفتر انسپکٹریس آف سکولز فار فزیکل
ایجوکیشن لاہور ڈویژن لاہور مقرر کیا گیا ہے۔

نوٹ:۔ م۔ محمد اکرم کو اپنے فرائض سے فوراً سبکدوش کر دیا جائے اور انھیں ہدایت کی جائے
کہ اپنی نئی آسامی پر تیاری کے لیے کوئی وقت لیے بغیر فی الفور حاضر ہو جائیں۔

این۔ ایس۔ ڈی ۸۲۴۴ م۔ رؤف محمود بٹ عارضی جونیئر کلرک دفتر ڈائریکٹر آف ایجوکیشن لاہور ریجن لاہور کو
۲۵ اگست ۱۹۶۲ء جنھیں سنٹرل میوزیم لاہور بھیجے جانے کے احکامات جاری ہوئے تھے۔ ایک نئی عارضی آسامی پر
گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ لاہور میں اپنی تنخواہ پر عارضی جونیئر کلرک مقرر کیا گیا۔

نوٹ:۔ م۔ علی محمد قائم مقام جونیئر کلرک سنٹرل میوزیم لاہور کے سابقہ احکامات تبادلہ و تقرر
نمبر ای/۷/ ۸۱ / ۶۲ — ۷۰۴/م مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۶۲ء منسوخ کیے جاتے ہیں۔

صیغۂ رجال ———————— شعبہ سکول

ای/۲۰۶/۵ م۔ فریدالدین بی۔ ایس سی۔ بی ایڈ سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول رنگ پور کو م۔ محمود مسعود
۱۶ جولائی ۱۹۶۲ء بی اے۔ بی ایڈ کی جگہ (جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول جلالپور پیر والا میں ہو چکا ہے) تاریخ
حاضری سے اپنی تنخواہ پر سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول خانیوال مقرر کیا گیا۔

اے ڈی ایم ایچ م۔ نذیر احمد بی ایس سی۔ بی ایڈ قائم مقام انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول شجاع آباد
(II) ۵۲۸۵ کو ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے بشاہرہ خود قائم مقام انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول
۱۲ جولائی ۱۹۶۲ء ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ سعید احمد۔ بی اے۔ بی ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کبروڑ پکا کو ایک نئی آسامی پر
تاریخ حاضری سے بشاہرہ خود قائم مقام انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ
مقرر کیا گیا۔

۵۲۸۰ م۔ محمد شریف۔ بی۔ ایس سی۔ بی ایڈ۔ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رینالہ خورد
جولائی ۶۲ کو ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور گریڈ کے مطابق قائم مقام انگلش ٹیچر
گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ نذیر احمد بی اے۔ بی ایڈ عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کسو وال کو (جو م۔
محمد عمر بی، ایس سی۔ بی ایڈ کے رخصت پر ہونے کی وجہ سے ان کی آسامی پر کام کر رہے ہیں)
۶۲-۷-۲۳ سے ایک نئی آسامی پر مشاہرہ خود قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم
اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد صفدر علی قریشی قائم مقام اے۔ ڈی۔ آئی آف سکولز رینالہ خورد (جو رخصت پر ہیں) کو
۶۲-۷-۲۳ سے ایک نئی آسامی پر مشاہرہ خود قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول
ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ بشیر احمد صابر بی اے۔ بی ایڈ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چشتیاں کو
ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے مشاہرہ خود قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول
ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً الطاف الرحمٰن بی اے۔ بی، ٹی قائم مقام انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول مظفرگڑھ کو ایک
نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے اپنے گریڈ میں قائم مقام انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول
روہیلیاں والی مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ رب نواز بی۔ اے۔ بی ایڈ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رحیم یار خان کو
تاریخ حاضری سے مشاہرہ خود ایک نئی آسامی پر اپنے گریڈ میں قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ
ہائی سکول نور پور نورنگا مقرر کیا گیا۔

ای/۵۲۶۹ م۔ محمد عزیز شاہ خانپوری ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول چک پی۔ ۱۷۲ ڈسٹرکٹ رحیم یار خان کو
۲۴ جولائی ۱۹۶۲ء $\frac{۲}{۵۹}$ ۱۹ قبل دوپہر سے ناشائستہ افعال کی بنا پر حکومت مغربی پاکستان کے قوانین ملازمین کی رو سے

قاعدہ (۶) (۱) ۲ کے تحت ملازمت سے برطرف کیا جاتا ہے۔

۔ ڈی ایم ای ا و م۔ رحمت اللہ قائم مقام اورینٹل ٹیچر کو (جن کے گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ بھیجے جانے کے
(ا)/۰۶-۵۵ احکام جاری ہوئے تھے) م۔ عزیز الحسن کی جگہ جن کا ۲۹ کو انتقال ہو گیا ہے۔
تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں قائم مقام اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول
اکال گڑھ مقرر کیا گیا۔

نوٹ:۔ م۔ محمد اشرف۔ ڈی۔ ٹی گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ کا حکم تبادلہ (دفتر نمبر ۱
Adm n/ ۲۰۷۹ مورخہ ۲۶ جون ۱۹۶۲ء) منسوخ کیا جاتا ہے۔

ڈی ایم ای م افتخار جلیل ایف اے۔ سی۔ ٹی اسسٹنٹ سٹور کیپر گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی سکول بہاولپور
(ت) ۹۰۰۹ کو ایک نئی آسامی پر بمشاہرہ -/۹۰ روپیے (پیمانہ تنخواہ ۸۰-۵-۱۲۰/۷-۱۹۰
۲۷ جولائی ۶۲ء علاوہ الاؤنس) تاریخ حاضری سے عارضی جونیئر انگلش ٹیچر مقرر کیا گیا۔

ای/۷۶۹۱ م۔ عبدالرحمن میٹرک۔ ایس، وی۔ قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول شاد پور صدر کو
۲۶ جولائی ۶۲ء تاریخ حاضری سے ایس۔ وی کی اس عارضی اضافی اسامی پر جو یکم جولائی ۱۹۶۲ء سے ایک
سال کے لیے منظور ہوئی تھی بمشاہرہ خود قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول
سرگودھا مقرر کیا گیا۔

۹۲۴۰ م۔ منور علی بی اے۔ بی ٹی۔ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول اکال گڑھ کو
۳۰ جولائی ۶۲ء اپنے گریڈ میں ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر
گورنمنٹ ہائی سکول تلاونڈی موسے خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً س۔ ابرار احمد بی اے۔ بی ایڈ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول شکر گڑھ
کو ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ
ہائی سکول تلاونڈی موسے خاں مقرر کیا گیا۔ (باقی)

آموزش

شمارہ ۳ — ستمبر ۶۲

اس شمارہ میں

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

ستمبر ۱۹۶۲ء

جلد ـــــــــــ ۱۵

شمارہ ـــــــــــ ۳

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

پبلشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی۔ خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۱۹۴ ۔ انارکلی لاہور سے شائع کیا

اداریہ

جمہوری ملکوں میں مدرسی نظام کا پہلا کام بچوں اور نوجوانوں کو فعال و بیدار شہری بنانا ہے لیکن شہریت کا عام تصور جو انیسویں صدی عیسوی تک مقبول رہا، وطن کی خدمت کرنے اور قومی وفاداریوں کا دم بھرنے تک محدود تھا۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کی محیّر العقول ایجادات اور رسل و رسائل کی بہتات نے دنیا کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا کہ شہریت کی وسعت آفاق سے ہمکنار ہوگئی اگرچہ شہریت کے اِس عالمگیر تصور میں مسلمانوں کے لیے کوئی انوکھی بات نہ تھی کیوں کہ بقول حالی ؎

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہُدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

آج ضرورت ہے کہ قوم کے نونہال اپنے وطن میں اہلِ وطن کا احترام کرنا سیکھیں اور جب ان میں اپنے حقوق و اختیارات کا احساس بیدار ہو تو وہ اس ذمہ داری کو بھی تسلیم کریں جو ان کے حقوق و اختیار کی وجہ سے ان پر عاید ہوتی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دلوں میں ایسی وسیع ہمدردی پیدا کریں جو اندرون و بیرونِ ملک پوری انسانیت کو محیط ہو۔ ورنہ ہمیں شاد عظیم آبادی کا ہمنوا ہونا پڑے گا ؎

جب اپنے آپ نہیں ہم تو ہوں گے غیر کے کب
زمانہ شاد ہم ایسوں سے احتراز کرے

جمہوری طرزِ حیات اختیار کرنے والوں پر تدریسِ شہریت کے سلسلے میں کچھ مخصوص ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور جمہوری ممالک کے مدارس سے یہ توقع حق بجانب ہے کہ وہ نوجوانوں کو جمہوری

فرائض حیات کے سمجھانے اور اس کا خوگر بنانے میں مدد دیں گے۔ چناں چہ آج کل یہ مسئلہ قومی اور بین الاقوامی نقطہ نظر سے روز افزوں اہمیت حاصل کر رہا ہے۔

اس مرحلے پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں شہریت کی تدریس ان مقاصد کے حصول میں کہاں تک مؤثر رہی ہے۔ کیا واقعی اس مضمون کے پڑھانے سے ہمارے مسائل کی تفہیم میں معقول مدد ملتی ہے؟ آیا طلبہ مضمون شہریت پڑھ کر انسانی رشتوں کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں اور تعاون کا ہاتھ بڑھاتے نظر آتے ہیں؟

ہماری شہری اور معاشرتی زندگی کے رجحانات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم دنیا میں جتنے مسائل حل کر سکتے ہیں اُن سے کہیں زیادہ مسائل خود پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہم گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے کی تیز حس پیدا کریں جو ماحول سے کامیاب مطابقت کے لیے ناگزیر ہے جس وقت تک ہم تخلیقی ہم آہنگی کی صلاحیت سے عاری ہیں اس وقت تک ہم کسی ترقی پسند تعلیمی نظام کی داغ بیل نہیں ڈال سکتے۔

رہنمائی کے ضرورت مند بچے کی مزید دیکھ بھال

ڈاکٹر عبدالرؤف، ڈائرکٹر بیورو آف ایجوکیشن، لاہور

مزید دیکھ بھال

اگر ابتدائی رہنمائی اور مشوروں کے بعد ضرورت مند بچوں کی مزید دیکھ بھال نہ کی جائے ۔۔۔ تو ان کے پہلے کی سی حالت کی طرف رجعت کر جانے بلکہ مزید بگڑ جانے کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے رہنمائی کے کام کو مؤثر اور کامیاب بنانے کے لیے مزید دیکھ بھال انتہا ع کی سخت ضرورت ہوتی ہے

مزید دیکھ بھال

۔۔۔۔۔ بچے کی متعلقہ مشکلات کا باضابطہ ریکارڈ رکھنا مزید دیکھ بھال کا بہترین اور آزمودہ طریقہ ہے۔ بسا اوقات رہنمائی کے ادارہ میں آنے والے بچے ایسے ریکارڈوں کی بدولت طرح طرح کے مزید خطروں سے بھی محفوظ ہو جاتے ہیں۔ مسلسل ریکارڈ میں ان بچوں سے متعلق تازہ بتازہ معلومات جمع کی جاتی ہیں جو کسی وقت اپنی کسی الجھن وغیرہ کے علاج کے لیے کلینک میں آئے ہوں اور صحت یاب ہو کر خارج کر دیے گئے ہیں۔ یہ ریکارڈ اس مقصد کے لیے رکھے جاتے ہیں کہ اگر کسی غفلت کی وجہ سے علاج یافتہ بچے اپنی پرانی الجھن کا شکار ہو جائیں تو دوبارہ علاج اور رہنمائی کے لیے ان ریکارڈوں سے استفادہ کیا جا سکے۔ مسلسل ریکارڈ رکھنے سے بچوں، والدین اور اساتذہ کے علاوہ ادارے کے عملہ کو بھی بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ کیوں کہ اس سے انھیں مختلف بچوں پر اپنے نفسیاتی طریقوں کی کامیابی یا ناکامی کا پتہ چلتا رہتا ہے

مسلسل ریکارڈ کی چند اقسام

مسلسل ریکارڈ کی چند عام مستعمل انواع درج ذیل ہیں :-

۱۔ تعلیمی تحصیل کا ریکارڈ

۲۔ ذہنی صحت کا ریکارڈ

۳۔ جسمانی صحت کا ریکارڈ

۴۔ معاشرتی صحت کا ریکارڈ

ان ریکارڈوں میں بچے کی تعلیمی تحصیل، ذہنی صحت، جسمانی کیفیات اور معاشرتی نشوونما اور تغیر و تنزل کے مکمل اندراج رکھے جاتے ہیں جس کا مطالعہ ہر اُس فرد کے لیے بیحد افزا ثابت ہوتا ہے جو بچوں کی مسلسل دیکھ بھال میں دل چسپی رکھتا ہو۔

والدین سے رابطہ

بچوں کی مزید دیکھ بھال کے لیے والدین سے رابطہ قائم کرنا بھی بیحد ضروری ہے۔ اس سے ماہر رہنمائی کو بچے کے کردار اور فکر میں تغیر و تنزل وغیرہ کا علم ہوتا رہتا ہے۔ ماہر رہنمائی یہ رابطہ ذاتی ملاقات سے قائم کرسکتا ہے

معلم کی مشکلات

ہر معلم اس قسم کے مسلسل ریکارڈ نہیں رکھ سکتا۔ ایک عام معلم کو ایسے ریکارڈ رکھنے میں متعدد مشکلات پیش آتی ہیں۔ ان مشکلات کی دو عام انواع یہ ہیں :۔

۱۔ اپنے تدریسی فرائض کے انبوہ تلے دبے ہوئے عدیم الفرصت معلم کو ایسے ریکارڈ رکھنے کا وقت میسر نہیں آتا۔

۲۔ اکثر معلم مسلسل ریکارڈوں کی حیثیت اور ان کے رکھنے کے طریقوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔

تدارک علاج سے بہتر ہے

بہترین لائحہ عمل یہ ہے کہ مدرسہ کا علمی، تفریحی اور معاشرتی ماحول اس قسم کا رکھا جائے کہ اس میں طلبہ کے بگڑنے کے امکان بہت کم ہوں۔ اس مقصد کے لیے دو بنیادی باتیں جن کا خصوصی خیال رکھنا ضروری ہے یہ ہیں :۔

اوّل :- پڑھانے کے خوش گوار طریقوں کا استعمال

دوم :- تفریحوں اور کھیلوں کی بہتر اور معقول تنظیم

ان احتیاطوں کے باوجود بھی اگر بگڑنے، سدھرنے اور پھر بگڑنے کے واقعات رونما ہوتے ہوں تو اس کے مناسب تدارک کا معقول اہتمام ہونا چاہیے۔ اس صورت میں ابتدائی رہنمائی کے بعد مزید دیکھ بھال کے کام سے غفلت برتنا مزید اور سنگین خطروں کو دعوت دینا ہے :-

حوالہ جات :-

(۱) بچوں کی رہنمائی۔
(۲) جدید تعلیمی نفسیات
(۳) بچوں کی نفسیات

نئے جغرافیائی رجحانات

پروفیسر فرحت اللہ خاں

خطائی جغرافیہ کی ابتدا

زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ شاید ہی کسی مضمون نے اپنا رنگ روپ اتنا زیادہ بدلا ہو جتنا جغرافیہ نے بدلا ہے۔ ہم نے جولائی کے آموزش میں بیان کیا تھا کہ اوکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ہربرٹسن نے سنہ ۱۹۰۵ء میں خطائی جغرافیہ کا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ بیسویں صدی کا یہ سب سے بڑا اور اہم کارنامہ تھا۔ اس نظریے کی نشو ونما پاتے ہی معلوم اور غیر معلوم دنیا کے حالات ایک نئے نظریے سے پیش کیے جانے لگے۔ پروفیسر ہربرٹسن نے قدرتی ماحول اور انسانی جدوجہد کو دھیان میں رکھتے ہوئے نئے خطے بنائے۔ الغرض جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ پروفیسر ہربرٹسن نے جرمن خیالات اور فرانسیسی رجحانات کو یکجا کیا اور جغرافیائی خطے کی یہ تعریف کی "جغرافیائی خطہ زمین کا وہ وسیع خطہ ہوتا ہے۔ جہاں سطح۔ آب وہوا۔ قدرتی نباتات اور باشندوں کے پیشے ایک جیسے ہوں"۔

ملکوں کا خطائی جغرافیہ اور ہمارے سکول

کچھ عرصہ بعد پروفیسر ہربرٹسن نے ہر ملک کے جغرافیائی حالات کو خطوں میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ فاضل پروفیسر کی شہرہ آفاق کتاب "دنیا کا طبعاتی جغرافیہ" Regions of The world دنیا کے سامنے آئی جس میں پہلی مرتبہ دنیا کے ملکوں کو خطوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہمارے سکولوں میں بھی سوالات کا طریقہ بدلا۔ طبعاتی جغرافیہ پر اس قسم کے سوالات پوچھے جانے لگے۔

۱۔ ہندوستان کو اس کے قدرتی خطوں میں تقسیم کریں!

۲۔ پنجاب کے خطے بنائیں اور کسی ایک کا مفصل حال لکھیں؟

۳۔ مغربی پاکستان کو کون کون سے قدرتی خطوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
۴۔ دریائے سندھ کی وادی کی ترقیاتی سکیموں اور لوگوں کے پیشوں کے حالات لکھیں؟

تدریس جغرافیہ پر اثر

اس طریقہ تدریس نے کرۂ ارض کو ایسے مختلف خطوں میں تقسیم کر دیا، جہاں ہر خطے میں خاص جغرافیائی خصوصیات نظر آنے لگیں۔ خطائی طریقے میں قدرتی ماحول، اس کے اثرات اور انسانی جدوجہد کا مطالعہ ساتھ ساتھ کیا جاتا ہے۔

(i) نیز قدرتی خطوں کا مطالعہ اور مقابلہ کرتے وقت یہ بھی واضح کیا جاتا ہے کہ کسی خطے کی آب و ہوا اور قدرتی ماحول کچھ ایسی چیزیں ہیں، جن کے اختلاف کی وجہ سے لوگوں کے طرز زندگی اور جدوجہد میں نمایاں فرق پڑ جاتا ہے۔ مثلاً آپ نے دیکھا ہوگا کہ پاکستان میں سرسبز اور شاداب پہاڑوں کے متوطن اور دامن سپند سواتی، خشک اور دشوار گزار شمالی اور جنوبی (وزیرستان کے) پہاڑوں کے لڑاکا وزیریوں سے کتنے مختلف ہیں؟ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ سالیہ پنجاب اور سندھ کی نہری آبادیوں کے کاشتکار۔ ریگستان۔ بہاولپور، تھر اور تھل کی آبادیوں سے کتنے مختلف اور زیادہ متمول ہیں؟

(ii) دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ کسی خطے کی آب و ہوا اور قدرتی ماحول ایسی اہم چیزیں ہیں۔ جن کے بدلنے پر بعض اوقات اب تک انسان قادر نہیں ہو سکا۔ مثلاً ٹنڈرا کے برف پوش میدانوں میں انسان کو اب تک خوراک حاصل کرنے میں دقت رہی۔ ریگستان میں اسے کہیں کہیں خانہ بدوشی بننا پڑا۔ الغرض ماحول انسان پر بھی حاوی رہا۔

خطائی جغرافیہ پڑھاتے وقت دو مشہور طریقے

پہلا یا انگریزی خطائی طریقہ اس طریقے کے مطابق پڑھاتے وقت طبعی جغرافیہ (PHYSICAL GEOGRAPHY) سے شروع کرتے ہیں اور طبعی حالات کا انسانی زندگی اور جدوجہد پر جو اثر پڑتا ہے اس کو عام طور سے بعد میں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً کسی خطے کا مطالعہ کرتے وقت سب سے پہلے

۱۔ محل وقوع ۲۔ اس کی سطح، ۳۔ آب وہوا، ۴۔ قدرتی پیداوار کا ذکر کرتے ہیں اور پھر بتلاتے ہیں کہ اس خطے کے جغرافیائی حالات سے (i) جانوروں کی تقسیم (ii) زرعی پیداوار (iii) معدنیات کی تقسیم (iv) دست کاریوں کے پھیلاؤ (v) آبادی کی تقسیم (vi) لوگوں کے پیشے (vii) شہروں (viii) ذرائع آمدورفت کی تقسیم (ix) اور خطے کی ترقی پر ان کا کیا اثر پڑا۔ ان سب میں منطقی طور پر ربط قائم کیا جانے لگا۔

ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔ قدرت نے سیالکوٹ کو ہموار سطح۔ سرن سوئی آب وہوا اور نباتات عطا کی ہے۔ ضلع سیالکوٹ۔

۱۔ محل وقوع:

عرض بلد		طول بلد
۳۲.۲۸	×	۷۴.۳۲

۲۔ سطح :۔ میدانی (گرم مرطوب)

۳۔ آب وہوا :۔ موسم سرما میں کثرت اور موسم گرما میں معمولی بارش ہوتی ہے۔ یہ ضلع سرن سوئی ہوائی کے خطے میں واقع ہے

۴۔ سرن سوئی جنگلات :۔ چونکہ یہ جنگلات سرن سوئی ہیں۔ اس لیے یہاں آم۔ امرود۔ شیشم پیپل وغیرہ کے درخت پائے جاتے ہیں۔

سرن سوئی خطہ کی وجہ سے مندرجہ ذیل حالات مزید پائے جائیں گے :۔

۱۔ **جانور** :۔ مثلاً بندر۔ گائے۔ بھینس۔ بھیڑ۔ بکری وغیرہ

۲۔ **زرعی پیداوار** :۔ مکئی۔ چاول۔ گنا۔ گندم۔ جو۔ کپاس وغیرہ

۳۔ معدنیات :۔ غیر حاضر کیونکہ میدان دریا بُرد مٹی کا بنا ہوا ہے۔

۴۔ دست کاریاں :۔ کپڑے کا کارخانہ۔ چاول چھڑنے کا کارخانہ، شکر سازی کی صنعت۔ کھاد کے کارخانے۔ کھیلوں کا سامان اور جراحی کے اوزار۔ لوہے کی الماریاں

۵۔ آبادی کی تقسیم :۔ گنجان آبادی۔

۵۔ لوگوں کے پیشے :۔ زراعت۔ صنعت و حرفت۔ سرکاری نوکری وغیرہ۔

۷۔ مشہور شہر :۔ سیالکوٹ۔ بڑا شہر ہے۔

۸۔ ذرائع آمد و رفت :۔ ریلیں۔ سڑکیں وغیرہ

۹۔ ترقیاتی سکیمیں :۔ چاولوں کے کارخانے اور لوہے کے سامان اور کھیلوں کے سامان کی صنعت۔

اب سارا جغرافیائی حال پڑھیئے۔

ضلع سیالکوٹ مون سونی خطہ میں واقع ہے۔ میدانی ملک ہونے کی وجہ سے جنگلات صاف کر دیے گئے ہیں۔ پھر بھی آم۔ امرود۔ لوکاٹ وغیرہ کے باغات عام ہیں۔ کھیتوں میں موسم سرما میں گندم جو بجئی۔ چنے کی کاشت اور گرما میں مکئی کپاس۔ چاول۔ گنا وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔ جانور عام ہیں۔ لیکن معدنیات کی کمی ہے۔ صنعتوں کا انحصار زراعت پر ہے۔ کھیلوں کے سامان کی لکڑی کشمیر کے پہاڑوں سے آتی ہے۔ آبادی گنجان ہے۔ لوگ زراعت اور صنعت و حرفت کا کام کرتے ہیں سیالکوٹ بہت بڑا شہر ہے۔ جہاں ترقیاتی سکیمیں جاری ہیں اور انسان دن رات اپنے ماحول سے فائدہ اٹھا کر نت نئی جدوجہد میں معروف رہتا ہے۔

دوسرا یا امریکی خطائی طریقہ

اس دوسرے طریقہ کے مطابق خطائی جغرافیہ کو انسانی زندگی سے شروع کرتے ہیں، جو بالعموم مختلف قدرتی حالات کے خلاف جدوجہد کی تصویر ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے میں اسے سماجی جغرافیہ بھی کہتے ہیں۔ اہل امریکہ کا خیال یہ ہے کہ جہاں ترقی پسند اور پڑھے لکھے لوگ جمع ہو جاتے ہیں وہ مل جل کر ماحول کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور ماحول/حالات کو انسان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ملک کی ترقی کے چند جغرافیائی طریقے مندرجہ ذیل ہیں۔ جن سے ہم اپنے ملک پاکستان کی ترقی بھی معرف لے سکتے ہیں۔

ملک کی آبادی کو اعلیٰ تعلیم سے مالامال کریں۔ تاکہ علم کی دولت حاصل کر کے ہر پاکستانی

طالب علم اپنے ملک کی معدنی۔ زرعی۔ اور انسان کی پیدا کردہ دولتوں مثلاً ذرائع آبپاشی۔ ذرائع آمدورفت اور ذرائع باربرداری سے پورا فائدہ اٹھائے۔ سیم اور تھور کے خلاف جنگ کرے اور اپنا نادارانہ طریقے سے محنت کر کے خوراک کی کمی کو افراط میں بدلے۔ ہمارے صدر مملکت محمد ایوب خان صاحب کی جاری کردہ اصلاحات میں پس پردہ یہی نظریہ کارفرما ہے۔ ہمارا اصلاحی پروگرام یہ ہے۔

۱۔ زرعی اصلاحات
۲۔ آبپاشی اور مسئلہ پانی پر عبور
۳۔ زرعی یونیورسٹی کی ابتدا
۴۔ سیم اور تھور کے خلاف جنگ

} تاکہ مسئلہ خوراک حل ہو۔

۵۔ انجینئرنگ یونیورسٹی کی ابتدا — تاکہ شہر اور نوآبادیاں قائم ہوں۔ نئے بند باندھے جائیں۔ نئے کارخانے چلائے جائیں اور معدنیات نکالنے کے لیے سروے کیا جائے۔

سماجی جغرافیہ کی ابتداء

سماجی بہبود کو مدنظر رکھنے والا بیسویں صدی کا ایک مشہور جغرافیہ دان ایلزورتھ ہنٹنگٹن ایلزورتھ کا یہ خیال ہے کہ جہاں دنیا میں عمدہ آب و ہوا (ELLSEWORTH HUNTINGTON) عمدہ پیداوار۔ عمدہ ماحول۔ عمدہ لوگ۔ عمدہ اخلاقی معیار پائے جاتے ہیں۔ اور ترقی پسند لوگ ایک سماجی نظام بناتے ہیں۔ وہاں تہذیب اور تمدن کا معیار بہت اونچا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اہل روس۔ اہل امریکہ کچھ انہی دولتوں سے مالا مال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے موسمی معائب پر کسی حد تک فتح پائی۔ زمین کے پوشیدہ خزانوں اور زراعت سے پورا فائدہ اٹھایا۔ سمندر کی تہوں میں خزانے ڈھونڈے اور اب کرۂ ہوا کی تسخیر میں مصروف ہیں۔ تاکہ نہ صرف زمین اور پانی پر بلکہ آسمانوں پر انسان کی برتری ثابت ہو جائے۔

ایلز ورتھ ہنٹنگٹن نے بتایا کس طرح انسان ماحول کے مطابق عمدہ طرز حکومت بناتا ہے

اس کی یہ دلچسپ ترتیب ملاحظہ کریں

انسان

قدرتی ماحول		قدرتی دولتیں	پیشے	انسانی ضروریات
ا۔ سطح	پہاڑ	جنگلات	لکڑی کاٹنا	خوراک
	میدان	معدنیات	کان کنی	لباس
	سطح مرتفع	گیاہستان	صنعت و حرفت	مکان
آب و ہوا اور قدرتی نباتات	۱۔ استوائی	برفستان	مویشی پالنا	فنون لطیفہ
	۲۔ سوانا	ریگستان	زراعت	ذرائع باربرداری
	۳۔ مون سونی	باغات	شکار	تفریحی مشاغل
	۴۔ گرم صحرائی	مچھلیاں	تجارت	تعلیم
	۵۔ روی		ملازمت	
	۶۔ معتدلائی ریگستان			
	۷۔ چینی			
	۸۔ سٹیپ			
	۹۔ مغربی یورپی			
	۱۰۔ نوکیلے پتوں کے جنگلات			
	۱۱۔ ٹنڈرا			

عمدہ طرز حکومت

فاضل ایلز ورتھ نے بتایا کہ انسان جس قسم کی قدرتی دولتوں اور آب و ہوا۔ نباتات اور پیشوں کے ماحول میں رہتا ہے وہ اپنی ضروریات زندگی اسی ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ ضروریات زندگی کی تکمیل کا طریقہ اسے تہذیب یافتہ دنیا میں ایک خاص مقام دیتا ہے اور ایسا انسان دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ جہاں اس قسم کے بہت سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ وہاں وہ محنت۔ مشقت۔ عـلم اور

ایمانداری سے کام لے کر دنیا میں ایک عمدہ طرزِ حکومت قائم کرتے ہیں۔ یہی قرآن کا فرمان بھی ہے۔

سماجی جغرافیہ کا ہمارے سکولوں پر اثر

ہمارے سکولوں میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے سماجی جغرافیہ پڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن نہ تو ہمارے جغرافیہ دانوں نے اس کی طرف توجہ فرمائی، نہ ہمارے اساتذہ نے اسے سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی ہماری درسی کتابیں کسی ڈھنگ اور قابلیت سے لکھی گئیں۔ لہٰذا سماجی جغرافیہ کو ترتیب ہی غلط دی گئی اور ہمارے کارفرمایانِ نصاب نے ایک نئی طرز کا سلیبس ہمارے سکولوں کے لیے نہ دیا جس کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے:-

۱- ملکوں کے نام۔

۲- لوگوں کے پیشے۔ مثلاً زراعت بھیڑ بکری پالنا وغیرہ۔ تفریحی مشاغل۔

اس میں بڑی غلطی یہ تھی کہ ماحول سے تعلق قائم نہ کرتے ہوئے طلبا انہیں رٹنے کی کوشش کرتے رہے اور وہ صلاحیتیں جو ربط سے پیدا ہوتی ہیں ان سے عاری رہ گئے۔ یہی وجہ ہے، کہ کونے کونے سے لوگوں نے اس نصاب اور کتابوں کی مذمت شروع کر دی ہے۔

نئے جغرافیائی رجحانات اور پاکستان

ہم سب پاکستانی ہیں۔ ہماری بیشتر آبادی کا مذہب اسلام ہے۔ اسلام کی تعلیم سے آجکل ہمارا مغرب زدہ انسان ناآشنا ہے۔ لیکن دنیا کا بڑے سے بڑا آدمی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات ہی دنیا کی ترقی اور امن کا ضامن ہے۔ ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ ہماری کائنات کی حکومت خدائے واحد کے ہاتھ میں ہے اور یہ خدا ہی ہے جس نے ساری کائنات کو انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے۔ چناں چہ ارشاد باری ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

ہم نے ساری کی ساری کائنات (جو آسمان اور زمین میں ہے) تمہاری خدمت میں لگا رکھی ہے

پھر فرمایا۔ جس طرح شہد کی مکھی انسان کی خدمت کے لیے مامور ہے، بالکل اسی طرح سمندر کی مچھلیاں

دد دوسرے جانور تمہاری خدمت پر مامور ہیں۔ بارش کا پانی مردہ کھیتوں کو زندہ کرتا ہے۔ شہروں اور بستیوں کی صفائی کا انتظام بھی بارش کے پانی پر ہے۔

بس اے مسلمانو! مطالعہ کائنات سے ذات الٰہی پر ایمان پیدا کرو۔ تمام اقوام خدا کا کنبہ ہیں۔ سب کے ساتھ ہمدردی ضروری ہے۔

فرمایا :- كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً

سب قومیں ہماری نگاہ میں ہمارا کنبہ ہیں۔ اس لیے ایک قوم دوسری قوم کو حقیر نہ سمجھے۔ کیوں کہ اسلام میں تمام انسانوں کے حقوق برابر ہیں۔ اور انسانی فلاح اور سعادت کا انحصار اعمال صالحہ پر ہے۔ مسلمان نیک عمل اور خوف خدا سے حیات طیبہ اور جنت حاصل کرتے ہیں۔ یہ سب مادی ماحول کے خلاف جدوجہد کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اسلام کی عالمگیر تعلیمات رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ جو کسی ایک جماعت اور مذہب کے لیے مخصوص نہیں۔ بلکہ جو انسان اور قوم اس پیمانے پر پوری اترے گی وہی جغرافیائی نظریہ کے مطابق خوش حال اور ترقی یافتہ قوم کہلائے گی اور علوم و فنون اس کی قدم بوسی کریں گے چنانچہ قرآن میں خدا نے اپنے حبیب پیغمبر کو حکم دیا کہ ان الفاظ میں اعلان کر دیں۔

قُلْ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

اے لوگو میں تمام قوموں کے لیے پیغام لے کر آیا ہوں۔ اُس خدا کی طرف سے جس کی سلطنت کی وسعت ساری کی ساری کائنات کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔

رسول پاک کا پیغام ساری دنیا کے لیے ہے۔ لیکن ہماری چھوٹی سی کائنات ہمارا قدرتی ماحول ہے اس میں جدوجہد کرنا اور باعمل زندگی بسر کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اسلام کی پیش کردہ تعلیم ہی دراصل صحیح جغرافیہ ہے۔ سب قومیں ہماری نگاہ میں ہمارا کنبہ ہیں۔ سائنسی ترقی نے ساری دنیا کو ایک چھوٹی سی دنیا بنا دیا ہے۔ اور اس دنیا کو اسلامی نظریۂ حیات کی ضرورت ہے۔

ہماری دعا ہے کہ پاکستان کے عوام جغرافیہ کے مفہوم کو صحیح صحیح سمجھ کر پاکستان میں اسلامی نظام زندگی قائم کریں۔

ہماری حکومت بھی خداوندی احکام کے مطابق ہماری مدد کرے۔ یقیناً وہ پاکستان ایک سچا جغرافیائی اور اسلامی پاکستان ہوگا جس کو قائم کرنے کے لیے اب تک ہماری حکومت کوشش کر رہی ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مآخذ

۱. القرآن

۲. رحمۃ اللعالمین

۳. تدریس جغرافیہ (یونیسکو)

۴. تدریس معاشرتی علوم (فرحت اللہ خان یوسف زئی)

باوقار اُستاد

انور قریشی ایم اے ڈپٹی انسپکٹر تعلیم لاہور

مئی اور جون کے شمارے میں مفصل بیان ہو چکا ہے کہ اساتذہ کو اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے کون سی اخلاقی علمی اور ادبی صلاحیتوں سے مرصّع ہونا چاہیے۔ وہاں ہم ان سرگرمیوں کا ذکر کر چکے ہیں جو نصابی ہیں جن کا تعلق بلا واسطہ استاد کی تدریسی زندگی سے ہے۔ لیکن مدرسہ میں استاد کی سرگرمیاں نصابی تدریس تک ہی محدود نہیں ہونی چاہئیں۔ بلکہ استاد کی اہمیت جماعت کے کمرے سے باہر زیادہ ہے۔ لہٰذا اس مضمون میں ہم استاد کی غیر نصابی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں اس کی خصوصیت اور رسائی اس کے وقار میں خاطر خواہ اضافہ کرتی ہے۔

کرۂ جماعت سے باہر استاد اور طلباء کے لیے سب سے اہم دو مقامات ہیں ایک کھیل کا میدان اور دوسرا اسٹیج۔

کھیل کا میدان

طالب علم کی زندگی میں طلب علم کے ساتھ ساتھ کھیل کا ذوق بھی پایا جاتا ہے۔ بلکہ نوجوانوں کی نگاہوں میں کلاس روم سے بڑھ کر کھیل کا میدان پرکشش اور جاذب نظر ہوتا ہے۔ تمام دن کی تعلیمی سرگرمیوں سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور دل و نگاہ ان لمحات کے منتظر ہوتے ہیں۔ جب آخری گھنٹی بجے اور بچے شور مچاتے ہوئے کمروں سے باہر بھاگیں اور کتابیں گراؤنڈ کے کناروں پر ڈھیر کر کے کودتے اچھلتے ہوئے فٹ بال کے پیچھے ہولیں یا کرکٹ کی گیند لے کر دھڑا دھڑ نٹ پریکٹس میں مشغول ہو جائیں۔ ان لمحات میں اساتذہ کو اپنا بچپن یاد رکھنا چاہیے۔ جب وہ ہیڈ سکول کے اختتام پر اسی ذوق و شوق کا مظاہرہ کرتے تھے اور کسی ضبط اور نظم کی پروا کیے بغیر کھیل کے میدان میں زور آزمائی پر تُل جاتے تھے۔

مگر عام طور پر مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اچھے ٹیچر اچھے کھلاڑی نہیں ہوتے۔ تدریسی اہمیت کا حامل استاد کھیل کے میدان میں پھسڈی ثابت ہوتا ہے اور کھلاڑی بچے استاد کو دو چار دھکے دیکر دن بھر کی سزاؤں کا بدلہ لے لیتے ہیں۔ مگر میں ایسے اساتذہ کو کامیاب اساتذہ شمار نہیں کرتا جو صرف کمرے کے ہیرو ہوں۔ موجودہ عہد کے تعلیمی پروگراموں میں طلبا کی غیر نصابی سرگرمیوں کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی کہ نصابی فعالیتوں کو حاصل رہی ہے اگر تعلیم و تدریس کا مقصد بچے کی ذہنی اور اخلاقی پرورش ہے۔ تو غیر نصابی سرگرمیاں زیادہ اہمیت کی مالک ہیں اور غیر نصابی سرگرمیوں میں کھیلوں کو بہت بلند مقام حاصل ہے جس کے پیش نظر اساتذہ کو نہ صرف خود اچھا کھلاڑی ہونا چاہیے بلکہ کھیلوں کی تنظیم پر حاوی ہونا ہر استاد کا فرض ہے جس کے بغیر مدرسہ میں اس کی اپنی اہمیت آدھی رہ جاتی ہے جس طرح کھلاڑی طلبا مدرسہ کی فضاؤں پر مسلط ہوتے ہیں۔ اسی طرح کھلاڑی اساتذہ بھی غیر کھلاڑی اساتذہ کی نسبت زیادہ باوقار اور باعزت ہوتے ہیں طلبا میں انہیں زیادہ شہرت اور ہردلعزیزی حاصل ہوتی ہے۔

سٹیج:۔ مدرسہ میں سٹیج کو بھی اتنی ہی عظمت حاصل ہے جتنی کھیل کے میدان کو۔ کھیل کے میدان میں بچے احساس کمتری کو دور کر سکتے ہیں، اسی طرح سکول سٹیج بھی اس احساس کو دور کرنے میں ممد ثابت ہوتی ہے لہذا اساتذہ پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو اس میدان میں بھی تربیت دیں۔ اس کی ابتدائی صورت کلاس روم کی انجمن ہے۔ جہاں بچوں کو ابتدائی مشق دی جانی چاہیے بچے اساتذہ کی مدد سے مضامین لکھیں یا تقاریر یاد کریں، نظم و نعت خوانی ہو اور ہلکے پھلکے ڈرامے بھی کیے جائیں۔ منتخب بچوں کو سکول کی سٹیج پر لایا جائے۔ میں نے تجربہ کیا ہے کہ اساتذہ کی لگاتار محنت سے بے شمار بچے نہ صرف اچھے مقرر بن گئے بلکہ ان میں ادبی لسانی جوہر پیدا ہو گئے اور انہوں نے تعلیمی لحاظ سے ایک خاص امتیاز حاصل کر لیا۔

میں نے اپنی تدریسی زندگی میں اس قسم کے بے شمار طلبا دیکھے ہیں جنہیں کھینچ کر کسی نہ کسی غیر نصابی سرگرمی میں شامل کیا گیا جس سے ان کی زندگی میں نمایاں انقلاب آیا اور وہ بعد ازاں اچھی خاصی شہرت کے مالک بن گئے۔ صحیح معنوں میں استاد وہی ہے جو اپنے شاگردوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو سمجھے اور انہیں ایک شاطر کی طرح بروئے کار لائے۔ بعض اساتذہ کھلاڑی بچوں کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں

کہ یہ تو کھلاڑی ہے۔ یہ کیا پڑھے گا۔ اسی طرح مقرر طلبا کے متعلق یہ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ تو لیکچر دیتے پھرتے ہیں، تعلیم کیا حاصل کریں گے۔ بلکہ بعض اساتذہ ایسے طلبا کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میری نگاہ میں وہ استاد بڑا ظالم ہے جو اپنے ذہین و فطین شاگرد کو خواہ وہ کسی میدان میں کامیاب ہو تھپکی نہ دے۔ اگر استاد کی محنت سے ایک ہونہار طالب علم سی ایس پی ہو گیا ہے تو اساتذہ ہی کی محنت سے ذہین بچے نہایت اچھے کرکٹ یا ہاکی کے کھلاڑی بن گئے ہیں۔ اگر کسی استاد کو اپنے سی ایس پی شاگرد پر ناز ہے تو مجھے اس شاگرد کے باعث فخر حاصل ہے جس نے اُن کے بل بوتے پر بین الاقوامی مقابلے میں ہندوستانی ٹیم کو شکست دی۔

غیر نصابی سرگرمیوں میں سکاؤٹنگ، سیر و تفریح سب شامل ہیں۔ اور استاد کو لازم ہے کہ بچوں کے ساتھ ان تمام مشاغل میں نہ صرف برابر کا شریک ہو بلکہ ان کی پوری طرح رہنمائی کرے۔ تاکہ ان میں سے ہر ایک سرگرمی بچے کے لیے مکمل سبق کی صورت اختیار کرے۔ مثلاً ہرن مینار کی سیر استاد کی صحیح رہنمائی کے بغیر محض تضیع اوقات ہے اور سوائے ٹانگیں تڑانے کے اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ استاد کو چاہیے کہ بچوں کو وہاں لے جانے سے پیشتر جہاں ان کے لیے بس کا بندوبست کرے اور ان کے دوپہر کے کھانے کی طرف توجہ دے وہاں شیخوپورہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر کا مطالعہ بھی کرے۔ علاوہ ازیں متعلقہ کتب سے بھی ہرن مینار کی بابت صحیح معلومات حاصل کرے اور وہاں پہنچ کر گھومنے سے پیشتر بچوں کو ہرن مینار کی تاریخی اہمیت سے آگاہ کرے۔ تاکہ طلبا کو اس مقام سے صحیح واقفیت حاصل ہو اور ان میں صحیح قسم کا تاریخی تجسس پیدا ہو جائے۔

ان سرگرمیوں کے علاوہ بیدار مغز استاد بچوں میں اور صلاحیتیں دیکھ کر انہیں بھی اجاگر کر سکتا ہے مثلاً شاعری، مصوری اور موسیقی۔ مگر جب تک استاد میں خود فنون لطیفہ کا ذوق نہ ہو وہ اپنے شاگرد کی صلاحیتوں کو پہچان سکتے ہیں اور نہ انہیں جلا دے سکتے ہیں۔ استاد کے مقام کو واضح کرنے کے لیے اللہ نے کتاب اللہ اور انبیاء کی مثالوں کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ اگر محض کتب سے دنیا کی اصلاح ہو سکتی تو اللہ صرف کتاب نازل کر دیتا، انبیاء کو دنیا میں نہ بھیجتا۔ انہی خطوط پر اساتذہ کے فرائض کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ صرف سمجھانے کی غرض سے عرض کیا گیا ہے ورنہ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

آج سے سو سال بیشتر ہمارے ملک میں یہ حالات نہ تھے۔ ہمارے تمام ائمہ دین، مبلغین، اولیائے کرام اور صوفیا کی اولین حیثیت یہ تھی کہ وہ اساتذہ تھے۔ وہ برصغیر پاک و ہند میں اپنی درس گاہیں کھول کر بیٹھ گئے انہوں نے افراد کی صلاحیتیں دیکھ کر انہیں ظاہر و باطن کے علوم سے بہرہ ور کیا اور تبلیغ اسلام کے لیے اپنے شاگردوں اور خلفا کو ملک کے کونے کونے میں بھیجا۔

اسلامی عہد کے صرف لاہور میں بسنے والے متوکل باللہ اساتذہ کی اگر ایک فہرست پیش کر کے ان کے حالات زندگی تحریر کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ مثلاً اکبری عہد کے شیخ سعد اللہ رحہ، شیخ اسحاق کاکو رحہ، ملا جمال تلوی رحہ، شیخ منصور لاہوری رحہ، شیخ معلوم لاہوری رحہ اور مولانا اللہ داد لنگر خانی کو کون نہیں جانتا جہانگیر کے عہد میں ملا عبدالسلام لاہوری۔ شاہ جہان کے عہد میں مدرسہ دائی لاڈو، درس میاں وڈا، مدرسہ وزیر خان، مدرسہ میانی صاحب اور مدرسہ خیر گڑھ دینی علوم کے مرکز تھے۔ اور اساتذہ میں شیخ عبدالکریم چشتی لاہوری اور شیخ جان محمد لاہوری مشہور ہستیاں تھیں۔ اسی طرح اورنگ زیب کے عہد میں شیخ عبدالعزیز و شاہ عنایت قادری رنجیت سنگھ کے زمانے میں خلیفہ غلام رسول و خلیفہ غلام اللہ اور مولوی غلام فرید صاحب۔

مندرجہ ذیل گوشوارہ ۱۸۴۹ء کا ہے جبکہ انگریز لاہور پر قابض ہو گئے۔ اس سے بخوبی ظاہر ہو جائیگا کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی لاہور کا تعلیمی ماحول کس قسم کا تھا۔

شہر لاہور کی آبادی	پچاس ہزار
فارسی سکول	ایک سو سولہ (۱۱۶)
عربی سکول	چھتیس (۳۶)
عربی فارسی مشترکہ سکول	چوالیس (۴۴)
شاستری سکول	اڑتیس (۳۸)

اس وقت لاہور کی آبادی تیرہ لاکھ ہے۔ اور لاہور کی تعلیمی درس گاہیں ناظرین کی نگاہ سے پوشیدہ

نہیں۔ بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علمی لحاظ سے کتنے آگے بڑھے ہیں۔

خدا جانے وہ لوگ کن صلاحیتوں کے مالک تھے کہ ان کی گذر اوقات توکل پر تھی۔ نہ وہ شاگردوں سے فیس لیتے تھے اور نہ والدین سے چندہ اور نہ ان کی تنخواہوں کے سکیل مقرر تھے۔ بادشاہ انہیں درباروں میں بلاتے تھے تو وہ نہ جاتے تھے۔ اگر بادشاہ یا والیِ ملک نذر پیش کرتے تو وہ انکار کر دیتے۔ اس کے باوجود ان کی بڑی لمبی لمبی عمریں ہوئیں اور لاکھوں بندگانِ خدا ان سے مستفیض ہوتے ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

٭

تدریس میں نفسیاتی اصولوں کا استعمال

مس اے ایم حسین لیکچرر نفسیات سنٹرل ٹریننگ کالج

۱۔ تعلیم کا روایتی نظریہ

قدیم نظریے کے مطابق بچے کو سبق پڑھانا، سبق کو دوہرانا، مشق کرنا اور پھر اس سبق کو سن لینا ہی تعلیم کا مقصد تھا۔ بچوں میں جو رویہ پیدا کیا جاتا ہے وہ دراصل استاد کا نظریہ ہوتا ہے۔ استاد کے خیالات کے مطابق ہی بچے کو درس دیا جاتا ہے اور اس وقت استاد کا یہی نظریہ تھا کہ درس و تدریس میں بچہ ایک غیر فعال عنصر بنا رہے

استاد کے فرائض :۔ استاد کے فرائض صرف یہ سمجھے جاتے تھے کہ وہ سبق پڑھائے اور بچہ اسے سن لے وہ بچوں کو کورس کی کتابوں کا رٹا لگوا دیتا اور بچہ اپنی رٹی ہوئی چیزیں امتحان کے وقت زبانی یا پرچے پر دوہرا دیتا۔

۲۔ جدید تعلیمی نظریہ

جدید تعلیمی نظریہ بچے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ بچہ صرف سیکھتا ہی نہیں بلکہ پوری سرگرمی سے حصہ لیتا ہے بچہ (ACTIVE LEARNER) ہے۔ بچہ ایک شخصیت ہے جو سنتا ہے۔ محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے
اب تعلیم کا ماحول بدل چکا ہے اور تعلیم سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ بچے کو مواقع مہیا کیے جائیں جن کی مدد سے وہ اپنی ضروریات، خواہشات، رجحانات اور میلانات کے مطابق اپنی شخصیت کی تکمیل کرے۔

استاد کے فرائض :۔ اب جدید نظریۂ تعلیم کے تحت استاد کے فرائض بھی تبدیل ہو گئے ہیں، اس کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں اور یہ ضروری ہو گیا ہے کہ استاد اپنا ذہنی رجحان بھی بدل دے اور مندرجہ ذیل چند باتوں کا خاص خیال رکھے۔

(۱)۔ انسانی قدروں کو سمجھنا ضروری ہے۔

(۲) معلم بچے کی ذہنی، جذباتی اور جسمانی صلاحیتوں کو سمجھے۔ اس کے ذہن میں یہ واضح تصور موجود ہو کہ تعلیم و تدریس سے کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جہاں طرز تعلیم اور طریق تدریس اور نفس مضمون جاننے کی ضرورت ہے، وہاں بچے کی نشو و نما، بچے کی صلاحیتیں اور اس کی ذہانت کے متعلق بھی جاننا ضروری ہے۔ اچھا معلم وہ ہے جو نفسیاتی اصولوں کو تعلیم و تدریس میں استعمال کرنا جانتا ہو۔

(۳) معلم بچوں کی رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہو۔

(۴) استاد کا واسطہ انسانوں سے پڑتا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں ایسے افراد ہیں جو سوسائٹی (معاشرہ) کے رکن بھی ہیں۔ پیدائش سے لے کر موت تک فرد و معاشرے کا آپس میں گہرا تعلق رہتا ہے۔ اور یہ تعلق ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہر انسان کا کردار ان اثرات ہی کے تحت تشکیل پاتا ہے۔ اس لیے انسان اور اس کے کردار اور رویّات کو سمجھنا ضروری ہے۔

(۵) تعلیم بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ہی شروع ہو جاتی ہے۔ جب بچہ اسکول میں آتا ہے تو وہ چند ایک چیزیں سیکھ چکا ہوتا ہے۔ اسے اپنے ماحول سے کچھ واقفیت ہوتی ہے۔ زبان پر بھی کافی عبور حاصل ہوتا ہے۔ کم از کم وہ اتنی زبان ضرور جانتا ہے کہ اپنی بات کہہ سکے اور دوسروں کا مطلب کسی حد تک سمجھ سکے۔ وہ اپنی اور اپنے ارد گرد کے لوگوں کے باہمی تعلقات کے متعلق بھی کچھ سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ مثلاً اگر وہ وہی کرے جو اس کی امی کہتی ہے تو امی ناراض نہیں ہوں گی اور اگر وہ کسی کو نہ مارے تو کوئی بھی اسے نہیں مارے گا۔

۳۔ نفسیاتی نقطہ نگاہ سے تعلیم کا مفہوم

از روئے نفسیات تعلیم سے مراد "تبدیلی" یا تبدیلیاں ہیں۔ جو کہ انسانی کردار میں ظاہر ہوتی ہیں۔ تعلیم سماجیت (SOCIALIZATION) کی ترویج ہے۔ تعلیم معاشرتی سلیقہ ہے۔ یہ وہ سرگرمی یا وہ عمل (PROCESS) ہے جس سے انسان معاشرے کا رکن بننا سیکھتا ہے۔ معاشرے کے رسم و رواج قوانین، مذہبی عقیدے اور زبان سیکھتا ہے۔ تعلیم جہاں سماجی نظریات کی ترویج ہے وہاں انفرادی حیثیت سے شخصیت کی تکمیل بھی ہے۔

ہر معاشرہ اپنے بچوں کو ایک خاص ڈھب پر ڈھالتا ہے۔ ہر معاشرے کا نظام کچھ ایسا ہوتا ہے کہ بچے کی تربیت اس معاشرے کے مطابق ہو سکے۔ بعض اوقات بچہ اپنے والد کے ساتھ کام کرتا ہے تاکہ بڑا ہو کر وہ کام کو جاری رکھ سکے۔

تعلیم کے سلسلے میں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ بچہ کمرۂ جماعت میں پڑھنا سیکھنے وقت اس کے علاوہ بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ اسے اپنے گردوپیش کا احساس بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اُسے استاد کا طریق تعلیم اور طرزِ گفتگو اور اپنے ساتھیوں کا شعور پسند ہے یا نہیں، اسے یہ بھی احساس پیدا ہوتا ہے کہ پڑھنا ایک خوش آئند مسئلہ ہے یا ایک مصیبت۔

اسکول کی خاص ذمہ داریاں : ۔ معاشرتی اقدار کا تعلم ایک طویل عمل ہے۔ سب کچھ ایک دن میں نہیں سیکھا جاتا۔ یہ لگاتار جاری رہتا ہے۔ اس میں سکول پر خاص ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ سکول لکھنا، پڑھنا اور گنتی سکھانے کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ معاشرتی علم، تاریخ، جغرافیہ اور شہریت کے مضامین کی معلومات فراہم کرنا سکول کے ذمہ ہے۔ دوسرا سکول کے ذمہ یہ کام ہے کہ معاشرے کے دوسرے رکن جو کام کر رہے ہیں ان کے کام کی تکمیل میں سہارا دے۔ بسا اوقات سکول کی منظم سرگرمیاں محلے اور گھر کے ناقص ماحول کی کمی کو پورا کر دیتی ہیں۔

سماجیت کے مقاصد : ۔

(i) **جسمانی صحت** :۔ بچہ اپنے جسم کی حفاظت کر سکے۔ مثلاً وہ یہ سمجھ لے کہ آگ خطرناک ہے اور اس سے بچنا ضروری ہے۔ راستہ پر چلتے ہوئے سڑک پر چلنے کے اصولوں کا خیال ضروری ہے وغیرہ وغیرہ۔

(ii) **معاشرتی قدروں کا فہم** :۔ اچھے کردار (GOOD BEHAVIOUR) کی بنیاد معاشرے کی قدروں کو ماننا ہے۔ مثال کے طور پر دوسروں کا خیال رکھنا۔ بڑوں کی عزت کرنا۔ سچ بولنا اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے قربانیاں کرنا۔

(iii) **مسئلوں کو سلجھانے کا شعور** :۔ سکول کے ذمہ یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ بچوں کو حیثیت بنائے ان میں خود اعتمادی پیدا کرے جو معلومات بچوں کو بہم پہنچائی جائیں مناسب اور کارآمد ہوں

اس کے ساتھ ہی بچوں کو ان معلومات کا استعمال بھی آنا چاہیے ورنہ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ مسئلوں کو سلجھانے سے مراد یہ ہوتی کہ بچہ مختلف حالات (SITUATIONS) میں اپنی مشکلات سے عہدہ برآ ہو سکے۔

(IV) خودداری وخود اعتمادی :۔ وہ بچہ جو بہت جلد ہمت ہار دیتا ہے یا جس کا نصب العین بہت پست ہوتا ہے یا جو بچہ کام سے گھبراتا ہے۔ وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کسی چیز کی کمی ہے۔ وہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ یا جن کے ساتھ وہ کام کرتا ہے اسے اس پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ کام نہ کرے کیوں کہ اگر وہ کام کرتا ہے اور بدقسمتی سے غلطی کر بیٹھتا ہے تو اس کی شامت آجاتی ہے۔ اسے ڈانٹا جاتا ہے اس پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ اس لیے آسان طریقہ بچے کی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ کام سے بھاگ ہی جایا کرے۔ سکول یہ خامی دور کر سکتا ہے۔ بچے کو ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں کہ اسے کامیابی کی خوشی حاصل ہو سکے اور اس طرح یقیناً اس میں خود اعتمادی پیدا ہو سکتی ہے۔ خود اعتمادی کے ساتھ خودداری کا بھی گہرا تعلق ہے۔ جب بچہ کامیابی حاصل کرتا ہے تو اس کی قدر اپنی نظروں میں بڑھ جاتی ہے اور وہ اگلی دفعہ خوشی اور شوق سے کام کرتا ہے اور اپنے آپ پر فخر محسوس کرتا ہے۔

(V) دوسروں کے حقوق کا احترام :۔ دنیا میں امن وامان کے قیام کے لیے اور معاشرتی نظام کو برقرار رکھنے کی خاطر دوسروں کے حقوق کا پاس ولحاظ نہایت ضروری ہے لیکن ڈر کے ذریعہ دوسرے کے حقوق کا احترام کروانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ سکول روزمرہ کی زندگی میں اس کا سبق دے سکتا ہے۔

(VI) نصب العین اور مشاغل :۔ بچے کے شوق ہمیشہ دوسروں کے مرہون منت ہوتے ہیں اور بہت سے ایسے شوق بچے کا نصب العین بن جاتے ہیں۔ اسکول میں استاد کی شخصیت ایک نمونے (MODEL) کی ہوتی ہے۔ اگر بچے ایک استاد کو پسند کرتے ہیں تو اس کی سب خوبیاں اپنا لیتے ہیں۔

تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ بچے میں اتنی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے ماحول اور گردوپیش سے

مطابقت پیدا کر سکے۔

۴۔ نفسیات

نفسیات ایک علم ہے ایسا علم جس کی مدد سے انسانی فطرت کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ انسانی کردار اور فطرت بچے کی نشوونما، اس کی ضروریات، صلاحیتیں، ذہانت اور رجحانات کے سمجھنے میں نفسیات سے مدد ملتی ہے۔

نفسیات کو ہم تعلیمی مسائل حل کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ نفسیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچے کو کب، کہاں اور کیوں کر تعلیم دی جائے تاکہ موثر ثابت ہو۔

۵۔ نفسیات اور تدریس

استاد اور تعلم میں ایک گہرا رابطہ ہے۔ یہ مانا کہ کوئی استاد بچے کی جگہ خود نہیں پڑھ سکتا۔ لیکن وہ تدریس کو موثر بنا سکتا ہے۔ بچے کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ بچے کو شوق دلا سکتا ہے تاکہ وہ ایک فعال متعلم (ACTIVE LEARNER) بن جائے۔

استاد اپنی مخصوص تدابیر اور تخیل بروئے کار لا کر بچے کے لیے ایسے مواقع فراہم کر سکتا ہے کہ اس کی معلومات اور تجربہ میں بیش از بیش اضافہ ہو۔ استاد کی جانچ اس سے نہیں ہو سکتی کہ وہ کتنے گھنٹے پڑھاتا ہے یا کورس کے کتنے گھنٹے پڑھا چکا ہے۔ استاد کی صحیح جانچ اور قدر اس سے معلوم ہو سکتی ہے کہ اس کا بچے پر کیا اثر ہوا (TOTAL INFLUENCE)

ایک قابل استاد ایک تخلیقی فن کار، سائنسدان اور ماہر کاریگر ہوتا ہے۔

تدریس کے نفسیاتی پہلو:۔ استاد جب نفسیاتی اصولوں کو تدریس میں عملی طور پر پیش کرتا ہے تو اس کے فرائض یہ ہوتے ہیں۔

ا۔ بچوں کی رہنمائی کرے اور انھیں راستہ دکھائے، اس سے مراد یہ ہوئی کہ بچے کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنے ماحول کو موثر انداز سے نبٹ سکے اور ماحول سے مطابقت پیدا کر سکے۔ استاد کمرۂ جماعت میں تیاری کرتا ہے۔ سبق کے لیے ضروری چیزیں مہیا کرتا ہے اور بچوں کی ہمت بڑھاتا ہے

ب ۔ استاد بچوں کو شوق دلائے یا بچوں میں شوق پیدا کرے ۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ بچوں کی دلچسپی اور خوشی کے مطابق درس دے۔ جذباتی تسکین کو نفسیات بہت اہم قرار دیتی ہے۔ معلم بچوں کو توجہ مبذول کرائے۔ بچوں کو انفرادی توجہ دے اور اپنے طریقہ تدریس میں مناسب تبدیلیاں پیدا کرے ۔

ج ۔ استاد بچوں میں پسندیدہ رویہ (ATTITUDE) اور نظریہ پیدا کرے ۔

رویہ اور نظریہ ایک حادثہ کے طور پہ پیدا نہیں ہوتا۔ روزمرہ کی زندگی کا اثر اور جذباتی لگاؤ بھی اس میں شامل ہوتا ہے ۔

استاد کے لیے یہ ایک چیلنج ہے کہ وہ بچہ اپنی انفرادی حیثیت بھی قائم رکھے۔ شخصیت کی نشوونما اپنی صلاحیتوں اور ضروریات کے مطابق مکمل کرے اور معاشرے کی قدریں بھی اپنے اندر سموئے ۔

استاد بچے کی نشوونما کا خیال رکھے اور بچے کی ذہنی جسمانی آمادگی کے مطابق تدریس کرے۔ بچہ جب سیکھنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ اس وقت اسے سیکھنے سے خوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔ نفس مضمون کو ترتیب وار پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ سبق کو پیش کرتے وقت بچے کا خیال بہت ضروری ہے۔ اس میں بچے کے پس منظر کا بھی دھیان رہنا چاہیے ۔

د ۔ استاد اپنے اندر ذاتی اور شخصی خوبیاں پیدا کرے ۔

۱۔ ذہانت کو کام میں لائے ——— (۲) قوت مشاہدہ تیز کرے ۔

۳ ۔ انسانی فطرت اور کردار کو بھی سمجھے ۔ ظاہری طرزِ عمل سے یہ اندازہ لگا سکے کہ اصل وجہ کیا ہے۔

۴ ۔ اپنے رفقائے کار سے تعلقات خوش گوار رکھے ۔

۵ ۔ خوبیاں پیدا کرے ، جو بچے پسند کرتے ہیں ۔ مثلاً مہربان ہو۔ خوش مزاج ۔ اور خوش طبع ہو منصف مستقل مزاج ۔ غیر جانبدار اور ٹھہری ہوئی طبیعت کا مالک ہو۔ لباس صاف ستھرا اور موزوں ہو۔ مددگار۔ ہمدرد اور دیانت دار ہو۔

۶ ۔ تربیت یافتہ ہونے کے بعد استاد کی تعلیم ختم نہیں ہو جاتی ۔ اپنے ذہن کو مسلسل بڑھنے کا موقع دینا چاہیے ۔

معاشرہ اور مدرس

محمد صدیق احمد لیکچرار ایڈیلیوایٹرز کالج لائلپور

معاشرہ اور مدرس لازم و ملزوم ہیں۔ کیوں کہ بہرحال مدرس معاشرے کا ہی ایک فرد ہوتا ہے جس معاشرے میں کسی مدرس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذارا ہو وہ اسی معاشرہ میں خوش رہتا ہے اور مفید کام سرانجام دے سکتا ہے۔ اگر اسے کسی غیر مانوس ماحول میں بھیج دیا جائے تو اسے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے میں کافی وقت صرف کرنا پڑے گا۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدرس اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ ناامیدی اور مایوسی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اس طرح اُس کی عملی تدریس پر بھی نمایاں طور پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک مدرس کے لیے مدرسہ طلبا اور معاشرہ کی کونسی اہم باتوں کا علم ضروری ہے ان باتوں کا علم حاصل کرنے کے لیے اسے کیا کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں؟ اور اگر وہ ان باتوں کو جان لے تو اسے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ کہ اس کی تدریس مفید و با مقصد ثابت ہو سکے۔

غالباً یہ تو سب ہی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک معاشرہ یا سوسائٹی دوسرے معاشرے یا سوسائٹی سے عموماً مختلف ہوتا ہے۔ ایک معاشرے کے حالات اور عوامل پوری طرح کسی دوسرے معاشرے کے حالات و عوامل سے مطابق نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے ایک مدرس جو ایک خاص ماحول کا عادی ہو چکا۔ کسی دوسرے ماحول میں جاتے ہی اپنے سامنے اَن گنت مسائل دیکھتا ہے جن کو حل کرنے میں اس کا بیشتر وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے تو یقیناً وہ ایک اچھا مدرس بن ہی نہیں سکتا۔ موثر تدریس کے لیے مدرس کا ماحول سے سمجھوتہ کرنا لازمی امر ہے۔ اسے دیکھنا پڑتا ہے کہ جن بچوں کا کام اس کے سپرد کیا گیا ہے وہ کس ماحول سے آئے ہیں۔ ان کے والدین کس قسم کے لوگ ہیں؟

مدرسین سے کیا کیا توقعات وابستہ کر رکھی ہیں؟ ان کے مذہبی، سیاسی اور اخلاقی نظریات اور رسم و رواج کیا ہیں؟ یہی نہیں بلکہ اسے یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے ساتھی اساتذہ کا رویہ کیسا ہے؟ کیا وہ آپس میں تعاون کرتے ہیں؟ کیا وہ اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں یا ادنیٰ جبلتوں کے حامل ہیں؟ یا یہ تنگ نظر، قدامت پسند، مغرور اور جھگڑالو ہیں؟ کیا مدرسہ کی منتظمہ طلبہ اور اساتذہ کے مسائل پر ہمدردی کے ساتھ غور و خوض کرنے کی متحمل ہوتی ہے؟ یا منتظمہ کا رویہ آمرانہ ہے؟

اچھا مدرس انتہائی نامساعد حالات میں بھی صورت حال کو اپنے لیے بہتر بنا سکتا ہے۔ اگر وہ کچھ سمجھ بوجھ رکھتا ہے اور اس کا ذہن تبدیلیوں کو قبول کرنے کا اہل ہے تو اسے نئے ماحول اور معاشرے میں چنداں تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ وہ تھوڑی سی کوشش سے معاشرے کو اپنے مقصد سے ہم آہنگ کر سکے گا۔ اس کی طرف سے صرف مخلصانہ کوشش اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ جس ماحول میں اسے قوم کے نونہالوں کی تربیت و تعلیم کا اہم فریضہ تفویض کیا گیا ہے اس کے افراد اساتذہ سے کیا توقعات وابستہ رکھے ہوئے ہیں؟ ان کے نزدیک اساتذہ کا کردار کیا ہونا چاہیے۔ یہ مانا کہ عوام یا بچوں کے والدین مدرس کو ایک فوق البشر شخصیت کے روپ میں دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں؛ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کے اساتذہ یا معلمین پیغمبروں جیسی خصوصیات کے حامل ہوں اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ اساتذہ ان کے مقرر کردہ معیار شرافت و علم پر پورا نہیں اترتا تو مایوسی کا شکار ہو کر اساتذہ کو من حیث القوم قابل مذمت تصور کرنے لگتے ہیں اور اس طرح اساتذہ و عوام کے درمیان منافرت و نفرت کی وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے۔

جس طرح بچوں کے والدین اساتذہ سے کچھ امیدیں رکھتے ہیں اسی طرح اساتذہ بھی بچوں کے والدین سے کچھ توقعات رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ عوام کا رویہ ان کے ساتھ ہمدردانہ ہو۔ وہ انھیں بھی انسان سمجھیں اور ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کریں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ معاشرے کے افراد یا والدین انھیں درخور اعتنا نہیں سمجھتے، وہ ان کے مسائل سے چشم پوشی کرتے ہیں اور وقت بے وقت ان کو ہدف تنقید بناتے رہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر کچھ ایسی حرکات سے

مرتکب ہوتے ہیں جو اساتذہ کی شایانِ شان نہیں ہوتیں؛ جو بہرصورت افسوس ناک ہے۔

معاشرے اور مدرسین کے تعلقات عملی تدریس کے لیے بہت اہم اور دور رس نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لیے اس پر نہایت احتیاط سے غور کرنے کے بعد اساتذہ کو ایسا لائحہ عمل تجویز کرنا چاہیے جس پر عمل پیرا ہو کر وہ معاشرے کو اپنے لیے مفید تر بنا سکیں۔ اس کے لیے مدرسین کا سوسائٹی کے حالات سے کما حقہٗ واقف ہونا ضروری ہے۔ اس کو حتی الامکان خود کو ان حالات کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنا چاہیے دوسری طرف عوام کو اساتذہ کے مسائل کو سمجھنا اور ان کی مدد کرنا چاہیے۔ "افہام و تفہیم سے ہی معاملات سلجھ سکتے ہیں" کچھ دو کچھ لو کے اصول کو اپنا کر ہی عمل تدریس کو مفید اور بانتیجہ بنایا جا سکتا ہے۔

میرے خیال میں مندرجہ ذیل امور اساتذہ، طلبہ اور عوام کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں:

۱۔ سکول میں جمہوری ماحول جاری و ساری ہونا چاہیے جہاں ہر ایک کو اپنی رائے کے آزادانہ اظہار کا حق حاصل ہو۔

۲۔ اساتذہ پر اتنی کڑی نگرانی نہ ہو کہ وہ ان کی ذہنی صلاحیتوں کو کند کر کے رکھ دے۔

۳۔ نصاب کی تیاری اور سکول کے عام معاملات میں اساتذہ، منتظمہ، عوام اور طلبہ کا تعاون ضروری ہے۔

۴۔ اساتذہ کو طلبہ سے انفرادی طور پر اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے اس کے لیے ٹیوٹوریل سسٹم کافی مفید ثابت ہوتا ہے۔

۵۔ یوم والدین اور دیگر مواقع پر عوام اور مدرسین کا ایک دوسرے سے ملاقات اور تبادلہ خیالات ہونا چاہیے۔ اس طرح مدرسین اور عوام کے تعلقات بہتر بنائے جا سکتے ہیں۔

۶۔ مختلف مضامین اور مسائل پر کانفرنسیں، تعلیمی ورکشاپ اور مباحثے حل مسائل میں مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

۷۔ سکول کے مختلف مضامین کے اساتذہ کی آپس میں اکثر اوقات ملاقاتیں مشترکہ مسائل کے حل میں مدد دے سکتی ہیں۔

۸۔ ہر نئے استاد کو پرانے اور تجربہ کار اساتذہ کی نگرانی درکار ہوتی ہے تاکہ وہ سکول کے مسائل میں نئے

استاد کی مدد کریں اس کو ہدایات دیں اور مناسب نصیحتیں کریں۔ لیکن ضروری ہے کہ ان کا رویہ نئے استاد کے لیے ہمدردانہ ہو۔

۹۔ ہر استاد کو طلبہ سے متعلق تمام ضروری معلومات عمل تدریس شروع ہونے سے پہلے ہی مہیا کر دینا چاہیے۔

۱۰۔ سکول کے میگزین یا رسالے کے ذریعہ سکول اور معاشرے کے حالات و مسائل سے مدرسین کو واقف کرا دینا ضروری ہے۔

۱۱۔ سکول کی منتظمہ کو وقتاً فوقتاً میٹنگ بلا کر اساتذہ کو سکول کے انتظام و انصرام میں حصہ لینے کا مناسب موقع فراہم کرنا لازم ہے۔

۱۲۔ سکول کی منتظمہ کو اساتذہ کی ضروریات اور سہولتیں وغیرہ کی عادات کا خیال رکھتے ہوئے ان کے مہیا کرنے کا انتظام کرنا چاہیے۔

۱۳۔ سکول کے منتظمین اور حکام کا رویہ آمرانہ نہیں ہونا چاہیے۔ ان کو اپنے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رکھنے چاہئیں۔ ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ جو بھی اور جس وقت بھی ان سے ملنا چاہے مل سکے۔

۱۴۔ سکول کے افسر اعلیٰ کو چاہیے کہ عوام اور پرانے ریٹائرڈ مدرسین سے مل کر اساتذہ اور عوام کے باہمی تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کرے۔

۱۵۔ منتظمہ کو ان پروجیکٹوں میں ذاتی طور پر دلچسپی لینی چاہیے جو اساتذہ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہوں۔ اس کے لیے ان کی مناسب امداد اور رہنمائی کرنی چاہیے۔

۱۶۔ اساتذہ اور منتظمہ کے مشترکہ اجلاس وقتاً فوقتاً اور مناسب وقفوں کے بعد مسلسل جاری رہنے چاہئیں۔

۱۷۔ منتظمہ کو اساتذہ، والدین اور طلبہ کی مشکلات کے حل کے واسطے ان کی حمایت اور امداد کرنی چاہیے۔

یہ ہیں وہ ضروری باتیں جن پر عمل پیرا ہو کر عوام و اساتذہ کے تعلقات کو بہتر اور عمل تدریس کو مفید و بامقصد بنایا جا سکتا ہے۔

آثارِ خوش خوانی

سید کوثر حسین

مطالعے کی دو قسمیں

زبان و ادب کے سیکھنے سکھانے میں مختلف اصنافِ سخن سے واسطہ پڑتا ہے۔ کبھی نظم ہے تو کبھی نثر کبھی ڈرامہ ہے تو کبھی افسانہ، اور کبھی اور کچھ۔ مگر باعتبارِ کیفیت ان کے مطالعے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ اول سرسری مطالعہ، دوم گہرا مطالعہ۔ مطالعے کی ان ہر دو اقسام کا مواد، مقصد اور منہاج ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جو قطعۂ نظم یا پارۂ نثر سادہ و سلیس ہو اس کا سرسری مطالعہ کفایت کرتا ہے۔ رنگین و ادق اندازِ بیان سمجھنے کے لیے گہرے مطالعے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر زیرِ مطالعہ مواد کے ہر پہلو سے آگاہی مقصود ہو تو گہرے مطالعے کے بغیر کام نہیں چلتا۔ البتہ معمولی واقفیت جو آسان عبارت کے مفہوم تک محدود ہو سرسری مطالعے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

سرسری مطالعہ

سرسری مطالعے کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ پیشِ نظر عبارت کا مفہوم جلد از جلد سمجھ لیا جائے۔ عبارت کی زبان اور اندازِ بیان سے کچھ غرض نہیں ہوتی، صرف زود خوانی اور زود فہمی مقصود رہتی ہے اور مطالعے کی رفتار تیز کرنے کے لیے حرکتِ زبان اور جنبشِ لب سے بھی اجتناب کیا جاتا ہے۔ عبارت کو دیکھ کر دل ہی دل میں (بلکہ آنکھوں ہی آنکھوں میں) قراءت کی جاتی ہے۔ گویا سرسری مطالعہ ایک خاموش مطالعہ ہے۔

دیکھا جائے تو سرسری مطالعے کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ بہت کچھ ہے۔ اس قسم کا مطالعہ ہماری معاشی اور معاشرتی ضرورت کی پیداوار ہے۔ اخبار دیکھنا، رسائل و اطلاعات پڑھنا، کچہریوں اور دفتروں میں بے شمار رپورٹوں کا معائنہ کرنا، خاموش مطالعے کا ہی منت پذیر ہے۔ اسی لیے مدرسے میں طلبہ کو خاموش

ے کی تربیت دی جاتی ہے۔ معلم سبق (مثلاً کہانی) کا ابتدائی حصہ زبانی بتاکر اور سبق کی عادت سکھاکر و پڑھنے کا شوق دلاتا ہے اور جب طلبہ پڑھ چکتے ہیں تو معلم سوالات کے ذریعے اس کا جائزہ لیتا ہے کہ طلبا ت کا مفہوم سمجھ گئے ہیں یا نہیں۔ اس قسم کے مطالعے میں۔ عبارت کو آواز پڑھنے کی نوبت آتی ہے نہ طلبہ کی نعاد قرأت اور ان کے لب ولہجہ کی صحت کا پتہ چلتا ہے۔

مطالعہ

گہرے مطالعے کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ زیرِ مطالعہ نظم یا نثر کا اچھی طرح پڑھنا، سمجھنا اور اس کی لفظی اد و معنوی خوبیوں کا پرکھنا آ جائے۔ اس لیے گہرے مطالعے کی تین منزلیں ہیں: قرأت، تفہیم اور استحسان۔

معلم سب سے پہلے تحریکِ ذہنی کے سہارے طلبہ کو سبق کی طرف مائل کرتا ہے۔ سوالات کے ذریعہ ان کی بقہ معلومات کا جائزہ لیتا ہے اور بعد ازاں سبق کا پس منظر (اگر ضرورت ہو) بیان کرکے سبق کا عنوان نا، اور سبق کی اہمیت اور اس کے قابلِ غور نکات پر توجہ دلاتا ہے۔ اس کے بعد معلم عبارت کا ایک حصہ پڑھ کر نہ قرأت پیش کرتا ہے۔ دو تین طالب علم یکے بعد دیگرے جماعت کے سامنے نمونۂ قرأت کے مطابق بلند آواز سے عبارت خوانی کرتے ہیں۔

دوسری منزل تفہیم سے تعلق رکھتی ہے جس میں معلم اپنے نفسیاتی علم کی روشنی میں۔ لغت معانی، تشریح و تنقید یا تلخیص کی مدد کرتا ہے۔

تیسری منزل استحسانِ عبارت سے متعلق ہے۔ ایک بار پھر عبارت کی قرأت کی جاتی ہے اور معلم طرزِ بیان کی خصوصیات اور الفاظ و معانی کے محاسن کی جانب توجہ دلاتا ہے۔ استحسان کے بعد اب تک جو کچھ پڑھا ہے اس کا جائزہ لیا جاتا ہے اور نئے الفاظ و محاورات کی مشق کرائی جاتی ہیں۔ اس طرح سبق کا اعادہ ہو جاتا ہے۔

گہرے مطالعے کا کوئی سبق قرأت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ قرأت نہ صرف قرأت کے لیے ضروری ہے بلکہ تفہیم و استحسانِ عبارت کے لیے ناگزیر ہے اور قرأت کی تعلیم معلم کے نمونۂ قرأت کی محتاج ہے۔

وہ قرأت جو گہرے مطالعے سے مخصوص ہے بلند خوانی کہلاتی ہے اور خاموش مطالعے کے برعکس

اعضائے صوت کی مدد سے عمل میں آتی ہے۔ اس وقت صرف بلند خوانی کے متعلق تفصیل سے کچھ عرض کرنا ہے۔ اچھی بلند خوانی کو خوش خوانی کہا جاتا ہے۔

خوش خوانی کے مقاصد

خوش خوانی کا پہلا مقصد ادبی استحسان میں اعانت کرنا ہے۔ خوش خوانی اپنی دل کشی اور دل آویزی کی وجہ سے نہ صرف سامعہ نوازی کرتی ہے بلکہ ذہن کو بھی سرور بخشتی ہے۔ نظم کا پورا حسن و جمال، خصائص کلام اور معانی میں غلطاں زیر و بم، صرف اسی وقت محسوس ہو سکتا ہے جب نظم کو آواز بلند پڑھا جائے۔ بلکہ نثر بھی اچھی بلند خوانی کی بدولت زیادہ پُر اثر اور خوش تر ہو جاتی ہے۔ خوش خوانی کی تربیت کا حصول ایک چشمۂ لطف و سرور کی دریافت کی مماثل ہے۔ سچ پوچھیے تو خوش خوانی اس مقصد کے تحت بلاغت کی کان اور استحسان کی جان ہے۔ جسے اس کا چسکا پڑ گیا وہ "من تو شدم تو من شدی" کے مصداق ایک دن ادبیات کی روح رواں بن کر رہے گا۔

خوش خوانی کا دوسرا مقصد خالص تدریسی نوعیت رکھتا ہے جس کی تکمیل ایک طرف خوش خوانی کرنے والے طالب علم کو اس عمل کا پھل دیتی ہے۔ دوسری طرف سننے والے طلبہ کو ان کی خاموش توجہ اور تنقید کا صلہ بخشتی ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ صحیح اندازِ تکلم کی تربیت اور ترتیل کی افزائش جو با آواز بلند پڑھنے سے بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کے سننے سے بھی۔ یہ قاری اور سامع، دونوں کو اسرارِ تلفظ بتاتی اور گفتگو کی موسیقی سکھاتی ہے۔

حُسنِ صوت

بلند خوانی تحریری علامات کو اصوات میں منتقل کرنے کا نام ہے اور یہ کام ہر عبارت خواں کر سکتا ہے۔ لیکن ہر شخص کی آواز منفرد ہوتی ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے۔ یہ آواز حسین و جمیل بھی ہو سکتی ہے اور قبیح اور کریہہ بھی۔ اس کا تعلق اگر قسمت یا عطیۂ فطرت سے نہیں تو جسمانی صحت سے ضرور ہے، اور مناسب ورزشوں اور مشقوں سے ایک حد تک اعضائے صوت کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اس وقت ہمیں خوش خوانی کی صرف ان خوبیوں سے بحث ہے جو تمام تر اکتسابی ہیں، یعنی توجہ، محنت اور مشق و مزاولت سے پیدا کی جا سکتی ہیں۔

خوش خوانی کے اجزائے ترکیبی

خوش خوانی کا دارومدار مندرجہ ذیل امور پر ہے۔ انھیں خوش خوانی کے اجزائے ترکیبی سمجھنا چاہیے

۱۔ صحتِ تلفظ :۔ خوش خوانی میں صحتِ تلفظ کو بڑی اہمیت ہے کیوں کہ تلفظ کی غلطی پوری قراءت پر پانی پھیر دیتی ہے اور قاری کی حیثیت کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ اس لیے تلفظ کی نگہداشت سب سے مقدم ہے۔

الفاظ حروف پر مشتمل ہوتے ہیں، اس لیے سب سے پہلے حروف کو ان کے صحیح مخرج سے ادا کرنے کی کوشش کی جائے اور قریب المخرج حروف میں امتیاز کر لیا جائے۔ کم سے کم ق ک۔ گ۔ غ اور س ش کی آوازوں کو خلط ملط ہونے نہ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ حروف کے صحیح اعراب (زبر، زیر، پیش) کا خیال بھی ضروری ہے۔ حرفِ متحرک کو ساکن اور حرفِ ساکن کو متحرک پڑھنے کی غلطی عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے مثلاً کَلَک بجائے کَلْک۔ غلَط بجائے غلْط۔ حفَظ بجائے حفْظ۔ بعض لوگ مقامی بولی کے اثر سے زبان کو اس طرح رگڑ کر بولتے ہیں کہ اس سے خواہ مخواہ ت یہ کی آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ٹوپی، بوتل وغیرہ۔ اس سے پرہیز لازم ہے۔ صحتِ تلفظ کے لیے حروف شمسی، حروف قمری اور واؤ معدولہ (جو بولا نہ جائے) کا علم اور تنوین، حرف موقوف یعنی جس حرف کا ماقبل جزم والا ہو، جیسے شب کا ب) حرفِ مدہ (یعنی جس حرفِ علت کی حرکتِ ماقبل موافق ہو جیسے نُور، باغ اور دین کی و۔ ا۔ ی) حرفِ لین (یعنی جس حرفِ علت کی حرکتِ ماقبل ناموافق ہو (جیسے موت، شور کا واؤ اور دیر، سیر کی ی) نونِ مخلوط (جو کلمے کے درمیان حرفِ ماقبل سے مل کر آواز دے۔ جیسے آنگ، پتنگ کا ن) نونِ غنہ (جو کلمے کے درمیان الف کے ساتھ اور کلمے کے آخر میں حرفِ علت کے ساتھ ناک میں بولا جائے (جیسے خواندہ، ماند، جہاں، نہیں کا ن) یائے معروف و واؤ معروف مجہول وغیرہ کی آوازوں سے پوری واقفیت ضروری ہے۔

اردو میں اعراب لگانے کا رواج کم ہے۔ اس لیے مبتدی کو قراءت میں سخت دشواری ہوتی ہے۔ علاوہ بر آں غیر ملکی الفاظ اردو میں اپنی آوازیں بدل چکے ہیں۔ مثلاً عربی کا مُوسِم اردو میں مَوسَم۔ لہٰذا تلفظ کی تحقیق کے لیے عربی اور فارسی لغات کی بجائے فرہنگِ آصفیہ یا فرہنگِ عامرہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے

۲۔ادراکِ رکن: ۔ بعض الفاظ یک رکنی ہوتے ہیں یعنی ان کا تلفظ منہ کی صرف ایک آواز سے ادا ہو جاتا ہے مثلاً دِل۔ گُل اور بعض الفاظ میں کئی کئی رکن ہوتے ہیں مثلاً دَلدَل۔ بُلبُل۔ کوشش جن میں دو دو رکن ہیں اور "طریقہ" جس میں تین رکن ہیں۔ اس طرح جب کسی لفظ میں ایک سے زیادہ رکن ہوں تو اس کے کسی رکن کی آواز خفیف اور کسی کی ثقیل ہوتی ہے اگرچہ کبھی کبھی رکنِ الفاظ کا تلفظ لحن کی ایک ہی سطح پر رہتا ہے۔ نہ کوئی رکن خفیف ہوتا ہے نہ کوئی رکن ثقیل۔ کیونکہ ان میں باہم کوئی فرق نہیں ہوتا مثلاً دَلدَل۔ بُلبُل۔ بکین جیسا (بچ۔ پنا) گودا (گو۔ دا) اور لہجہ (لہ۔ جہ) کے تلفظ میں پہلا رکن ثقیل ہے اور دوسرا رکن خفیف اگر تلفظ کے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے تو تلفظ مضحکہ خیز ہو جائے گا۔ "سلیقہ" میں تین رکن ہیں پہلا خفیف ہے۔ دوسرا ثقیل ہے اور تیسرا خفیف۔ رکنِ خفیف جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ نسبتاً آہستہ سے بولا جاتا ہے اور ثقیل نسبتاً زور سے۔

وہ رکن جس میں صرف ایک ہی حرف ہو وہ ہمیشہ خفیف ہی ہوتا ہے مثلاً نہ دمت دفن، رُوت، میں "خ" اور کلامِ غالب میں "ک" اور "م" حروف متحرکہ (مثلاً سے۔ ہے۔ پہ۔ میں۔ کرو وغیرہ) کی آوازیں جو رکنِ خفیف ہی بناتی ہیں۔ دراصل کسی لفظ کے صحیح تلفظ کے لیے صرف حرکات و سکنات کو ملحوظ رکھنا ہی کافی نہیں بلکہ ارکان کی نوعیت کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا جس رکنِ خفیف یا رکنِ ثقیل کا ذکر ہو رہا ہے اس کا فنِ عروض کی اصطلاحوں سے کوئی تعلق نہیں۔ فنِ عروض میں خفیف و ثقیل سبب و وتد کی نوعیت کا اظہار کرتے ہیں۔

۳۔ رموزِ اوقاف کی نگہداشت: ۔ خوش خوانی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ پڑھتے ہوئے رموزِ اوقاف کا خیال رکھا جائے۔ اگرچہ رموزِ اوقاف قواعد کے تجویز کردہ نشانات ہیں جن کا اصل مقصد جملے کی ساخت بتانا اور مختلف اجزائے جملہ کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ہے لیکن ان میں سے بعض نشانات ایسے ضرور ہیں جو عبارت خوانی کے دوران میں دم لینے کی منزل بتاتے ہیں۔ ان سے نگاہ اور زبان دونوں کو سہارا ملتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک خالص لسانی کام بھی انجام دیتے ہیں۔ یعنی معانی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ درمیان میں آکر ان الفاظ میں فصل پیدا کر دیتے ہیں جن کے گڈمڈ ہونے کا احتمال ہو۔

جس نقطے پر سکتے کا نشان (۔) ہو، اس کے آخری رکن پر زبان ذرا اوپر مڑ جاتی ہے جس سے یہ ظاہر رہتا ہے کہ جملہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ وقفے (؛) اور رابطے (:) پر دونوں ایک ہی سطح پر سنبھلے رہنے کا میلان ظاہر کرتی ہے۔ یہاں آواز ذرا زیادہ توقف کرتی ہے اور جملہ خاتمے کی جانب بڑھتا ہے۔

۴۔ **تغیرِ لحن** :۔ تکلم کا لحن سے وہی تعلق ہے جو موسیقی کا سرگم سے ہوتا ہے۔ جس طرح مردوں کا کان میں موسیقی کو دوبارہ دہرا لاتا ہے۔ اسی طرح لحن بھی تکلم کی تشکیل پیدا کرتا ہے۔ جو کوئی ناواقف محض موسیقی سے محظوظ ہو تو ہو سکتا ہے مگر اسے پوری طرح سمجھ نہیں سکتا اسی طرح وہ شخص جو زبان کے لب و لہجے سے ناواقف ہو۔ زبان کو اہلِ زبان کی طرح سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تکلم زبان پر پوری توجہ دی جائے اور کانوں کو گفتگو کے اچھے نمونے سننے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں صحیح نمونوں کا سننا اور ان کی تقلید کرنا ہی صحیح لسانی عادات پیدا کر سکتا ہے۔

یہ مانا کہ عام طور پر لہجے کی لغزش ایسی نہیں ہوتی کہ کلام کو بالکل ہی ناقابلِ فہم بنا دے۔ لیکن اس سے مفہوم ضرور مجروح ہو جاتا ہے بعض وقت لہجے کی تبدیلی کی بدولت ایک ہی لفظ سے سامع کے ذہن میں نہ صرف مختلف بلکہ متضاد معانی منتقل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ "خوب" مدح کے موقع پر بھی بولا جا سکتا ہے اور ذم کے ذیل میں بھی، بلکہ اسی لفظ سے مدح و ذم کے مختلف مدارج کا اظہار بھی ممکن ہے اور اس اظہار کی خوبی طرزِ ادا کے ہاتھ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لب و لہجہ گفتگو کی موسیقی کو صرف خارج از آہنگ ہونے سے باز رکھتا ہے بلکہ اس موسیقی کے اثر کی نگہداشت بھی کرتا ہے کون نہیں جانتا کہ غلط لب و لہجہ سے الفاظ و معانی میں منافرت پیدا ہو جاتی ہے اور لہجے کی نرمی یا سختی الفاظ کی معنویت کو کم یا زیادہ کر سکتی ہے۔ مہربانی کے الفاظ اگر درشت لہجے میں کہے جائیں تو طعن و تشنیع بن جاتے ہیں۔

خبریہ جملے کا لہجہ ... ہے۔ استفہامیہ کا ... جملے میں آواز ... بلندی سے پستی کی طرف آتی ہے۔ استفہامیہ جملے میں، اگر کوئی سوالیہ لفظ (مثلاً کیا، کون، کب وغیرہ موجود نہ ہوں) تو ان جملے کا آخری لفظ جملے کے لحن کا نقطۂ عروج ہوا کرتا ہے۔ اگر لحن کے اس ... جوابی انداز میں فرق آ جائے

تو جملہ مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ ذرا اس کا تصور کیجیے کہ ایک شخص جواب کے لہجے میں سوال کرتا ہے اور دوسرا شخص سوال کے لہجے میں جواب دیتا ہے۔

سوال :- آپ بازار جا رہے ہیں۔

جواب :- نہیں میں بازار نہیں جا رہا ہوں ؟

حکم اور درخواست میں بالعموم لحن ہی مابہ الامتیاز ہوا کرتا ہے۔ اگر دعائیہ جملے میں حکم کا سا لب و لہجہ آ جائے تو غلط نہیں گناہ ہے۔ "واہ" کہنے کا انداز کچھ اور ہے "آہ" کہنے کا انداز کچھ اور۔ استعجابیہ جملہ اگر استعجابیہ انداز سے ادا نہ ہو تو بے معنی ہے، یا گمراہ کن۔ حیرت، غم، خوشی اور اضطراب کی کیفیات اپنے اظہار کیلئے الفاظ سے زیادہ تغیر لحن کا سہارا لیتی ہیں۔

مسلسل عبارت میں اگر کوئی جملہ معترضہ یا بصورتِ اقتباس کوئی قول آ جائے تو بیان کا لہجہ بدلنا پڑتا ہے۔ تاکہ نقلِ قول کی تازگی قائم رہے اور خلطِ مباحث نہ پیدا ہو۔

۵۔ صفتِ روانی : ۔ خوش خوانی میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ جملے اس طرح ادا ہوں جس طرح عام طور پر گفتگو میں منہ سے نکلتے ہیں۔ جھجک یا رکاوٹ نہ ہو۔ جھٹکے نہ لگیں اور جملے کے درمیان بے موقع توقف نہ ہو۔ قراءت میں روانی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب پڑھنے والا الفاظ کی شکلوں اور مفہوم سے اچھی طرح واقف ہو۔ اور کوئی خارجی عامل مثلاً عبارت کا غیر واضح ہونا یا نقطوں کا نامناسب کام مانع نہ ہو۔

اگر عبارت خوانی کی رفتار بہت ہلکی ہو تو سننے والوں کو اس سے کوفت ہوتی ہے اور پڑھنے والا خود بھی اسے دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔ روانی کی صفت ذوقِ ادب کا بیش خیمہ ہے۔ اس سے علم و ادب میں ترقی کرنے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔

۶۔ اهتمام سنر تبل : ۔ خوش خوانی میں صرف روانی کافی نہیں کیونکہ پڑھنے کی حد سے زیادہ رفتار، عبارت کی خوبیوں کو ملیامیٹ کر دیتی ہے۔ بعض کم ذوق اس تیزی سے شعر پڑھ جاتے ہیں کہ شعر کی لطافت کا محسوس ہونا تو درکنار، مطلب کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سننے والے دیکھتے رہ جاتے ہیں

فاصلہ ایک دوسرے سے سر کرتا دیکھ کر جملوں میں ابتری پڑ جاتی ہے اور معانی و مطالب گھل کر رہ جاتے ہیں اس بے پروائی کے ہاتھوں نہ معلوم روزانہ کتنے خون ہوتے ہیں۔ مفہوم عبارت کی وضاحت کے لیے احتیاط طولانی کی رفتار کو معتدل رکھنا نہایت ضروری ہے۔

۷. تعینِ تاکید :- ہر جملے میں ایک نقطہ مفہوم کے اعتبار سے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ مفہوم کی وضاحت کے لیے پڑھتے وقت اس پر زور دینا ضروری ہے۔ اس زور یا تاکید کی بڑی اہمیت ہے۔ کیوں کہ ایک ہی جملے میں مختلف الفاظ پر زور دینے سے معانی بالکل مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً :-

آپ آج مضمون لکھ رہے ہیں = یعنی آج سے پہلے مضمون لکھ لینا چاہیے تھا۔

آج آپ مضمون لکھ رہے ہیں = یعنی اس سے قبل تو اور لوگ یا دوسرے لوگ مضمون لکھا کرتے تھے۔

آج آپ مضمون لکھ رہے ہیں = یعنی آج کا دن تو کچھ اور لکھنے یا کچھ اور کرنے کا تھا۔

آج آپ مضمون لکھ رہے ہیں = یعنی یہ تو آج سے بہت پہلے لکھا جا چکنا چاہیے تھا۔

۸- اصلی اور تعارفی جملوں میں امتیاز :- مقالے کی بلند خوانی میں ایک اور اصول ملحوظ رکھنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ جو جملے مقالے کی اصل عبارت کو متعارف کرنے کے لیے استعمال ہوئے ہیں انہیں نسبتاً دھیمے اور غیر منفعل لہجے کے ساتھ ادا کیا جائے۔

۹. جملوں کی گروہ پسندی کا لحاظ :- عبارت کے صرف وہی حصے بلا توقف یا لگاتار پڑھنے چاہئیں جو معنوی حیثیت سے ربط رکھتے ہوں۔ بالعموم دو تین جملوں میں ربط خاص ہوتا ہے۔ انھیں جملوں کا ایک گروہ سمجھنا چاہیے۔ ایک کے بعد دوسرا گروہ آتا ہے۔ چناں چہ ایک ہی پارۂ نثر میں متعدد گروہ ہو سکتے ہیں ہر گروہ کے درمیان نمایاں وقفہ ضروری ہے۔ جب ایک گروہ ختم ہو جائے تو قاری اطمینان سے پورا سانس لے سکتا ہے۔ درمیان میں سانس لینے سے قراءت کے فطری مد و جزر میں فرق آ جائے گا اور وہی بے کیفی پیدا ہو گی جو کسی مصرع کے مسکوت ہونے سے پیدا ہوتی ہے +

قومی سیرت کی تعمیر میں تاریخ کا حصہ

نذیر احمد

پاکستان تحریک کانفرنس کے ایک اہم اجلاس میں ایک جلیل القدر قومی رہنما نے کہا تھا: -

"مجھے آپ جیسے عالموں کے مجمع کو یہ بتانے کی حاجت نہیں کہ ہم دنیا کی اس عظیم ثقافت کے علم بردار ہیں جس نے زمانے کے اتار چڑھاؤ کے باوجود ایک حیرت انگیز قوت حیات کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن یہ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ وہی ثقافت جس نے اپنے زمانۂ اقبال میں مسعودی، البیرونی، ابن اثیر، طبری اور ابن خلدون جیسے جید عالم پیدا کیے تھے۔ کہ جن کا تبحر علمی صرف تاریخ تک ہی محدود نہ تھا، وہی ثقافت اپنے آخری دور میں اپنی وقائع نگاری کے لیے آرنلڈ، میور، سائکس، لین پول اور گلوم جیسے یورپی عالموں کی محتاج ہوگئی۔ گو ان مغربی عالموں کی بلند علمی صلاحیتوں میں کسی کو کلام نہیں، لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں مٹ سکتی کہ وہ ہماری ثقافت کی روح سے بے خبر تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر مقامات پر انہوں نے واقعات کو بُری طرح مسخ کیا ہے۔ اس سے زیادہ قابل افسوس امر یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں اسلامی تاریخ کو یا تو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا اور یا اسے بالکل ادنیٰ مقام دیا گیا۔ اس طرح مسلمان بچے کئی پشتوں تک ایسی درسی کتابوں سے تربیت پاتے رہے جو ان کی ماضی کو نہایت بھونڈے رنگ میں پیش کرتی تھیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل اپنے آبا و اجداد کے کارناموں پر فخر و مباہات کے جذبات سے بالکل خالی رہے، کیونکہ انہیں ان کارناموں کی خبر ہی نہ تھی۔ ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کو اس دوہری بدنصیبی سے نجات دلانا ہے۔ ماسوقہ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ پاکستان کے سب تاریخ داں اپنے مجموعی علم و فضل کو اس برعظیم کی ایک صحیح اور بے لاگ تاریخ لکھنے کے لیے وقف کر دیں۔ تاکہ اسلامی ثقافت کے ذہنی سرچشموں کی صحیح ترجمانی ہو سکے اور اس کے کارناموں کا جائزہ لیا جا سکے۔"

تاریخ کیا ہے؟

ان خیالات کی توضیح کرنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ ہم اس بات کو طے کر لیں کہ تاریخ سے مراد آخر کیا ہے؟ بے شک تاریخ سے مراد انسان کے ماضی کی کہانی ہے۔ مگر اس کہانی کا رنگ ہر زمانے میں مختلف رہا ہے قرون اولیٰ کا انسان اس کہانی میں اپنے آباؤ اجداد کے خدائی رنعاف دیکھنے کا خوگر تھا اس کے لیے قدرت کے پیچ در پیچ کارخانہ کی تشریح یہی تھی کہ جیسے ہمارے زمانے میں اس کے باپ دادا نے سورج، چاند، ہوا، بارش، بجلی اور دوسرے مظاہر قدرت سے جنگیں کیں اور انہیں اپنی اور اپنی نسل کی خدمت گذاری کے لیے رام کر لیا کبھی ان مظاہر قدرت کو اپنے ان بڑے بوڑھوں کی روحوں کا جلوہ خیال کیا جاتا تھا۔ ہندوستان، ایران، میکسیکو اور دوسرے ملکوں کی پرانی تاریخیں اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ان ملکوں کے حکمران سورج دیوتا کی اولاد ہونے کے دعویدار رہے اور ان کی نگاہ میں کوئی تاریخی کتاب جو اس عقیدے کو جھٹلانے والی ہو قابل اعتماد نہ ہو سکتی تھی۔

از منہ وسطیٰ میں آ کر دیکھیں تو یہاں بھی تاریخ انسان کی کہانی کو ایک ایسے ڈھنگ میں پیش کرتی ہے کہ وہ منطق بعید بن کر رہ جاتی ہے جس کی تھاہ کو پادریوں اور پروہتوں کے سوا اور کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب دیوی دیوتاؤں کی جگہ ایک برتر ہستی لے لی ہے جو کائنات عالم کی پیدا کرنے والی ہے وقتاً فوقتاً اپنے برگزیدہ بندے دنیا کو راستہ دکھانے کے لیے بھیجتی رہی ہے۔ مگر یہ برگزیدہ بندے اب بھی سطح زمین پر نہیں بلکہ ہوا اور بادلوں میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور قرون وسطیٰ کا انسان خوف و عقیدت سے سر جھکائے ان ناقابل فہم داستانوں کو گذرے ہوئے وقتوں کی سچی تاریخ خیال کرتا ہے۔ اس تاریخ کے بارے میں کسی عقلی شک و شبہ کو دل میں جگہ دینا گویا اپنے مذہب سے منہ موڑنا اور دوزخ میں جگہ خریدنا ہے۔

اسلام کی آمد

اسلام کے آتے ہی تاریخ ایک نئے باوقار دور میں داخل ہوتی ہے اور وہ دور اب تک باقی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہی دنیا کے وہ بانی مذہب ہیں جن کی شخصیت تاریخ کے اجالے میں نمودار ہوئی اور جن کا زمانہ بعد از بعثت کی زندگی کا ہر فعل تاریخ کی پوری روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مسلمان کی دینی اور دنیاوی نجات اسی میں ہے کہ وہ اسوۂ نبوی کی پوری پوری پیروی کرے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اسوۂ نبوی کو سچے اور بے لاگ رنگ میں

دیکھا جائے۔ اِس ضرورت نے تاریخ کو داستان قصے کہانیوں کی پست سطح سے اٹھا کر ایک باقاعدہ سائنس کے تجزیہ کے لیے ایسے اصول وضع کیے جو ہمیشہ کے لیے اِس کی بنیاد قرار پائے۔ اِس لحاظ سے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جدید علم تاریخ کے موجد مسلمان ہیں۔ دنیائے علم پر اسلام کا یہ احسان ہے جس کا اعتراف مخالفوں نے بھی کیا ہے۔ اگرچہ مسلمانوں نے علم کی دوسری شاخوں میں بھی قابلِ قدر اضافے کیے لیکن فن تاریخ نویسی میں انہوں نے ایک ایسی بلند تر کی بنیاد ڈالی جس سے بہتر کوئی اور راہ ذہن میں آ ہی نہیں سکتی، چونکہ مسلمان فنِ تاریخ نویسی کے ایجاد کرنے والے تھے۔ اِس لیے قدرتی طور پر بلند پایہ مورخوں کا جو گروہ اسلام نے پیدا کیا، ان کے علمی کمالات پر آج بھی دنیا انگشت بدنداں ہے۔

تاریخ کا جدید نظریہ

مسلمان مؤرخوں نے تاریخ کا جو نظریہ قائم کیا وہ یہ ہے کہ تاریخ کا مقصد واقعات کو بلا کم و کاست بیان کر دینا ہے اور بس۔ مؤرخ کے لیے لازم ہے کہ وہ ذاتی پسند کے پردے کو بیچ سے بالکل اٹھا دے اور مخالف و موافق سب شہادتوں کو اکٹھا کر کے بے لاگ عقل و منطق کی روشنی میں واقعات کو ایک زندہ تسلسل کی لڑی میں پرو دے جس کی ہر کڑی اپنے سیاق و سباق سے بدنی رشتے رکھتی ہو۔ اور جس کے نکل جانے سے سارے تسلسل میں ایک خلا پیدا ہو جائے۔ چونکہ انسانی زندگی ایک ایسی وحدت ہے جس کا ہر جزو دوسرے اجزا پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اِس لیے مؤرخ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ واقعات اور شخصیتوں کی ظاہری بھڑک میں کھو کر نہ رہ جائے۔ بلکہ زندگی کے ہر گوشے کو نگاہ میں رکھے اور سطحی شور اور ظاہری نمائش کی تہ میں ایسے گہرے مؤثرات کی تلاش کرے جن کے صدہا سالہ خاموش عمل سے دفعتہً یہ گرجنے والا شور اور چندھیا دینے والی چمک پیدا ہوئی ہے۔

اسلام نے ہی سب سے پہلے دنیا کو اِس حقیقت سے آگاہ کیا کہ دنیا کی ساری قومیں دراصل ایک ہی عالمگیر کنبہ کے افراد ہیں۔ جن کا مفاد ہر لحاظ سے مشترک ہے۔ اسلام کے اِس بنیادی عقیدہ نے مسلمان مؤرخوں کے نظریہ میں بھی عالمگیر وسعت پیدا کر دی۔ وہ کسی ملک یا قوم کی تاریخ کو کوئی ایسی شے نہیں سمجھتے جو دوسرے ملکوں کے حالات سے اثر پذیر نہ ہو۔ بلکہ وہ نوعِ بشر کی ساری تاریخ کو ایک ایسا

سیلِ رواں سمجھتے ہیں جس کا ہر قطرہ کل کی کیفیت سے متاثر ہوتا ہے۔ گو کسی خاص لمحہ میں اس سیل کے بعض حصے زیادہ شدید ہوں اور بعض بالکل پرسکون نظر آتے ہوں۔

اگرچہ عہدِ حاضر کی سائنسی ایجادات نے فاصلے کے بُعد کو صد درجہ گھٹا کر دنیا کے سب گوشوں کو ایک دوسرے سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ آج قوموں کی عالمگیر برادری زیادہ صحیح معنوں میں ایک کنبے کے افراد کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اور پچھلی دو جنگوں کی ہمہ گیر تباہی نے مغربی دنیا کو اس امر کا بہت شدید احساس دلایا ہے مگر سچ یہ ہے کہ مہذب دنیا نے "بعد از خرابی بسیار" جو سبق آج سیکھا ہے، مسلمانوں کے لیے وہ سبق کوئی نیا سبق نہیں۔

قومیت اور وطنیت کی تحریکیں

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں یورپ میں جگہ جگہ قومی اور وطنی تحریکوں نے سر اٹھایا۔ گو اس وقت تک یورپ تاریخ کے متذکرہ صدر سائنسی نظریہ کو اصولاً مان چکا تھا، مگر قوم اور وطن کے خود پرست اور آتش مزاج بت کسی بے لاگ رائے کے متحمل نہ تھے۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ میں ہر جگہ قومی تاریخ ان بتوں کے قصیدے بن کر رہ گئی۔ عام ذہنی بیداری سے یہ حقیقت اب سب پر کھل چکی تھی کہ قوموں کی قوتِ حیات کا سارا سرمایہ وہ حرارت ہے جو قومی خون کو گرماتی ہے اور اس حرارت کا واحد سرچشمہ وہ نظریے ہیں جو قومی ثقافت کی جان ہیں۔ چنانچہ قوم کا شاندار ماضی، اس کے مشاہیر کے کارناموں اور قومی عزم و پامردی کی روائتوں کو نئی نسلوں کے سامنے اس قدر حسین اور چکا چوند پیدا کرنے والے رنگوں میں پیش کیا گیا کہ وہ اپنے آپ کو خلافتِ ارضی کا واحد جائز حق دار سمجھنے لگیں۔ صرف اپنے قومی محاسن کو ہی ابھارنے کی کوشش نہ کی گئی بلکہ دوسروں کے محاسن کو گھٹایا گیا اور اپنے تفوق کو ہر میدان میں اچھالا گیا۔ اور نوجوانوں کے بھڑکیلے جذبات سے اس قدر کھیلا گیا کہ دنیا کو ایک ربع صدی میں دو مرتبہ جنگ کے عالم سوز شعلوں میں کودے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔

قومیت کیا ہے؟

یہاں یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آخر قومیت ہے کیا شے۔ کیا ایک بولی بولنے والے لوگ ایک قوم ہوتے ہیں؟ مشرقی اور مغربی پنجابیوں اور مشرقی اور مغربی بنگالیوں کی بولی ایک ہی ہے مگر ظاہر ہے کہ

وہ دونوں ہم قوم نہیں ہیں۔ کیا جغرافیائی حدود قومیت کی حدیں معین کرتی ہیں۔ یہاں بھی خود ہندوستان کی مثال ہی اِس خیال کے بطلان کے لیے کافی ہے۔ یورپ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔ کیا مذہب کا رشتہ انسانوں کو ایک قوم بنا دیتا ہے۔ عیسائی یورپ کی حالیہ جنگیں اِس خیال کے غلط کرنے کے لیے کافی ہیں۔ آخر ایک قوم کے افراد میں مشترک قدر ہے کونسی ؟ مثلاً ایک سندھی، ایک پنجابی، ایک بنگالی، ایک سرحدی اور ایک بلوچ میں وہ قدرِ مشترک کونسی ہے جو ان سب کو پاکستانی بناتی ہے۔ اِس سوال کا اگر کوئی تسلی بخش جواب دیا جا سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ ان سب کی ثقافت ایک ہے۔ یعنی ان کے مشاہیر نے ماضی میں کچھ ایسے کارنامے سرانجام دیے تھے جن کا ذکر ان کے خون کو گرما دیتا ہے۔ انہوں نے ماضی میں ایک واحد نصب العین کے لیے مل کر کوشش کی تھی۔ اور آج بھی یہ سب اپنی متحدہ کوششوں سے اِس نصب العین کو ہر ممکن بچاؤ کرنے کو تیار ہیں گویا ثقافت عبارت ہے ایک ایسی روحانی قوت سے جس کو بہت سے افراد کی متفقہ کوششوں نے پیدا کیا۔ جو علوم و فنون کی مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہوئی اور جسے برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لیے وہ افراد اب بھی ہر ممکن کوشش کے لیے آمادہ ہیں۔ یہی ثقافت قومیت کی جان ہے۔ اور خود ہمارے پاکستان کا مطالبہ صرف اسی بنا پر کیا تھا کہ ہماری ثقافت ہندوؤں سے بالکل الگ تھی۔ ہمارے ہیرو ہندوؤں کی نظروں میں ان کے قومی دشمن تھے۔ اور ان کے اکثر ہیرو ہماری نظر میں بے وقر۔

اسلام اور قومیت

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام انسان کی عالمگیر اخوت کا علمبردار ہے۔ وہ رنگ نسل اور جغرافیائی حدود کی بنا پر انسانی دھڑا بندیوں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ اِس بات کا سختی سے مخالف ہے کہ محض رنگ یا نسب کی بنا پر ایک آدمی کو دوسرے سے برتر سمجھا جائے۔ اِس کے نزدیک امتیاز کا واحد معیار تقویٰ ہے جو شخص اللہ سے جتنا زیادہ ڈرتا ہے اسی قدر اس کا مقام بلند ہے وہ قوم اور ملک کے نام پر مذہبی انسانی کے جواز کا فتویٰ دینے کے سخت خلاف ہے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جداگانہ قومی ثقافت کا منکر ہے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک متعدد صحابی حضرت سلمان فارسی کے نام سے موسوم تھے۔ گویا ان کی قومیت ان کے نام کا جزو تھی اور یہ امر ان کے تقویٰ کے راستہ میں حائل نہ تھا۔ قومی ثقافت ایک

ذہنی قوت ہوا کرتی ہے۔ جو قوم کے تمام افراد میں قدر مشترک کا کام دیتی ہے۔ اسلام نے اپنے عالمگیر پھیلاؤ کے زمانے میں اس قومی ثقافت کو کبھی مٹانا نہیں چاہا۔ ہاں اس نے صرف اسے زیادہ پاکیزہ اور باوقار بنانے کی کوشش کی۔

ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ ثقافت ہی وہ مشترک قدر ہے جو قوم کے افراد کو ایک رشتے میں پروتی ہے۔ اور اس طرح ان بکھرے ہوئے ذرّوں کو ایک مضبوط دیوار کی شکل دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی شیرازہ بند قوت بذات خود نہایت کارآمد ہے۔ کیوں کہ جب تک افراد کسی ایک لڑی میں پروئے نہ جائیں وہ اجتماعی زندگی کے لیے کبھی فعال عنصر نہیں بن سکتے۔ یہ بھلا کیوں کر ممکن تھا کہ اسلام جیسا دین فطرت ایسی کارآمد شے کو ممنوع قرار دیتا۔ چناں چہ اسلام کی فتوحات کے بعد بھی ایرانی، مصری اور رومی ثقافتیں باقی رہیں۔ البتہ ان کے انسانیت سوز خد و خال اسلام کے انسانیت نواز رجحانات کے زیر اثر خود بخود مٹ گئے اور وہ صحیح معنوں میں کارآمد قوتیں بن گئیں۔

مغربی قومیت نوازی

اسلام فطرت اور اعتدال کا راستہ ہے۔ اس نے ایک متعدل اور قدرتی جذبہ قومیت کی کبھی نفی نہیں کی۔ مگر جس قومیت نے مغرب میں جنم لیا وہ از حد جنگجویانہ اور تباہ کن قسم کی تھی۔ مغرب نے قوم اور وطن کے نام پر ہر برائی کو روا سمجھا۔ چناں چہ مشہور اطالوی محب وطن کاوُر جو اطالیہ کی قومی تحریک میں پیش پیش تھا خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ جو کچھ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اپنے ملک کی خاطر جائز سمجھا اگر خود اپنی ذاتوں کے لیے روا رکھتے تو اول درجے کے بدمعاشوں میں شمار ہوتے یہ طرز عمل صرف اطالویوں تک ہی محدود نہیں بلکہ یورپ کی سیاسی بساط کے سب مہرے اسی سیاہ رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ پہلی عالمگیر جنگ کی ہولناک تباہیوں نے پہلی مرتبہ مغربی سیاست دانوں کو یہ احساس دلایا کہ قومی جذبہ کو اس طرح بدلگام چھوڑ دینے کا مطلب تہذیب و تمدن کی تباہی ہوگا۔ چناں چہ اس بدلگام گھوڑے کو رام کرنے کے لیے جمعیت اقوام کا چابک سوار پیدا کیا گیا۔ مگر یہ وحشی رم خوردہ لیے کمزور اور ناتجربہ کار ہاتھوں میں کیوں کر قابو میں رہتا۔ بدک کر ایک ایسی دولتی جھاڑی کہ نہ صرف

چاک سوار کا نام و نشان تک مٹا دیا، بلکہ ساری دنیا کو پھر اک جہاں سوز جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا۔

دوسری جنگ کے فوراً بعد پھر کوشش شروع کی گئی کہ قومی عصبیت کے جذبے کو جائز حدود کے اندر رکھنے کے لیے ایک باقتدار بین الاقوامی ادارہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ یہ ادارہ آج اتحادی اقوام کی انجمن کی شکل میں موجود ہے۔ یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے کہ جمعیت اقوام کے اس جانشین کی کوششیں کس حد تک کامیاب ہوں گی۔ مگر یہ بات بالکل واضح ہے کہ انسانیت کی نجات اسی میں ہے کہ وہ اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق قومی اور نسلی گروہ بندیوں کو ثانوی درجہ دے اور عالمگیر مشترک مفاد کو زندگی کے ہر میدان میں اولیت دے۔

پاکستان اور قومی ثقافت

اس ساری بحث سے یہ بات اب بالکل صاف ہو گئی ہو گی کہ گو جنگجویانہ قومیت نوع انسانی کے امن عالم کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ تاہم ایک معتدل قسم کی قومی ثقافت نہ صرف قومی زندگی کی صحت کے لیے ضروری ہے بلکہ ایک عالمی معاشرے کی تخلیق میں بھی ایک کارگر قوت ثابت ہو سکتی ہے۔ کسی قوم کی موثر اجتماعی زندگی اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک قومی ثقافت کے بڑھنے پھولنے کے پورے مواقع موجود نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ استبدادی فاتح قومیں مفتوحین کی قومی روح کو کچلنے کے لیے سب سے پہلا وار اس کی قومی ثقافت پر کرتی ہیں۔ برطانوی تسلط کے دو صد سالہ زمانے میں ہند کی مسلمانوں کی ثقافت مسلسل جور و ستم کا نشانہ بنی رہی۔ اغیار نے ہماری قومی روح کے سرچشموں کو گدلا کرنے یا انہیں سرے سے خشک کر دینے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ مگر یہ امر ہماری ثقافت کی سخت جانی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ اغیار کی کوششیں اپنے مقصد میں ناکام رہیں۔ اور بالآخر ہماری قومی ثقافت کے بڑھنے پھولنے کے لیے راستہ بالکل صاف ہو گیا۔

قومی ثقافت کسی قسم کی اجتماعی زندگی کے لیے صالح خون کا حکم رکھتی ہے۔ اب جبکہ ہم آزاد ہیں اور اپنی اجتماعی زندگی کے خود نگران ہیں، ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنی قومی ثقافت کے سرچشموں کو اس خس و خاشاک سے بالکل پاک کر دیں جس سے وہ اٹے پڑے ہیں اور جس نے ہماری قومی روح

کو سیرابی کو روک دکھا ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہو لیتا ہماری قومی وحدت پائیدار بنیادوں پر قائم نہیں ہو گی اور ایک ایسی دنیا میں جو آج بھی اپنے تمام بین الاقوامیت کے نعروں کے باوجود ابھی دلی طور پر قومیت اور وطنیت کی ہی پجاری ہے۔ کوئی قوم یا ملک اپنی ثقافتی زندگی کی صحت سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔

قومی ثقافت کے سرچشمے

اب غالباً یہ امر کسی مزید روشنی کا محتاج نہیں کہ قومی ثقافت ایک ذہنی قوت ہے جو قوم کے تمام افراد کے دل و دماغ کو زندگی کی تر و تازگی بخشتی ہے، یہ ذہنی قوت عہدِ ماضی کی ان کامرانیوں یا ناکامیوں کی پیداوار ہوتی ہے جن میں سے قوم گذر رہی ہوتی ہے اور آئندہ قومی عزائم کو حرکت دینے والی قوت بھی یہی ہوتی ہے۔ اس تجربے کی روشنی میں قومی تاریخ کو ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ تاریخ ہی وہ ابدی سرچشمہ ہے جس سے کسی قوم کی ثقافتی روح سیراب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندہ قومیں اپنی تاریخ کے مدون کرنے اور اسے موزوں شکل میں بچوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے بہت بڑے بڑے اہتمام کرتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ عالم میں ہم جب کبھی کسی قوم کے زوال کا حال پڑھتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ قوم اپنی بیتی ہوئی عظمت کو بھی ساتھ ہی ساتھ بھولتی چلی جاتی ہے۔ تا آں کہ وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ جاتی ہے اور اسے اپنی زندگی کے افق پر روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔

ہماری قومی زندگی ان تمام مرحلوں میں سے گذر چکی ہے۔ ایک وقت تھا کہ مسلمان اس برصغیر میں بطور فاتح داخل ہوئے۔ اور صدیوں تک اس کی تقدیر کے مالک بنے رہے۔ اس دور میں ہماری تاریخ کی تدوین بھی خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں تھی۔ پھر دفعتہً پستی کا دور شروع ہوا۔ مسلمان اس قدر اچانک گرا کہ وہ بالکل چکرا گیا۔ اور ابھی سنبھلنے کے لیے آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ چاروں طرف سے اغیار نے نرغے میں لے لیا۔ چالباز دشمن نے تاک کر سب سے پہلا وار ہماری ثقافتی زندگی کے سرچشموں پر کیا۔ محمود غزنوی کا سا بے عدیل سپہ سالار ایک وعدہ خلاف لٹیرا بنا دیا گیا۔ علاؤالدین خلجی جیسا تیز فہم اور نکتہ رس

رتھا ایک حریص ابن الوقت کے رنگ میں پیش کیا گیا۔ اورنگ زیب جیسا درویش منش اور اولوالعزم حکمران مذہبی دیوانہ قرار پایا۔ اکبر کی اسلام دشمنی کو اچھالا گیا۔ اور سیواجی جیسے ڈاکو کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیئے گئے۔ یہ محض چند سوئی سوئی مثالیں ہیں ورنہ اغیار کے معاند ہاتھوں نے اسلامی تاریخ کے تمام مشاہیر کو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایک ہی سیاہ رنگ میں رنگ دیا۔ اور آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود بعض مسلمان جوش رواداری میں غیر مسلموں سے بھی چار قدم آگے بڑھ گئے اور ہمیں اپنے اسلاف کا نام لیتے شرم آنے لگی۔

اسلامی تاریخ درسی نصاب سے سرے سے غائب تھی۔ تاریخ ہند کا اسلامی عہد اس تاریک رنگ میں پیش کیا جاتا تھا کہ جس پر وحشی قوموں کا سر بھی ندامت سے جھک جائے۔ مسلمان کسب معاش کے لیے مجبور تھا کہ اپنے بچوں کو اسی زہریلی تربیت کے حوالے کر دے۔ اسلامی تاریخ کے سب سے ثقہ راوی میور اور لین پول تھے۔ ایسے حالات میں یہ کیا عجب تھا کہ قوم نہ صرف اپنی عظمت رفتہ سے بے خبر ہو جائے بلکہ اپنے نامور آباؤ اجداد سے نسبت رکھتے ہوئے بھی ہچکچائے۔ علامہ اقبال نے اسی کیفیت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے ؎

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

آزاد زندگی کے تقاضے

اب پاکستان ایک آزاد ملک ہے اور ہم ایک مستقل قوم ہیں۔ ہماری قومی زندگی کا دار و مدار ہماری ثقافتی روح کی قوت پر ہے۔ اس معاملے میں تغافل روا رکھنا اپنے اوپر سب سے بڑا ظلم کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد قوم کی تعلیمی ضروریات کی طرف توجہ دی گئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہمارا نظام تعلیم اسلامی بنیادوں پر ہوگا۔ قوم کی ثقافتی روح کی بحالی کے لیے برصغیر ہند و پاک کی ایک صحیح اور مستند تاریخ کا طلبا کے سامنے پیش کرنا آج وقت کا ایک بہت بڑا تقاضا ہے اور پاکستانی تاریخ دانوں پر یہ فرض بڑی شدت سے عائد ہوتا ہے کہ وہ ہماری ثقافتی زندگی کے سوتوں کو اس زہر کی آلائش سے پاک کریں جو اغیار کی ریشہ دوانیوں نے ان میں ملا رکھا ہے ٭

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

پاکستانی طلباء کے لیے دولت مشترکہ کے تعلیمی وظائف

۲۹ اگست کو دس پاکستانی اسکالروں کا ایک گروپ "سرکیشیا" کے ذریعہ کراچی سے لندن روانہ ہوگیا۔ یہ اسکالر وہاں دولتِ مشترکہ تعلیمی وظائف کی اسکیم کے تحت پوسٹ گریجوایٹ تعلیم حاصل کریں گے ایک اسکالر پہلے ہی برطانیہ پہنچ چکا ہے اور چار اسکالروں کی ایک اور جماعت ۶ ستمبر کو بی او اے سی طیارہ کے ذریعہ کراچی سے پرواز کرے گی۔ دولت مشترکہ تعلیمی وظائف کمیشن نے سال رواں کے لیے پندرہ پاکستانی طلباء کو وظائف دیئے ہیں۔ دولت مشترکہ تعلیمی وظائف اکتوبر ۱۹۶۳ء سے برطانیہ میں دیئے جائیں گے۔ کمیشن نے جن کامیاب پاکستانی اسکالروں کے ناموں کا اعلان کیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ سید نیاز احمد (ڈھاکہ یونیورسٹی) یونیورسٹی آف برمنگھم میں ریاضیات کی تعلیم حاصل کریں گے۔

۲۔ مسز احمد (کلکتہ یونیورسٹی) یونیورسٹی کالج لندن میں نفسیات کی تعلیم حاصل کریں گی۔

۳۔ مس شمیمہ اختر (پنجاب یونیورسٹی) مانچسٹر یونیورسٹی میں نظری ریاضیات کی تعلیم حاصل کریں گی۔

۴۔ آفتاب عالم (پنجاب یونیورسٹی) امپیریل کالج لندن میں کنکریٹ ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کریں گے

۵۔ شمیم احمد چوہدری (پنجاب یونیورسٹی) لیورپول یونیورسٹی میں طبیعی کیمیا پڑھیں گے۔

۶۔ مس عاصمہ حق (ڈھاکہ یونیورسٹی) ہورنسی کالج آف آرٹ اینڈ کرافٹس میں دیواروں کی آرائش کے متعلق تعلیم حاصل کریں گی۔

۷۔ سید م۔ یا جعفر (عثمانیہ یونیورسٹی) مانچسٹر یونیورسٹی میں الیکٹریکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کریں گے

۸۔ نصیر احمد خاں مہندی (پنجاب یونیورسٹی) لندن میں سینہ کے امراض کے انسٹی ٹیوٹ میں طب پڑھیں گے

۹۔ محمد غلام مصطفےٰ (ڈھاکہ یونیورسٹی) برک بیک کالج، لندن میں شماریات کی تعلیم حاصل کریں گے۔

۱۰۔ مس نسیم فاطمہ نقوی (پٹنہ یونیورسٹی) لیڈز یونیورسٹی میں کیمیا کی تعلیم حاصل کریں گی۔

۱۱۔ مدد علی قادری (سندھ یونیورسٹی) اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن میں عربی پڑھ

۱۲۔ قاضی حباب الدین احمد (ڈھاکہ یونیورسٹی) کنگس کالج، نیوکیسل کیمیکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر

۱۳۔ سید نسیم حیدر رضوی (پنجاب یونیورسٹی) ڈنڈی ڈینٹل اسکول سینٹ اینڈریوز میں دندان
کی تعلیم حاصل کریں گے۔

۱۴۔ نریبندر ناتھ رائے (ڈھاکہ یونیورسٹی) چرچل کالج کیمبرج میں طبیعات کی تعلیم حاصل کریں گے۔

۱۵۔ ذکی الدین احمد (ڈھاکہ یونیورسٹی) نیو کالج آکسفورڈ میں جدید تاریخ ہند کا مطالعہ کریں گے

دولت مشترکہ تعلیمی وظائف کی ایک اسکیم کو تعین یہ ۱۹۵۸ء میں مانٹریال کی دولت مشترکہ تجارتی کانفرنس میں تسلیم کیا گیا تھا۔ اس اسکیم کے تحت تقریباً ایک ہزار تک دولت مشترکہ تعلیمی وظائف بنایا گیا تھا۔ برطانیہ نے ان میں سے پانچ سو تعلیمی وظائف کسی ایک سال کے دوران مہیا کرنے دی تھی۔

۱۹۵۹ء میں ایک پارلیمانی قانون کے ذریعہ برطانیہ میں دولت مشترکہ تعلیمی وظائف کمیشن قائم تاکہ اس اسکیم کے برطانوی حصہ پر عمل درآمد کیا جا سکے۔

یہ کمیشن اسکالروں کو ان امیدواروں میں سے منتخب کرتا ہے جن کی سفارش سمندر پار دولت ممالک کی حکومتیں کرتی ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ملک تعلیمی وظائف دیتا ہے تو یہ کمیشن برطانیہ کی جا امیدواروں کی سفارش بھی کرتا ہے۔ تمام صورتوں میں وظائف دینے والا ملک ہی حتمی انتخاب برطانیہ کے وظائف پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لیے تجویز کیے گئے ہیں۔ اور محض بے حد قابل میں ہی انڈر گریجویٹ معیار پر دیئے جائیں گے۔ یہ تعلیمی وظائف عام طور پر دو سال کی مدت ہیں اور برطانیہ میں اسکالر کے قیام کے دوران کرایہ، تعلیمی فیس اور رہائشی اخراجات پر مشتمل بیویوں کے ہمراہ آنے والے اسکالروں کے لیے خاص الاؤنسوں کا بندوبست کیا گیا ہے۔

۲۹ اگست کو آر ایم ایس "سرکیشیا" کے ذریعہ کراچی سے روانہ ہونے والوں میں نو پرنٹس اسکالر بھی تھے۔

۱۔ مسٹر محمد عبدالجلیل، آنند موہن کالج، میمن سنگھ لیڈز یونیورسٹی میں انگریزی زبان و ادب کا مطالعہ کریں گے۔

۲۔ مسٹر محمد شمس الضحیٰ چاٹگام کالج میں انگریزی کے لیکچرار، لیڈز یونیورسٹی میں انگریزی زبان و ادب کا مطالعہ کریں گے۔

۳۔ مس منور سلطانہ رشید لیکچرر ریاضیات گورنمنٹ کالج برائے خواتین لائل پور، بانگھم یونیورسٹی میں ریاضیات کا مطالعہ کریں گی۔

۴۔ مسٹر ایم اے آئی قریشی صدر شعبۂ سائنس پی اے ایف پبلک اسکول سرگودھا، ساؤتھ ہیمپٹن یونیورسٹی میں سرٹیفکیٹ ان ایجوکیشن کی تعلیم حاصل کریں گے۔

۵۔ مسٹر شوکت سلطان سینئر ہاؤس ماسٹر گورنمنٹ کیڈٹ کالج حسن ابدال انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن یونیورسٹی آف ہل میں درس و تدریس کے پوسٹ گریجویٹ کورس کی تعلیم حاصل کریں گے۔

۶۔ مس نفر یسا فرنینڈیز سینٹ جوزف کالج برائے خواتین میں انگریزی کی لیکچرر، لیڈز یونیورسٹی میں انگریزی زبان و ادب کا مطالعہ کریں گی۔

۷۔ مسز طیبہ نبی خاں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ قومی عجائب گھر کراچی، برٹش میوزیم اور میوزیمس ایسوسی ایشن لندن میں ڈپلوما آف دی میوزیمس ایسوسی ایشن کا مطالعہ کریں گے۔

۸۔ ڈاکٹر مسز ایس خاں یونائیٹڈ کرسچن ہسپتال لاہور میں ایک شعبہ کی ریذیڈنٹ سینٹ اینڈریوز یونیورسٹی میں کیلینڈ کمیونیکل میڈیکل سائنس کورس کا مطالعہ کریں گی۔

۹۔ مسٹر ایس یو سلیم راولپنڈی میں گونگوں اور بہروں کے سرسید سکول کے ہیڈ ماسٹر مانچسٹر یونیورسٹی میں علم سماعت اور گونگوں کی تعلیم سے متعلق ڈپلومہ حاصل کریں گے۔

برٹش کونسل کے دوسرے اسکالر کے ۔ عزیز الرحمٰن جو مشرقی پاکستان کیڈٹ کالج، چاٹگام کے ہاؤس ماسٹر اور لیکچرر ہیں ۲۷ ستمبر کو ہوائی جہاز کے ذریعہ روانہ ہوں گے۔ مسٹر رحمٰن یونیورسٹی آف ہل میں سائنسی مضامین کی تدریس کے طریقوں کا مطالعہ کریں گے۔

مندرجہ ذیل برٹش کونسل اسکالر برطانیہ میں اپنی اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء کو ایم "ٹلیشیا" کے ذریعہ پاکستان واپس ہوئے۔

۱۔ مسٹر مسیح الدین احمد صدیقی گورنمنٹ کالج ناظم آباد کراچی میں انگریزی کے سینئر لکچرر جنھوں نے لیڈز یونیورسٹی میں ۱۹۶۰ء میں انگریزی زبان وادب کا مطالعہ کیا۔

۲۔ مسٹر ابن لے چودہری پی اے ایف پبلک اسکول سرگودھا میں ریاضیات کے ٹیچر جنھوں نے ناٹنگھم یونیورسٹی سے تعلیم میں پوسٹ گریجویٹ سرٹیفکیٹ حاصل کیا (سال ۱۹۶۲ء)

پاکستان میں کیمبرج کے طلبہ (مارٹن ہوپ کے قلم سے)

اس سال کے شروع میں مغربی پاکستان کے ضلع گوجرانوالہ کے دیہات بذریعہ ڈاک سے انگلستان کو ایک رپورٹ بھیجی گئی تھی اس میں کوئی سنسنی خیز بات نہیں تھی۔ البتہ اس میں خاموشی سے ہمارے زمانہ کی نمایاں سماجی ترقی کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ایک ایسی ترقی جو ایک خوشحال اور صحت مند دنیا کو تشکیل دینے میں معاون ہے۔

کچھ نوجوان طلباء نے چند ماہ پیشتر کیمبرج ایشیائی مہم کے تحت پاکستان کا دورہ کرکے یہ رپورٹ بھیجی تھی، وہ یہ معلوم کرنے گئے تھے کہ برطانوی نوجوان خود اپنا مستقبل بنانے سے پہلے کسی دوسرے ملک میں ایک یا دو سال تک کس طرح مفید خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

برطانیہ میں اس قسم کی رضاکارانہ خدمت کا تصور، امریکی دستہ امن سے متعلق صدر کینیڈی کے اعلان سے دو سال پہلے موجود تھا۔

کیمبرج کی یہ مہم کچھ سوالات کا جواب دینے اور سمندر پار رضاکار ادارہ سے متعلق مسائل کی وضاحت کرنے کے لیے ترتیب دی گئی تھی۔ یہ مقصد موقع پر کماحقہ تحقیقات کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے یہ تحقیقات وہ نوجوان کریں گے جو ان لوگوں کی صلاحیتوں کو سمجھتے ہیں جنھیں ان کی پیروی کرنی ہے۔

بیس سے لے کر پچیس سال کی عمر کے ان تمام نوجوان طلباء کی جماعت کیمبرج سے روانہ ہوئی تھی لیکن اپنی کم عمری کے باوجود وہ دور دراز کا سفر کر چکے تھے۔ ان میں سے ایک طالب علم مسٹر جیم رسل نے سنہ ۱۹۶۰ء میں کیمبرج ایکوئیڈر مہم کی قیادت کی تھی جس نے اینڈیسن اور ایکوئیڈر کے جنگلوں میں آٹھ ہفتے گذارے تھے۔ ایک دوسرے طالب علم مسٹر ڈیوڈ بکیلین نے متعدد سال تک آسٹریا، ... کے

کیمپوں میں خدمات انجام دی تھیں۔

پاکستان پہنچنے کے بعد ہم نے گہرا مطالعہ کیا اور ہر ممبر نے اپنے خاص میدان میں کام کرنا شروع کیا بھرپور گاؤں میں ۳۰۴۰ آدمیوں کی مردم شماری کی گئی جس سے پوری برادری کی ایک اہم تصویر سامنے آئی پیدائش شادی اور موت، کام اور کھیل کے وقت لوگوں کے عادات و اطوار ان کے مطالعہ کے موضوع تھے۔

یہ عام قسم کے سماجی جائزہ سے کسی قدر اہم کام تھا۔ اس کے ذریعہ اس قسم کے معاشی امور بھی زیر غور آئے مثلاً محنت کی تقسیم، کام کے ٹھیکوں کا طریق کار، اور تاجروں اور دستکاروں کے کام کرنے کے طریقے۔

انہوں نے جو معلومات حاصل کی ہیں وہ مستقبل میں ان نوجوانوں کے لیے معاون ہوں گی جو اس قسم کی برادریوں میں جائیں گے۔ انہیں ان کی ضروریات کا گہرا احساس ہوگا۔ طلبا اور گریجویٹ دیہی ترقی اور تعلیم میں امداد دینے کے لیے نسبتاً زیادہ موزوں ہوں گے۔

چونکہ بیشتر دیہاتوں کی معیشت کی بنیاد زراعت پر ہے اس لیے بھرپور میں جس طریقہ سے اس پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔ اسکا تفصیلی طور پر مطالعہ کیا گیا۔ ہم نے چاول کی فصل کے زمانے میں وہاں پہنچے اور گندم بونے سے لے کر اس کی کٹائی تک کے مراحل کا جائزہ لیا۔ ہم کے ممبروں نے زمینداری، کرایہ داری، کاشتکاری کے طریقوں، آبپاشی، پیداوار، مویشیوں اور ان کے ماہر زراعت کے قول کے مطابق پیچیدہ محنت کے روابط کا مطالعہ کیا۔

انہوں نے محسوس کیا کہ وراثت ملنے پر جائداد کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جانے کی وجہ سے زمینیں منتشر حالت میں ہیں اور یہ ایک خاص مسئلہ ہے۔ البتہ دیہاتوں میں عام بھلائی کے لیے مل جل کر کام کرنے کے فوائد کا شعور پیدا ہو چلا ہے

مشینوں سے کام کرنے کے بڑھتے ہوئے امکانات کے پیش نظر بعض موزوں شہروں میں صنعت کی بھی گہری نظر سے چھان بین کی گئی۔

تعلیم کے مقاصد اور طریقوں کو جاننے کی غرض سے انھوں نے قصبہ اور دیہات کے سکولوں کا دورہ

پیدا اور ابتدائی طبی امداد کی ڈسپنسری کے قیام کے ساتھ ساتھ دیہاتیوں کی صحت پر عملی توجہ دی۔

ان نوجوانوں کو جو اجنبی ملکوں میں خدمات انجام دینے کی غرض سے باہر جارہے ہیں، مؤثر طور پر کام لینے کے لیے ترقی کے مناسب خطوط اور رفتار دونوں کا جاننا ضروری ہے۔

نہ صرف دیہی زندگی کے واقعات ضبط تحریر میں لائے گئے بلکہ کیمرہ کے ذریعہ ان کی تصاویر بھی لی گئیں۔ اس جماعت کے فوٹوگرافر کو بڑی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ خواتین نے بھی توہمات اور تعصبات کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور تصویر کھچوانے میں مسرت محسوس کرتی تھیں۔

مہم کے فوٹوگرافر بہت سی خاموش اور رنگین تصاویر کے علاوہ ہزاروں فٹ طویل فلم بھی اپنے ہمراہ برطانیہ لے جائیں گے۔ اس فلم کو ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے کا امکان ہے۔ اس فلم میں دیہاتی زندگی کے پس منظر میں پاکستان کی دیہی ترقی اور صنعتی منصوبوں کے بعض پہلو پیش کیے جائیں گے۔

مہم صرف اپنے اسی کام کا مظاہرہ نہیں کرے گی جو کچھ انہوں نے مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے اس کی مفصل رپورٹ کے علاوہ خانگی اور دستکاری وزراعت سے متعلق اشیا کا ایک ذخیرہ بھی برٹش میوزیم کے لیے لے جائے گی۔ نیز دو ممبروں نے ایک ہفتہ صرف کرکے نویں صدی کے دو مندروں اور دوسری قدیم ہندو عمارتوں کے فوٹو میوزیم کے لیے حاصل کیے۔

مہم کو کس قسم کے رضاکار کی تلاش ہے؟ مثال کے طور پر نئی صنعتوں کے لیے تجربہ کار لوگ مددگار رہیں۔ اسکولوں کے اساتذہ کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات کی ضرورت ہے۔

امید ہے کہ اس مہم سے صرف یہی اندازہ نہیں ہوگا کہ کس قسم کا کام کرنا ہے، بلکہ یونی ورسٹیاں اور سکول سمندر پار ملکوں میں رضاکارانہ خدمات انجام دینے کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ برطانوی ارباب صنعت کا بھی خیال ہے کہ ماہر نوجوان کارکنوں کی خدمات مستعار دے کر مہم مفید کام کرسکتی ہے۔ اس کے باوجود کہ آج کل نوجوان لوگوں پر نکتہ چینی کی جاتی ہے وہ پہلے کی طرح خدمت کرنے کے لیے کمربستہ رہتے ہیں چوں کہ اس خدمت میں مہم جوئی بھی شامل ہے اس لیے یہ ان کے لیے اور زیادہ باعث کشش ہے۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ———————— شعبہ سکول

۳-۲-۲-۶۲ م۔ محمد عبد اللہ سندھو ایم۔ اے۔ بی ایڈ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ کو ایک نئی اسامی پر تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور گریڈ میں قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول تلاونڈی موسے خاں مقرر کیا گیا۔ ۳۰ جولائی ۱۹۶۲ء

ایضاً م۔ غلام حسین بی اے ایم۔ ایڈ سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رینالہ خورد کو تاریخ حاضری سے ایک نئی آسامی پر اپنی تنخواہ اور گریڈ میں سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول تلاونڈی موسے خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمود اختر۔ ایم اے۔ بی۔ ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کسووال کو ایک نئی آسامی پر اپنی تنخواہ اور گریڈ میں تاریخ حاضری سے سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول تلاونڈی موسے خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد عبد اللہ قریشی ایم اے۔ بی۔ ٹی۔ عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول احمد پور شرقیہ کو ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے اپنے گریڈ میں بمشاہرہ خود عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول تلاونڈی موسے خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبد الحمید سیال بی اے۔ بی۔ ٹی سینئر انگلش ٹیچر جامعہ عباسیہ بہاولپور کو ایک نئی اسامی پر تاریخ حاضری سے اپنے گریڈ میں بمشاہرہ موجودہ سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول دو میلاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبد الرحمن بی اے۔ بی ایڈ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول دہاڑن والا کو

ایک نئی آسامی پر بشاہرہ خود اپنے گریڈ میں قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول روہیلیانوالی مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ خدا بخش خاں بی اے بی ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول فیروزہ کو ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے اپنے گریڈ میں بشاہرہ خود سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً محمد فاروق بی اے بی ایڈ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول الہ آباد کو م۔ نذیر احمد بی، ایس سی۔ بی ایڈ کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول اوکاڑہ میں ایک نئی آسامی پر ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور گریڈ میں قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول شجاع آباد مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ سعید احمد خاں بی اے۔ بی ایڈ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول بہاولنگر کالونی کو م۔ الطاف الرحمٰن بی اے۔ بی ٹی سینئر انگلش ٹیچر کی جگہ جن کا ایک نئی آسامی پر گورنمنٹ ہائی سکول روہیلیانوالی میں تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد حفیظ خاں بی اے۔ بی ایڈ عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول سانگلہ کو (جو م۔ منظور حسین کیبٹی بی ایس سی۔ بی ٹی کے بلائے نربیت بیرون ملک چلے جانے کی وجہ سے ان کی آسامی پر کام کر رہے ہیں) م۔ عبید اللہ سندھو ایم۔ اے ایڈ کی جگہ (جن کا ایک نئی آسامی پر گورنمنٹ ہائی سکول تلاڈنڈی ہو سے خاں تبادلہ ہو چکا ہے) تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور گریڈ میں قائم مقام انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً محمد سعید بی اے۔ بی ایڈ۔ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری کو م۔ محمد فاروق کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول الہ آباد مقرر کیا گیا۔

۶۲ خوشی محمد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چونیاں کو م۔ محمد سعید کی جگہ جن کا
۳/۱۲ تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری مقرر کیا گیا
۲۱۹-۳ چوہدری نیاز احمد خلیل بی۔ اے۔ بی۔ ٹی اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر راولپنڈی کو م۔ احمد دین کی جگہ
۹/۴۲ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول حضرو مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ احمد دین بی اے۔ بی ایڈ قائم مقام انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول حضرو کو ایک موجودہ خالی آسامی پر تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور گریڈ میں بہ مقام انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ غلام حیدر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جہلم کو م۔ نیاز احمد خلیل کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر راولپنڈی مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد اکرم بی اے۔ بی ٹی اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر گجرات کو م۔ محمد سرور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پھالیہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد سرور بی اے۔ بی۔ ٹی انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پھالیہ کو قاضی مہتاب الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مری مقرر کیا گیا۔

ایضاً قاضی مہتاب الدین بی اے۔ بی۔ ٹی۔ ایم ایڈ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز مری کو صوفی عبد القیوم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے انگلش ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول لالہ موسیٰ مقرر کیا گیا۔

ایضاً صوفی عبد القیوم۔ بی اے۔ بی۔ ٹی انگلش ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول لالہ موسیٰ کو م۔ محمد اکرم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مقرر کیا گیا۔

ای/۶۰۸۵ م۔ انور علی خاں بی اے بی ٹی اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز مظفرگڑھ کو م۔ عبد القیوم کی جگہ
۴۲ جی ۱۰ جن کا روہیلاں والی کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول وہیوا مقرر کیا گیا۔ م۔ انور علی خاں کا استحقاق منصب انسپکٹر آف سکول ملتان ڈویژن

کے دفتر میں منتقل کیا جاتا ہے۔

نوٹ: ۔ م۔ انور علی خاں (مستقل ہیڈ ماسٹر کے تقرر تک) گورنمنٹ ہائی سکول وہیوا میں بطور کارگذار ہیڈ ماسٹر خدمت انجام دیں گے۔

ای/۶۰۸۳ م۔ محمد نواز۔ ایس وی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول علی پور کو م۔ عبداللطیف کی جگہ جن کا تبادلہ
۱۰ اگست ۱۹۶۲ء ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبداللطیف ایس۔ وی قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول مظفر گڑھ کو م محمد بخش کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور گریڈ میں قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملتان مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد بخش ایس وی قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملتان کو م۔ محمد نواز کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول علی پور مقرر کیا گیا۔

ای/۶۰۹۱ م۔ عبدالغنی شیدا قائم مقام اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر فار فزیکل ایجوکیشن منٹگمری کو راؤ نواب علی خاں
۱۰ اگست ۱۹۶۲ء کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں قائم مقام اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر فار فزیکل ایجوکیشن ملتان مقرر کیا گیا۔

ایضاً راؤ نواب علی خاں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر فار فزیکل ایجوکیشن ملتان کو م۔ عبدالغنی شیدا کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر فار فزیکل ایجوکیشن منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ای/۶۰۸۱ م۔ محمد حفیظ اللہ مخدوم بی اے۔ بی ٹی اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز ڈیرہ غازیخان
۱۰ اگست ۱۹۶۲ء کو م۔ انور علی خاں کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول وہیوا میں ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اپنے گریڈ میں قائم مقام ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز مقرر کیا گیا۔

۶۰۸۱ سردار شاہ بی اے۔ بی ٹی سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول جام پور کو م۔ محمد حفیظ اللہ مخدوم
۶۲ء کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے سلے۔ ڈی۔ آئی
ایس ڈیرہ غازی خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد اقبال بی اے۔ بی ٹی۔ ڈپ ان ایجوکیشن (لودھراں) اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز ملتان
ڈویژن کو، سردار شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ
میں سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جام پور مقرر کیا گیا۔

نوٹ:۔ محمد اقبال گورنمنٹ ہائی سکول جام پور میں بطور کارگزار ہیڈ ماسٹر کام انجام دیں گے۔ تاوقتیکہ کسی مستقل
ہیڈ ماسٹر کا تقرر عمل میں آئے۔

۱۷ ڈی ای ایس م۔ عبدالمجید بی ایس سی بی ایڈ قائم مقام سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول یزمان کو سائنس کی
۳۰۵۰۷ ایک نئی اضافی آسامی پر تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور گریڈ میں قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر
۱ اگست ۱۹۶۲ء (سائنس ماسٹر) گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ مقرر کیا گیا۔

۱۸ ڈی ای ایس م۔ منظور احمد نظامی بی اے بی ٹی کو جو گورنمنٹ ہائی سکول یزمان میں بطور ہیڈ ماسٹر کام کر رہے ہیں
۱۰۵۰۷ ایک نئی عارضی آسامی پر اپنی تنخواہ اور گریڈ میں تاریخ حاضری سے کارگزار ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی
۱۱ اگست ۱۹۶۲ء سکول کوٹ سمابہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ غلام نبی مسلم ایم اے۔ بی ٹی سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول چوہدری جی لاہور کو، ایس
عبدالغفور شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے
کارگزار ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی بھٹیاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً ایس عبدالغفور شاہ کارگزار ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی بھٹیاں کو مسٹر ایس۔ ڈی سانگر کی
جگہ جن کا گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ میں تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے
کارگزار ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول فورٹ عباس مقرر کیا گیا۔

نوٹ :۔ م۔ غلام نبی مسلم اپنے تقرر بطور کارگزار ہیڈ ماسٹر کی وجہ سے کسی اضافی معاوضہ یا کسی

اگلے گریڈ میں ترقی کے مستحق نہیں ہوں گے۔ یہ تقرر محض خانہ پُری کی حیثیت رکھتا ہے اور کسی وقت بھی کوئی وجہ قرار دیئے بغیر ختم کیا جا سکتا ہے۔

(I) اے ڈی ایم ایچ ۱۲۵۰۷ ۱۵ اگست ۱۹۶۲ء م۔ محمد انور قائم مقام سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول سانگلہ کو (جو م۔ محمد رفیق کے استحقاق منصب کے سلسلہ میں کام کر رہے ہیں) م۔ محمد اشرف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں م۔ محمد اشرف کی تاریخ سبکدوشی سے قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول سانگلہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۲۲۱۲ ۱۵ اگست ۱۹۶۲ء م۔ خورشید حسین۔ ایچ۔ پی۔ او۔ ٹی۔ گورنمنٹ نارمل اسکول گجرات کو م۔ مسعود احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں پرشین ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول لالہ موسیٰ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ مسعود احمد ایچ۔ پی۔ او۔ ٹی۔ گورنمنٹ نارمل سکول لالہ موسیٰ کو م۔ خورشید حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں پرشین ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول گجرات مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ حبیب الرحمٰن ثاقب ایس۔ وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول حضرو کو ایک موجودہ خالی اسامی پر تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور گریڈ میں ایس وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چک لالہ راولپنڈی مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ منظور حسین ایچ۔ پی۔ او۔ ٹی۔ گورنمنٹ ہائی سکول فتح جنگ کو ایک موجودہ خالی آسامی پر تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں پرشین ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ٹھگوال مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ نذر حسین ایس۔ وی۔ ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی دادن خان کو ایک موجودہ خالی آسامی پر تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور گریڈ میں ایس وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ٹھگوال مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ فتح محمد پی۔ ٹی آئی۔ گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور کو ایک موجودہ خالی آسامی پر تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور گریڈ میں پی۔ ٹی۔ آئی۔ گورنمنٹ ہائی سکول ٹھگوال مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ بشیر احمد ایس۔ وی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی گھیب کو ایک نئی آسامی پر

تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور گریڈ میں ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پھالیہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۲۲۱۶ م۔ جلال الدین ایس وی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور کو ایک موجودہ خالی آسامی پہ
۱۵ اگست ۱۹۶۲ء اپنی تنخواہ اور گریڈ میں تاریخ حاضری سے ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چک ۴۷ (راولپنڈی)
مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد اشرف ایس۔ وی۔ ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول فتح جنگ کو م۔ جلال الدین کی جگہ
جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ
ہائی سکول کیمبل پور مقرر کیا گیا۔

ای/۲۵۲۲۶ م۔ اصغر علی میٹرک جے اے وی ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول چک نمبر آر-۲/۱۰۰ کو م۔ مقبول احمد
۱۵ اگست ۱۹۶۲ء کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں جے اے وی
ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول چک نمبر ایف/۹۵ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ مقبول احمد میٹرک جے اے وی ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول چک نمبر ایف/۹۵ کو م۔ اصغر علی
کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں جے اے۔ وی
ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول چک نمبر آر ۲/۱۰۰ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۲۲۳۰ م۔ عابد حسین ایف۔ ایس سی بی اے۔ بی۔ ٹی انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چکوال کو م۔ محمد افضال
۱۵ اگست ۱۹۶۲ء کی جگہ جو ایم۔ ایڈ کلاس میں داخلہ لے رہے ہیں ۲-۹-۶۲ سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں
انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چکوال مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ مردان علی۔ بی۔ اے۔ بی ایڈ انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کھیوڑہ کو ایک موجودہ خالی
آسامی پر تاریخ حاضری سے اپنے گریڈ میں بمشاہرہ خود انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چکوال
مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبدالقیوم مرزا بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کھیوڑہ کو م۔ غلام مصطفیٰ کی
کی جگہ جو ایم ایڈ کلاس میں داخلہ لے رہے ہیں ۲-۹-۶۲ سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں انگلش ٹیچر

سنٹرل گورنمنٹ ہائی سکول چک لالہ (راولپنڈی) مقرر کیا گیا

ایضاً فدا حسین حافظ ایف۔ اے سی۔ ٹی انگلش ٹیچر سنٹرل گورنمنٹ ہائی سکول پامرلائنز۔ راولپنڈی کو ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کھوٹہ (بشاہرہ غور) مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد اشرف خاں۔ ایف۔ اے سی۔ ٹی۔ انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول حضرو کو م۔ فدا حسین حافظ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے (اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں) انگلش ٹیچر سنٹرل گورنمنٹ ہائی سکول پامرلائنز۔ راولپنڈی مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ خداداد۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جہلم کو م۔ انور علی شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے (اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں) انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول بھالیہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ انور علی شاہ بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول بھالیہ کو م۔ خداداد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جہلم مقرر کیا گیا۔

ای/م/۲۲۲۹ چوہدری محمد شریف بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر راولپنڈی کو م۔ غلام حیدر کی
۱۷ اگست ۱۹۵۲ء جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جہلم مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ غلام حیدر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جہلم کو چوہدری محمد شریف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں اسسٹنٹ انسپکٹر راولپنڈی مقرر کیا گیا۔

ایضاً راجہ محمد اختر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر راولپنڈی کو م۔ غلام مصطفےٰ کی جگہ جن کا انتقال ہو گیا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول حضرو مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد شفیع بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول حسن ابدال (حال ہیڈ ماسٹر

ڈی سی ہائی سکول چیب) کو راجہ محمد اختر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے
گریڈ میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر راولپنڈی مقرر کیا گیا۔

(د) اے ڈی ای این ۲۹۷۷/۴ ۱۵ اگست ۱۹۶۲ء — وحید بخش بھٹی۔ بی اے۔ بی۔ ایڈ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رو ہیلیاں والی ایک نئی اضافی آسامی پر تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

(ہ) اے ایم ڈی ای این ۷۸۱۷/ ۱۷ اگست ۱۹۶۲ء — م۔ علی محمد ملک ایم اے بی ایڈ ایک امیدوار کو (جو محکمہ امداد دیہات کے ایک ملازم رکن تھے) ایک نئی عارضی اضافی آسامی پر موسم گرما کی تعطیلات کے بعد تاریخ حاضری سے بمشاہرہ ۱۷۰/- روپے ۱۲۰/- — ۱۰ — ۲۰۰/- — ۱۰ — ۳۰۰/- کے پیمانہ تنخواہ میں عارضی سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً — ایک امیدوار م۔ بشیر علی قریشی ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ بی ایڈ کو بمشاہرہ ۱۷۰/- روپے پیمانہ تنخواہ ۱۲۰/- — ۱۰ — ۲۰۰/- — ۱۰ — ۳۰۰/- بعد تعطیلات موسم گرما تاریخ حاضری سے ایک نئی عارضی و اضافی آسامی پر عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چونیاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ مشتاق احمد ایم اے بی ایڈ ایک امیدوار کو بعد از تعطیلات موسم گرما تاریخ حاضری سے م۔ عبدالحمید سیال کی جگہ جن کا گورنمنٹ ہائی سکول رو ہیلیاں والی تبادلہ ہو چکا ہے۔ جامعہ عباسیہ بہاولپور میں بمشاہرہ ۱۷۰/- روپے بہ پیمانہ تنخواہ ۱۲۰/- — ۱۰ — ۲۰۰/- — ۱۰ — ۳۰۰/- عارضی سینئر انگلش ٹیچر مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ دین محمد ایم اے بی۔ ایڈ ایک امیدوار کو بعد از تعطیلات موسم گرما۔ تاریخ حاضری سے ایک نئی عارضی آسامی پر، بمشاہرہ ۱۷۰/- روپے بہ پیمانہ تنخواہ ۱۲۰/- — ۱۰ — ۲۰۰/- — ۱۰ — ۳۰۰/- عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ امان اللہ خاں قریشی۔ ایم اے۔ بی۔ ایس سی بی۔ ایڈ کو بعد از تعطیلات موسم گرما۔ تاریخ حاضری سے سائنس ماسٹر کی نئی اور عارضی آسامی پر گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ میں بمشاہرہ ۱۷۰/- آ

بہ پیمانہ تنخواہ -/۱۲۰ — ۱۰ — -/۲۰۰ — ۱۰ — -/۳۰۰ روپے عارضی عارضی ماسٹر مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ مسعود بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ایڈ ایک امیدوار کو بعد از تعطیلات موسم گرما بتاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے، بہ پیمانہ تنخواہ -/۱۲۰ — ۱۰ — -/۲۰۰ — ۱۰ — -/۳۰۰ روپے سائنس ماسٹر کی ایک نئی عارضی آسامی پر عارضی سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول سیالکوٹ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ تعشق حسین چغتائی بی۔ ایس۔ سی۔ بی ایڈ ایک امیدوار کو بعد از تعطیلات موسم گرما بتاریخ حاضری سے سائنس ٹیچر کی نئی عارضی آسامی پر بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے بہ پیمانہ تنخواہ -/۱۲۰ — ۱۰ — -/۲۰۰ — ۱۰ — -/۳۰۰ روپے عارضی سائنس ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملتان مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ ضیاء الدین بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ایڈ ایک امیدوار کو بعد از تعطیلات موسم گرما بتاریخ حاضری بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے بہ پیمانہ تنخواہ -/۱۲۰ — ۱۰ — -/۲۰۰ — ۱۰ — -/۳۰۰ روپے سائنس ٹیچر کی ایک نئی عارضی آسامی پر، عارضی سائنس ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ کیا گیا۔

ایضاً محمد حسین بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ ایک امیدوار کو بعد از تعطیلات موسم گرما بتاریخ حاضری م۔ غلام حسین کی جگہ جن کا گورنمنٹ ہائی سکول راولپنڈی سے تبادلہ ہو چکا۔ بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے بہ پیمانہ تنخواہ -/۱۲۰ — ۱۰ — -/۲۰۰ — ۱۰ — -/۳۰۰ روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رسالہ خورد مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد یوسف بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ ایک امیدوار کو ایک نئی عارضی آسامی پر بعد از تعطیلات تاریخ حاضری سے بہ پیمانہ تنخواہ -/۱۲۰ — ۱۰ — -/۲۰۰ — ۱۰ — -/۳۰۰ روپے بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول راولپنڈی سے مقرر کیا گیا۔

آموزش

جلد ۱۵ شمارہ ۴ — لاہور — اکتوبر

اس شمارہ میں

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

اکتوبر سنہ ۱۹۶۲ء

جلد ——— ۱۵
شمارہ ——— ۴

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

پبلشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۱۴۲ انارکلی لاہور سے شائع کیا

اداریہ

تعلیمی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں تعلیمی رہنمائی پر بہت زور دیا ہے۔ چنانچہ ثانوی تعلیم، پیشہ ورانہ تعلیم، اعلیٰ تعلیم، اور حرفتی تعلیم کے سلسلے میں تعلیمی رہنمائی بار بار زیر بحث آئی ہے۔

درحقیقت انفرادی صلاحیتوں کا فطری فرق اور کسی شعبہ میں خصوصی مہارت حاصل کرنے کا روزافزوں رجحان، طلبہ کی رہنمائی اور انتخاب کو ضروری قرار دیتا ہے۔ پھر ایسے ملکوں میں، جہاں وسائل کا محدود ہونا اس امر کا متقاضی ہو کہ موجودہ ذرائع سے انتہائی فوائد حاصل کئے جائیں وہاں تعلیمی رہنمائی کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے

بسا اوقات جامعہ کے "تازہ وارد" کو عام طور پر انتخاب نصاب اور مدرسے تعلیمی معیار کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ کمیشن کی رائے ہے کہ اسکولوں کالجوں اور بالخصوص پیشہ ورانہ کالجوں میں فیل ہونیوالوں کی کثرت اور مختلف پیشوں اور حرفتوں کے میدان میں ہمارے طلبہ کی کم عیاری کا بڑا سبب یہی ہے کہ دوران تعلیم اُن کو مناسب رہنمائی اور مشورہ میسر نہیں آتا۔

دراصل کسی فرد کے تعلیمی امکانات اُس کے ذوق اور ذاتی دلچسپیوں پر منحصر ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ اکثر و بیشتر طلبہ اپنی خداداد صلاحیتوں اور ذاتی دلچسپیوں کو پس پشت ڈال کر کسی دوسرے کی یا خود غلط آرزو یا حکم کے تحت یا دوسرے حالات کے زیر اثر مضامین کا انتخاب کر لیتے ہیں اور اس طرح محدود لیاقت والے طلبہ کو یونیورسٹی کے اعلیٰ و پیچیدہ نصاب سے الجھنا پڑتا ہے۔ اور اعلیٰ درجے کے ذہین طلبہ معمولی قسم کی تعلیم میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کا نتیجہ ضرر رساں بھی ہوگا اور ملال انگیز بھی۔

مدرسوں میں تعلیمی رہنمائی کے لیے ایک ایسے منظم پروگرام کی ضرورت ہے جو صحیح نفسیاتی

نظر پر مبنی ہو اور جس میں طلبہ کی تمام تعلیمی زندگی کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس پروگرام میں طلبہ کا انتخاب اور ان کی جماعت بندی کے جدید نفسیاتی طریقوں کا استعمال بھی شامل ہو۔ مثلاً ذہانت اور انفرادی ذوق کو معلوم کرنے کی معروضی آزمائشیں، مسلسل ریکارڈ، اور طلبہ کی تعلیمی ترقی اور سماجی ہم آہنگی کا جائزہ جو جدید تکنیکوں کے ذریعے بخوبی ممکن ہے۔

کمیٹی کی رائے ہے کہ آٹھویں جماعت پاس کرنے پر جب بعض طلبہ صنعت و حرفت سیکھنے کی غرض سے صنعتی مدارس میں داخلہ لیتے ہیں۔ یا دسویں جماعت کے بعد کامرس، انجینیرنگ یا ایسا ہی کوئی مخصوص کورس اختیار کرتے ہیں یا اس کے بعد بارھویں جماعت کے اختتام پر جب ان کے کالج یا یونیورسٹی میں داخل ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو ان کو تعلیمی رہنمائی اور مشورے کی سخت ضرورت ہے۔

طلبہ کی رہنمائی اور مشورہ ایک علم بھی ہے اور فن بھی۔ جو لوگ اس کام کا بیڑہ اٹھاتے ہیں انہیں پیشہ ورانہ علم اور مخصوص آلوں اور تکنیکوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چونکہ ہمارے تعلیمی اداروں میں مکمل مشورے کے لیے ضروری ساز و سامان موجود نہیں ہے۔ اس لیے موجودہ کارکنوں اور محدود سہولتوں کو غنیمت سمجھ کر اس کام کا آغاز کرنا ہے۔ جب تک ہمارے معلمین کو تعلیمی رہنمائی کے بنیادی اصولوں اور طریقوں کی تربیت دینے کا اہتمام نہ ہوا نہیں خود ایک معقول و ترقی پسند طریق وضع کرنا ہوگا تاکہ اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکیں۔ طلبہ سے ہمدردی۔ ان کے مفاد سے دلچسپی اور عام بصارت و بصیرت کے سہارے تدریسی تکنیکوں اور غیر رسمی مشوروں کے ذریعہ بہت سے ایسے مسائل حل کیے جا سکتے ہیں جن سے طلبہ کو واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کچھ طلبہ ضرور ایسے رہیں گے جو اپنے پیچیدہ اور بظاہر لاینحل مسائل کی بدولت تربیت یافتہ تعلیمی مشیروں اور ماہروں کے محتاج ہوں۔

تعلیمی رہنمائی اور مشورے کے سلسلے میں سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور کا چائلڈ گائڈنس کلینک ضروری خدمات انجام دیتا رہتا ہے اور کالج میں زیرِ تربیت طلبہ کے لیے رہنمائی کا ایک باقاعدہ پروگرام زیرِ عمل ہے۔

بچے کی نشوونما

مس اے ایم حسین۔ بیچرار سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور

۱۔ بچے کی نشوونما سے مراد :-

بچے کی نشوونما کے مطالعہ سے مراد ان درجوں کی خصوصیات کا مطالعہ ہے جن سے ہر فرد کو پیدائش کے بعد سے بڑھاپے تک گذرنا پڑتا ہے۔ بچے کی نشوونما کے مطالعہ کے لیے فزیالوجی۔ سوشیولوجی اور نفسیات سے مدد لینی پڑتی ہے

۲۔ نشوونما کے مطالعہ کا فائدہ

(ا) اس قسم کا مطالعہ ہمیں براہ راست تو یہ نہیں بتاتا کہ بچوں کی تربیت کیسے کی جائے۔ البتہ اس کی مہیا کی ہوئی معلومات کی بنا پر ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ بچے کے لیے تعلیمی اور تربیتی پروگرام کیسے مرتب کیے جائیں

(ii) ہم بالیدگی کے مختلف درجوں کی خصوصیات کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہر درجہ اپنے طور پر مکمل ہوتا ہے۔ اور استاد اگر ان کو نظر انداز نہ کرے تو درس و تدریس کو بچے کے مطابق بنا سکتا ہے۔

(iii) اس مطالعہ کی بنا پر ہم ایک معیار قائم کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق کہہ سکتے ہیں کہ آیا ایک بچہ عام (NORMAL) بچوں کی طرح ہے یا پسماندہ (BACKWARD) ہے۔ یا اپنی عمر سے کچھ آگے۔ اس طرح ہم بچے سے بے جا توقعات نہیں رکھتے۔

(iv) اگر بچپن سے سن بلوغت تک کسی بچے کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے ماضی و حال اور مستقبل کا باہمی تعلق (INTER RELATION) بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اور یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ نشوونما اور بالیدگی کے درجات ترتیب وار ہیں اور ایک منزل دوسری منزل کے بعد شروع ہو جاتی ہے۔

(v) نشوونما باقاعدہ ہوتی ہے تعلیم و تربیت اس میں یا تو مدد دیتی ہے یا حارج ہوتی ہے۔ لیکن

ایسے نہیں ہو سکتا کہ کسی ایک منزل کو حذف کر دے یا بدل دے یہی وجہ ہے کہ بچے اور اس کی دلچسپیوں کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے۔

بچے کی نشوونما کے مطالعہ کے وقت ہمیں نہ صرف اس کی جسمانی و ذہنی بلکہ معاشرتی نشوونما کو بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہے بچے کے کردار (BEHAVIOUR) کا ذکر اس معاشرہ کے بغیر جس میں کہ وہ پرورش پاتا ہے بے معنی ہے۔ بچے کا ماحول اور اس پر انداز ہونے والی تہذیب و تمدن کو سمجھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بچے کی ذات کو سمجھنا۔ بچے کی نشوونما کے جدید نظریے کے مطابق بچہ اور معاشرہ دونوں مطالعہ کا لازمی جزو ہیں۔ اگرچہ ہم مطالعہ کا آغاز بچہ سے ہی کرتے ہیں۔ لیکن اس کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ اس کی صلاحیتیں، خصوصیات، رجحانات اور ذہانت معاشرہ کے مطابق ہی پروان چڑھتی ہے۔ معاشرتی سلیقہ سیکھنا اور معاشرے کو اپنے میں سمو لینا بچہ کی خاص صلاحیت ہے۔

۱۳۔ بچے کی نشوونما کا مطالعہ بتاتا ہے کہ:۔

(ا) چند خصوصیات ایسی ہیں جو سب بچوں میں ہوتی ہیں۔ کیوں کہ سب انسانی بچے ہیں۔ وہی جسم دو ٹانگیں، دو ہاتھ، دو آنکھیں، کان، ناک وغیرہ۔ ہر بچہ اپنے اعضائے حس اور حواس کے ذریعے دنیا سے متعارف ہوتا ہے۔ ہر بچے کو تحریک و ترغیب (STIMULATION) کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچہ میں ذہانت اور چند صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ خاص کر معاشرتی سلیقہ سیکھنے کی صلاحیت۔

(ب) بالیدگی اور نشوونما کا عمل سب بچوں کے لیے ایک جیسا (SIMILAR) ہوتا ہے، جو معاشرے کے اثر سے بے نیاز رہتا ہے۔ مثلاً ہر بچہ کا سر اس کے دھڑ سے پہلے بڑھتا ہے اس طرح نشوونما سر سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے اپنے کندھے وغیرہ سے کام لیتا ہے اور بازو یا انگلیوں وغیرہ کا استعمال بعد میں سیکھتا ہے۔ اسی طرح پہلے وہ پورے جسم کو اور بعد میں اعضائے جسم کو استعمال کرتا ہے۔

(ج) ہر بچہ میں کچھ خاص اندرونی، پوشیدہ طاقت ہوتی ہے جس کا ظہور بچپن سے بڑھاپے تک ہوتا رہتا ہے

مثلاً اس کی بنیادی ضرورتیں۔

(د) بچوں میں کچھ اختلافات بھی ہوتے ہیں جن کی وجہ حیاتیاتی توارث ہے۔

(ہ) چند ایک ایسی خصوصیات ہیں جو ہر بچہ کی زندگی سے متعلق ہیں۔

۴۔

ہر ایک فرد دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ اختلاف صرف توارث کا نتیجہ ہی نہیں ہوتا جہاں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "وہ ایسا ہی پیدا ہوا ہے"۔ وہاں یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اسے ماں باپ نے بگاڑا ہے کیوں کہ ہر فرد توارث و تربیت دونوں کے اثر کا نتیجہ ہے۔ یہ بحث کہ توارث زیادہ اہم ہے یا تربیت بے معنی ہے دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ دونوں برابر کا حصہ لیتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ تربیت صرف اسی صورت میں موثر ہو سکتی ہے جبکہ فطری استعداد موجود ہو۔

زندگی کا آغاز

توارث کا اصلی مفہوم سمجھنے کے لیے زندگی کے آغاز کا مطالعہ ضروری ہے۔ انسان کی زندگی کی ابتدا واحد خلیے سے ماں کے پیٹ کے اندر ہوتی ہے۔ اس خلیے کو باروار خلیہ کہتے ہیں۔ یہ مادہ اور نر تناسلی خلیوں کے باہمی اختلاط کا نتیجہ ہے۔ اسی کو نطفہ قرار پانا کہتے ہیں۔ اس خلیہ میں تمام جسمانی اور ذہنی خصوصیات موجود ہوتی ہیں جن کا اثر بچے کی نشوونما پر پڑتا ہے اور جن کا اظہار تمام عمر ہوتا رہتا ہے۔ نطفہ قرار پاتے ہی باروار خلیہ کی تقسیم شروع ہو جاتی ہے۔ بعض خلیے جسم۔ اعصاب۔ گوشت پوست بنانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور چند خلیے جسم کی ساخت میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔ یہ تناسلی خلیے نسل بر نسل منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ موروثی صفات اور خصوصیات کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ عمر اور اکتسابی خصوصیات کا نسل بر نسل منتقل ہونے والے خلیوں پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ نہ اکتسابی خصوصیات توارث پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایک شخص ۵۰ سال کی عمر میں جو توارثی صفات اپنے بچے میں منتقل کرے گا وہ وہی ہوں گی جو وہ ۱۰ سال کی عمر میں کرتا۔ جنگ کے زمانے میں جو سپاہی اپنی ٹانگیں اور بازو وغیرہ ضائع کر بیٹھے ہیں ان کی اولاد صحیح و سالم ہی پیدا ہوتی ہے۔

بارداری کے وقت ہی یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ طفلیہ مرد ہوگا یا عورت۔ قد لمبا ہوگا یا پست۔ خوبصورت ہوگا یا بدصورت۔ موٹا ہوگا یا دُبلا۔ ذہین ہوگا یا غبی۔ اسی وقت یہ بھی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ آنکھوں کی رنگت۔ ناک کا نقشہ۔ جلد کا رنگ، اور بالوں کی رنگت اور ساخت کیسی ہوگی۔ یہاں یہ بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حیاتیاتی توارث یہ فیصلہ نہیں کرتا کہ بچہ بندوق سے کھیلنے کا شوقین ہوگا یا گلی ڈنڈے سے۔ کوئی ہنر بھی ورثہ میں نہیں ملتا۔ ہنرمند ہونے کی استعداد البتہ ورثے میں ملتی ہے

نشوونما کا پہلا سال

یہ ابتدائی بچپن کا زمانہ چند خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ بچہ اپنے گردوپیش اور اپنے ماحول سے اپنے حواس کے ذریعہ متعارف ہوتا ہے اور ابتدائی عمر میں بہت کچھ سیکھتا ہے ۔

حواس کی نشوونما

بچے کے حواس پیدائش کے وقت بہت محدود کام کرتے ہیں لیکن بہت جلد ان کی نشوونما شروع ہو جاتی ہے۔ پیدائش کے بعد ہی بچہ اپنی دونوں آنکھوں کو استعمال نہیں کر سکتا۔ مگر چند دنوں بعد ان کا استعمال شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح کان بھی شروع میں صرف بلند آواز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ زبان مختلف چیزوں مثلاً نمک اور میٹھے کے مزہ کے فرق کا اندازہ نہیں لگا سکتی۔ مگر جلد ہی بچہ میٹھے پانی اور سادہ پانی کے مزہ کو محسوس کرتا ہے۔ ناک مختلف قسم کی بو میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتی ۔

جسمانی نشوونما

پیدائش کے وقت عام بچے ۷½ پونڈ وزن اور ۲۰ انچ قد کے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں وزن اور قد میں لڑکوں سے کچھ کم ہوتی ہیں۔ سال کے آخر میں بچہ کا وزن پیدائش کے وزن سے تین گنا ہو جاتا ہے اور قد میں ½ حصہ کا اضافہ ہوتا ہے ۔

پیدائش کے وقت بچے کے جسم میں ۲۷۰ ہڈیاں ہوتی ہیں جو نہایت نرم اور لچکدار ہوتی ہیں اور آہستہ آہستہ مضبوط ہونا شروع ہوتی ہیں۔ منہ میں دانت کوئی نہیں ہوتا۔ پہلے دانت ۶ ماہ، ۷ ماہ کی

عمر میں نکلتے ہیں۔

بنیادی ضروریات

پہلے سال میں بچے کی بنیادی ضروریات میں بھوک۔ پیاس سونا اور آرام شامل ہیں۔ یہی دیگر ضروریات کی بنیاد بنتی ہیں اور بچے کو معاشرتی سلیقہ سیکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ بچہ ماں سے مانوس ہو جاتا ہے کیونکہ وہی اس کی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔

تاثرات کا اظہار

بچہ اپنے تاثرات کا اظہار بہت محدود طریقے سے کر سکتا ہے۔ بھوک پیاس یا تکلیف کا اظہار رو کر کرتا ہے۔ انگوٹھا چوس کر یا ماں کا دودھ پی کر اسے تسلی ہوتی ہے۔ تیز روشنی میں آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سر اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔

۶ ماہ کا بچہ بیٹھنا شروع کرتا ہے، ۷ ماہ کی عمر میں وہ گھٹنوں کے بل رینگنا شروع کرتا ہے۔ ۸ ماہ کی عمر میں گھٹنوں اور پاؤں کے بل رینگتا ہے۔ اسی طرح پہلے وہ کسی چیز کو پکڑ کر کھڑا ہوتا ہے اور ۱۲ ماہ کی عمر میں کسی سہارے کے بغیر چل سکتا ہے۔

بعض اوقات نشوونما کے ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں تبدیلی کی رفتار ہموار نہیں ہوتی اور ایک درجہ دوسرے درجہ میں مدغم ہو جاتا ہے۔

زباندانی

ولادت کے وقت سے بچے کی زبان کا افتتاح ہوتا ہے۔ سانس لیتے ہوئے اور دودھ پیتے ہوئے وہ مختلف قسم کی آوازیں نکالتا ہے۔ بالیدگی کے ساتھ ساتھ وہ اور بھی آوازیں نکال کر تجربہ کرتا ہے۔ غوں غوں۔ آ۔ آ وغیرہ کی خوب مشق کرتا ہے ۲ ماہ کی عمر میں پہلا حرف بولتا ہے اور ۶ ماہ کی عمر میں مختلف آوازوں کی نقل کرتا ہے۔ اور جیسے جیسے بڑا ہوتا ہے دیگر اظہار کے طریقے سیکھ لیتا ہے۔

نشوونما کا دوسرا سال :۔ بچے کا دماغ وزن میں بڑھتا ہے اور عملی طور پر دو لکڑی کے ٹکڑے

اوپر نیچے رکھ کر مینار سا بنا سکتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے گیند پھینک سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ گیند پاس ہی گر جائے، سو مختلف الفاظ بول سکتا ہے اور انہیں پُر معنی طریق سے استعمال کر سکتا ہے۔ وہ مختلف آوازوں کی طرف دھیان دے سکتا ہے کہ آواز کہاں سے آتی ہے۔

اس دور میں لڑکے ہاتھ پاؤں کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ گھر کے لوگ اسکی زیادہ تعریف کرتے ہیں اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ لیکن لڑکیاں زبان میں زیادہ مہارت حاصل کرتی ہیں لڑکوں سے زیادہ الفاظ کا ذخیرہ رکھتی ہیں۔

بچہ اب بھی دوسروں کی مدد کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ اکیلے کہیں آنے جانے میں جھجکتا ہے لیکن جیسے جیسے اس کی ہمت افزائی ہوتی ہے وہ خود اعتمادی حاصل کر لیتا ہے۔ اگر والدین اسے اجازت دیں کہ وہ اپنے چھوٹے موٹے کام خود کرے تو اسے اچھا لگتا ہے اور آئندہ کے لیے ہمت بندھ جاتی ہے۔ اس دوران میں بچہ یہ بھی سیکھ جاتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ اگر اچھے تعلقات رکھنے ہیں تو ان کے کہنے کے مطابق اسے کام کرنا چاہیے۔ دوسروں کا خیال رکھنا چاہیے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس کی سزا ملتی ہے اس دور میں بچہ اپنی زبان سے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے وہ کسی دوسرے بچے کے ساتھ ایک ہی کمرے میں کافی دیر تک کھیلتا رہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ کھلونوں کا لین دین نہیں کرے گا۔

۳ سے ۵ سال تک کی نشوونما

بچہ زبان پر کافی عبور حاصل کر لیتا ہے اس کے الفاظ کا ذخیرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ ۵ سال کے آخر تک تقریبًا دو ہزار الفاظ جمع ہو جاتے ہیں۔

تجسّس کا جذبہ بہت تیز ہوتا ہے۔ ہر چیز کو چھو کر اور توڑ پھوڑ کر دیکھنا چاہتا ہے۔

اس دور میں اکثر اوقات بچہ کو الفاظ کی ادائیگی میں مشکلات پیش آتی ہیں کئی دفعہ وہ الفاظ صاف نہیں بول سکتا اور لکنت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک عام بات ہے۔

اگر ماں باپ بہت تشویش کا اظہار کریں تو ان کی یہ فکر و تشویش بچے پر بھی اثر کرتی ہے اور اتنی کمی

الفاظ کے بولنے سے وہ گھبراتا ہے۔ ممکن ہے وہ مستقل طور پر انہیں غلط بولنا شروع کردے اور زبان میں لکنت پیدا ہوجائے۔ وہ عام الفاظ کی تعریف بھی کرسکتا ہے۔ بچے کی یادداشت اس دور میں بہت اچھی ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں حرف بحرف یاد کرلیتا ہے۔

رفتہ رفتہ بچہ میں معاشرتی شعور پیدا ہوجاتا ہے۔ لڑکا باپ کی نقل کرتا ہے اس کے لیے ہر چیز میں باپ ماڈل کا کام کرتا ہے اور لڑکی ماں کی مثال سامنے رکھ لیتی ہے۔

بچہ بہت سے سوالات کرتا رہتا ہے لیکن ان کے جوابات کی نہ امید رکھتا ہے نہ اس کا انتظار کرتا ہے کہ جواب سن لے۔ خاص کر ۳ سال کی عمر میں ہر سوال کا جواب "نہیں" دیتا ہے۔ حالاں کہ اکثر اوقات وہ کام کرتا بھی جائے گا۔ لیکن زبان سے یہی کہتا رہے گا۔

اس دور میں بچے کا قد اور وزن بھی بڑھتا رہتا ہے ذہنی نشوونما خوب تیزی سے ہوتی ہے معاشرتی نشوونما اس شخصیت کی تشکیل میں مدد دیتی ہے۔ دوسرے بچوں کے ساتھ رفاقت کے جذبے بھی اجاگر ہونے لگتے ہیں۔

۵ سال سے دس سال میں نشوونما

پرائمری سکول کا دور:- اس دور میں قد بڑا بڑھتا رہتا ہے۔ وزن قد کی نسبت زیادہ بڑھتا ہے۔ اعضا کی حرکی نشوونما بھی بڑھتی رہتی ہے۔ لڑکے لڑکیوں کی نسبت دراز قد نظر آتے ہیں۔

جب بچہ سکول میں داخل ہوتا ہے تو نیا ماحول اس کی معاشرتی نشوونما میں ایک سنگ میل کا مقام رکھتا ہے۔ معاشرتی سلیقہ زیادہ سیکھنے لگتا ہے۔ اب وہ گروہوں کی صورت میں کھیل کو دلپسند کرتا ہے۔ اپنے ساتھیوں کا گروہ وہ خود منتخب کرتا ہے۔ عموماً بچہ اپنی ہی جنس کے افراد سے میل جول رکھتا ہے اور اپنے دوستوں کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ اس کی عادات سے خاندان کے اثر کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

کمرۂ جماعت میں اسے محسوس ہوتا ہے کہ استاد چند بچوں کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اور

آموزش

انہیں دوسروں پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ اسے پہلی دفعہ احساس ہوتا ہے کہ رتبہ صرف پیار کے علاوہ بھی کسی اور چیز پر منحصر ہے۔ بچے کے کردار کا انحصار استاد کے رویہ پر ہوتا ہے۔ اگر استاد اسے اچھا بچہ کہتا ہے تو وہ اسی معیار پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسکول کا مناسب نظم و نسق اس کا مددگار ہوتا ہے۔ استاد کا متوازن رویہ بچے کی جذباتی صحت کے لیے بہت مفید ہے۔

بچے کی ذہنی نشو و نما اور زیادہ ترقی کرتی ہے۔ زبان دانی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

بچے کا کردار اس کی بنیادی ضرورتوں کا اظہار ہوا کرتا ہے ÷

بنیادی تقاضے اور بچّہ

محمد صدیق احمد لیکچرر گورنمنٹ ایجوکیشنز کالج لائل پور

قوم کے نونہالوں کی ہمہ جہتی نشوونما اور صحیح تربیت کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بنیادی ضرورتوں کو نظر میں رکھا جائے۔ بچوں کی مثال ان نازک پودوں جیسی ہوتی ہے جن کی لازمی ضروریات مثلاً خوراک دھوپ، ہوا، اور پانی کا بندوبست نہ کیا جائے تو نہ صرف ان کی نشوونما رک جاتی ہے بلکہ وہ مرجھا کر سوکھ جاتے ہیں۔ اگر ان ضروریات میں سے چند ایک پوری ہو جائیں تو پھر بھی ان کی نشوونما پوری طرح نہیں ہو پاتی۔ یہی حال بچوں کا ہے۔ خوراک اور لباس کے علاوہ ان کی کچھ اور ضرورتیں بھی ہوتی ہیں جن کو پورا کیے بغیر ان کی نہ تو مکمل طور پر نشوونما ہو سکتی ہے نہ ہی وہ ترقی کر سکتے ہیں۔

اس مسئلہ پر مزید بحث کرنے سے پہلے اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ ہر بچہ انفرادی طور پر ایک مکمل وحدت ہوتا ہے۔ اس کے کردار کے مختلف پہلو الگ الگ دیکھے جا سکتے ہیں مگر ہمیں کسی وقت بھی اس مکمل وحدت یعنی بچے کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بچے کے مختلف کرداری پہلو طبعی۔ ذہنی۔ جذباتی و معاشرتی تقاضوں پر مشتمل ہوتے ہیں جس طرح ہم کسی پودے کی ساخت سمجھنے کے لیے اس کے تنے۔ جڑ۔ پتوں۔ پھلوں اور پھولوں کو الگ الگ کر کے دیکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ پودے کے یہ حصے کل پودے سے الگ کوئی شے ہیں۔

پودے کی طرح بچّہ بھی ایک مکمل وحدت ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنا اشد ضروری ہے جس طرح ایک پودے کی اگر پوری طرح حفاظت کی جائے اور اس کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے تو وہ پودا خراب موسم اور ناساعد حالات میں بھی اپنی نشوونما جاری رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک بچے کے بنیادی تقاضوں کا لحاظ رکھا جائے اور ضروریات کے پورا

کرنے کا بندوبست کیا جائے تو وہ بھی خراب حالات سے پوری طرح عہدہ برا ہونے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔

مادی وجود کو احساسات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی احساسات اور معاشرتی حالات کو الگ الگ کیا جا سکتا ہے۔ الگ الگ ضرورتوں اور تقاضوں کا ذکر محض سہولت کی خاطر کیا جا رہا ہے تاکہ اس طرح مکمل وحدت یعنی بچے کی رہبری اور رہنمائی اچھی طرح کی جا سکے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بچے کے الگ الگ ٹکڑے کر رہے ہیں۔ کسی فرد کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے اس کے صرف ایک کردار کی پہلو پر ہی غور کرنا کافی نہیں ہوتا۔ اس کے واسطے ضروری ہے کہ تمام پہلوؤں کو مدِنظر رکھا جائے اور متعلقہ مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔

ہم اگر ایک بچے کو ایک مکمل وحدت کا درجہ دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے کردار کے تمام بنیادی پہلوؤں، تقاضوں اور ضرورتوں سے بھی کماحقہٗ واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ معلم و استاد ہمارا یہ کہنا غلط ہے کہ مدرسہ سے باہر بچہ جو کچھ کرتا ہے اس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں اور اس کے واسطے ہمارے اوپر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے کے مترادف ہے۔ بچہ مدرسہ سے باہر جو کچھ کرتا ہے اس کے لیے بھی استاد اتنا ہی ذمہ دار ہوتا ہے جتنا کہ بچے کے والدین اور دیگر متعلقہ افراد ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ اگر بچے کو اپنے گھر مناسب خوراک نہیں ملی یا وہ کسی وجہ سے رات کو سو نہیں سکا تو کوئی استاد کس طرح اس کو تحصیلِ علم پر آمادہ کر سکتا ہے۔ ہم کو حتی المقدور یہ کوشش کرنی چاہیے کہ بچے کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کریں تاکہ وہ مدرسہ میں ہر اعتبار سے ترقی کر سکیں۔ کیونکہ یہی ہماری اہم ترین ذمہ داری ہے اور اس سے پہلوتہی کرنا اخلاقی لحاظ سے قابلِ مذمت طرزِ عمل تصور کیا جاتا ہے۔

طبعی تقاضے

ہم سب خوراک، ہوا، پانی، آرام، نیند، جسمانی اور جنسی تحریکات کی ضرورتوں سے واقف ہیں۔ آپ کہیں گے کہ ایک پرائمری سکول کے بچے کے جنسی مسائل ہوتے ہی کون سے ہیں۔ لیکن مدرسہ یا جماعت میں

تمام بچے ہم عمر نہیں ہوتے۔ ان میں سے بعض بچے دوسروں کے مقابلے میں جنسی اعتبار سے پہلے سن بلوغ کو پہنچ جاتے ہیں ان کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کے جسم کی ساخت میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کا کیا مطلب ہے؟ یہ بات ان بچوں کے لیے بھی آتنی ہی سچ ہے جو عنقریب بالغ ہونیوالے ہوتے ہیں۔ جسمانی اعتبار سے تندرست و توانا بچہ کمزور ناتوان اور بیمار بچے کے مقابلے میں علم کی تحصیل میں زیادہ رغبت حصّہ لیتا ہے۔ اچھی صحت نہ صرف طبعی تقاضوں کے پورے کرنے سے حاصل ہوتی ہے بلکہ اس کے لیے بچوں کو بیماری اور جسمانی چوٹ سے محفوظ رکھنے کے لیے مناسب انتظام ہونا چاہیے۔

ذہنی تقاضے

ہمارے مدرسوں میں اب تک بچوں کے ذہنی تقاضوں کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ کئی اعتبار سے ان پر غور کرنا اور انہیں پیدا کرنے کی کوشش کرنا ازبس ضروری ہے۔ کسی بچے کی مسلسل نشوونما کے لیے عمر کے ساتھ ساتھ اس کی سمجھ اور شعور میں بھی مسلسل اضافہ ہونا چاہیے۔ کچھ جاننے اور سیکھنے کی خواہش ہر بچے میں موجود ہوتی ہے۔ ایک کم عمر بچے کا ذوق تجسس جتنا زیادہ ہوتا ہے اسی کی شہادت اس کے نامختتم سوالات کا سلسلہ دیتا ہے جو وقتاً فوقتاً اپنے بڑوں سے کرتا رہتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کے اس جذبۂ تجسس کو کس طرح کام میں لایا جائے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ان بچوں کو جھڑک کر ان کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے اور اس طرح ان کے سوچنے سمجھنے کی راہ میں ناقابلِ عبور رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ بعض مدرس بچوں کو نصاب کی کتابیں ہی پڑھا دینا کافی سمجھتے ہیں اس طرح بچہ کتاب تو رٹ لیتا ہے۔ لیکن عملی طور پر اس میں نت نئے مسائل اور حالات کو سمجھے اور ان سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت بالکل پیدا نہیں ہوتی۔ عملی دنیا میں ان کا کتابی علم محض بیکار ثابت ہو کر رہ جاتا ہے۔

جب بچہ عملی دنیا میں اپنے مدرسہ کے حاصل کردہ علم سے فائدہ اٹھانا سیکھ جاتا ہے، تو اس میں خود اعتمادی کا جوہر پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح ایک اچھے اور باشعور شہری کی تخلیق ہوتی ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ بچے کے ذہنی تقاضوں کو سمجھ کر ان کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے

جذباتی تقاضے

ہر جذبہ احساس سے متعلق ہوتا ہے اور احساسات میں سب سے اہم خود اعتمادی کا احساس ہے اعتماد دو قسم کا ہوتا ہے ایک تو وہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یعنی اپنے آپ پر اعتماد اور دوسرا اعتماد دیگر افراد سے تعلق رکھتا ہے۔ بچے کو ہمیشہ یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ ایک قابل شخص ہے اور دوسروں کو اس کی عزت کرنی چاہیے۔ اگر وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ دوسرے اس سے محبت کرتے ہیں اس کی صحبت میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور جو کچھ وہ کرتا ہے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں تو وہ خود کو ایک اہم ہستی سمجھنے لگتا ہے۔ یہ خود اعتمادی کے احساس کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس طرح مسلسل کامیاب تجربات کے ساتھ ساتھ اس کا یہ احساس بڑھتا جاتا ہے اور نئے نئے حالات سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیتیں اجاگر ہوتی جاتی ہیں۔

خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ اسے یہ احساس بھی ہونا چاہیے کہ وہ بھی دوسروں پر اعتماد کر سکتا ہے اسے یقین ہونا چاہیے کہ دوسرے اس کی خامیوں اور کوتاہیوں پر انگشت نمائی نہیں کریں گے۔ اور انہیں نشانۂ تضحیک بنانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ضرورت کے وقت اس کی مدد کریں گے۔ اسے یہ بھی احساس ہونا چاہیے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کو سمجھ سکتے ہیں اور اس کے مراسم اور تعلقات دیرپا اور قابل اعتماد ہیں۔ اسے یہ بھی احساس ہونا چاہیے کہ دوسروں کو بھی اس کی ضرورت ہے۔ اس پر بھروسہ ہے اور یہ کہ وہ ان کی خوشی میں خوش ہیں۔ الغرض ہر استاد کو ہر بچے کے ذہنی تقاضے پورے کر کے ایک مکمل اور مفید کردار کی تعمیر میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔

معاشرتی تقاضے

معاشرتی اور جذباتی تقاضوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ بہت سے احساسات ایسے بھی ہوتے ہیں جو جذباتی تقاضوں کی آسودگی کا سبب بنتے ہیں اور جن کا تعلق معاشرے سے بھی قریبی ہوتا ہے۔ جذباتی اور معاشرتی تقاضوں میں تمیز کرنے کے لیے یہ جان لینا چاہیے کہ جذباتی تقاضوں کا تعلق زیادہ تر احساسات سے ہوتا ہے اور معاشرتی تقاضے خاص طور پر طرز عمل سے متعلق ہوتے ہیں۔

سکول کے بچوں میں فطری طور پر دوسرے بچوں سے تعلقات استوار کرنے اور دوستی پیدا کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ دوسرے بچوں سے دوستی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان دوستوں کو یہ بتا دے کہ وہ ان کو پسند کرتا ہے۔ ان کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے اور ان کی مدد بھی کر سکتا ہے اس طرح باہمی تعاون کی فضا میں بچے میں مشکل مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ معاشرتی حیوان ہے۔ معاشرہ کے اندر آپس میں تعلقات بڑھانے کے لیے اسے قوت نطق اور اس کے استعمال کی خصوصیت تفویض کی گئی ہے۔ چناں چہ لازم ہے کہ بچوں کو سوسائٹی کا ایک کارآمد رکن بنانے کے لیے ان کے درمیان قریبی تعلقات اور تعاون کی فضا پیدا کرنے کے لیے ان کے معاشرتی تقاضوں کو دھیان میں رکھا جائے اور ان کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہر بچہ انفرادی طور پر جداگانہ شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی نشوونما اور کردار کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے کام میں ماحول ایک اہم کام ادا کرتا ہے۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے ہم جانتے ہیں کہ ہر بچہ فطرتاً دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کا اپنا جسم ہوتا ہے جو وہ اپنے اجداد سے ورثہ میں پاتا ہے اور پھر ماحول کے اثر سے اس میں کئی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ جس طرح اس کا ورثہ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے اسی طرح اس کا ماحول بھی منفرد ہوتا ہے۔ دو افراد کے لیے ایک ہی صورت حال ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ دو جڑواں بچوں کے لیے ابتدا میں ایک ہی ماحول ایک جیسا اثر ڈال سکتا ہے اس کے بعد وہ مختلف اعتبار سے ان دونوں پر الگ الگ اثر انداز ہو کر ان کے کردار میں نمایاں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ماحول ایک زبردست قوت ہے جس کا اثر ہر فرد پر جدا جدا اور شدید ہوتا ہے اس لیے مختلف تقاضوں کو پورا کرتے وقت ماحول کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔

بچے کی مسلسل نشوونما اور ہمہ جہتی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ان بنیادی تقاضوں کو پورا کیا جائے جن کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے لیکن ان تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں تو نتیجہ مایوسی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ کسی بچے کی تمام توانائی ان تقاضوں کے پورا ہونے میں

صرف ہوتی ہے اور اگر راستے میں رکاوٹیں حائل ہوں تو فطری طور پر بچہ ان کو ہٹانے کی کوشش کرتا ہے یہ کشمکش مختلف شکلیں اختیار کر سکتی ہے۔ تقاضے کی شدت بچے کی نشوونما کے درجے۔ اس کے ماضی کے تجربات اور دیگر امور پر منحصر ہوتی ہے۔

مدرسہ کی مناسب فضا اور ماحول میں کشمکش نسبتاً کم شدید ہوتی ہے۔ کیوں کہ اسے مسائل کے حل کیلئے اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لانے کا موقع مل جاتا ہے۔ جب بچے کا واسطہ کسی مشکل مسئلہ سے پڑتا ہے تو اپنی پوری قوت سے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مختلف طریقے خود بخود تخلیق کرتا ہے اس طرح اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن مسئلہ کے حل کرنے میں ناقابل عبور رکاوٹیں حائل ہو جائیں تو بچہ اپنے آپ کو اس مسئلہ کے حل کرنے کے ناقابل پاکر مایوس ہو جاتا ہے اس طرح اس کی مکمل نشوونما اور ترقی رک جاتی ہے۔

بچہ جب دیکھتا ہے کہ اس کے بنیادی تقاضے پورے نہیں ہو سکتے تو وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ دنیا بہت وسیع ہے اور اس کا اس دنیا اور اس کے حالات پر کوئی زور نہیں چل سکتا۔ اب اسے اپنی صلاحیتوں پر شک ہونے لگتا ہے۔ وہ آرام طلب اور عافیت کوش بن جاتا ہے، وہ دوسروں کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ خود اپنی طرف سے کوئی جدوجہد شروع نہیں کر سکتا۔ پہلے زمانے کے مکتبوں اور گھرانوں میں بچوں کو تعلیم دینے کا مقصد ہی یہ ہوتا تھا کہ وہ بچے اپنے بزرگوں کے کہنے پر عمل کریں اور ان میں فرماں برداری کی عادت پیدا کی جائے۔ بیرونی طور پر بچوں کو فرمانبرداری پر آمادہ کرنا کسی طرح مستحسن نہیں ہوتا جب سے کہ بچے کا شعور اتنا بیدار کیا جائے کہ وہ بڑوں کی عزت خود بخود کرنے لگے اور ان کا کہنا ماننے لگے۔ اس کے لیے اسے اس کے بنیادی تقاضوں سے محروم کرنا نامناسب ہے۔ اس طرح کی فرمانبرداری بچہ مجبوراً کرتا ہے اس سے اس کی دلی تسلی بالکل نہیں ہوتی، وہ دیکھتا ہے کہ اس کی فرمانبرداری اور اطاعت کے باوجود اسے نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ اپنے اوپر اس کے اپنے اعتماد میں مزید کمی ہو تی جاتی ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ کوشش کا فائدہ کیا ہے؟ وہ مختلف مسائل اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کی بجائے ان سے فرار اختیار کرنے لگتا ہے وہ دور ہی سے اس دنیا کا تماشہ دیکھنے کا عادی بن جاتا ہے۔

مباحثہ کے دوران خاموش بیٹھا رہتا ہے اور اکثر اوقات خیالی پلاؤ پکانے میں مصروف رہتا ہے اپنے تصورات کی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ اپنے خوابوں کی دنیا میں وہ اپنے آپ کو بڑا بہادر اور قابل ترین شخص تصور کرتا ہے۔ اپنے خوابوں کی دنیا میں ناممکن کو ممکن بناتا اور ان لوگوں کی نظروں میں جو اسے نظر انداز کرتے رہے ہیں ایک ہیرو کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس خوابوں کی دنیا میں وہ اپنے بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے کا بندوبست کر لیتا ہے جو حقیقت کی دنیا میں پورے نہیں ہو سکتے وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ہوائی محل تعمیر کرنے میں صرف کر دیتا ہے اور یہ اس کی عادت ثانیہ بن کر رہ جاتی ہے اور وہ نفسیاتی طور پر ایک ذہنی مریض بن جاتا ہے۔

ان حالات میں رفتہ رفتہ وہ اپنے خیالات میں اتنا مستغرق ہو جاتا ہے کہ وہی خواب اس کی دنیا بن کر رہ جاتے ہیں اور وہ حقیقی دنیا کو غیر حقیقی سمجھنے لگتا ہے۔ وہ دنیا اور اس کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیتیں کھو بیٹھتا ہے اور اس طرح نیم پاگل سا انسان بن کر رہ جاتا ہے بچے کو ایسے حالات سے بچانے کے لیے اس کے بنیادی تقاضوں کا احترام ضروری ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اگر بچے کے بنیادی تقاضے پورے نہ کیے جائیں تو اس کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ شدید جذبات مثلاً غم و غصہ کی حالت میں انسان کا ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے اگر کسی شخص کو بار بار غم و غصہ کا دورہ پڑے تو اس کا نظام ہاضمہ ایک مستقل بیماری کی حالت اختیار کر لیتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہوتا چلا جاتا ہے اور مختلف بیماریوں کے حملے کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ بالکل یہی حال اس بچے کا ہو جاتا ہے جس کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے کا انتظام نہیں کیا جاتا۔ اعصابی کھچاؤ اور جذباتی ہیجان اس کے نظام ہاضمہ پر اثر انداز ہو کر اسے جسمانی طور پر کمزور بنا دیتے ہیں اور وہ بیماری کے حملہ اور چوٹ برداشت کرنے کی قوت کھو دیتا ہے۔

ایک بچہ جب اپنے آپ پر اعتماد کھو دیتا ہے تو اپنے آپ کو ناکارہ سمجھنے لگتا ہے وہ اپنے آپ سے ہمیشہ ناراض رہتا ہے۔ اس طرح اعصابی کھنچاؤ بیماری کا موجب بنتا ہے۔ بلکہ اس بیماری کو لم

نکمے پن کی سزا سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح سوچنے سے وہ اپنے آپ کو تسلی دے لیتا ہے کہ اگر وہ کامیاب نہیں ہو سکتا تو کوئی بات نہیں کم از کم اسے اپنی ناکامی کی سزا تو مل رہی ہے۔

بچے جب مدرسے میں داخل ہو جاتے ہیں تو ان کی ہمہ جہتی ترقی اور نشو و نما میں مدد کرنا اساتذہ کا اہم فریضہ ہے۔ لیکن یہ ترقی اور نشو و نما اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مدرسین بچوں کے بنیادی تقاضوں کو نہ سمجھیں اور ان کو پورا کرنے کا انتظام نہ کریں۔ ہر مدرس کا انفرادی طور پر ہر بچہ سے نفسیاتی لحاظ سے واقف ہونا لازم ہے اور صورت احوال کے تقاضوں کے مطابق ایسا لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیے کہ الگ الگ ہر بچہ کے بنیادی تقاضوں کو سمجھے۔ ان کو پورا کرے اور ایک مفید اور با مقصد شہری بننے میں ان کی مدد کرے۔

جوانی کے چند اہم مسائل

ڈاکٹر عبدالرؤف ڈائرکٹر ویسٹ پاکستان بیورو آف ایجوکیشن لاہور

بلوغت کا ہیجانی دور ختم کر کے زندگی کا کارواں قدرے ثابت قدمی سے جوانی کی منزلوں کی طرف بڑھتا ہے۔ جوانی میں ذہنی اور جسمانی توانائی اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ بلوغت کی ہلچل چوں کہ ختم ہو چکی ہوتی ہے اس لیے ذہن اور جسم میں قدرے پختگی آ جاتی ہے۔ تخلیقی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ فکر اور عمل کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ جوان لڑکے لڑکیاں یوں محسوس کرتے ہیں جیسے وہ مشکل سے مشکل کام بھی بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ ان کے عزائم بلند ہو جاتے ہیں۔ کسی نصب العین کو سامنے رکھ کر اس کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کرنے اور پیہم عمل کرنے کا اشتیاق بے حد بڑھ جاتا ہے۔

ابتدائی تربیت کی اہمیت

جوان مرد اور عورت سراپا قوت، سراپا عمل، سراپا زندگی ہوتے ہیں۔ اگر ان کے ذہن میں کچھ کر دکھانے کا خیال سما جائے تو کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ جوانی میں انسانی فکر اور عمل کون سی سمتیں اختیار کرتا ہے۔ یہ بات بیشتر بچپن کی تربیت پر منحصر ہے۔ اگر بچپن میں غیر مناسب حرکتیں کرنے کا جنون ہو گیا ہے۔ برے لوگوں سے میل جول رہا ہو۔ سینما بینی کی چاٹ پڑ گئی ہو۔ پڑھائی سے نفرت پیدا ہو گئی ہو۔ کام سے جی چرانے کی عادت پڑ گئی ہو تو جوانی میں فکر و عمل غیر موزوں سمتوں کی طرف چل نکلتے ہیں۔ طرح طرح کی خلافِ معاشرت حرکات کا شوق چرآتا ہے۔ عیش و عشرت اور آوارگی کا اشتیاق بڑھتا جاتا ہے اور محنت کیے بغیر دولت حاصل کرنے کی ترکیبیں سوجھتی ہیں۔ بعض نوجوان تو خلاف معاشرت اور مجرمانہ حرکتوں میں اس قدر مہارت حاصل کر لیتے ہیں کہ ان کا وجود گھر اور معاشرے کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے،

وہ جہاں کہیں بھی ہوں معاشرہ اُن کے بُرے کردار اور مجرمانہ ذہنیت سے ہر لحظہ خطرے میں رہتا ہے۔

بگڑے نوجوانوں کی اصلاح

اس قسم کے غیر ذمہ دار، اوباش طبع اور جرائم پسند نوجوانوں کو ڈھیل دے دینا قرین مصلحت نہیں ہے۔ ان میں محنت کرنے اپنے آپ کو کارآمد بنانے اور معاشرے کے نظم و نسق کی اطاعت کرنے کی عادت اور مذہبی اور اخلاقی اصولوں کے احترام کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔ علاج اور اصلاح کا یہ کام بچپن میں تو آسانی سے ہو سکتا تھا مگر جوانی میں عادتیں چونکہ پختہ ہو چکی ہوتی ہیں اس لیے اس قسم کے بگڑے ہوئے نوجوانوں کو راہ راست پر لانے کے لیے بہت احتیاط کرنی چاہیے۔

ایسے خوش نصیب بچے جنھیں بچپن میں اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا ہو۔ اچھی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہو۔ اچھی تعلیم و تربیت میسر آئی ہو۔ کھیل اور تفریح کے مناسب سامان مہیا ہوئے ہوں۔ جوان ہو کر اپنی تخلیقی قوتیں اپنی اور دوسروں کی بھلائی میں صرف کرتے ہیں۔ یہی جوان پھر زیادہ پختہ کار ہو کر معاشرے کی زندگی کے مختلف شعبوں کے قائد بنتے ہیں اور معاشرہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور گراں قدر خدمتوں سے مستفید ہوتا ہے۔

کاہل اور سست نوجوان

جوانوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو نہ تو اول الذکر کی طرح خطرناک ہوتا ہے اور نہ مؤخر الذکر کی طرح کارآمد ہی ثابت ہوتا ہے۔ یہ طبقہ ایسے جوانوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اگرچہ زندگی کے ابتدائی ادوار میں محنت و مشقت کے عادی نہیں ہوتے نہ ان کی تعلیم و تربیت ہی مکمل ہوتی ہے۔ مگر چونکہ وہ بُری صحبت سے محفوظ رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ بداخلاقی اور مجرمانہ حرکات سے اجتناب کرتے ہیں۔ وہ امنگوں اور آرزوؤں سے بیزار اور بڑی روکھی پھیکی سی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض نوجوان اپنے دوسرے ساتھیوں کو ترقی کرتے دیکھ کر کچھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اکثر یہ تصور کر کے کہ "اب کچھ نہیں ہو سکتا" کاہل اور سست ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے نوجوانوں کی مناسب رہنمائی کی جائے تو ان میں سے اکثر کسی نہ کسی علم یا ہنر میں تھوڑا بہت کمال حاصل کر سکتے ہیں۔

اور اس طرح بچپن اور بلوغت کے ضائع شدہ وقت کا کافی حد تک کفارہ کر لیتے ہیں۔

اکثر حالتوں میں جوانی کا کچھ عرصہ تو اس علم یا ہنر کی تکمیل ہی میں گذر جاتا ہے جس کی ابتدا بچپن یا بلوغت میں ہوتی ہے۔ تکمیل علم و ہنر کا یہ دور مختلف درس گاہوں میں مختلف طریقوں سے بسر ہوتا ہے اکثر طلبہ سکولوں اور کالجوں کے ابتدائی مرحلوں میں مطالعہ کے لیے غیر فنی مضامین کا انتخاب کرتے ہیں اس لیے نوجوان طلبہ کی اکثریت اپنی غیر فنی مضامین کی تکمیل کے سلسلہ میں جوانی کے ابتدائی سال آرٹ کالجوں میں گذار دیتی ہے۔

آرٹ کالجوں کے نوجوان

آرٹ کالجوں کی زندگی فنی کالجوں سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ فنی کالجوں کی طرح ان کالجوں میں تعلیم ذہن پر اتنا بوجھ نہیں ڈالتی اور نہ ہی جسم پر اتنی پابندیاں عاید کرتی ہے۔ آرٹ کالجوں کی ثقافتی، تمدنی، اور تفریحی زندگی میں بے حد دلچسپ اور کافی تنوع ہوتا ہے جس سے نوجوان طلبہ کو آرٹ کالجوں میں دلچسپی کے کافی وسیع سامان میسر آجاتے ہیں۔ مشاعرے، مباحثے، ڈرامے، محفلیں، ہنگامے کھیلیں وغیرہ آرٹ کالجوں کی رونق کو دوبالا کیے رکھتے ہیں۔

نوجوان طلباء کی اقسام

آرٹ کالجوں میں کئی قسم کے طلباء مشاہدہ میں آتے ہیں۔ طلبا کا ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جو امتحانات میں کامیابی اور انعامات کے حصول کے لیے ہمیشہ تگ و دو کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر جسمانی طور پر بہت کمزور ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی ان کے کمروں میں جانے کا اتفاق ہو تو میز پر کتابوں کے انبار کے ساتھ ہی وٹامین کی شیشیاں بھی پڑی ہوئی نظر آئیں گی۔ ایسے نوجوان اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ سیر و تفریح اور ورزش کی کمی وٹامین کی گولیاں نگلنے سے پوری ہو سکتی ہے۔ چند طلبا ایسے بھی ہوتے ہیں جو کالج کے آخری سالوں میں مقابلہ کے کسی امتحان کی تیاری میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ چونکہ مقابلے کے امتحان میں جسمانی صحت اور شخصی وجاہت کے پہلوؤں کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس لیے یہ نوجوان اسی لالچ کی وجہ سے علمی مشغلوں کے ساتھ ساتھ صحت اور تفریح کے تقاضوں کو بھی فراموش نہیں کرتے۔ بعض طلبا کھیل کود

اور ورزش میں باقاعدہ حصہ لیتے ہیں اور اپنی علمی مصروفیات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ بعض آرٹس کالجوں میں پیشہ ور کھلاڑی بھی پائے جاتے ہیں۔ ان نوجوانوں کو کھیل میں کھیل کی خاطر کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ ٹیم میں کوئی عہدہ حاصل کرنے یا کھیل میں کمال کے بل بوتے پر چاندی بنانے کی وجہ سے کھیل میں لگاؤ ہوتا ہے۔ ان میں سے اکثر طلبہ امتحانوں میں بار بار فیل ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے طلبہ کی تعداد بہت کم ہے جو کالج کی زندگی کے دوران میں تعلیم اور کھیل تفریح وغیرہ میں متوازن حصہ لیتے ہوں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی ذہنی اور جسمانی تربیت میں توازن پیدا کیا جائے۔ آرٹ کالج کا شعبۂ نفسیات اس فریضہ کو بڑی اچھی طرح سرانجام دے سکتا ہے۔

کالج کی زندگی اور حقیقت

مجموعی طور پر آرٹ کالجوں کے اکثر نوجوانوں کی زندگی روزمرہ حقائق کی تلخیوں سے کوسوں دور گذرتی ہے صرف ان چند طلباء کو زندگی کے تلخ تجربات اور حقائق سے کچھ روشناسی ہو جاتی ہے۔ جو تعطیلات گرما میں کسی دفتر یا کارخانہ وغیرہ میں عارضی طور پر ملازمت اختیار کر لیتے ہیں یا وہ طلباء جو تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی ملازمت یا چھوٹی سی تجارت وغیرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے کالج کی اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہو کر جب وہ زندگی اور معاش کے جھمیلوں میں پڑتے ہیں تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک اجنبی اور ناسازگار دنیا میں آن پھنسے ہیں۔ اس تلخ احساس سے انہیں سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ بعض نوجوان اس صدمے کی تاب نہ لاکر ذہنی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں یا محض معاشرے سے انتقام کی خاطر جرم یا سماج دشمن حرکتوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

نوجوانوں کی رہنمائی

نوجوانوں کی ان تلخیوں سے نجات دلانے کے لیے ہمیں اپنے نظام تعلیم اور نظام معیشت پر نظر ثانی کرنا ہو گی۔ صرف ان طلبہ کو کالجوں میں پڑھنے کا مشورہ دینا چاہیے جو ذہنی طور پر اعلیٰ تعلیم کے اہل ہوں کالج کی تعلیم کے دوران میں ان کے معاشی رجحانوں کا جائزہ لینا چاہیے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ انہیں آئندہ زندگی میں مناسب پیشہ اختیار کرنے کے لیے تیاری کا موقع دینا چاہیے۔ گرمی کی چھٹیوں میں طلبہ کے لیے

کھیتوں، دفتروں، کارخانوں وغیرہ میں وقتی ملازمتوں کا اہتمام ہونا چاہیے تاکہ یہ نوجوان پڑھائی اور کتابوں میں الجھ کر زندگی کے حقائق سے بالکل منقطع نہ ہو جایا کریں۔ کالجوں میں نوجوان طلبا کی جذباتی رہنمائی کیلئے نفسیاتی کلینک کھولے جانے چاہئیں۔ جہاں ان کی ذہنی تکالیف کا بروقت علاج کیا جائے اور انہیں اپنی روزمرہ الجھنوں کے بارے میں مناسب رہنمائی میسر آ سکے۔

فنی کالجوں کے نوجوان

فنی کالجوں کے نوجوان طلبہ کی زندگی بہت مختلف ہوتی ہے آرٹ کالجوں کے برعکس فنی کالج میں ایک مخصوص فن اور پیشہ کے لیے علمی تربیت دی جاتی ہے۔ آرٹ کالجوں کے طلبہ میں انفرادی اختلافات اس قدر زیادہ اور رجحانات میں تنوع اس کثرت سے ہوتا ہے کہ اس پہلو سے ان میں کوئی یکسانیت یا یکجہتی شاذ ہی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس فنی کالجوں میں طلبہ میں یکجہتی نسبتاً نمایاں ہوتی ہے۔ اور وہ ایک ہی خاندان کے مختلف افراد معلوم ہوتے ہیں۔ کالج کے تمام طلبا۔ طب، انجنیئری، قانون، تعلیم وغیرہ کے طالب علم ہونے کی وجہ سے ایک ایسا منظم گروہ نظر آتے ہیں جن کے عزائم، فکر اور کردار میں آرٹ کے طلبہ کی نسبت بہت کم اختلاف اور تنوع موجود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ، ان لوگوں کی جذباتی زندگی آرٹ کالجوں کے نوجوانوں کی زندگی سے اس پہلو سے نسبتاً خوشگوار ہوتی ہے کہ انہیں یہ طمانیت نصیب ہوتی ہوتی ہے کہ وہ معاشرے کے ایک مفید فن میں علمی تربیت پا رہے ہیں اور یہ کہ اس تربیت سے فراغت پاکر وہ معاشرے کے کارآمد اور برسرِ روزگار فرد بن جائیں گے۔ اس لیے یہ نوجوان اپنی تعلیمی زندگی کے دوران میں بھی زندگی کے حقائق سے عموماً منقطع نہیں رہتے۔

فنی تربیت کے ذہنی عواقب

فنی کالجوں کے طلبہ بڑی مصروف زندگی گذارتے ہیں۔ ان کے مضامین قدرے خشک ہوتے ہیں۔ مسلسل عملی تربیت انہیں بور بھی کرتی ہے۔ انہیں تفریح اور کھیلوں میں شرکت کے لیے بہت کم وقت ملتا ہے اس قسم کی غیر متوازن زندگی سے ان کے ذہن پر بہت ناخوشگوار بوجھ پڑتا ہے جو بسا اوقات خطرناک ذہنی الجھنوں اور بیماریوں کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص فن میں مہارت

کو حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن زندگی کی روحانی اور جمالیاتی قدروں سے عموماً ناآشنا رہتے ہیں۔ چنانچہ فنی کالجوں میں نوجوان طلبہ کو کسی خاص فن کی تربیت دینے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے لطیف احساسات اور جذبات کے اظہار کے مواقع بھی دینے چاہئیں جس طرح آرٹ کالجوں میں مختلف سوسائٹیاں اور کلب وغیرہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان فنی اداروں میں بھی اس قسم کی تفریحی انجمنوں کے قیام کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔

تعلیم یا فن کی تکمیل کے بعد نوجوان کو زندگی کے دو بڑے مسائل پیش آتے ہیں۔ ان میں سے ایک روزگار کا مسئلہ ہے اور دوسرا رفیق حیات یا رفیقۂ حیات کی تلاش کا معاملہ۔

تلاشِ معاش کا معاملہ

فنی درس گاہوں کے تربیت یافتہ نوجوانوں کے لیے تلاش معاش کا مسئلہ اتنا مشکل نہیں ہے ہمارے ہاں تقریباً ہر فن کے تربیت یافتہ نوجوانوں کی کمی ہے۔ اس لیے طب۔ انجینئری۔ قانون اور تعلیم کے شعبوں میں تربیت یافتہ نوجوانوں کو کام ڈھونڈنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آتی۔ مگر آرٹ کالجوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں کو اس سلسلہ میں طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مقابلے کے امتحان میں بہت کم نوجوان کامیاب ہوتے ہیں۔ معدودے چند نوجوانوں کو اعلیٰ ملازمتیں میسر آتی ہیں۔ چنانچہ آرٹ کالجوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اکثر نوجوانوں کو معاشی میدان میں مایوسیوں، تلخیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض نوجوان تو ان تلخیوں اور مسلسل ناکامیوں کو برداشت کر لیتے ہیں مگر اکثر نوجوانوں کی زندگی میں محرومیت کا احساس شدت پکڑنے لگتا ہے جس کے نتائج بیشتر حالتوں میں فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

ابتدائی دشواریاں

جن نوجوانوں کو مختلف دفتروں اور اداروں میں ملازمت مل جاتی ہے ان میں سے اکثر کو اپنی ناتجربہ کاری اور دفتری آداب سے ناواقفیت کی بنا پر ابتدائی سالوں میں طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا رہتا ہے۔ ان بعض نوجوانوں کو اپنی طبیعت کے مطابق ہی کام کرنے کی عادت پڑ گئی ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے طریق کار میں

اپنے ساتھیوں یا افسروں کے حسب منشا ترمیم نہ کر سکتے ہوں تو انہیں ملازمت ایک بارگراں دکھائی دینے لگتی ہے۔ سہو و خطا اور تجربوں کے مختلف ادوار سے گذر کر انجامِ کار وہ مطابقت اور کامیابی کے موٹے موٹے اصولوں سے متعارف ہو جاتے ہیں۔ اکثر حالتوں میں مطابقت اور معاشی کامیابی کا یہ دور ڈھلتی جوانی میں شروع ہوتا ہے۔ نوجوان ملازموں کے مالکوں اور افسروں کو ان کی مشکلات کا احساس ہونا چاہیے۔ انہیں ان کی مشکلات کو دور کرنے کی سنجیدہ اور مخلص کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ان کے عمل میں کسی نو وارد سے سہو و خطا ہو جائے تو اُسے درگذر کر دینا چاہیے اور نرمی اور تحمل سے اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔ اگر اُس کے کسی ماتحت نے کوئی اچھا کام کیا ہو تو مالکوں اور افسروں کو چاہیے کہ اُس کی حوصلہ افزائی کریں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنے سے وہ اپنے نوجوان عملہ سے زیادہ کام لے سکتے ہیں۔

رفیقِ حیات کی تلاش

رفیقِ حیات یا رفیقۂ حیات کی تلاش کا مسئلہ ہمارے بدنصیب معاشرے کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے لیے غالباً سب سے پیچیدہ اور مشکل معاملہ ہے۔ چوں کہ ہمارے ہاں لڑکے لڑکیوں کو آپس میں ملنے جلنے کے بہت کم مواقع میسر آتے ہیں۔ اس لیے اکثر شادیوں میں عین شادی کے دن ہی فریقین کو ایک دوسرے کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ اِس معاملے میں اکثر اوقات احساسات و جذبات اور اخلاق و عادات کی ہم آہنگی۔ ذہنی اُمنگوں جیسا صحت اور قابلیت کی بجائے فریقین کے مال و دولت کو مرکزی اہمیت دی جاتی ہے۔ اسی لیے ہمارے ہاں ازدواجی زندگی عموماً تلخ اور شادیاں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ شادی بیاہ کے بعد بھی بعض گھریلو پیچیدگیاں ابتدائی ازدواجی زندگی کی مسرتوں کو پامال کر دیتی ہیں۔ مثلاً فریقین کے والدین لڑکے اور لڑکی پر اپنا مخصوص اثر و رسوخ قائم کرنے کے لیے خوامخواہ دھڑے بندی کی حرکتوں پر اتر آتے ہیں جس کا مجموعی نتیجہ سب کے لیے ہلاکت ثابت ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کا علاج یہ ہے کہ نوجوان لوگ شادی سے پہلے اِس بات کی اچھی طرح تسلی کر لیا کریں کہ اُن کی زندگی کے موجودہ ساتھی ان کے لیے واقعی طور پر موزوں ہیں اور خیالات و جذبات، شوق اور مشاغل آداب و عادات کے اعتبار سے واقعی ان سے ہم آہنگ ہیں۔ اس جانچ پرکھ کے بعد جب ایک بار شادی کا فیصلہ کر لیا جائے تو پھر اُس پر انسانیت سے قائم رہ کر ازدواجی زندگی کو اس قدر خوش گوار

رکھا جائے کہ کسی خارجی یا داخلی عنصر کی مداخلت ان کے تعلقات کو مکدر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جوانی کی اہمیت

فطرت نوجوانوں کو کمال فیاضی سے توانائی، روشن دماغی اور حرارتِ فکر و عمل عطا کرتی ہے۔ تعلیم، روزگار اور ازدواجی زندگی کے معاملوں میں اگر نوجوان ان خداداد صلاحیتوں کو بطریقِ احسن بروئے کار لانے کا تہیہ کریں تو ان کی زندگی متعدد حادثوں سے بچی رہتی ہے اور ازدواجی زندگی بھی بے حد خوشگوار بسر ہوتی ہے اس کے برعکس نوجوان اپنی ان فطری صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیں اور زندگی کی الجھنوں کا حل ڈھونڈنے کے لیے کوئی منظم اور معقول کوشش نہ کریں تو ساری زندگی تلخیوں اور ناکامیوں کا نذر ہو جاتی ہے۔ ٭

جغرافیہ میں نئے رجحانات

انسانی جدوجہد

پروفیسر فرحت اللہ خاں نیو مسلم کالج لاہور

انسانی جغرافیہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کائنات کو بنایا اور اسے حضرت انسان کی خدمت کے لیے مقرر کر دیا۔ فرانسیسی علما بھی اس پر ایمان رکھتے تھے چنانچہ وڈال بلانشے (VINDEL LA BLANCHE) نے بتایا کہ انسان دنیا میں بہت بڑی طاقت ہے۔ وہ علم کی مدد سے اپنے گردونواح کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر سکتا ہے اسی زمانہ میں اہل فرانس نے نہر سویز بنا کر ایشیائی تجارت کا دروازہ کھولا اور ریگستانی فوج بنا کر صحرائے اعظم جیسے لق و دق صحرا پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ فرانس میں انسانی جغرافیہ (HUMAN GEOGRAPHY) کی بنیاد پڑی۔ اصولاً یہ نظریہ مغربی یورپ کے لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔

انسانی جغرافیہ اور تہذیبیں

انسانی جغرافیہ کی بنیاد پڑتے ہی انسان مطالعہ کا مرکز بن گیا۔ ماہرین علم نے سوچنا شروع کیا کہ ابتدائی انسان تو جانوروں کی طرح رہتا تھا، پھر کیوں کر اس نے بڑی بڑی تہذیبوں کی بنیاد ڈالی۔ بہت سے علما اس پر غور کرنے لگے۔ جوں جوں انسان میں ماحول کے خلاف جدوجہد کرنے کی طاقت بڑھی اور وہ سائنسی دولتوں سے مالامال ہوتا گیا۔ تہذیبوں کے معیار بدلنے لگے۔

شکاری انسان

ابتدائی زمانہ میں انسان شکار کر کے یا درختوں کے پھل کھا کر زندگی بسر کرتا تھا۔ جنگلی جانور اُسے بہت ستاتے تھے۔ اس لیے وہ رات کو غاروں میں چھپ کر سوتا اور دن کو نکیلے پتھروں سے ان کا شکار کرتا

تاریخ کے اِس دور کو پتھر کا زمانہ (STONE AGE) کہتے ہیں۔

دھاتوں کے زمانے کا اِنسان

پتھروں کے ٹکراؤ سے آگ پیدا ہوئی۔ آگ سے انسان نے اپنا کھانا بھونا۔ وہ کسی پہاڑی میں آگ تاپ رہا تھا کہ دھات پگھل کر ایک طرف جمع ہوگئی۔ دھات کو کوٹ کر انسان نے نئے ہتھیار بنائے اور شکار کو بآسانی حاصل کرنے لگا۔ تاریخ میں اس دور کو دھات کا زمانہ (METAL AGE) کہتے ہیں۔

گڈریا اِنسان

انسان نے دشمن جانوروں مثلاً شیر، چیتے، سانپ وغیرہ کو ہلاک کیا اور دوست جانوروں مثلاً گائے، بھینس، بھیڑ، بکری، اونٹ گھوڑے وغیرہ کو پالا۔ مؤخرالذکر انسان گلہ بان یا گڈریا (HERDER) کہلایا۔ یہ جانوروں کی کھالوں سے شکلیں خیمے اور چمڑے سے ٹوپیاں اور بوٹ۔ اور خوراک کے لیے جانوروں سے دودھ اور گوشت حاصل کرتا۔ اس کے پاس ہزاروں کی تعداد میں بھیڑ بکریاں ہوتی تھیں جن کے لیے نئی چراگاہوں کی تلاش میں ادھر اُدھر پھرتا رہتا۔ وسط ایشیا کے آریا اور کرغیز اسی دور کی یادگار ہیں۔ تاریخ میں اسے گڈریوں کی تہذیب کا زمانہ (HERDERS AGE) کہتے ہیں۔ ہلاکو خاں، چنگیز خاں اور کرشن مراری اسی دور میں پیدا ہوئے۔

کاشتکار اِنسان

انسان اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے جانوروں سے بہت بلند تھا۔ وہ اپنی فہم و فراست کو زندگی کے ہر پہلو میں استعمال کر سکتا تھا۔ چناں چہ پودوں کا مطالعہ کر کے اس نے جلد معلوم کر لیا کہ زمین سے بیج کیسے اُگتا ہے۔ پودا کیسے نشوونما پاتا ہے اور دھوپ کی تمازت سے کیسے پکتا ہے۔ انسان نے انہی بیجوں کو کہیں گندم کہیں چاول، کہیں مکئی وغیرہ کا نام دے کر بویا، اور اچھی فصلیں حاصل کیں۔ اس طرح کھیتی باڑی کی بنیاد پڑی۔ تاریخ میں اِس دور کو زرعی تہذیب کا زمانہ (AGRICULTURAL CIVILISATION) کہتے ہیں۔

زرعی تہذیب کی بنیاد پڑتے ہی مِل جُل کر لوگ گاؤں میں رہنے لگے۔ ہر گاؤں کا سردار چُنا جانے لگا۔

اس کی مثال آج بھی پاکستان کے ہر گاؤں میں نظر آتی ہے۔ ہماری اسی فی صدی آبادی آج بھی اُن لوگوں کی ہے جو کاشتکار ہیں یا کاشتکاروں کے ذریعہ اپنی روزی کماتے ہیں۔

پاکستانی گاؤں

کبھی گاؤں میں جا کر دیکھیں۔ اکثر مکان مٹی اور گارے کے بنے ہوتے ہیں۔ ان میں کسان رہتے ہیں ہر کسان کا ایک کھیت ہے۔ جہاں وہ کھیتی باڑی کرتا ہے۔ ہر گاؤں میں ایک لوہار، ایک بڑھئی، ایک جولاہا، ایک موچی، ایک نائی، ایک دو دکاندار بھی ہوتا ہے۔ یہ کاشتکار کے لیے کام کرتے ہیں اور فصل پکنے پر اس سے اناج میں معاوضہ حاصل کرتے ہیں۔

ہمارے گاؤں میں مسجد نمایاں ہوتی ہے۔ یہاں کسان نماز پڑھتا ہے۔ یہیں بچوں کا مکتب بھی ہے۔ ایک چوپال ہوتی ہے جہاں پٹواری یا دوسرے افسر آتے ہیں۔ یا فرصت کے وقت گاؤں کے لوگ اپنا وقت گذارتے ہیں۔

کاشتکار کی زندگی کا ایک دن

کسان صبح صبح اٹھ کر سب سے پہلے نماز ادا کرتا ہے پھر گھر سے اپنے مویشیوں کو کھول کر کھیت کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ وہ ٹھنڈے ٹھنڈے وقت ہل چلاتا یا نلائی کرتا ہے۔ سورج کی تپش بھی اسے کچھ نہیں کہتی کیوں کہ یہی کھیت اس کے بال بچوں کے لیے چاول یا گندم پیدا کرتا ہے۔

دوپہر کے وقت اس کی بیوی لسی اور روٹی لے کر کھیت میں پہنچتی ہے۔ جسے وہ درخت کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے بیٹھ کر کھاتا ہے اور پھر درخت کے سائے میں سستانے کے لیے لیٹ جاتا ہے۔ دوپہر کے بعد اپنے مویشی لیکر واپس گھر آ جاتا ہے۔ بارش نہ ہو تو گڑگڑا کر یہ دعا مانگتا ہے

دھرتی سوکھی۔ کھیت پیاسا

میرے مولا پانی دے۔ میرے داتا پانی دے

کاشتکار کی روزی

کھیت کی کھیتی کاشتکار کی ساری دولت ہوتی ہے۔ جب فصل پک جائے تو سال بھر کی اپنی ضروریات

گھر میں جمع کر کے باقی منڈی میں لے جاتا ہے۔ فصل بیچ کر جو روپیہ حاصل کرتا ہے اس سے لگان اور مالک زمین کی ادائیگی کرتا ہے۔ باقی روپے سے گھر اور بچوں کی ضروریات خریدتا ہے۔ اس کی ساری روزی ایک کھیت اور چند مویشیوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس کی حالت بہتر بنانا ہر اچھی حکومت کا فرض ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم نے پاکستان میں زرعی اصلاحات کو بہت بڑی اہمیت دی ہے۔ کیوں کہ اس کی بربادی سے تمام ملک پر اثر پڑتا ہے۔ تب ہی تو ہمارے ملک کے ایک مشہور شاعر نے غصہ میں آکر لکھا:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

انسان اور معاشرہ

جب گاؤں سے شہر قائم ہوئے۔ حکومتوں کی بنیاد پڑی تو اسے معاشرتی قانون بنانے پڑے۔ مہاتما بدھ یا حضرت موسیٰ اور دیگر پیغمبروں کی تعلیم میں ان کی جھلک نظر آتی ہے۔ جیساں جیہ ہمارے پیغمبر آخرالزمان تک ان بنیادی اصولوں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اخلاقیات کے مالک بن کر مسلمان دنیا پر چھا گئے انہوں نے بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور لائبریریاں قائم کیں۔ ایک خدا کا تخیل جسے بابا گرونانک نے بھی اپنایا، اسلام ہی نے پیش کیا ہے۔ ہمارا رب، رب العالمین یعنی سب دنیاؤں کا رب ہے اور ہمارا معاشرہ انسانی ہمدردی کا حامی ہے۔ دنیا کے لوگ سب بھائی بھائی ہیں۔ اس تخیل سے متاثر ہو کر وِنڈل وِلکی ایک امریکن نے کہا تھا۔ دنیا کے قانون ایک جیسے ہونے چاہئیں۔ دنیا میں یو۔این۔او کا قیام بھی اسی نظریہ پر دلالت کرتا ہے۔

دریافت کا دور

پندرھویں صدی کے آخر میں واسکوڈی گاما نے کالی کٹ پہنچکر ہندوستان کا اور کولمبس نے امریکہ یعنی نئی دنیا کا راستہ معلوم کیا۔ براعظم شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ۔ آسٹریلیا دریافت ہوئے بعد یہ دنیا پرانی دنیا اور نئی دنیا میں تقسیم ہو گئی۔

ترقی یافتہ اور پسماندہ دنیا کی تقسیم

مغربی اقوام نے شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو آباد کیا اور اُن ملکوں سے

پیدا ہوا فائدہ اٹھانے کے لیے وہاں کے اصلی باشندوں کو یا تو تہ تیغ کر دیا یا جنگلوں اور ریگستانوں میں دھکیل دیا۔ انہوں نے افریقہ کو بھی بانٹ لیا اور جنوبی ایشیا پر بھی اپنا قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ لیکن ایشیا کے لوگ کچھ پرانی تہذیبوں کے مالک تھے۔ اس لیے ان کی یلغار سے پیچھے رہے۔ پھر بھی جنوبی ایشیا پر انہوں نے اپنے اعلیٰ ہتھیاروں سے قبضہ جما لیا اور ہمیں ہندوستان میں دو سو سال تک ان کی غلامی میں رہنا پڑا چنانچہ وہ ترقی یافتہ اقوام کہلائیں، اور ہم پسماندہ۔

مغربی اقوام کی ترقی کا راز

انسان اور اس کے ماحول کی لا متناہی جدوجہد میں اس کی ترقی کا راز ہے۔ خدا نے مغربی اقوام کو نئے براعظم دئیے۔ ان براعظموں تک پہنچنے کے لیے انہوں نے اپنے ذرائع باربرداری کو سنوارا۔ دنیا کی دولت اب ان کے قدموں پر تھی اور اس سے مالا مال ہو کر وہ ترقی یافتہ انسان کہلانے لگے

صنعتی انقلاب اور اس کے اثرات

(INDUSTRIAL REVOLUTION)

انیسویں صدی کے آغاز میں انگلستان میں صنعتی انقلاب رونما ہوا۔ ایک سائنسدان نے چکر کو بھاپ کی طاقت سے چلایا۔ پھر کیا تھا، ریلیں چلنے لگیں۔ دخانی جہاز تیز رفتار ہو گئے۔ کارخانے دھڑا دھڑ بننے لگے۔ فیکٹریوں میں مزدوروں اور مالکوں کے تعلقات کو نئے سرے سے درست کرنا پڑا۔ آہستہ آہستہ ساری دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

پہلا اثر۔ دنیا کی دو حصوں میں تقسیم

۱۔ صنعتی ملک مثلاً۔ انگلستان۔ جرمنی۔ فرانس وغیرہ

۲۔ زرعی یا خام اشیا پیدا کرنے والے ملک۔ مثلاً ہندوستان۔ مصر۔ چین وغیرہ

کوئی جہاز جو صنعتی ملکوں کو جاتا تھا، عموماً خام اشیا مثلاً کپاس۔ پٹ سن۔ کھالیں وغیرہ لے جاتا اور جو صنعتی ملکوں سے آتا وہ مشینیں۔ ادویات۔ کپڑا وغیرہ اپنے ساتھ لاتا۔

دوسرا اثر۔ علوم وفنون میں ترقی اور دنیا کی ترقی یافتہ اور پسماندہ اقوام میں تقسیم

جو ملک صنعتی ترقی کی آماجگاہ بنے وہاں علوم وفنون ان کی باندی بن کر رہ گئے۔ تہذیب وتمدن کا معیار ہی کچھ اور ہوگیا۔ وہ لوگ جو موٹر، ریڈیو، بنگلہ اور بنگلے میں میز کرسی رکھتے تھے مہذب اور ترقی یافتہ کہلانے لگے۔ ان کا معیار زندگی (STANDARD OF LIFE) بھی بہت بدل گیا۔ ان کے علاوہ پرانی تہذیبوں کے لوگ جو سادہ زندگی بسر کرتے تھے پسماندہ (BACKWARD) اقوام کہلانے لگے۔ صنعتی ملکوں میں دولت عام ہوگئی۔ اتنی عام کہ لوگوں نے دولت ہی کو خدا سمجھنا شروع کر دیا۔ پرانی اقدار ختم ہو گئے اور معیار تہذیب معیارِ زندگی کا پیمانہ بنی۔ اِس کو دیکھ کر ڈاکٹر اقبال پکار اٹھے ع

یہ صنّاعی فقط جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تیسرا اثر ملکوں میں خودکفیل بننے کی خواہش

صنعتی انقلاب نے اضلاع متحدہ امریکہ اور روس جیسے ترقی یافتہ ملکوں کو مجبور کیا کہ دنیا میں تجارتی مسابقت سے بچنے کے لیے اپنے ہی ملک میں خام مال پیدا کریں۔ اتفاق سے امریکہ تو پہلے ہی گندم، مکئی، کپاس وغیرہ کے لحاظ سے دنیا بھر میں اول تھا، روس نے بھی اپنے پنج سالہ منصوبوں کے ماتحت زراعت اور صنعت دونوں کو ترقی دی تاکہ ملک بیرونی درآمد سے آزاد ہو جائے اور اپنی ضروریات کے لیے خودکفیل ہو۔ ایسے ملکوں کو (SELF SUFFICIENT) خودکفیل ملک کہتے ہیں۔ پاکستان کو بھی خودکفیل ملک ہونا چاہیے اور اپنی صنعتوں کو باقاعدہ بنانے کے لیے لوہے اور فولاد کا کارخانہ ضرور بنانا چاہیے۔ تاکہ ہم مشینی سامان خود بنا سکیں۔

چوتھا اثر:- حیرت انگیز ایجادات اور ان کا غلط استعمال

صنعتی انقلاب کے بعد لوگ بے پناہ جذبے کے مالک بن گئے۔ ان میں تجسس اور معلومات کا ذوق اتنا بڑھ گیا کہ کوئی سمندروں کی تہ میں جا کر معلومات حاصل کرنے میں مصروف ہوا۔ کوئی آسمانوں پہ اڑ کر چاند اور مریخ تک پہنچنے کا ارادہ کرنے لگا۔ انسانی خدمت کا دھیان رکھا۔ بلکہ سیاسی نااتفاقیوں کی بنا پر ایٹم بم۔ ہائیڈروجن بم۔ نائٹروجن بم۔ ناکن راکٹ۔ اور

ان سے تیز ہوائی جہاز بنائے۔ امریکہ اور روس کی سیاسی مخالفت نے بیسویں صدی کے آغاز
ں دو بڑی جنگوں کی نیاد ڈالی جس میں دنیا کی تقریبًا تمام اقوام شریک ہوئیں۔

نواں اثر۔ صنعتی انقلاب اور سماجی جغرافیہ

صنعتی انقلاب کے بعد انسان روز بروز ترقی کے زینے پر چڑھ کر اپنے نظریات اور ضروریات بدلتا رہا۔ آج ہم روس اور امریکہ کے باشندوں کو انسانی دنیا کے سب سے بڑے مہذب لوگ استے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ جتنا ان لوگوں کا اثر ہمارے ملک میں آئے گا وہ ہمارے لیے مشعل راہ کا کام دے گا۔ کیوں کہ آج کی مہذب دنیا میں یہ اچھے معاشرے اور سماج کے نمائندے ہیں۔

اس تخیل نے سماجی جغرافیہ (SOCIAL GEOGRAPHY) کی بنیاد ڈالی۔ اس نظریہ کے مطابق جہاں ماہرین سائنس، اچھے فن کار اور مہذب انسان جمع ہو جاتے ہیں، وہاں معاشرہ بلند اور سماجی حالت بہتر ہو جاتی ہے۔

سماج کے مطالعہ نے ہمیں یہ ماننے پر بھی مجبور کیا کہ ہمارے معاشرہ میں مختلف لوگ مختلف کام کرتے ہیں اور جہاں وہ اکٹھے ہو جائیں وہاں معاشرہ عمدہ اور ترقی یافتہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً سماج میں لوگ اپنے پیشوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ جہاں چند لوہار جمع ہوئے اس علاقے کا نام ہی کوٹلی لوہاراں ہو گیا لاہور جیسے شہر میں طلبا کی بستیاں علیحدہ ہیں، مزدوروں کی علیحدہ کلرکوں کی علیحدہ۔ کاشت کاروں کی علیحدہ تاجروں کی علیحدہ۔ کارخانہ داروں کی علیحدہ اور ان بستیوں میں ہر جگہ ایک نیا معاشرہ نظر آتا ہے۔ لیکن ان تمام پیشہ وروں میں ایک اتحاد قائم ہے کیوں کہ ہر پیشے کا مقصد ایک نظام کو کامیاب کرنا ہوتا ہے۔ اسے مغربی اقوام تقسیم کار (DIVISION OF LABOUR) کہتی ہیں۔ لیکن باوجود اس کے سماجی جغرافیہ، اتحادِ انسانی، اور عالمی اخوت پر زور دیتا ہے۔ آج کل جب تک کوئی ملک دوسرے ملک سے تجارتی، ثقافتی اور سیاسی تعلقات قائم نہ کرے تنہا خوش نہیں رہ سکتا۔

جغرافیہ کا احاطۂ کار

موجودہ علمِ جغرافیہ نے انسانوں کی معاشرتی زندگی اور باہمی جمیعتی نظام پر بہت زور دیا ہے، چنانچہ

—— اس کی افادیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے خالی نہیں۔ محکمہ زراعت ہو یا محکمہ صنعت و حرفت۔ محکمہ موسمیات ہو یا ریلوے۔ محکمہ تعلقات عامہ ہو یا ملٹری کا محکمہ، غرض ہر محکمہ میں جغرافیہ کا علم ضروری ہے۔

جغرافیہ ہمارے لیے یہ دنیا انسان کے گھر کی مانند ہے جہاں وہ معلوم کرتا ہے کہ انسان اپنی ضروریات کیسے مہیا کرتا ہے۔ یہ قوموں کے تہذیب اور تمدن جانچنے میں ہماری مدد کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ابتدائی انسان کیسے مہذب بنا۔

پس جغرافیہ کا علم انسان میں وسعتِ نظر، بصیرت اور ہمدردی پیدا کرتا ہے۔ جغرافیہ کے طالب علم میں قوتِ مشاہدہ اور سائنسی طرزِ فکر موجود ہوتے ہیں۔ جغرافیہ ماحول کی دولتیں انسان کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ تاکہ وہ روزی کمائے اور خدا کا شکر ادا کرے۔ بقول شیخ سعدیؒ ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نخوری

اس کے مطالعہ سے قوتِ تخیلہ۔ قوتِ تجسس اور قوتِ عمل میں حیرت انگیز ترقی ہوتی ہے
آج ترقی یافتہ انسان کے لیے دنیا کے لوگوں کے جغرافیائی حالات جاننا از بس ضروری ہے۔ ☆

اعداد

پروفیسر ظرافت اللہ خاں سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور

تمہید:۔ ہمارے ملک میں جتنی بے قاعدگی سے ریاضی پڑھائی جاتی ہے، شاید ہی کوئی اور مضمون اس طرح پڑھایا جاتا ہو۔ بچہ جب سکول کی پہلی جماعت میں داخل ہوتا ہے تو اسے گنتی اردو میں سکھائی جاتی ہے اور وہ ہندسوں کو اس طرح لکھتا ہے۔

۱، ۲، ۳، ۴۔۔۔۔ ۹، ۱۰، ۱۱۔۔۔۔

دو چار سال تک وہ حساب کے سوال انہی اردو ہندسوں کی مدد سے حل کرتا ہے۔ جب وہ پانچویں جماعت میں پہنچتا ہے تو اسے ایک مشکل سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے۔ یعنی اسے اردو ہندسے ترک کرنے پڑتے ہیں جن کا وہ عادی ہوتا ہے اور ان کی جگہ انگریزی ہندسے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ اب وہ حساب کے سوال ان نئے ہندسوں 11، 15، 9 .... 3، 2، 1 کی مدد سے نکالتا ہے۔ انگریزی ہندسوں کی عادت اسے ایک دم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ دیکھا گیا ہے کہ شروع میں کافی دقت ہوتی ہے۔ اکثر طلبا سوال حل کرتے وقت کچھ ہندسے اردو میں اور کچھ انگریزی میں لکھتے ہیں۔ بعض مرتبہ کئی مہینوں کی کوشش کے بعد انہیں انگریزی ہندسے لکھنے کی عادت ہوتی ہے۔

پانچویں سے آٹھویں جماعت تک طالب علم سوالات حل کرنے میں ہندسے تو انگریزی استعمال کرتے ہیں لیکن طریقہ عمل اردو لکھائی کی طرح دائیں سے بائیں ہوتا ہے۔ سوالات کی رقمیں بھی دائیں سے بائیں طرف لکھتا ہے۔ مثلاً:۔

	آٹھویں میں جواب	نویں میں جواب
1- $5 \div 15$	3	$\frac{1}{3}$
2- $4 + 5 - 7$	6	2
3- $[1+\{(4-7)-2\}+2]-5$	3	7 -

جوں ہی طالب علم نویں جماعت میں پہنچتا ہے اسے ایک اور مشکل سے واسطہ پڑتا ہے اب وہ سوالوں میں نہ صرف انگریزی ہندسے استعمال کرتا ہے۔ بلکہ اسے سوالوں کی رقمیں اور ان کے حل بھی انگریزی طریقے سے یعنی بائیں طرف سے دائیں طرف لکھنے اور پڑھنے پڑتے ہیں چنانچہ اب وہ مندرجہ بالا سوالات کے مختلف جواب نکالتا ہے اور بجا طور پہ حیران ہوتا ہے کہ اسی سوال کا پہلے جواب اور تھا، اب اور ہے۔ اس کی پریشانی بڑھ جاتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ آٹھویں میں تو ۲ اور ۳ کا جذر اس طرح 2√ ، 3√ لکھا جاتا تھا لیکن نویں میں $\sqrt{2}$ اور $\sqrt{3}$ لکھا جاتا ہے۔ آٹھویں میں "بڑا ہے" یوں $<$ لکھا جاتا تھا۔ لیکن نویں میں یہی نشان "چھوٹا ہے" کو ظاہر کرتا ہے اور بڑا ہے "$>$" اس نشان سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ آٹھویں میں لا کی دوسری قوت اس طرح لکھتے تھے ^{2}لا نویں میں x کی دوسری قوت کو x^2 لکھتے ہیں جسے وہ کبھی x^2 لکھتا ہے اور کبھی ^2x ۔

کبھی دائیں سے بائیں اور کبھی بائیں سے دائیں طرف لکھنے اور پڑھنے کی الجھن اتنی سخت ہوتی ہے کہ کمزور طلبا کی کمر ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور انہیں ریاضی سے بیزاری ہو جاتی ہے۔ اکثر طلبا ریاضی کو مشکل مضمون قرار دے کر اسے کوسنے لگتے ہیں۔

امریکہ اور انگلستان میں ہر ایک بچہ جس طریقے سے ریاضی کی تعلیم شروع کرتا ہے تمام عمر اسی طریقہ پہ گامزن رہتا ہے۔ لیکن پاکستان میں ہر بچہ کو کم از کم دو مرتبہ اپنا راستہ بدلنا پڑتا ہے۔

انگریزوں کے زمانے میں ماہرین تعلیم کا خیال تھا، کہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنائے بغیر اعلیٰ تعلیم

حاصل نہیں کی جا سکتی۔ چناں چہ نویں جماعت سے ہی ریاضی کی تعلیم انگریزی میں شروع کی جاتی تھی۔ انگریزوں کے جانے کے بعد اِس خیال کے حامی کم ہو گئے۔ لیکن اب بھی اِس خیال کو کافی حامل ہے کہ اعلیٰ ریاضی پڑھانے کے لیے ذریعۂ تعلیم تو اردو ہو لیکن طریقۂ عمل خالص انگریزی ہو۔ نئے نصاب کے مطابق نویں دسویں کی ریاضی کی کتابیں اسی اصول پر لکھی گئی ہیں جس کا نتیجہ حوصلہ افزا ثابت نہیں ہو گا۔ اکثر طلبا ریاضی سے بددل ہو جائیں گے اور ریاضی پڑھنے والوں کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی جائے گی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ماہرینِ تعلیم نے ریاضی کے طلبا کی اس دماغی الجھن کا احساس نہیں کیا۔ اور اگر کیا ہے تو اِس کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ ریاضی جیسے دقیق مضمون میں طالب علم کے ذہن میں الجھنیں اور دقتیں پیدا کرنا حصولِ تعلیم میں رکاوٹ پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ وہ طالب علم جو ریاضی سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے وہ سائنس کی تعلیم بھی حاصل نہیں کر سکتا، کیوں کہ سائنس کی عمارت ریاضی کی بنیادوں پر ہی قائم ہے۔ اور اگر ہمارے طلبا ریاضی اور سائنس میں پیچھے رہ گئے، تو اقوامِ عالم میں ہمارا مقام ظاہر ہے۔

اردو کو ذریعۂ تعلیم بنا کر سوالوں کو انگریزی کی طرح حل کرنا اساتذہ اور طلبا دونوں کے لیے مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح چھوٹی جماعتوں میں ریاضی اردو میں پڑھائی جاتی ہے اور سوالوں کی رقمیں اور حل دائیں طرف سے بائیں طرف لکھے جاتے ہیں اسی طرح اونچی جماعتوں میں بھی پڑھایا جا سکتا ہے۔ تقریباً بارہ سال ہوئے پروفیسر خواجہ دل محمد صاحب نے گیارہویں بارھویں جماعتوں کے لیے "جبر و مقابلہ" لکھ کر یہ ثابت کیا کہ اونچی جماعتوں میں ریاضی اردو میں اردو کے طریقے سے پڑھائی جا سکتی ہے۔

مندرجہ ذیل سبق گیارھویں جماعت کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس کا عنوان ہے "اعداد"۔ یہ سبق اردو میں اردو کے طریقے سے پڑھایا جائے گا اور ثابت کیا جائے گا کہ ریاضی کو انگریزی طریقے سے پڑھانا ضروری نہیں اور نہ ہی سوال کے حل اور رقمیں انگریزی کی طرح لکھنا ضروری ہیں۔

سبق

اعداد

دسویں جماعت تک ہم نے بعض اعداد پڑھے ہیں۔

مثلاً:- 1، 2، 3، 4، 10، 15، 56 .... وغیرہ جنھیں مثبت صحیح اعداد کہتے ہیں۔

اور -7، -25، -101 .. وغیرہ جنھیں منفی صحیح اعداد کہتے ہیں۔

ان اعداد کے علاوہ $\frac{2}{5}$، $\frac{1}{2}$، $\frac{3}{4}$، .... بھی اعداد ہیں لیکن انھیں کسریں کہا جاتا ہے۔

.2، .25، .023 — بھی اعداد ہیں لیکن انہیں کسور اعشاریہ کہتے ہیں۔

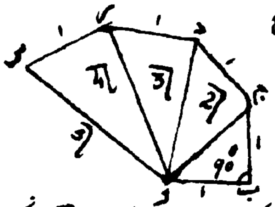
مندرجہ بالا تمام اعداد "اعداد ناطق" (RATIONAL NOS) کہلاتے ہیں۔ انہیں ناطق اس لیے کہتے ہیں کہ یہ تمام اعداد اپنی پوری پوری قیمت بتا دیتے ہیں۔

بعض اعداد علامت جذر کے ساتھ بھی لکھے جا سکتے ہیں مثلاً $\sqrt{4}$، $\sqrt{9}$، $\sqrt{25}$ ... وغیرہ کیوں کہ یہ اعداد اپنی پوری پوری قیمت یعنی 2، 3، 5 ... بتا رہے ہیں یہ اعداد بھی "اعداد ناطق" ہیں۔

لیکن $\sqrt{2}$، $\sqrt{3}$، $\sqrt{7}$ وغیرہ اعداد ناطق نہیں۔ کیوں کہ یہ اعداد ایسے ہیں جنکی پوری پوری قیمت حسابی طریقوں سے نہیں معلوم کی جا سکتی۔ مثلاً جذر کے قاعدے سے $\sqrt{2} = 1.4141$ لیکن یہ جواب صرف چار درجے اعشاریہ تک درست ہے۔ پورا پورا جواب نہیں۔ ایسے اعداد کو "اعداد غیر ناطق" یا اعداد اصم (IRRATIONAL NOS, SURDS) کہتے ہیں۔ اصم عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں بہرہ۔ ان اعداد کو اعداد اصم اس لیے کہتے ہیں کہ یہ آپ کی کچھ نہیں سنتے اور اپنی پوری پوری قیمت نہیں بتاتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ $\sqrt{2}$، $\sqrt{3}$، $\sqrt{5}$ وغیرہ جو کہ اعداد اصم ہیں ان کی پوری پوری قیمت حسابی طریقوں سے تو معلوم نہیں کی جا سکتی لیکن ہندسی طریقوں (GEOMETRY) سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ وہ مقام ہے جہاں حساب ناکام ہو جاتا ہے۔ لیکن ہندسہ کامیاب ہے۔

آئیے $\sqrt{2}$ ، $\sqrt{3}$ ، $\sqrt{5}$ وغیرہ کی قیمت ہندسی طریقوں سے معلوم کریں۔ دی ہوئی شکل میں

ب ہ = ب ج = ۱ انچ



چنانچہ مسئلہ فیثا غورث کی مدد سے ا ج = $\sqrt{2}$ انچ اسی طرح ا د = $\sqrt{3}$ انچ

ا ہ = $\sqrt{4}$ انچ اور ا س = $\sqrt{5}$ انچ

مندرجہ بالا تمام اعداد ہم نے دسویں جماعت تک پڑھے ہیں۔ ان تمام اعداد کو دو اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک قسم اعداد ناطق اور دوسری "اعداد غیر ناطق" یا اصم کہلاتی ہے اور دونوں قسم کے اعداد حقیقی (REAL NOS) کہلاتے ہیں۔ یعنی

3، $\sqrt{2}$، $\sqrt{7}$، $\sqrt{16}$ وغیرہ سب اعداد حقیقی ہیں کیونکہ یہ اعداد یا تو ناطق ہیں یا غیر ناطق۔

اب ہم ایسا عدد معلوم کریں گے جس سے دسویں جماعت تک ہمیں سابقہ نہیں پڑا مثلاً :-

$\sqrt{-1}$ ، $\sqrt{-2}$ ، $\sqrt{-3}$ ، $\sqrt{-4}$ وغیرہ وغیرہ خیال رہے کہ $\sqrt{-4} = -2$ نہیں ہے کیونکہ (-2) کو (-2) سے ضرب دیں تو (-4) نہیں بلکہ (+4) آتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ (-4) کی پوری قیمت معلوم نہیں ہوسکتی۔ لیکن $\sqrt{-4}$ اصم بھی نہیں۔ کیونکہ ہندسی طریقے سے اس کی پوری قیمت معلوم نہیں کی جاسکتی۔

غرضیکہ $\sqrt{-1}$ ، $\sqrt{-2}$ ، $\sqrt{-3}$ ، $\sqrt{-4}$ ... وغیرہ ایسے اعداد ہیں جن کی پوری قیمت نہ تو حسابی طریقوں سے معلوم ہوسکتی ہے نہ ہی ہندسی طریقوں سے۔ اس جگہ حساب و ہندسہ دونوں ناکام ہوجاتے ہیں۔ البتہ الجبرا ہمیں ان اعداد کے متعلق کچھ حد تک آگاہ کرتا ہے۔

الجبرا بتاتا ہے کہ √ا × √ا = ا

چنانچہ $\sqrt{-1} \times \sqrt{-1} = -1$ یعنی $\sqrt{-1}$ ایسا عدد ہے کہ اگر اس کو اسی سے ضرب دیں تو (-1) آتا ہے۔

$\sqrt{-2} \times \sqrt{-2} = -2$

$\sqrt{-3} \times \sqrt{-3} = -3$

اور $\sqrt{-4} \times \sqrt{-4} = -4$ یعنی $\sqrt{-4}$ ایسا عدد ہے کہ اگر اسے اسی سے ضرب دیں تو (-4) جواب آتا ہے

$\sqrt{-1}$ ، $\sqrt{-2}$ ، $\sqrt{-3}$ ، $\sqrt{-4}$ .... وغیرہ اعداد "موہومہ" IMAGINARY NOS کہلاتے ہیں۔ اعداد موہومہ بے شمار ہیں۔ اور ریاضی میں اکثر اُن سے واسطہ پڑتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل مساواتوں سے بھی ظاہر ہے۔

حل کرو (۱) $x^2 + 1 = 0$

حل۔ $x^2 = -1$

اس لیے $x = \sqrt{-1}$

اسی طرح اگر مساوات $x^2 + 2 = 0$ کو حل کریں تو $x = \sqrt{-2}$ آئیگا۔

دونوں مساواتوں کا حل یعنی $\sqrt{-1}$ ، $\sqrt{-2}$ اعداد موہومہ ہیں۔

تمام اعداد موہومہ میں $\sqrt{-1}$ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ عدد ہے جو تمام اعداد موہومہ کو موہومہ بناتا ہے۔

آئیے ثابت کریں کہ $\sqrt{-2}$ کو موہومہ بنانے والا دراصل $\sqrt{-1}$ ہی ہے۔

ثبوت $\sqrt{-2} = \sqrt{(-1) \times 2} = \sqrt{2} \times \sqrt{-1}$

$\sqrt{2}$ عدد حقیقی ہے اور $\sqrt{-1}$ موہومہ

لہذا $\sqrt{-2}$ کو موہومہ بنانے والا عدد $\sqrt{-1}$ ہے

اسی طرح ثابت کیا جا سکتا ہے کہ تمام اعداد موہومہ کو موہومہ بنانے والا عدد $\sqrt{-1}$ ہی ہے۔

یعنی ریاضی میں اگر $\sqrt{-1}$ کا وجود نہ ہوتا۔ تو اعداد موہومہ کا وجود بھی نہ ہوتا $\sqrt{-1}$ کی اہمیت کے پیش نظر اس پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

$\sqrt{-1}$ کو انگریزی میں "i" (IOTA) سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ پروفیسر خواجہ دل محمد صاحب نے $\sqrt{-1}$ کو ج سے ظاہر کیا ہے۔ لیکن "i" کی شکل چونکہ "خ" سے ملتی ہے اس لیے $\sqrt{-1}$ کو خ سے ظاہر کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ "IOTA" انگریزی کا حرف نہیں بلکہ یونانی ابجد کا حرف ہے۔ انگریزوں نے ریاضی میں تقریباً تمام یونانی ابجد کے حروف کو استعمال کیا ہے۔ اردو میں ریاضی پڑھاتے وقت ہم وہی یونانی حروف بھی رکھ سکتے ہیں جو کہ عام طور پر رائج ہیں اور ان کی جگہ عربی ابجد بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

اب ہم $\sqrt{-1}$ کو خ رکھ کر اس عدد موہومہ کے خواص معلوم کرتے ہیں۔

(۱) $\text{خ} = \sqrt{-1}$

(۲) $\text{خ}^2 = \sqrt{-1} \times \sqrt{-1} = -1$

(۳) $\text{خ}^3 = \sqrt{-1} \times \sqrt{-1} \times \sqrt{-1} = -1\sqrt{-1} = -\text{خ}$

(۴) $\text{خ}^4 = \sqrt{-1} \times \sqrt{-1} \times \sqrt{-1} \times \sqrt{-1} = (-1) \times (-1) = +1$

(۵) چونکہ $\text{خ}^4 = 1$ اس لیے دونوں طرف مربع مکعب وغیرہ لینے سے خ^8 ، خ^{12} ، خ^{16} وغیرہ سب (+1) کے برابر ہیں۔

(۶) خ^{10} کی قیمت اس طرح معلوم کی جا سکتی ہے

$$\text{خ}^{10} = \text{خ}^8 \times \text{خ}^2 = (+1)(-1) = -1$$

اسی طرح خ کی ہر قوت کی قیمت معلوم کی جا سکتی ہے۔

خ خود تو عدد موہومہ ہے لیکن اس کی قوتیں اعداد موہومہ بھی ہو سکتی ہیں اور اعداد حقیقی بھی۔

اعداد مرکب:- اعداد مرکب اعداد موہومہ کی خاص شکل ہے۔

$2 + \sqrt{-3}$ ، $-5 + \sqrt{-2}$ ، $-1 - \sqrt{-5}$ ... وغیرہ سب اعداد مرکب ہیں

ان کی شکل ا + خ ب سے ملتی ہے مثلاً:-

$$2 + \sqrt{-3} = 2 + \sqrt{3 \times (-1)}$$

$$= 2 + \sqrt{-1} \times \sqrt{3}$$

$$= 2 + \text{خ}\sqrt{3}$$

$= \text{ا} + \text{خ ب}$ [اگر ا کو 2 اور ب کو $\sqrt{3}$ کے برابر سمجھ لیا جائے

ا + خ ب کی شکل رکھنے والے تمام اعداد اعداد مرکب (COMPLEX NOS) کہلاتے ہیں۔ مرکب اعداد اعلیٰ ریاضی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ دو درجی مساواتوں (QUADRATIC EQUATIONS) کے حل اکثر مرکب اعداد ہوتے ہیں۔ گیارہویں جماعت میں پہنچتے ہی طالب علم کو جگہ جگہ مرکب اعداد سے واسطہ پڑتا ہے۔

اعداد مرکب جتنے اہم ہیں اتنے دلچسپ بھی ہیں۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے واضح ہوگا کہ یہ اعداد کتنے دلچسپ ہیں۔ مثلاً :-

$\frac{-1 + \sqrt{3}\,\text{خ}}{2}$ ، $\frac{-1 - \sqrt{3}\,\text{خ}}{2}$ دو مختلف مرکب اعداد ہیں انہیں یوں لکھا جا سکتا ہے $\left(-\frac{1}{2}\right) + \left(\frac{\sqrt{3}}{2}\text{خ}\right)$ ، $\left(-\frac{1}{2}\right) - \left(\frac{\sqrt{3}}{2}\text{خ}\right)$ دونوں ا + خ ب کی شکل میں لکھے جا سکتے ہیں۔ یہ دونوں عدد مختلف ہیں۔ لیکن ان میں یہ عجیب خاصیت ہے۔ کہ

(۱) اگر پہلے عدد کا مربع لیا جائے تو دوسرا عدد آ جاتا ہے اور اگر دوسرے کا مربع اٹھایا جائے تو پہلا عدد آتا ہے۔

(۲) اگر پہلے عدد کو الٹ دیا جائے تو دوسرا عدد آ جاتا ہے اور اگر دوسرے عدد کو الٹ دیا جائے تو پہلا عدد آ جاتا ہے۔

(۳) پہلے عدد کا مکعب لیا جائے تو "۱" آتا ہے اور دوسرے کا مکعب کا لیا جائے تو تب بھی "۱" آتا ہے۔

یہ تمام نتائج حیرت انگیز ہیں۔ آئیے ان نتائج کو ثابت کریں۔

(۱) پہلے ہم ثابت کریں گے کہ پہلے عدد کا مربع دوسرے کے برابر ہے

ثبوت۔ کیوں کہ $(\text{ا} + \text{ب})^2 = \text{ا}^2 + 2\,\text{اب} + \text{ب}^2$

اس لیے $\left[\left(\frac{\sqrt{3}\,ی}{2}\right)+\left(-\frac{1}{2}\right)\right]^2 = \left(\frac{\sqrt{3}\,ی}{2}\right)^2 + 2\left(\frac{\sqrt{3}\,ی}{2}\right)\left(-\frac{1}{2}\right) + \left(-\frac{1}{2}\right)^2$

$= \frac{1}{4} - \frac{\sqrt{3}\,ی}{2} + \left(\frac{3}{4}\right)ی^2$

$= \frac{1}{4} - \frac{\sqrt{3}\,ی}{2} - \frac{3}{4}$

$= -\frac{1}{2} - \frac{\sqrt{3}\,ی}{2}$

$= \left(-\frac{1}{1}\right) - \left(\frac{\sqrt{3}\,ی}{2}\right)$ جو دوسرا عدد ہے

اسی طرح ثابت کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے عدد کا مربع پہلے عدد کے برابر ہے۔

(۲) اب ہم ثابت کریں گے کہ پہلے عدد کا الٹ دوسرے عدد کے برابر ہے۔

ثبوت: پہلے عدد کا الٹ $= \frac{2}{(\sqrt{3}\,ی)+(-1)} = \frac{2}{(\sqrt{3}\,ی)+(-1)} \times \frac{(\sqrt{3}\,ی)-(-1)}{(\sqrt{3}\,ی)-(-1)}$

$= \frac{2\left[(\sqrt{3}\,ی)-(-1)\right]}{(\sqrt{3}\,ی)^2-(-1)^2} = \frac{2\left[(\sqrt{3}\,ی)-(-1)\right]}{-3-1}$

$= \frac{\sqrt{3}\,ی-(-1)}{2}$ جو دوسرا عدد ہے۔

اسی طرح ثابت کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے عدد کا الٹ پہلے عدد کے برابر ہے

(۳) اب ہم ثابت کریں گے کہ پہلے عدد کا مکعب "ا" کے برابر ہے۔

ثبوت: کیونکہ $(ا+ب)^3 = ا^3 + 3ا^2ب + 3اب^2 + ب^3$

چنانچہ $\left[\frac{(\sqrt{3}\,ی)+(-1)}{2}\right]^3 = \left[\frac{(\sqrt{3}\,ی)+(-1)}{8}\right]^3$

$= \frac{(\sqrt{3}\,ی)^3+3(\sqrt{3}\,ی)^2(-1)+3(\sqrt{3}\,ی)(-1)^2+(-1)^3}{8}$

$= \frac{1}{8}\left[(3\sqrt{3})\,ی-3(-3)-(3\sqrt{3})\,ی+(-1)\right]$

$= \frac{1}{8}\left[9+(-1)\right] = 8 \times \frac{1}{8} = 1$

اسی طرح ثابت کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے مرکب عدد کا مکعب بھی "ا" کے برابر ہے۔

اعداد موہومہ اور مرکب اعداد کے دلچسپ خواص یہیں ختم نہیں ہوتے لیکن یہ سبق یہاں ختم کیا جاتا ہے۔

خلاصہ: اس سبق میں جن اعداد پر بحث کی گئی ہے وہ یہ ہیں:-

صحیح اعداد۔ اعداد ناطق۔ اعداد غیر ناطق یا اصم۔ اعداد حقیقی۔ اعداد موہومہ اور اعداد مرکب ❖

تعلیم و تدریس میں نفسیات کا حصّہ

صوفی گلزار احمد ہائر سیکنڈری سکول گلبرگ لاہور

علم نفسیات دراصل ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ تعلیم و تدریس ان میں سے ایک اہم شعبہ ہے تعلیمی نفسیات نے افلاطون کے زمانہ میں جنم لیا اور اب تک برابر ترقی کر رہی ہے۔ تعلیم ہماری شخصیت اور اخلاق کی کڑیوں کو مضبوط اور پائدار کرنے میں کافی حد تک مدد دیتی ہے اور یہ عین قرین قیاس ہے کہ تعلیم ہماری ذہنی اور جسمانی قوتوں کی مناسب نشو و نما کا نام ہے۔ ایس جی اس بارے میں کہتا ہے کہ تعلیم و تدریس دراصل ہر فرد کے خارجی ماحول کے تاثرات کی ایک حد سمجھی جاتی ہے۔ ہر فرد اپنی تخلیقی قوتوں کو ابھارنے میں ماحول سے کافی حد تک متاثر ہوتا ہے۔ تعلیم کا مسئلہ اتنا آسان اور سادہ نہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ زندگی کے اہم فرائض سے واقف کرانا اور پھر ان فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک لائحہ عمل بنانا تعلیم کا ایک ضروری جزو ہے جو تعلیم ان مقاصد کو نظر انداز کر دے وہ تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ عام تعلیمی اداروں میں حصول تعلیم کے لیے کیا طریقے استعمال میں لائے جاتے ہیں اور استاد ایک ماہر نفسیات کی حیثیت میں کیا کام سرانجام دے سکتا ہے۔

موجودہ تعلیمی اداروں کے استاد طالب علموں کے دل و دماغ کو کافی حد تک متاثر کرتے ہیں اور اکثر استاد طالب علموں کو اپنی ذاتی قابلیت کے ذریعہ تعلیم کا اعلیٰ معیار بخشتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کے اہم مسائل سے واقفیت دلانا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی تعلیم طالب علم کی سوچ سمجھ کو ہمیشہ کے لیے مفقود کر دیتی ہے اور اسے ہر مسئلہ پر استاد کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے اور اسکی ذہنی نشو و نما رک جاتی ہے۔ بعض لوگ یہاں تک خیال کرتے ہیں کہ استاد کو ہر مضمون کے متعلق کماحقہٗ واقفیت حاصل ہونی چاہیے۔ لیکن ایک فرانسیسی ماہر تعلیم نے اس بات کو جھٹلا دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ استاد کے لیے

یہ لازمی نہیں کہ وہ نفسِ مضمون سے مکمل طور پر آگاہ ہو۔ بلکہ وہ شاگردوں میں ایسا اشتیاق پیدا کر سکتا ہے کہ وہ ہر مضمون کے متعلق خود سے مطالعہ کریں اور ایسے دقیق مسائل کی کھوج لگائیں جن سے استاد بھی بے بہرہ ہے۔ یہ بات بہت حد تک صحیح ہے۔ اکثر اوقات وہ استاد سے بھی زیادہ واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کو پروان چڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ طالب علموں میں کسی مضمون کے لیے تجسس پیدا کیا جائے۔ اکثر موقعوں پر دیکھا گیا ہے کہ استاد کی واقفیت طالب علم کے لیے زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ وہ خود ان سے بہرہ ور نہ ہو۔

ایک مشہور ماہر تعلیم فروبل لکھتا ہے کہ استاد ایک باغبان کی مانند ہے اور بچہ ایک پودا اور اسکول ایک باغ۔ ایک باغبان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ پودا خوب پھلے پھولے۔ خیال ہے وہ پودے کی نشو و نما کے لیے خوب محنت سے کام کرتا ہے۔ اسی طرح استاد کی بھی یہ دلی تمنا ہوتی ہے۔ کہ طالب علم لائق ہو اور علم کی صحیح قدر و منزلت سے روشناس ہو۔ چنانچہ یہ بات قرین قیاس ہے کہ ہر بچے کو علم حاصل کرنے کے لیے اپنی ذات سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ علم حاصل کرنے کے لیے ہر فات مسلسل جدوجہد میں رہتی ہے۔ قدیم زمانے میں بچوں کو تعلیم کے معاملے میں آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ وہ مسائل خود ہی نمٹاتے تھے اور ہر قسم کے خارجی دباؤ سے آزاد رہتے تھے۔ موجودہ نظام تعلیم میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ہر مسئلہ کا حل بچوں کے دماغ میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سوچنے کی طاقت بالکل مفقود ہو جاتی ہے اور روشن خیالی اور کوشش سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم کا نصب العین امتحانی معیار پر پورا اترنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لیے بعض لوگ یہ صحیح کہتے ہیں کہ طالب علم کی بجائے استاد کو سبق پڑھانے اور ان کے دماغ میں ٹھونسنے کے لیے کافی محنت سے کام لینا پڑتا ہے۔ استاد اب وہی کام سرانجام دیتا ہے جو پہلے طالب علم کے سپرد تھا۔ فروبل نے مشہور ماہر تعلیم روسو کی تقلید کرتے ہوئے یہ نظریہ بنایا۔ اس نظریہ تعلیم میں فطرت کو کافی اہمیت حاصل ہے اور ہر بچے کی فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ اسے کنڈرگارٹن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ بچوں میں صحیح تعلیمی ذوق پیدا کیا جائے اور وہ اسی طرح ممکن ہے کہ ان میں تجسس پیدا کیا جائے تاکہ وہ خود علم کی کھوج میں رہیں۔ رنگوں سے واقفیت کرانے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے ذہن میں ہر رنگ کا تصور پیدا کیا جائے۔ چناں چہ مختلف قسم کے رنگ دکھانے کا موقع فراہم کرنا چاہیے۔ تاکہ وہ رنگوں میں امتیاز کر سکیں۔ استاد کا فرض صرف یہی نہیں کہ وہ طالب علموں کو پڑھائے اور انہیں معلومات بہم پہنچائے۔ بلکہ طالب علموں کے دل و دماغ کو سمجھنا استاد کے فرائض میں داخل ہے ان کی ذہنی ضروریات کو سمجھنا اور پھر اس کے مطابق انہیں معلومات بہم پہنچانا ایک ماہر نفسیات استاد کا کام ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ طالب علم ذہنی اور جسمانی لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں استاد کو سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور اکثر اوقات وہ اپنی جائز محنت کا صلہ حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ موجودہ نظامِ تعلیم میں بھی اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ طالب علموں کے ذہن کو بخوبی سمجھا جائے اور ان میں علم کی کھوج لگانے کا مادہ پیدا کیا جائے۔ موجودہ تعلیم کی بانی میریا منٹسوری ہیں جو دو چار سال پیشتر پاکستان میں وارد ہوئی تھیں اور کچھ عرصہ تک ان کی تقاریر کا سلسلہ جاری رہا تھا۔

علم حاصل کیے بغیر اچھا اخلاق پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ سقراط کہتا ہے کہ صحیح اخلاق علم کی کنجی ہے اور سوسائٹی کا بدکار آدمی گناہ کا ارتکاب اسی حالت میں کرتا ہے جبکہ وہ علم سے بے بہرہ ہو۔ موجودہ زمانے کا فلسفی ہربرٹ سپنسر بھی اس کی تائید میں لکھتا ہے۔ شائستہ اخلاق پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اچھی عادات پیدا کی جائیں۔ ہر بچہ اچھی اور بُری عادات کا مالک ہوتا ہے۔ یہ والدین اور استاد کا فرض ہے کہ بچے کو بُری عادات سے بچالیں۔ اور اچھی عادات پیدا کرنے میں ان کی رہنمائی کریں۔ بچوں کے ماحول کا جائزہ لینا بھی نہایت ضروری ہے کیوں کہ شخصیت کے سنوارنے یا بگاڑنے میں ماحول نمایاں حصہ لیتا ہے۔ اس کے علاوہ بچے کی ذاتی قابلیت اور دیگر رجحانات کا پتہ لگانا اتنا ہی اہم کام ہے۔ ہربرٹ سپنسر نے تعلیم کو نفسیات کی روشنی میں دیکھا۔ اس کے خیال کے مطابق دنیاوی تجربات ہی تمام علوم کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ ہر انسان اپنے ماحول میں مختلف تجربات سے دوچار ہوتا ہے اور پھر انہیں اپنے خیال کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک صحیح ماحول پیدا کرنے میں استاد کا بہت بڑا حصہ ہے کیوں کہ

استاد بچے کے قریب ہوتے ہوئے اس کی نشو و نما کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہربرٹ سپنسر نے اپنے نظامِ تعلیم میں استاد کی شخصیت کو بہت سراہا ہے۔ ایک بیدار مغز استاد بچے کی صحیح نشو و نما کی خاطر ایسا ماحول پیدا کرنے میں صحیح رہنمائی کر سکتا ہے جس سے بچے کا اخلاق بہتر بنایا جا سکے۔

قدیم یونانیوں کی رائے

قدیم یونانیوں میں سقراط تعلیم کا مقصد ان الفاظ میں بھی بیان کرتا ہے کہ تعلیم کے لیے لازمی ہے کہ وہ اچھے شہری پیدا کرے۔ تاکہ ہر فرد خوشی اور آرام سے زندگی بسر کر سکے۔ قدیم یونانیوں کے نزدیک تعلیم ہر فرد کے آرام و آسائش اور کامیابی کی ضامن تھی۔ یونانیوں میں سقراط کو بہت رتبہ حاصل ہے اور سقراط کا شمار دنیا کے مشہور اساتذہ میں ہوتا ہے۔ سقراط کے شاگرد افلاطون نے تعلیم کے چند بنیادی اصول وضع کیے اور انہیں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کی کتاب "دی پبلک" میں یہ نظامِ تعلیم وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظامِ تعلیم پرامن اور انصاف پسند ریاست کے قیام کی تلقین کرتا ہے۔ چونکہ ہر فرد فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے مختلف ہے۔ اس لیے افلاطون نے افراد کو مدنظر رکھ کر تعلیم کے بنیادی اصول ترتیب دیے۔ ریاست کے ہر فرد کے لیے تعلیم لازمی امر ہے۔ ہر فرد اپنی تعلیم کے زیر اثر اور فطری صلاحیتوں کے مطابق زندگی کے مختلف پیشوں میں سے کوئی پیشہ پسند کرنے کا حق رکھتا تھا۔ افلاطون کے خیال کے مطابق ایسا پیشہ ور آدمی سوسائٹی کا مفید فرد ثابت ہوتا ہے۔ اور ایسے پیشہ ور افراد کی سوسائٹی ایک معیاری اور اعلیٰ سوسائٹی کہلانے کی مستحق ہے۔ افلاطون یہ بھی لکھتا ہے کہ تعلیم کے معاملہ میں بچوں کو آزادانہ رائے زنی کا موقع میسر ہونا چاہیے۔ بچوں کو یہ موقع فراہم کیا جائے کہ وہ ہر چیز کے متعلق خود رائے قائم کریں۔

ارسطو کا نظریۂ تعلیم لوگوں کو پاکبازی کی ترغیب دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ارسطو اور افلاطون کا نظریۂ تعلیم ریاست کے مجموعی افراد کی حالت بہتر بنانے پر زور دیتا تھا۔ اس کے برعکس یونانیوں میں ہر فرد کی تعلیم کا علیحدہ علیحدہ خیال بھی رکھا جاتا تھا اور مجموعی حیثیت سے فرد کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ روسو ماہر تعلیم نے بچوں کے مطالعہ پر زور دیا۔ اس کا خیال تھا کہ بچوں کو ذہنی اور جسمانی لحاظ سے

پرکھنا چاہیے۔ ایک دوربین استاد جسے دن بھر بچوں کے ساتھ رہنے کا موقع میسر ہو۔ ان کے دل
کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ بعض استاد اس معاملے میں بڑے دوربین ہوتے ہیں۔ وہ ان کے احساسا
اور جذبات سے جلد ہی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ان باتوں کا پتہ چلانے کے لیے ضرو
ہے کہ استاد محبت اور شفقت کا رویہ اختیار کرے اور بچوں کو کبھی یہ احساس نہ ہونے پائے کہ ا
ساتھ ناجائز سختی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔

مختلف ماہرین تعلیم کی رائے

جے ایس ل لکھتا ہے کہ ایسی تعلیم جو طالب علموں کے باہمی رابطے سے حاصل ہو زیادہ مف
برعکس ایسی تعلیم کے جو استاد کی مدد سے حاصل ہو۔ طالب علموں میں آزادانہ میل جول۔ ان کی تحقیقی قو
کو مضبوطی بخشتا ہے۔ اور نئے خیالات کے تبادلہ کے باعث مختلف مسائل سے واقفیت کراتا ہے۔

ماہر تعلیم ٹیبلر کا خیال تھا کہ شاگردوں کے دل و دماغ کو سمجھنا استاد کا اولین فرض ہے۔ وہ ان
کی خداداد قابلیت اور ذہانت کے مطابق انہیں کسی خاص پیشہ کو اختیار کرنے میں مدد دیتا تھا۔

سرٹی پرسی نن لکھتا ہے کہ مقصد تعلیم یہ ہے کہ انسان میں خود بیداری ہو اور وہ شخصیت
پہچانے۔ ڈاکٹر جیمز ڈرویر لکھتا ہے کہ تعلیمی معاملات میں نفسیات کو بڑا دخل حاصل ہے
شخصیت و کردار کا مطالعہ ماہر تعلیم کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تعلیم اور نفسیات آہستہ
ترقی کر رہے ہیں۔ شخصیت و کردار کی پختگی اور اس کے متعلق ہدایات بہم پہنچانا ماہر تعلیم کا فرض ہے۔
اپنی مشکلات کو حل کرنے کے لیے نفسیات سے استفادہ نہیں کرتا۔ بلکہ ماہر نفسیات کے لیے
مسائل ڈھونڈتا ہے۔ اور علم نفسیات میں اضافہ کرتا ہے بسن ۱۹۱۲ء میں تعلیمی کانفرنس کی صدار
کرتے ہوئے سر جان ایڈیمز نے کہا کہ تعلیم نے نفسیات پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ اگرچہ اس بیان میں مبا
ضرور ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ موجودہ نفسیاتی ریسرچ تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دے
رہی ہے۔ چنانچہ ماہر نفسیات کے لیے مدرسے سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہے۔

موجودہ دور میں نفسیات تعلیم کی روز بروز ترقی میں اہم کام سرانجام دے رہی ہے۔

یات میں کوئی مقصد یا منزل مقرر نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے جو واقعات اور حادثات کی
ضاحت کرتا ہے اور یہ نہیں کہ واقعات کیسے واقع ہونے چاہئیں۔ یہ کام فلسفہ کے سپرد ہے
کے سامنے ایک خاص منزل مقصود ہوتی ہے اور وہ مختلف واقعات اور حادثات کا کھوج
ہے اور پھر ان واقعات کی انسانی زندگی میں خاص حدود مقرر کرتی ہے۔ نفسیات کے بغیر
علیم کو کسی صورت بھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ شاگردوں کے اخلاق و کردار کو سمجھنے کے لیے
د نفسیات کا سہارا لیتا ہے۔ استاد ان کے اخلاق کو اسی صورت میں سمجھ سکتا ہے کہ وہ ان کے
د دماغ کا صحیح طور پر تجزیہ کرے۔ اس میں شک نہیں کہ نفسیات کوئی مقصد یا لائحہ عمل نہیں
ا لیکن وہ تعلیمی مقاصد کو حاصل کرنے میں مدد ضرور دیتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا، کہ
نذہ کے لیے ماہر نفسیات ہونا نہایت ضروری ہے ؎

تعلیمی تعاون کے پچاس سال

(راب ہینسفیلڈ کے قلم سے)

اس سال برطانوی دولت مشترکہ کی یونیورسٹیوں کی انجمن کی پچاسویں سال گرہ اور رہوڈس تعلیمی وظیفہ کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے۔ دونوں تمام دولت مشترکہ میں تعلیمی تعاون کے ارتقا کی اہم کڑیاں ہیں ایک ایسا تعاون جو حالیہ برسوں میں بے حد مستحکم اور وسیع رہ چکا ہے۔ تعاون باہمی کی دولت مشترکہ جماعت نے ۱۹۱۳ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے کام کا آغاز کیا اور اسی سال جون جولائی میں یونیورسٹی آف لندن کے زیر اہتمام سلطنت برطانیہ کی یونیورسٹیوں کی پہلی کانگرس منعقد ہوئی تھی۔ یہ جماعت پہلے سلطنت برطانیہ کی یونیورسٹیوں کے بیورو کی حیثیت سے مشہور رہی تھی۔ لیکن ۱۹۴۸ء میں اس نے اپنا موجودہ نام برطانوی دولت مشترکہ کی یونیورسٹیوں کی انجمن (اے۔ یو۔ بی۔ سی) اختیار کر لیا۔ اب اس انجمن کی رکنیت تمام دولت مشترکہ کے ایک سو پچیس یونیورسٹی اداروں پر مشتمل ہے۔ لندن میں اس انجمن کا ایک دفتر انتظامیہ موجود ہے۔ جو دولت مشترکہ یونیورسٹیوں کے مابین رابطہ (مثلاً عملہ کی بھرتی کے سلسلہ میں) قائم کرتا ہے اور یونیورسٹی کانگریسوں کے انعقاد کا انتظام کرتا ہے۔ ان کانگریسوں کا مقصد انٹر یونیورسٹی مفادات کو بڑھانا اور عام دلچسپیوں میں اضافہ کرنا ہے۔ آٹھویں کانگریس ۱۹۵۸ء میں مونٹریال میں منعقد کی گئی تھی۔ نویں کانگریس جو اے یو بی سی کی گولڈن جوبلی منائے گی جولائی ۱۹۶۳ء میں لندن میں منعقد کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے اعلیٰ افسروں کے چھوٹے چھوٹے اجلاسوں کی شکل میں بھی کانگریسیں منعقد ہوتی ہیں۔ یہ اجلاس ہر سال ایک مختلف دولت مشترکہ ملک میں منعقد ہوتے ہیں۔ ایک مکمل کانفرنس کے مقابلہ میں ان اجلاسوں میں تعلیمی حکمت عملی پر نسبتاً بار بار صلاح مشورے ہوتے ہیں۔

انجمن دولت مشترکہ تعلیمی وظائف اور فیلوشپ منصوبہ کو وسعت دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ان وظائف کا خاکہ ۱۹۵۸ء میں مانٹریل میں ہونے والی دولت مشترکہ کانفرنس میں تیار کیا گیا تھا اور ان کی تفصیلات دوسرے سال آکسفورڈ کی پہلی دولت مشترکہ تعلیمی کانفرنس میں مرتب کی گئی تھیں۔ اس منصوبہ کا مقصد دولت مشترکہ کے ہر ایک ملک کے طلبا کو مجموعی حیثیت سے دولت مشترکہ کے وافر تعلیمی وسائل میں شریک ہونے کے مواقع دے کر اس ملک کو تعلیم سے مالامال کرنا ہے۔

۱۹۵۹ء کی آکسفورڈ کانفرنس نے نہ صرف مشترکہ ثقافتی امور کے باہمی تبادلہ کا آغاز کیا بلکہ اسکی ترقی کے لیے ایک قوت محرکہ کا کام کیا۔ جو دولت مشترکہ نصب العین کے لیے بے حد ضروری ہے۔ جب تعلیمی ظیفہ اور فیلوشپ منصوبہ وضع کیا گیا تو برطانیہ کی یونیورسٹیوں اور صنعتی تربیت کے اداروں میں پہلے ہی سے سمندر پار دولت مشترکہ ممالک کے تقریباً پینتیس ہزار طلبا تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ دیگر دولت مشترکہ ممالک مثلاً آسٹریلیا، کینڈا، اور نیوزی لینڈ میں بھی دولت مشترکہ طلبا کی خاصی تعداد موجود تھی۔ ان میں سے بیشتر کولمبو منصوبہ کے تحت تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ سمندر پار طلبا کے لیے مالی امداد کی چند اسکیمیں گذشتہ کئی برسوں سے جاری ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور رہوڈس تعلیمی وظائف ہیں۔ ان تعلیمی وظائف کے تحت دیگر دولت مشترکہ ممالک کے تین ہزار سے زائد طلبا۔ یونیورسٹی آف آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔

غالباً سب سے زیادہ اہم طالب علم استاد یا باصلاحیت استاد ہوتا ہے۔ آکسفورڈ کانفرنس نے تسلیم کیا کہ تمام دولت مشترکہ ممالک کی تعلیمی ترقی کے لیے نئے اساتذہ کی ایک غیر معمولی تعداد ضروری ہے۔ لیکن وہاں اساتذہ کی عام قلت ہے۔ خاص طور پر افریقہ میں ۱۹۵۹ء سے نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ ممالک کے طلبا، کے لیے اساتذہ کی تربیت کی آٹھ سو نشستیں مہیا کی گئی ہیں۔ جن میں سے چار سو برطانیہ میں ہیں۔ لیکن جیسا کہ جنوری میں دہلی میں منعقد ہونے والی دوسری دولت مشترکہ تعلیمی کانفرنس میں کہا گیا۔ مزید توسیع کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

تربیتی سہولتیں ہمیشہ اساتذہ کے تربیتی اداروں میں نشستوں کی شکل میں نہیں دی جاتیں۔ مثلاً کے طور پر برطانوی اساتذہ اپنی موسم گرما کی تعطیلات میں نائیجیریا کے اساتذہ کے لیے نائیجیریا میں ریفریشر

ورسوں کا ایک سلسلہ چلاتے ہیں۔ اس سکیم کا پہلا سال ۱۹۶۱ء تھا۔ اس سال تیکین برطانوی اساتذہ نائیجیریا گئے۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں ستر اساتذہ کی ایک جماعت برطانیہ سے ان کورسوں کو چلانے کے لیے ئیجیریا گئی۔ ان کورسوں میں پرائمری اور ثانوی اسکولوں کے اساتذہ نے حصہ لیا اور ان کے ذریعہ نائیجیریا ے اساتذہ کے تدریسی طریقوں کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ خاص طور پر سائنس، ریاضی اور انگریزی ی تدریس میں۔

انگریزی، دولت مشترکہ برادری کی عام زبان اور اس کے تعلیمی تعاون باہمی کی بنیاد ہے۔ دوسری بان کی حیثیت سے انگریزی زبان کی تدریس کی تربیت کافی عرصہ سے برٹش کونسل کا خاص موضوع ہے بنش کونسل ۱۹۶۱ء سے کسی نہ کسی طرح ایک لاکھ افراد سے زائد کو انگریزی کی تدریس کے مواقع فراہم رہی ہے۔ ان میں سے بیشتر افراد دولت مشترکہ ممالک میں ہیں اور اکثر انگریزی زبان کے با صلاحیت ساتذہ ہیں۔ انگریزی کو دوسری زبان کی حیثیت سے پڑھانے سے متعلق ایک دولت مشترکہ کانفرنس نوری ۱۹۶۱ء میں میکریری کالج (یوگنڈا) میں منعقد ہو چکی ہے۔

دولت مشترکہ سے اساتذہ کی قلت کو دور کرنے کے لیے نسبتاً بہتر صورت حال رکھنے والے ممالک سے ان ممالک میں اساتذہ کا زکیا جاتا ہے جو قلت کا شکار ہیں۔ ۱۹۵۹ء کی آکسفورڈ کانفرنس نے دوبارہ اس کام کو تیزی سے آگے بڑھایا ہے ہد ایک سکیم کا اعلان کیا ہے کہ یہ اسکیم آئندہ سال مکمل طور پر روبہ عمل آنے کے بعد دولت مشترکہ ممالک کے لیے مزید چار سو ساتذہ مہیا کرے گی۔ دیگر دولت مشترکہ ممالک بھی اپنے اساتذہ کو سمندر پار ملازمتوں کے لیے تیار کر رہے ہیں۔

اب دولت مشترکہ ممالک کے درمیان بے شمار تعلیمی روابط اس انتظامی ادارہ کے دو حصوں کے ذریعہ مل میں آتے ہیں، جسے کانفرنس نے ۱۹۵۹ء میں قائم کیا تھا اور ۱۹۶۲ء میں اس کی توثیق کی تھی، یعنی دولت مشترکہ لیمی روابط کی کمیٹی اور یونٹ جو انتظامی ادارہ کی ہدایات کے تحت کام کرتے ہیں۔ کمیٹی تعلیمی سہولتوں کی مختلف اسکیموں ملاح و مشورے کے مواقع فراہم کرتی ہے اور یونٹ، دولت مشترکہ تعلیمی تعاون باہمی کے مرکزی حوالہ کی حیثیت سے م کرتا ہے۔ یہ دونوں باہم مل کر بڑے پیمانہ کی دولت مشترکہ تعلیمی کانفرنسوں کے درمیانی وقفوں میں ضروری سلسل کو برقرار رکھتے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں کینیڈا میں منعقد ہونے والی تیسری کانفرنس کے بعد پھر بہت کچھ غور و خوض

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ——————— شعبۂ سکول

حکم اے ڈی ای این ایک امیدوار م۔ محمد حنیف شاہ بی۔ اے۔ بی ایڈ کو بعد از تعطیلات موسم گرما تاریخ حاضری سے
۷۸۱۷/ ایک نئی عارضی آسامی پر ۱۳۰/- — ۱۰ — ۲۰۰/- — ۱۰ — ۳۰۰/- کے گریڈ میں بشاہرہ
۱۰ اگست ۱۹۶۲ء ۱۳۰/- روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ایس۔ ڈی ہائی سکول بہاولپور مقرر کیا گیا۔

ایضاً ایک امیدوار م۔ رشید احسین بی اے۔ بی ایڈ کو بعد از تعطیلات موسم گرما تاریخ حاضری سے م۔ سعید احمد کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ میں ہو چکا ہے بشاہرہ ماہوار تنخواہ ۱۳۰/- — ۱۰ — ۲۰۰/- — ۱۰ — ۳۰۰/- روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کہروڑ پکا مقرر کیا گیا۔

ایضاً ایک امیدوار م۔ بشیر احمد۔ بی۔ اے۔ بی ایڈ کو بعد از تعطیلات موسم گرما تاریخ حاضری سے۔ م۔ محمود اختر کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول تل ونڈی موسے خاں ہو چکا ہے بشاہرہ ماہوار تنخواہ ۱۳۰/- — ۱۰ — ۲۰۰/- — ۱۰ — ۳۰۰/- روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جام پور مقرر کیا گیا۔

ایضاً ایک امیدوار م۔ محمد اقبال بی۔ اے۔ بی ایڈ (کلرک دفتر آڈیٹر اینڈ اکاؤنٹنٹ ویسٹ پاکستان) کو بعد از تعطیلات موسم گرما تاریخ حاضری سے م۔ مقصود علی کی جگہ (جن کا گورنمنٹ ہائی سکول تل ونڈی موسے خاں تبادلہ ہو چکا ہے) ۱۳۰/- — ۱۰ — ۲۰۰/- — ۱۰ — ۳۰۰/- کے گریڈ میں ۱۳۰/- روپے ماہوار تنخواہ پر عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کمال گڑھ مقرر کیا گیا۔

ایضاً ایک امیدوار۔ م۔ عبدالقیوم بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ کو م۔ محمد شریف کی جگہ (جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ میں ہو چکا ہے) بعد تعطیلات موسم گرما، تاریخ حاضری سے

۱۳۰/- روپے عارضی ۱۳۰/- ۳۰۰/- کے گریڈ میں بشاہرہ -/۱۳۰ ۱۰ — ۲۰۰/- ۱۰ — ۱۳۰/-
سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول بیتالا غدر مقرر کیا گیا۔

ایضاً ایک امیدوار م۔ ریاض احمد خاں بی۔ اے۔ بی ایڈ کو بعد تعطیلات موسم گرما تاریخ حاضری سے
ایک نئی عارضی اضافی اسامی پر ۱۳۰/- ۱۰ — ۲۰۰/- ۱۰ — ۳۰۰/- کے گریڈ میں
بشاہرہ -/۱۳۰ روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ایس۔ ڈی۔ ہائی سکول بہاولپور
مقرر کیا گیا۔

ایضاً ایک امیدوار۔ م۔ محمد منیر کو بعد از تعطیلات موسم گرما تاریخ حاضری سے ایک نئی عارضی اضافی
آسامی پر ۱۳۰/- ۱۰ — ۲۰۰/- ۱۰ — ۳۰۰/- کے گریڈ میں بشاہرہ -/۱۳۰ روپے
عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول بہاول نگر کالونی مقرر کیا گیا۔

ایضاً ایک امیدوار م۔ ریاض حسین بی۔ اے بی۔ ایڈ کو بعد تعطیلات موسم گرما۔ تاریخ حاضری سے
۱۳۰/- ۱۰ — ۲۰۰/- ۱۰ — ۳۰۰/- روپے کے گریڈ میں بشاہرہ -/۱۳۰ روپے
عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جام پور مقرر کیا گیا۔

ایضاً ایک امیدوار مسٹر مایا داس بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ کو بعد تعطیلات موسم گرما۔ تاریخ حاضری سے
م۔ سعید احمد خاں کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول مظفرگڑھ میں ہو چکا ہے -/۱۳۰
۱۰ — ۲۰۰/- ۱۰ — ۳۰۰/- کے گریڈ میں -/۱۳۰ روپے ماہوار تنخواہ پر عارضی
سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول بہاول نگر کالونی مقرر کیا گیا۔

م۔ محمد انور بیگ۔ بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ایڈ کو سائنس ٹیچر کی ایک نئی عارضی اضافی آسامی پر بعد تعطیلات
ایضاً موسم گرما۔ تاریخ حاضری سے -/۱۳۰ ۱۰ — ۲۰۰/- ۱۰ — ۳۰۰/- روپے کے گریڈ
میں بشاہرہ -/۱۳۰ روپے عارضی سائنس ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول شرقپور مقرر کیا گیا

ایضاً ایک امیدوار م۔ عصمت اللہ ایم۔ اے بی۔ ایڈ کو بعد تعطیلات موسم گرما تاریخ حاضری سے
سائنس ٹیچر کی ایک نئی عارضی اضافی آسامی پر ۱۳۰/- ۱۰ — ۲۰۰/- ۱۰ — ۳۰۰/- کے گریڈ میں

بمشاہرہ -/۱۲۰ روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پسرور مقرر کیا گیا۔

نوٹ :- (۱) مندرجہ بالا امیدواروں کا تقرر محض عارضی ہے اور اسناد کی مصدقہ نقول پیش کرنے پر موقوف ہے۔ ان کی خدمات عارضی تقرر کے دوران میں مہینے بھر کی تنخواہ دے دینے یا اختتام ملازمت کی وجہ بتانے کے بغیر، ایک ماہ کا نوٹس دے کر ختم کی جا سکتی ہے۔

(۲) ان کی ملازمت کے حدود و شرائط نظر ثانی پر منحصر ہے۔ جو حکومت مغربی پاکستان کے احکام کے مطابق عمل میں آئے گی۔

(۳) رخصت، سفر الاؤنس، طبی امداد اور تنخواہ وغیرہ کے سلسلے میں ان کا تقرر اُن قواعد و احکام کے تحت متصور ہوگا جو اُن کے درجے کے سرکاری ملازمین کے لیے وقتاً فوقتاً نافذ ہوتے رہیں۔

(۴) سابق ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم مغربی پاکستان کے خط نمبر ADMN-I-3/11 مورخہ $\frac{4}{62}$ 30 کے تحت م بشیر علی قریشی م۔ دین محمد اور م محمد حنیف کے حق میں عمر کا سوال نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

(۵) مندرجہ بالا آخری سات امیدواروں کے لیے قواعد کے مطابق عمر کے معاملے میں رعایت برتی گئی ہے۔

ADMN-I /۹۷۰ ۱۸ اگست ۱۹۶۲ء م۔ محمد شریف۔ میٹرک۔ پی۔ ٹی۔ آئی۔ ڈی۔ سی مڈل سکول تلونڈی موسے خاں (گوجرانوالہ) کو حکومت مغربی پاکستان کے محکمہ تعلیم کی چٹھی نمبر S.O.(IX) 6/47-61 مورخہ $\frac{4}{62}$ 11 کے مطابق آٹھ منظور شدہ آسامیوں میں سے ایک آسامی پر یکم جولائی ۶۲ء سے قائم مقام پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول تلونڈی موسے خاں (گوجرانوالہ) مقرر کیا گیا۔

ان کی تنخواہ علاوہ الاؤنس -/۶۰ روپے ہوگی اور گریڈ -/۶۰ - ۴ - -/۱۰۰ -/۱۰۵ - ۷ - -/۱۴۰ روپے ہے۔

ایضاً م۔ محمد سعید۔ ایس۔ وی قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ کو تاریخ حاضری سے

محولہ بالا آسامیوں میں سے ایک آسامی پر بشاہرہ خود قائم مقام درنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول تونڈی موسے خان مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ منظور احمد میٹرک۔ ایچ۔ پی۔ او۔ ٹی قائم مقام اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملتان کو تاریخ حاضری سے محولہ بالا آسامیوں میں سے ایک آسامی پر بشاہرہ خود قائم مقام اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبدالوکیل میٹرک جے ڈی پی ایف قائم مقام پی ٹی آئی گورنمنٹ ہائی سکول شجاع آباد کو محولہ بالا آسامیوں میں سے ایک آسامی پر تاریخ حاضری سے بشاہرہ خود قائم مقام پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبدالجبار میٹرک ایس وی ورنیکلر ٹیچر ڈی سی مڈل سکول روہیلاں والی کو محولہ بالا آٹھ آسامیوں میں سے ایک آسامی پر یکم جولائی ۱۹۶۲ء سے قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول روہیلاں والی ڈسٹرکٹ مظفرگڑھ مقرر کیا گیا۔

ان کی تنخواہ علاوہ الاؤنس -/۷۲ روپے ہوگی اور پیمانہ تنخواہ -/۶۰ - ۴ - -/۱۰۰ -/۱۰۵ - ۷ - -/۱۴۰ ہوگا۔

ایضاً م۔ منظور احمد خان میٹرک ایس۔ وی۔ ورنیکلر ٹیچر ڈی سی مڈل سکول روہیلاں والی کو محولہ بالا آٹھ آسامیوں میں سے ایک پر یکم جولائی ۱۹۶۲ء سے بشاہرہ -/۷۲ روپے (پیمانہ تنخواہ -/۶۰ - ۴ - -/۱۰۰ -/۱۰۵ - ۷ - -/۱۴۰) قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول روہیلاں والی ڈسٹرکٹ مظفرگڑھ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد موسے میٹرک ایس وی ورنیکلر ٹیچر ڈی بی سی مڈل سکول روہیلاں والی کو محولہ بالا آٹھ آسامیوں میں سے ایک آسامی پر بشاہرہ -/۷۲ روپے گریڈ -/۶۰ - ۴ - -/۱۰۰ -/۱۰۵ - ۷ - -/۱۴۰ قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول روہیلاں والی ڈسٹرکٹ مظفرگڑھ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبدالستار میٹرک جے پی۔ ڈی آئی، پی۔ ٹی۔ آئی۔ ڈی سی سی مڈل سکول روہیلاں والی (مظفرگڑھ) کو نئی منظور شدہ پانچ آسامیوں میں سے ایک پر یکم جولائی ۱۹۶۳ء سے قائم مقام پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول روہیلاں والی (مظفرگڑھ) مقرر کیا گیا۔ ان کی تنخواہ ۷۰/- روپے علاوہ الاؤنس۔ بیمانہ تنخواہ (۶۰/- - ۴ - ۱۰۰/- - ۵ - ۱۰۵/- - ۱۴۰/-)

ایضاً م۔ امام بخش قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جلالپور پیر والا کو محولہ بالا پانچ آسامیوں میں سے ایک پر تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ پر قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول روہیلاں والی (مظفرگڑھ) مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد امیر اورنیٹل ٹیچر عربک اسکول رفیق محرم شریف کو تاریخ حاضری سے محولہ بالا آٹھ آسامیوں میں سے ایک آسامی پر بمشاہرہ خود اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول نورپور نورنگا مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد اکبر پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول احمد پور شرقی کو تاریخ حاضری سے محولہ بالا آٹھ آسامیوں میں سے ایک آسامی پر بمشاہرہ خود پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول نورپور نورنگا مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد اقبال شاہ مڈل۔ ایس۔ وی ورنیکلر ٹیچر لوئر مڈل سکول کالونی رحیم یار خاں کو تاریخ حاضری سے محولہ بالا آٹھ آسامیوں میں سے ایک آسامی پر بمشاہرہ خود ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول نورپور نورنگا مقرر کیا گیا۔

شعبۂ نظارت

۱۱۴ ESTT م۔ عبدالحکیم بی اے۔ بی ٹی اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز سہال (راولپنڈی)
۲۱ اگست ۱۹۶۲ء کو تاریخ حاضری سے محمد عشرت اقبال بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز میانوالی مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد عشرت اقبال بی اے بی۔ ٹی اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز میانوالی کو تاریخ حاضری سے چوہدری نظام الدین ایم اے۔ بی۔ ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز گجرات مقرر کیا گیا۔

نوٹ :- اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز راولپنڈی کی آسامی بعد میں پر کی جائے گی ۔

ای/۸۶۴۶ م ۔ اللہ بخش بی اے ۔ بی ۔ ایڈ ۔ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی کو
۲۱ اگست ۶۲ء تاریخ حاضری سے م ۔ نذر عباس رضوی بی ۔ اے ۔ بی ۔ ایڈ کی جگہ جو ۶ اپریل ۶۲ء سے مستعفی
ہو گئے ہیں ۔ اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول
سرگودھا مقرر کیا گیا ۔

ایضاً م ۔ عبد الحمید نظامی بی اے ۔ بی ۔ ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول بھکر کو تاریخ حاضری سے
م ۔ اللہ بخش بی اے بی ایڈ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں سینئر
انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی مقرر کیا گیا ۔

۶۴۸۵ م ۔ عبد الحق ایم اے ۔ بی ۔ ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پاکپتن کو تاریخ حاضری سے
۲۱ اگست ۶۲ء م ۔ عبد القیوم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول
منٹگمری مقرر کیا گیا ۔

ایضاً م ۔ عبد القیوم ایم اے ۔ بی ۔ ٹی سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول منٹگمری کو تاریخ حاضری
سے م ۔ محمد سعید اختر کی جگہ اپنی تنخواہ اور گریڈ میں سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول
منٹگمری مقرر کیا گیا ۔

ایضاً م ۔ محمد سعید اختر ایم اے ۔ بی ۔ ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری کو م عبد الحق کی
کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول
پاکپتن مقرر کیا گیا ۔

ای/۲۱/۲۲۲۷ م ۔ قاضی فضل الٰہی بی ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز گوجر خان کو تاریخ حاضری سے
۲۲ اگست ۱۹۶۲ء میر عبد الرؤف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۔ اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں انگلش ٹیچر
گورنمنٹ ہائی سکول راولپنڈی مقرر کیا گیا ۔

ایضاً م ۔ رشید احمد بی ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کھاریاں کو تاریخ حاضری سے

قاضی فضل الٰہی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز گوجرخان مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ مختار حسین نقوی بی اے بی ایڈ انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول مری کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالحکیم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ بڑتاہرہ خود اسسٹنٹ ڈائرکٹر انسپکٹر آف سکولز سہال (راولپنڈی) مقرر کیا گیا۔

ای/۲۲۷۴۴/۴ م۔ صالح محمد میٹرک ایس۔ وی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول حضرو کو ایک موجودہ خالی
۲۴ اگست ۱۹۶۲ء آسامی پر اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پھالیہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۲۷۴۵/۴ م۔ عابد حسین نقوی بی اے۔ بی ایڈ انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول للہ کو م۔ احمد دین کی
۲۴ اگست ۱۹۶۲ء جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ احمد دین بی۔ اے۔ بی ایڈ قائم مقام انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور کو م۔ محمد عنایت کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں قائم مقام انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی گھیب مقرر کیا گیا۔

نوٹ:۔ ہر دو افسر اپنے خرچ سے اپنی نئی آسامی پر جائیں گے۔

صیغۂ رجال ——— شعبۂ دفتر

ای/۸۷۵۹ م۔ ثناء اللہ فاروقی۔ قائم مقام شیپوٹائپسٹ کو جو بیورو آف ایجوکیشن لاہور میں کام کر رہے ہیں
۲۴ اگست ۱۹۶۲ء جونیئر کلرک کی ایک نئی اضافی عارضی آسامی پر موجودہ گریڈ ۷۵/۱۷۵ + ۲۰ روپے کی بجائے ۶۰/- - ۴ - ۱۰۰/- - ۵ - ۱۲۰/- روپے کے سابقہ گریڈ میں تاریخ حاضری سے جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خان مقرر کیا گیا۔

ای/۸۹۸۷ م۔ علی رضا جعفری عارضی جونیئر کلرک گورنمنٹ بہاول کالج بہاول نگر کو جو م۔ محمد رمضان جونیئر کلرک

آموزش

۱۴ اگست ۱۹۶۲ء کے رخصت پر جانے کی وجہ سے ان کی اسامی پر کام کر رہے ہیں جو جونیئر کلرک کی ایک نئی آسامی پر جو ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء سے چھ ماہ کی مدت کے لیے منظور ہوئی ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر عارضی جونیئر کلرک دفتر ڈائرکٹر آف ایجوکیشن لاہور ریجن لاہور مقرر کیا گیا۔

ای/۸۷۸۲ م۔ محمد انور خان ولد محمد خاں میٹرک (ایک امیدوار) کو ایک نئی اسامی پر جو سرکاری چٹھی نمبر
۱۴ اگست ۱۹۶۲ء ۶۱-۸/۶-X/۵.۰.۵ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۶۳ء کے مطابق منظور ہوئی ۱۱ جولائی ۱۹۶۲ء قبل دوپہر سے عارضی جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول ملتان مقرر کیا گیا۔ ان کا پیمانہ تنخواہ -/۶۰ — ۴ — -/۱۰۰ — ۵ — -/۱۲۰ ہوگا۔

اس تقرر میں م۔ محمد انور کا تھرڈ کلاس میٹرک لیٹ ہونا نظر انداز کر دیا گیا ہے البتہ ان کا تقرر محض عارضی ہے جو سرکاری محکموں کے فاضل عملے کی دستیابی پر بغیر نوٹس دیئے یا وجہ بتائے ختم کیا جا سکتا ہے۔

جی ۶۵۱۳ م۔ منظور احمد میٹرک II ولد نذیر احمد (ایک امیدوار) کو تاریخ حاضری سے جونیئر کلرک کی ایک نئی عارضی آسامی پر چھ ماہ کے لیے عارضی جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول پاک پٹن بمشاہرہ -/۶۰ روپے (علاوہ الاؤنس) مقرر کیا گیا۔

ای ۶۶۲۲ م۔ نور احمد ترین ولد خان تاج محمد خان ترین میٹرک (ایک امیدوار) کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالحمید
۹۳۹۰ عارضی جونیئر کلرک کی جگہ جن کا ڈائرکٹر ایجوکیشن لاہور ریجن لاہور کے دفتر میں تبادلہ ہو چکا ہے
۳۰ اگست ۱۹۶۲ء بمشاہرہ -/۶۰ روپے (علاوہ الاؤنس) -/۶۰ — ۴ — -/۱۰۰ — ۵ — -/۱۲۰ کے گریڈ میں، عارضی جونیئر کلرک گورنمنٹ کالج مظفرگڑھ مقرر کیا گیا۔

نوٹ:- از روئے قاعدہ م۔ نور احمد ترین کا میٹرک II ہونا نظر انداز کر دیا گیا ہے اور ان کا تقرر محض عارضی ہے۔ اور کسی وقت بھی نوٹس دیئے بغیر یا وجہ بتائے بغیر ختم کیا جا سکتا ہے۔

G/۶۶۲۳ ایک امیدوار محمد اختر میٹرک III ولد دولت علی کو تاریخ حاضری سے جونیئر کلرک کی ایک
۳۱ اگست ۱۹۶۲ء نئی آسامی پر عارضی جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول روہیلیاں والی ضلع مظفرگڑھ مقرر کیا گیا

ان کی تنخواہ ۶۰/- روپے علاوہ الاؤنس اور گریڈ ۶۰/- - ۴ - ۱۰۰/- - ۵ - ۱۴۰/-
رہے گا۔

نوٹ م۔ محمد اختر کا میٹرک III ہونا از روئے قاعدہ نظرانداز کر دیا گیا ہے اور ان کا تقرر محض عارضی ہے جو سرکاری محکموں کے فاضل عملے کی دستیابی پر کسی نوٹس یا وجہ بتلائے بغیر ختم کیا جا سکتا ہے۔

صیغۂ رجال ———— شعبۂ سکول

۸۵۴/۲/۴ ۲۳ اگست ۶۲ء م۔ محمد صادق ولد چودہری عمر دین میٹرک II (ایک امیدوار) کو ڈرائنگ ماسٹر کی خالی آسامی پر تاریخ حاضری سے ۶۰/- - ۴ - ۱۰۰/- - ۵ - ۱۰۵/- - ۷ - ۱۴۰/- کے گریڈ میں بشاہرہ ۶۰/- روپے ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ڈنگہ ٹیگہ (بہاولپور) مقرر کیا گیا۔

E/۸۵۴۲ ۲۳ اگست ۶۲ء ایک امیدوار م۔ محمد صدیق ولد احمد دین میٹرک جے ڈی پی ای کو پی۔ ٹی آئی کی خالی جگہ پر تاریخ حاضری سے ۶۰/- - ۴ - ۱۰۰/- - ۵ - ۱۰۵/- - ۷ - ۱۴۰/- کے گریڈ میں بشاہرہ ۶۰/- روپے قائم مقام پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ مڈل سکول محمد پور سنارن ضلع بہاول نگر مقرر کیا گیا۔

ADMN/I-۸۶۵ ۲۴ اگست ۶۲ء م۔ محمد حسین ڈار ایم اے بی۔ ایڈ قائم مقام انگلش ٹیچر۔ ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ گکھڑ کو م۔ دین محمد کی جگہ اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ دین محمد ایم اے بی۔ ایڈ (ایک امیدوار) کو م۔ محمد حسین ڈار کی جگہ ۱۴۰/- - ۳۰۰ روپے (علاوہ الاؤنس کے گریڈ میں بشاہرہ ۱۷۰/- روپے قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر۔ ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ گکھڑ مقرر کیا گیا۔

ADMN/I-۸۸۰ ۱۵ اگست ۶۲ء ایک امیدوار، م۔ لال خان رانجھا۔ ایف اے۔ سی۔ ٹی کو موسم گرما کے بعد تاریخ حاضر کا سے ایک نئی عارضی آسامی پر بشاہرہ ۹۰/- علاوہ الاؤنس عارضی جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ

تلونڈی موسے خاں متقرر کیا گیا۔

ایضاً ایک امیدوار م۔ منظور احمد ایف اے سی۔ ٹی کو ایک نئی عارضی آسامی پر موسم گرما کی تعطیلات کے بعد تاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۹۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی جونیر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول تلونڈی موسے خاں متقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد اقبال ایف اے سی۔ ٹی سابق جونیر انگلش ٹیچر ڈی سی مڈل سکول ملٹری فارم اوکاڑہ کو ایک نئی عارضی آسامی پر یکم جولائی ۶۲ء سے بمشاہرہ -/۹۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی جونیر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری اوکاڑہ متقرر کیا گیا۔

ایضاً ایک امیدوارم۔ محمد نصیر خاں زاہد بی اے سی۔ ٹی کو ایک نئی عارضی آسامی پر موسم گرما کے بعد تاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۹۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی جونیر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری اوکاڑہ متقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ فیض محمد خان بلوچ (ایک امیدوار) کو ایک نئی عارضی آسامی پر تعطیلات موسم گرما کے بعد تاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۹۰ روپے عارضی جونیر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول روہیلاں والی متقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ سعید محمد ایف اے سی۔ ٹی (ایک امیدوار) کو ایک نئی عارضی آسامی پر بمشاہرہ -/۹۰ روپے موسم گرما کے بعد تاریخ حاضری سے عارضی جونیر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول روہیلانوالی متقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد عظیم میٹرک جے اے وی ٹیچر کمپلیسری ایجوکیشن سینٹر بہاولپور کو ایک نئی عارضی آسامی پر بمشاہرہ -/۹۰ روپے موسم گرما کی تعطیلات کے بعد تاریخ حاضری سے عارضی جونیر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول لنڈ پور لورینگا متقرر کیا گیا۔

ـد ۱۵ شمارہ ۵ لاہور نو

اس شمارہ میں

آموزش

لاہور

نومبر ۱۹۶۲ء

جلد ـــــــ ۱۵

شمارہ ـــــــ ۵

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

پبلشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی۔ لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی ی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۱۹۴ - انارکلی لاہور شائع کیا

فطری طور پر باہمی کشش محسوس کرتے ہیں۔ مگر بعض دفعہ نوجوان لوگ اِس پہلی ملاقات ہی میں ایک دوسرے کی "محبت" میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور بڑی سرعت کے ساتھ بغیر سوچے سمجھے، آپس میں شادی کرنے کا فیصلہ بھی کر لیتے ہیں۔ اِس قسم کی ڈراماتی شادیاں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ مجھے اِس قسم کی متعدد ناکام شادیوں کے نفسیاتی تجزیہ کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے فریقین کا ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھنا اور اچھی طرح جانچ پڑتال کرنے کے بعد ایک دوسرے کو بطور رفیقِ زندگی منتخب کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہ سب کچھ بھلا ایک مختصر سی ملاقات میں کیسے ممکن ہو سکتا ہے چنانچہ ایسی شادیوں میں فریقین کو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ ان میں کئی ایسی باتیں موجود ہیں جنھیں وہ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محبت میں تنزل واقع ہونا شروع ہو جاتا ہے، اور بے اعتنائی، اظہارِ بیزاری کشیدگی اور نفرت کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے فریقین ایک دوسرے سے جدا ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

شادی اور عمر

اسی طرح ابتدائی عمر میں ہونے والی شادیاں بھی اکثر ناکام رہتی ہیں۔ بیس اکیس برس کی ابتدائی عمر میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے ذہن ابھی پختہ کار نہیں ہوا ہوتا۔ نوجوانوں کو ایک دوسرے کے زاویہ نگاہ سمجھنے، ایک دوسرے کے جذبوں کا احترام کرنے اور روزمرہ گھریلو باتوں میں تعاون اور سمجھوتے کے اصولوں پر کاربند رہنے کا سلیقہ ابھی اچھی طرح نہیں آیا ہوتا۔ اِس لیے اِس عمر کی شادیاں بھی اکثر اسی وجہ سے ناکام ہو جاتی ہیں۔ ایک امریکی ماہرِ نفسیات نے سینکڑوں کامیاب اور ناکام شادیوں کا تجزیہ کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ اگر لڑکا اکیس برس سے کم عمر کا ہو تو شادی کی کامیابی کے امکان بہت کم رہ جاتے ہیں ۲۲، اور ۲۵ برس کی عمر کے لگ بھگ شادی کرنے والے لڑکے لڑکیاں نسبتاً زیادہ کامیاب رہتے ہیں مگر ۳۰، اور ۳۴ برس کی درمیانی عمر میں شادی کرنے والوں کی شرح کامیابی سب سے زیادہ تھی۔ اِس تحقیق میں عمر اور زندگی کے تجربوں کی اہمیت اور ازدواجی زندگی میں ان کا مقام کس قدر واضح ہے
ہمارے ہاں شادی کی عمر میں تاخیر کرنے کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں تو

دھڑا دھڑ بچے پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ضبطِ ولادت سے متعلق لاعلمی اور غلط رجحان بھی ہمارے ہاں عام ہے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی معاشرے کی الجھنوں میں مزید پیچیدگیوں کا باعث بنتی چلی جا رہی ہے۔

ہنگامی شادیاں

شادی کی ایک اور قسم جو عموماً ناکام رہتی ہے ہنگامی شادی ہے۔ لڑکی جوان ہونے لگے۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم کے لیے کہیں جانے لگے۔ بڑھاپے کی وجہ سے والدین کی یہ خواہش اچانک بہ شدت اختیار کرنے لگے کہ لڑکے لڑکی کو اپنی زندگی میں بیاہ دینا چاہیے۔ تو شادی کے فوری اہتمام ہونے لگتے ہیں۔ اس ہنگامی صورتِ حال میں کوئی یہ نہیں سوچتا کہ زندگی کے اس اہم ترین معاملہ کے لیے محتاط تجزیہ اور سنجیدہ غور و فکر کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس قسم کے حالات میں لڑکوں کی نسبت لڑکیاں زیادہ نقصان اٹھاتی ہیں۔ ہمارے ہاں جب لڑکیاں جوان ہو جاتی ہیں تو والدین کی مسلسل پریشانی کا باعث بن جاتی ہیں۔ ایک ایسے بدنصیب معاشرے میں جہاں اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے لڑکیوں کی روزمرہ نقل و حرکت بھی اخلاقی خطروں سے خالی نہ ہو یہ پریشانی زیادہ شدت پکڑ جاتی ہے۔ چنانچہ اکثر والدین یہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح لڑکی کی کہیں نہ کہیں شادی ہو جائے اور وہ اس اہم فریضہ کو جس قدر جلد ہو سکے سرانجام دے کر اطمینان کا سانس لے سکیں۔ وہ عجلت بازی کی ایسی شادی کے بھیانک نتائج پر سنجیدہ غور و فکر قطعی معطل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی اس عجلت بازی کا خمیازہ لڑکے لڑکی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ مغربی ممالک میں اس سمت میں جو تحقیق ہوئی ہے اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جنگ اور ہنگامی صورتِ حال میں جھٹ پٹ کی شادیاں اُن شادیوں کی نسبت عموماً ناکام رہتی ہیں جو جنگ کے پہلے یا بعد کے عرصہ میں احتیاط اور تحمل سے کی جاتی ہیں۔

انمل بے جوڑ شادیاں

ناکام شادیوں کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو محض فریقین کے والدین کی مرضی کی بنا پر ہوتی ہے بعض والدین لڑکے لڑکی کی اپنی پسند اور میلان وغیرہ کو قطعی بالائے طاق رکھ کر ان کی شادی وغیرہ کا

اداریہ

۲۴ اکتوبر کا دن اقوامِ متحدہ کی آرزوؤں کا اشتہار بن کر آیا۔ یہ اشتہار دنیا کی ایک سو دس قوموں کی یک جہتی اور انسان دوستی کا آئینہ دار تھا۔ سچ پوچھیے تو دنیا میں اقوامِ متحدہ ہی ایک ایسی تنظیم ہے جس سے بلا تفریقِ مذہب و ملت اقوام کی خوش حالی کا انصرام اور امنِ عالم کا قیام وابستہ ہے۔ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر چودھری ظفر اللہ خاں نے اس حقیقت کو اپنے پیغام میں اس طرح بیان کیا ہے :-

"اقوامِ متحدہ کے منشور کے تحت انسان کو تاریخ میں پہلی بار امن، خوش حالی اور آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ حاصل ہوا ہے۔"

پاکستان ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء سے اقوامِ متحدہ کا رکن چلا آتا ہے اور پاکستانیوں نے حسبِ دستور امسال بھی یومِ اقوامِ متحدہ شایانِ شان طریق سے منایا۔ کالجوں، یونیورسٹیوں اور سرکاری اداروں میں جلسے منعقد ہوئے اور اقوامِ متحدہ کے مقاصد کو سراہا گیا۔ صدرِ پاکستان نے بنفسِ نفیس اقوامِ متحدہ کے منشور پر اعتماد رکھنے اور اس کی حمایت کرنے کا اعلان کیا۔ صدرِ مملکت کے اس اعلانِ واجب الاذعان میں پاکستان کا ہر فرد شریک ہے اور بے شک صدرِ پاکستان کی آواز کُل پاکستان کی آواز ہے۔

۲۴ اکتوبر کے اجتماعات میں اقوامِ متحدہ کا منشور بھی جا بجا مقررین کی زبانوں پر آیا جس کی گونج اب تک کانوں میں سنائی دیتی ہے۔ ——— "ہم اقوامِ متحدہ کے لوگوں نے اس بات کا مصمم ارادہ کر رکھا ہے کہ آنے والی نسلوں کو جنگ کی تباہی سے بچائیں گے ...... ہم چھوٹی اور بڑی قوموں کے مساوی حقوق پر یقین اور اعتماد کا اعادہ کرتے ہیں اور عزمِ راسخ رکھتے ہیں کہ ایسے حالات پیدا کریں گے جن میں انصاف اور

آموزش

معاہدوں کا احترام برقرار رہے . . . . . اچھے ہمسایوں کی طرح امن سے رہیں گے . . . . . ہر فردِ بشر کے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کی حوصلہ افزائی کریں گے۔"

یہ فردوسِ گوش آوازیں ایک نہایت طمانیت بخش اور راحت رساں مستقبل کی پیش قیاسی کرتی ہیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو اور اقوامِ متحدہ اپنے عظیم الشان مشن میں کامیاب و کامران ہو کر رہے ع

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

لیکن ان خوش آئند آوازوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کے حساس و باخبر شہریوں کو ان قتیلۃ السیف مظلوموں کی پکار بھی سنائی دیتی رہی ہے۔ جو آج کشمیر میں قید و بند کی زندگی گذار رہے ہیں جنھیں حقِ خود ارادیت عطا کرنے کے وعدے کئے گئے لیکن وعدہ وفائی کی گھڑی کبھی نہیں آئی۔ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ سنہ ۱۹۵۳ء کے "علی نہرو سمجھوتے" کے مطابق نہ صرف یہ طے پایا تھا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ عام رائے شماری کے ذریعہ کیا جائے گا۔ بلکہ رائے شماری کا ایک ایڈمنسٹریٹر بھی مقرر ہوا تھا جس کی رُو سے سنہ ۱۹۵۴ء میں ناظمِ رائے شماری کا تقرر ہونا تھا جو کبھی نہیں ہوا۔ حالاں کہ آج تک بھی معاہدہ ہے۔ ہندوستان کو ہاتھ آتے ہی اس نے ہتھیا رکھا کر کے کشمیر کے مستقبل کو اور زیادہ تاریک کر دیا ہے جو یقیناً اقوامِ متحدہ کے بلند بانگ دعوئے امن گستری کو ایک کھلا چیلنج ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کی عالمی تنظیم اس عالم آشوب حالات سے کیوں کر عہدہ برآ ہوتی ہے ؛

ازدواجی زندگی

ڈاکٹر عبدالرؤف ڈائرکٹر ویسٹ پاکستان بیورو آف ایجوکیشن لاہور

خوشگوار ازدواجی زندگی ایک بیش بہا نعمت ہے جس کا میسر آجانا انسان کی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے۔ ازدواجی زندگی کی کامیابی کی بیشتر ذمہ داری بچپن کی تربیت پر منحصر ہے۔ اگر بچپن میں لڑکے لڑکیوں کو خوش رہنے، اور کھیل کود اور کام کاج میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی معقول تربیت میسر آئی ہو تو اُن کی ازدواجی زندگی میں جھگڑوں اور تلخیوں کے امکان گھٹ جاتے ہیں اس کے برعکس اگر بچپن کی بنیادی تربیت میں خامیاں رہ گئی ہوں اور جلنے کڑھنے اور لڑنے بھڑنے کی عادتوں کو راسخ ہونے کا موقع مل گیا ہو تو ازدواجی زندگی کے مکدر ہونے کے امکان نسبتاً بڑھ جاتے ہیں ابتدائی جذباتی تربیت کے علاوہ ازدواجی زندگی کی کامیابی یا ناکامی کے لیے متعدد دیگر عناصر بھی ذمہ دار بنتے ہیں

ویران گھر اور بدنصیب بچے

مجھے کئی ایسے گھروں میں جانے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے جہاں ازدواجی زندگی ہنگاموں اور تلخیوں کی نذر ہو چکی ہے۔ اُف یہ ویران گھر کس قدر اداس اور بھیانک دکھائی دیتے ہیں۔ میں جب ان بدنصیب گھروں کے معصوم بچوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے سفاک معاشرتی نظام پر سخت وحشت ہوتی ہے جو نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اپنی پسند کا رفیق حیات منتخب کرنے اور ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کی تربیت کا کوئی اہتمام نہیں کرتا۔ ازدواجی زندگی بہت پیچیدہ اور لطیف زندگی ہے۔ اس کی ذمہ داریوں سے کامیابی سے نمٹنے اور اس کی مسرتوں سے صحیح طرح لطف اندوز ہونے کے لیے مسلسل محنت اور تخلیقی فکر کی اشد ضرورت ہے جس طرح فنّی زندگی کی کامیابی معقول فن کے

ب اور اس میں کامیابی کی سائنسی تربیت پر منحصر ہے۔ اسی طرح ازدواجی زندگی کی کامیابی کے لیے
نول ساتھی کا انتخاب ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس ساتھی سے عین انسانیت سے نباہنے کا ڈھنگ
نا بھی بے حد ضروری ہے۔ شادی بیاہ کے معاملوں پر تحقیقی مراکز قائم کرنے۔ شادی کے لیے رہنمائی
کے ادارے اور ازدواجی الجھنوں کے علاج کے لیے نفسیاتی کلینک کھولنے ہی سے اس قسم کی تربیت
معقول اہتمام کیا جا سکتا ہے۔

صابر عورتیں اور جابر مرد

مغربی ممالک میں ازدواجی ناکامیوں کی تعداد حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی ہے۔ مجھے مغرب میں طلاق
کی عدالتوں کے ہنگامے دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے۔ یہ عدالتیں بے حد مصروف رہتی ہیں۔ ان عدالتوں
کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ازدواجی کشیدگی، لڑائی جھگڑے اور طلاق کی وبا مغرب میں بہت
تشویشناک صورت اختیار کر گئی ہے۔ ہمارے ہاں ازدواجی زندگی کے ان حادثوں اور تلخیوں کی شرح
کیا ہے؟ اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ ہمارے ہاں زندگی کے ان اہم معاملوں کے
اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوتے اس کے علاوہ ہمارے معاشرے میں یہ رواج چلا آ رہا ہے کہ ازدواجی
تلخیوں کا کوئی معقول حل ڈھونڈنے کی بجائے ان کو چپکے سے سہہ لیا جاتا ہے۔ یہ رجحان ہماری عورتوں
میں تو بہت عام ہے۔ ہمارے ہاں ایسی عورتوں کی کمی نہیں ہے جو ازدواجی الجھنوں کا شکار ہو کر تپ دق
اعصابی امراض اور طرح طرح کی ذہنی بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہیں یہ صابر عورتیں اپنی ازدواجی زندگی کو
مسلسل جذباتی اور جسمانی اذیت کے ہاتھوں ختم کر دینے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ مگر ظالم خاوند کے جور و جفا
کو قانون یا طبیب کے سامنے پیش کرنے کی جرأت نہیں کرتیں۔

پہلی نظر کی محبت

ازدواجی زندگی میں تلخیوں، کشیدگیوں اور ناکامیوں کی ذمہ داری بیشمار عناصر پر عاید ہوتی ہے۔ اکثر
حالتوں میں تو یہ شادی کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اسمیں تلخی اور ناکامی کے امکانات
پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں۔ جوان لڑکے لڑکیاں جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو

سارا معاملہ خود ہی طے کر لیتے ہیں۔ اِس قسم کی اکثر شادیوں میں میاں بیوی یوں محسوس کرتے ہیں جیسے وہ ایک دوسرے پر خواہ مخواہ تھوپ دیئے گئے ہوں۔ ایسی انمل بے جوڑ شادیوں میں اکثر اوقات مضحکہ خیز پہلو یہ ہوتا ہے کہ لڑکے لڑکی میں مزاج تعلیم و تمدن اور مشاغل وغیرہ کی ہم آہنگی کو نہایت سفاکی سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اگر والدین اپنی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باذوق صاحبزادی کے لیے کسی اَن پڑھ دیہاتی کا انتخاب کر لیں تو میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں مسرتوں کی امید رکھنا صریح حماقت ہوگی۔ اسی طرح کسی فن کار نوجوان کو کسی اکھڑ قسم کی لڑکی سے بیاہ دینا بہت بڑی بدذوقی ہے جو شاذونادر ہی پروان چڑھ سکتی ہے۔

بعض اوقات والدین شادی کے ذریعے اقتصادی یا سیاسی منفعت کی سودا بازی کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ وہ اِس گھٹیا سودا بازی میں کامیاب ہوں یا نہ ہوں۔ اس قسم کے ازدواجی عہد و پیمان عموماً ناکام رہتے ہیں اور دو اچھے بھلے نوجوانوں اور ان کے ہونے والے بچوں کو جو عظیم نقصان پہنچتا ہے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

گھریلو جھگڑے

بسا اوقات اچھی بھلی شادیاں محض چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے ناکام ہو جاتی ہیں۔ اگر میاں بیوی ایک دوسرے پر نکتہ چینی یا ایک دوسرے کے معاملوں میں بیجا مداخلت کرتے رہتے ہوں تو ازدواجی زندگی مکدر ہو سکتی ہے۔ اِس قسم کی کج بحثوں میں زیادہ تنازع موضوع عموماً کچھ اِس قسم کے ہوتے ہیں۔ خاوند کارات کو دیر گئے گھر لوٹنا۔ بچوں کی پرورش میں کوئی دلچسپی نہ لینا۔ بیوی کو اپنی صحیح آمدنی اور کاروباری مشاغل سے غافل رکھنا۔ بیوی کے رشتہ داروں کی متوقع طریقے سے خاطر مدارت نہ کرنا۔ گھریلو اور ذاتی خرچ کے لیے بیوی کو مناسب رقم نہ دینا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح خاوند کا گھریلو نظم و نسق کی ہر خامی کے لیے بیوی کو مورد الزام ٹھہرانا۔ بیوی کی جمالیاتی دلچسپیوں پر خواہ مخواہ اعتراض کرنا اور ہر معاملے میں برتری اور ہٹ دھرمی کا اظہار کرنا وغیرہ۔

بعض دفعہ ان اختلافی امور کی نوعیت خفیف اور عارضی ہوتی ہے۔ اور ان سے میاں بیوی کے باہمی تعلقات مستقل طور پر کشیدہ نہیں ہوتے۔ مگر اکثر اوقات یہ بحثیں کج فہمی اور مستقل دھڑے بندی کی

حد تک پہنچ جاتی ہیں جن میں فریقین ایک دوسرے کے زاویۂ نگاہ اور شکایت کو اچھی طرح سمجھنے کی کوئی پُرخلوص اور منظم کوشش نہیں کرتے۔ وہ تحمل اور معقول طریقے سے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے اور ایک دوسرے کے قریب آنے کے موٹے موٹے اصولوں کو اس حد تک نظر انداز کر دیتے ہیں کہ باہم لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے گھر میدانِ کارزار دکھائی دینے لگتا ہے۔

ہمارا گھریلو کردار

ہمارے معاشرے میں ایک عام مرض یہ بھی ہے کہ ہم گھر کے باہر کے لوگوں سے تو عموماً بڑے اخلاق اور خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں مگر گھر کے اندر داخل ہوتے ہی ان سب اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اگر کسی محفل میں گپ بازی کے دوران میں آپ کے کسی دوست کو آپ کی کوئی بات سمجھ نہ آئے تو آپ بے ساختگی سے کہتے ہیں دیکھئے نا! میں تو فقط یہ کہنا چاہتا تھا۔ مگر آپ نے اسے یوں سمجھ لیا مجھے افسوس ہے کہ میں اسے اس رنگ میں پیش نہ کر سکا اور آپ کو غلط فہمی ہوئی وغیرہ۔

سڑک پر چلتے چلتے غلطی سے آپ کا کندھا کسی سے چھو جائے تو آپ بار بار "معاف کیجئے گا" کہتے نہیں تھکتے۔ قہوہ خانے میں چائے کی پیالی بنانے میں ذرا سی مدد ملنے پر آپ "شکریہ" "نوازش" کی بھرمار شروع کر دیتے ہیں۔ روز کے ملنے والے متعدد احباب سے آپ ان کی خیریت اس طرح پوچھتے ہیں جیسے اُن سے کئی سالوں کے بعد ملے ہوں۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی آپ خندہ پیشانی کے ان اصولوں کو نہ جانے اس بیدردی سے کیوں کچل دیتے ہیں۔ حالانکہ گھر میں ان کے اخلاق کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ بے رُخی سرد مہری، ترش روئی اور گرم مزاجی کے مظاہروں کے بجائے اگر آپ بیوی سے بھی اسی تبسم طریق سے پیش آیا کریں جس سے آپ گھر کے باہر ـــــ دیکھے جاتے ہیں تو اس ذرا سی بات سے ازدواجی زندگی کئی ناگوار حادثوں سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ آپ کی مسرتوں میں یقیناً اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور آپ میں زیادہ اور بہتر کام کرنے کی صلاحیتیں اجاگر ہو سکتی ہیں۔

ایک دوسرے میں دلچسپی

ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے میاں بیوی کو ایک دوسرے کے کام اور مشغلوں میں

ں کی بہت دلچسپی پیدا کرنی چاہیے۔ اگر آپ کے میاں تاجر ہیں تو آپ کو ان کی تجارت کے نشیب و فراز سے
ڑی بہت واقفیت ہونی چاہیے۔ اگر انہیں مچھلیاں پکڑنے کا مشغلہ مرغوب ہو تو آپ بھی کبھی کبھی
ں دلچسپ شغل میں شریک ہو کر ان کی مسرتوں میں اضافہ کا باعث بن سکتی ہیں۔ اسی طرح اگر بیگم صاحبہ
ہیں تو آپ اُن سے کبھی کبھی تعلیم اور مدرسہ کی باتیں کر کے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اگر انہیں موسیقی
شغف ہو تو آپ بہت خوش نصیب ہیں۔ آپ کو موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

بچوں کی پرورش کا معاملہ محض آیا، یا بیگم ہی کی اجارہ داری نہیں ہے۔ اس میں آپ کو بھی مناسب
لینا چاہیے۔ بچوں کی تربیت میں والدہ کی شرکت سے ازدواجی زندگی پر بہت خوش گوار اثر پڑتا ہے
بچے بھی پدرانہ شفقت کی محرومی کے مہلک اثرات سے بچ جاتے ہیں۔ اسی طرح گھریلو نظم و نسق کا سارا
بیوی کے کندھے پر ڈال دینا قرین مصلحت نہیں۔ گھر ایک ایسی تفریح گاہ ہے جس کی بہتر دیکھ بھال
ں اور بیوی دونوں کی مشترکہ کوششوں ہی سے ہو سکتی ہے۔ گھر پر مذہبی اور معاشرتی تہواروں اور
بوں کے اہتمام میں میاں بیوی مشترکہ حصہ لیا کریں تو اس سے بھی تعاون اور ایک دوسرے سے ہنسی خوشی
ہنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اگر ممکن ہو سکے تو میاں بیوی ہر سال اپنی شادی کی برسی منایا کریں اس
ی موقع پر سابقہ سال کی ازدواجی مسرتوں کی یاد تازہ کیا کریں اور ماضی کی تلخیوں کی مذمت کر کے عہد
ریں کہ آئندہ سال تلخیوں کو رونما ہونے کا موقع نہیں دیا جائے گا اور مسرتوں میں اضافہ کے لیے
ہ اور تعاون کی کوششیں کی جائیں گی۔

دواجی تلخیوں کا علاج

ازدواجی زندگی خواہ کتنی ہی مکدر کیوں نہ ہو چکی ہو اگر ایک بار اسے خوش گوار بنانے کا تہیہ کر لیا جائے
ئی وجہ نہیں کہ اس میں ناکامی ہو۔ بعض گھروں میں میاں بیوی کے مابین آئے دن کوئی نہ کوئی ہنگامہ بپا
ا ہے۔ مزاجوں اور شخصیتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہونے کی وجہ سے فریقین ایک منٹ کے لیے
ں ایک دوسرے سے نباہ کرتے نظر نہیں آتے۔ اس قسم کی تلخ زندگی سے سارے گھر کی فضا
ر رہتی ہے۔ اگر ان لوگوں نے شادی سے پہلے ایک دوسرے سے متعلق معلومات حاصل کی ہوتیں

ایک دوسرے کو جانچا پرکھا ہوتا تو وہ شاید آپس میں شادی کرنے سے باز رہے ہوتے۔ مگر اب چوں کہ یہ غلطی ہو چکی ہے۔ اس لیے انسانیت کا تقاضا ہے کہ اسے اچھی طرح نباہ جائے۔ ایسی ازدواجی کشیدگی کے لیے دو صورتیں ممکن ہیں۔

اوّل : طلاق

دوئم : باہمی نباہ کی منظم کوششیں۔

طلاق کا تجزیہ

ازدواجی زندگی کے لڑائی جھگڑوں اور بد مذاقیوں کے حل کے لیے طلاق آخری حربہ ہے۔ معاشرتی اعتبار سے طلاق ازدواجی جھگڑوں کا کوئی معقول علاج نہیں ہے۔ یہ زندگی کی تکالیف کا حل ڈھونڈنے کے بجائے اُن سے فرار کا ایک ایسا طریق ہے جس میں بزدلی اور سفاکی پائی جاتی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے آپ نے ایک دوسرے سے ازدواجی عہد و پیماں باندھنے میں کس قدر اشتیاق اور گرم جوشی کا اظہار کیا تھا۔ ازدواجی پیمان باندھنے سے آپ نے اس زندگی کی ساری ذمہ داریوں سے نمٹنے کا عہد بھی کیا تھا۔ اب آپ کس تنگ دلی سے ان سب ذمہ داریوں سے انحراف پر تُل بیٹھے ہیں۔ اس حرکت سے آپ یہ بھی ثابت کر رہے ہیں کہ زندگی کی الجھنوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بارے میں آپ نہایت بزدل اور فرار پسند واقع ہوئے ہیں۔ مذہب نے بھی طلاق کو کوئی مستحسن مقام نہیں دیا۔ بہترین صورت یہی ہے کہ گھریلو زندگی کو خوش گوار بنانے کی طرف پوری توجہ اور محنت صرف کی جائے تاکہ تلخی یا طلاق کی نوبت ہی نہ آئے۔

کسی کو رفیق حیات یا رفیقۂ حیات منتخب کرنے سے پہلے اچھی طرح چھان پھٹک کرنا اور کسی تجویز کو قبول کرنا یا مسترد کرنا ہر نوجوان کا فطری حق ہے۔ مگر انسانیت کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ جب ایک بار غلط یا صحیح فیصلہ کر کے ازدواجی زندگی کا آغاز کر دیا جائے تو پھر اس فیصلے پر ثابت قدمی سے قائم رہا جائے اور زندگی کی تلخیوں اور مسرتوں کو خندہ پیشانی سے قبول کیا جائے۔ ازدواجی زندگی کے آغاز کے بعد اخلاقی پہلو سے فریقین کو ایک دوسرے پر تخریبی تنقید و تنقیص کا قطعی کوئی حق نہیں پہنچتا۔

ایک دوسرے سے الجھنے اور نت نئے ہنگامے بپا کرنے کی بجائے اگر میاں بیوی اپنے آپ کو تھام

برداشت اور تعاون کے اصولوں کا خوگر بنالیں تو انہیں اپنی متعدد ناکامیوں اور غلطیوں پہ ہنسنے کا موقع مل سکتا ہے جس سے ازدواجی زندگی کی بیشتر کشیدگیاں دور ہو سکتی ہیں اور زندگی کے تمام شعبوں میں مسرت اور کامیابی کے امکان بڑھ سکتے ہیں۔

ازدواجی تلخیوں کو ختم کرنے کی اہمیت

ہماری زندگی کے اکثر جھگڑے اور بے شمار تلخیاں درگذر کرنے اور بھول جانے سے بھی اپنی شدت کھو دیتے ہیں۔ اس طرح سے اگر ازدواجی تلخیوں کی شدت میں روز بروز کمی واقع ہونی شروع ہو جائے تو ایک دن ایسا بھی آ سکتا ہے جب تلخیاں بالکل ختم ہو جائیں اور ازدواجی زندگی میں مسرتوں کا آغاز شروع ہو جائے۔ ازدواجی تلخیوں کو یوں ختم کرنا میاں بیوی کے ذاتی مفاد اور ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے ہی ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بچوں کی مناسب نشوونما کے لیے بے حد اہم ہے کیونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ والدین کی ازدواجی کشیدگی بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت پہ بہت ناگوار اثر ڈالتی ہے اور ان کی جذباتی زندگی درہم برہم کئے رکھتی ہے۔ ایسے بدنصیب گھروں میں تربیت پائے ہوئے بچوں کی آئندہ ازدواجی زندگی میں بھی ایسی تلخیوں کے رونما ہونے کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ والدین جو ازدواجی زندگی کو ماہ عروسی کی طرح خوشگوار بنائے رکھتے ہیں ایک ایسے صحت مند جذباتی ماحول میں بچوں کی تربیت کرتے ہیں جس میں پروان چڑھ کر وہ بھی اپنے والدین کی طرح کامیاب اور خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

(یہ مقالہ اردو تدریس کانفرنس دسمبر ۱۹۶۱ء میں پڑھا گیا)

...سی کتابوں کا معیارِ قرأت اور اُس کے جانچنے کے طریقے

...فیسر شیخ اصغر علی ٹیکنیکل کالج لائل پور

آج جسے دیکھئے درسی کتابوں سے غیر مطمئن نظر آتا ہے۔ ایسی درسی کتابیں ایک کثیر تعداد میں ...جود ہیں جن سے استاد نالاں ہیں اور تلامذہ متنفر، والدین ان سے ناخوش ہیں اور بہت سے ماہرین تعلیم ...ض۔ ایسی کتابوں پر سبھی طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ کسی کو شکایت ہے کہ مشکل ہیں۔ ...ی کو گلہ ہے کہ ان میں واقعات و حقائق کو ان کے اصلی اور حقیقی رنگ میں پیش نہیں کیا گیا۔ کسی کو کتاب ...کتابت و طباعت پر اعتراض ہے اور کسی کو زبان و بیان پر۔ کوئی معترض ہے کہ یہ کتابیں معیاری نہیں ہیں ...ر کوئی شاکی ہے کہ یہ کتابیں بے رنگ اور غیر دلچسپ ہیں۔ سب سے بڑا اعتراض جو ان کتابوں پر کیا جاتا ...ہ وہ یہ ہے کہ درسی کتابوں کا معیار قرأت (Read ability) بچوں کی استعداد قرأت (Reading ability) سے بالعموم بلند ہوتا ہے اور معیار قرأت اور استعداد قرأت ...ں عدم توازن کی وجہ سے بچے زبان کی شکل میں الجھ کے رہ جاتے ہیں اور مضمون کے مطالب تک ...ن کی رسائی نہیں ہوتی۔ بچوں کی درسی کتابوں میں خواہ وہ اردو زباندانی کی ہوں یا تاریخ اور جغرافیے کی، ...نس کی ہوں، یا ریاضی کی مصنفین طلبہ کی استعداد قرأت کو ملحوظ رکھے بغیر عبارت آرائی کے شوق یا بچوں ...ذخیرۂ الفاظ میں اضافے کے جنون میں مشکل اور غیر مانوس الفاظ ٹھونستے چلے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ...تا ہے کہ عبارت گنجلک ہو جاتی ہے۔ کتابیں قاری کے فہم سے بلند ہو جاتی ہیں اور پھر یہ تنفر ایک ...غدی مرض کی طرح پورے عمل تعلیم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

اس نشست میں ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ کسی کتاب کے معیار قرأت سے کیا مراد ہے۔ ...ون سے عناصر اور عوامل ہیں جو کتابوں کے معیار قرأت کو متعین کرتے اور ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اور وہ کون سے طریقے ہیں جن سے ہم کسی کتاب کے معیارِ قراءت کو پرکھ سکتے ہیں۔

CARTER V. GOOD اپنی تصنیف "لغات التعلیم" میں "معیارِ قراءت" کی یوں تعریف کرتا ہے کہ اس سے مراد کسی پارے کی وہ صلاحیت ہے جو اسے قاری کے استعداد قراءت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔

WEBSTER کے نزدیک "معیارِ قراءت" سے مراد کسی کتاب یا ادب پارے کا قابلِ مطالعہ یا ناقابلِ فہم ہونا ہے اور اس کے مطابق کسی قابلِ مطالعہ کتاب میں ان تین خصوصیات کا پایا جانا نہایت ضروری ہے۔

(۱) خط صاف اور واضح ہو۔

(۲) کتاب اتنی دلچسپ اور خوش آئند ہو کہ اس کا پڑھنا قاری کے لیے بوجھ نہ ہو۔

(۳) جس استعداد کے قاری کے لیے لکھی گئی ہو اس کے لیے اس کا پڑھنا سہل ہو۔

گویا خوش خطی۔ دلچسپی اور سہولت قراءت کسی کتاب کے معیارِ قراءت کو متعین کرتے ہیں۔ کتاب کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہو۔ اگر اس کا خط صاف اور واضح نہ ہوگا تو قاری کے لیے اس کتاب کا پڑھنا مشکل ہوگا۔ اسی طرح اگر کتاب بہت عمدہ کتابت اور طباعت کی حامل ہو۔ لیکن اس کا مواد قاری کے ذوق، اس کے نظریات اور اس کی خواہشوں کی تسکین کا سامان فراہم نہیں کرتا تو اس کا پڑھنا بھی قاری کے لیے مشکل ہو جائے گا۔ اور اسی طرح موضوع اور مواد بھی دلچسپ ہو۔ کتابت بھی عمدہ ہو، لیکن الفاظ مشکل اور عبارت گنجلک ہو تو بھی ایسی کتاب قبولِ خاطر اور قابلِ فہم نہ ہوگی۔ گویا معیارِ قراءت صرف واضح خط، سہل زبانی یا دلچسپی سے عبارت نہیں۔ بلکہ معیارِ قراءت ان تینوں کے حسین امتزاج کا نام ہے ایک امریکی ماہرِ تعلیم George Spache معیارِ قراءت کو "ادراک پذیری" کا دوسرا نام سمجھتا ہے۔ اور اس کے نزدیک اس کا مفہوم کسی کتاب کا درجۂ اشکال (Difficulty level) ہے۔ ہر کتاب جو پڑھنے والے کی استعداد قراءت کے مطابق لکھی جائے گی وہ معیارِ قراءت کے لحاظ سے عمدہ اور معیاری کتاب سمجھی جائے گی اور اس کا درجۂ اشکال وہی ہوگا جو قاری کا درجۂ قراءت ہے۔

معیارِ قراءت پر اثر انداز ہونے والے عوامل

سب سے پہلا شخص جس نے اس موضوع کو اپنی توجہ اور مطالعے کا مرکز بنایا۔ وہ ایک روسی ماہرِ لسانیات RUBAKIN تھا۔ اس محقق نے روسی ادب اور روسی زبان کے مطالعے کے بعد یہ پتہ

چلایا کہ کسی کتاب کے معیارِ قراءت کو بڑھانے یا گھٹانے میں ان دو عناصر کا ہاتھ ہے۔

اول :- ناخواندہ اور غیر مانوس الفاظ UNFAMILIAR WORDS

دوم :- لمبے لمبے فقرے جبکہ وہ ایک کثیر تعداد میں ہوں

اس کے بعد شرمین SHERMAN ایک امریکی محقق نے RUBAKIN کے اس نظریے کی تائید کرتے ہوئے بتایا کہ جملے کا اختصار اور لمبائی علی الترتیب عبارت کی تسہیل اور اشکال پر منتج ہوتے ہیں یعنی جس عبارت میں جملے چھوٹے ہوں گے وہ زیادہ قابل فہم ہو گی۔ بہ نسبت اس عبارت کے جس کے جملے لمبے ہوں گے۔ ایک اور امریکی ماہر لسانیات KITTSON نے اس نظریے کو امریکی روزناموں اور رسالوں پر آزمایا اور اس نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ صرف جملوں کی لمبائی ہی عبارت کو مشکل نہیں بناتی بلکہ کثیر الحرفی مرکبات بھی معیارِ قراءت کو متاثر کرتے ہیں۔ اس میدان میں جن امریکی ماہر علم اللسان نے باقاعدہ علمی اور سائنسی انداز میں تحقیق کی ہے ان میں گرے (GRAY) اور لیری (LEARY) کا نام سرِفہرست آئے گا۔ ان کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ معیارِ قراءت صرف نامانوس الفاظ اور فقروں کی لمبائی سے عبارت نہیں بلکہ معیارِ قراءت پر اثر انداز ہونے والے یہ چار عناصر ہیں :-

(۱) موضوع (۲) اندازِ بیان (۳) فقروں کی بندش اور ساخت

(۴) کتاب کی ترتیب و تنظیم۔

RUTH STRANG نے اس موضوع پر تحقیق کرنے کے بعد انہی چاروں عوامل کی تائید کی۔ البتہ شائل اور انداز کو سرِفہرست رکھا اور موضوع کو جو GRAY اور LEARY کی تحقیق میں سرِفہرست تھا، دوسرا درجہ دیا۔ دو اور امریکی ماہرین تعلیم MORRIS اور HOLVERSON اسی موضوع پر کام کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ صرف الفاظ کا اشکال "معیارِ قراءت" کو متاثر نہیں کرتا۔ بلکہ اصل چیز ان کا محلِ استعمال ہے۔ ان محققین نے خیال ظاہر کیا کہ معیارِ قراءت کا تخمینہ لگاتے وقت ذخیرۂ الفاظ کو دو شعبوں میں تقسیم کر لینا چاہیے۔

(۱) ایسے الفاظ جو محض اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوئے ہوں۔ اور

(۲) ایسے الفاظ جو کسی پورے خیال کی ترجمانی کرتے ہوں اور سیاق و سباق میں ایسے معنی دیتے ہوں، جو

معنوں سے قدرے یا بالکل مختلف ہوں۔

کولمبیا یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کے سابق صدر IRVING LORGE کی تحقیق کے مطابق مشکل الفاظ اور جملے کی لمبائی صرف یہی دو بنیادی عناصر ہیں جو معیارِ قرات کو زیادہ تر متاثر کرتے ہیں۔ باقی عناصر بلاشبہ معیارِ قرات پر کسی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں لیکن ان کی حیثیت محض ضمنی یا اضافی ہے۔

علیٰ ہٰذالقیاس اس موضوع پر مختلف ماہرین لسانیات و محققین تعلیم نے کام کیا ہے اور ان سب کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کتابوں کے معیارِ قرات کو متاثر کرنے میں مندرجہ ذیل عوامل کارفرما ہیں۔

۱۔ فرہنگ :- (VOCABULARY LOAD) معیارِ قرات کو متاثر کرنے والے جملہ عناصر میں یہ عنصر سرفہرست آتا ہے۔ یہ ایک مسلم امر ہے کہ عبارت میں نئے یا غیر مانوس (UNFAMILIAR) الفاظ جس قدر زیادہ ہوں گے۔ اسی قدر عبارت کا پڑھنا مشکل ہو جائے گا اور اسی طرح جتنے مانوس الفاظ زیادہ ہوں گے عبارت سہل ہو گی۔ پڑھے ہوئے الفاظ کے اعادہ (تکرار) پر اسی لیے زور دیا جاتا ہے کہ اس سے معیارِ قرات یا درجۂ اشکال کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح چھوٹے الفاظ یعنی دو حرفی یا سہ حرفی مرکبات ہوں بالعموم بڑے الفاظ یعنی پنج حرفی یا شش حرفی مرکبات سے آسان ہوتے ہیں۔ عصر حاضر کے ایک مشہور امریکی محقق فلیش FLESCH لکھتے ہیں کہ یہ محض نامانوس الفاظ کا استعمال عبارت کی تفہیم پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ اصل چیز جو عبارت کے اشکال اور الجھاؤ کا باعث ہوتی ہے وہ مجرد اور غیر مقرون (ABSTRACT) الفاظ کا استعمال ہے۔ مقرون (CONCRETE) الفاظ خواہ نئے اور مشکل ہی کیوں نہ ہوں معیارِ قرات کو بہت زیادہ متاثر نہیں کرتے۔

۲۔ فقرے کی ساخت :- (SENTENCE STRUCTURE) دوسرا عنصر جو معیارِ قرات پر اثر انداز ہوتا ہے وہ فقروں کی بناوٹ ہے۔ فقرہ جس قدر لمبا ہو گا، عبارت اسی قدر مشکل ہو گی، ایسی عبارت جو سادہ اور مختصر جملوں پر مشتمل ہو گی اس عبارت سے یقیناً آسان سمجھی جائے گی جو مرکب اور پیچیدہ جملوں سے مل کر بنی ہو گی۔

۳۔ تخیل کی گہرائی :- (IDEA DENSITY) خیالات سادہ ہوں تو عبارت کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

لیکن جوں جوں خیالات پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں عبارت کی تفہیم مشکل ہوتی چلی جاتی ہے۔

۴۔ **دلچسپی:**۔ (INTEREST) اگر موضوع قاری کے ذوق کے مطابق ہو۔ اگر مصنف کا طرزِ بیان صاف اور واضح ہو۔ اگر وہ قاری کو بلاواسطہ مخاطب کر کے سمجھانے کے قابل ہو۔ اگر اس کی تحریر میں اسمائے ضمیر کثرت سے استعمال کیے گئے ہوں۔ اگر مصنف کی اپنی ذات کا عکس اس کی تحریر میں نمایاں نظر آتا ہو۔ اگر کہانی یا مضمون لکھنے والا قاری باتیں کرتا ہوا نظر آئے تو عبارت آپ سے آپ دلچسپ ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مکالمے اور عبارت کے وہ ٹکڑے جس میں متکلم کی بات کو بلاواسطہ (DIRECT SPEECH) بیان کر دیا گیا ہو۔ قاری کے لیے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں بہ نسبت بیانیہ مضامین کے۔ اس بارے میں امریکی خاتون (CHOLL) نے سچ کہا ہے۔

"ماہرین قرأت اور اساتذہ اس بات کا ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ قاری اگر کسی موضوع اور مضمون کے ساتھ غایت درجے کی دلچسپی رکھتا ہو تو وہ عبارت کے اشکال اور فقروں کی پیچیدہ تراکیب کی حدود توڑ کر بھی عبارت کے مفہوم کو پا لیتا ہے۔"

۵۔ **کتاب کی ماہیت، بناوٹ اور ترتیب:**۔ (FORMAT) کسی کتاب کی ظاہری شکل و صورت اس کی طباعت و کتابت، اس کی توضیحات و تصاویر اور اس کے اسباق کی ترتیب بھی عناصر یقیناً عبارت کی تفہیم میں سہولت پیدا کرتے ہیں اور کتاب کے معیار قرأت کو معتدل اور متوازن کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہال برٹ (HAL BERT) نے کئی کتابوں کے تجربے کے بعد یہ بات ثابت کی کہ مصوّر کہانی سے بچے سبق کی تفہیم میں مدد لیتے ہیں اور اس سے زیادہ تفصیلات اخذ کرتے ہیں۔ بہ نسبت ایک غیر مصوّر کہانی کی عبارت کے۔

۶۔ **مواد کی ترتیب** (ORGANIZATION) عبارت میں خیالات کی تنظیم اور جملوں کی ترتیب کا خیال رکھا جائے تو نہ صرف عبارت میں ایک حسن اور بانکپن پیدا ہو جاتا ہے۔ بلکہ ایسی عبارت سہل الفہم بھی ہو جاتی ہے۔ مواد کو عنوانات، ذیلی عنوانات اور پھر مزید چھوٹی چھوٹی سرخیوں میں تقسیم کرنے سے عبارت کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔ اور اس کا معیار قرأت اعتدال پر آ جاتا ہے۔ درسی کتابوں کے

مقابلے میں بعض خلاصوں اور گائیڈوں کی مقبولیت کا راز بھی اسی نکتے میں مضمر ہے کہ وہاں مواد کو اختصار کے ساتھ چھوٹی چھوٹی سرخیوں کے تحت دیا جاتا ہے۔ عبارتوں کی غلط اور مشکل ترتیب کے باعث اور لمبے اور نظر کو تھکا دینے والے پیروں کی وجہ سے بعض اوقات آسان الفاظ پر مشتمل عبارات بھی گنجلک ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مشکل الفاظ کو نکال کر محض آسان الفاظ لگا دینے سے عبارت کے "معیار قرات" میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جب تک کہ اس عبارت کے ڈھانچے اور اس کی پوری ترتیب کو نہ بدل دیا جائے عبارت کی تسہیل کا راز عبارت کی مجموعی ہیئت اور اس کی ترتیب میں ہے نہ کہ محض انفرادی لفظوں اور جملوں میں

معیار قرأت کو جانچنے کے طریقے : - اس نظریے سے عبارت کو جانچنا اور کتابوں کو پرکھنا کہ وہ کس سطح اور کس استعداد کے قاری کے لیے موزوں ہوں گی خاصا کٹھن کام ہے اور اس مشکل کام کو دو طریقوں سے سرانجام دیا جاتا ہے۔

۱- داخلی طریقہ :- (SUBJECTIVE MOTHOD)

۲- خارجی طریقہ :- (OBJECTIVE MOTHOD)

داخلی طریقہ : - معیار قرات کے بارے میں انسانی اندازے اور تخمینے جو محض پارکھ کی ذاتی رائے اور اس کی داخلی سوجھ بوجھ کے عکاس ہوں۔ داخلی طریقے کی صف میں شمار ہوتے ہیں۔ اس طریقے کی رو سے کتاب کو پرکھنے والا کتاب کا مطالعہ کرتا ہے۔ زبان و بیان کا جائزہ لیتا ہے۔ موضوع اور مطالب پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے اور اس سارے عمل کے بعد وہ کتاب کے "معیار قرات" کے بارے میں اپنی رائے دیدیتا ہے یہ اندازہ پارکھ کے ذاتی نظریات، اس کے مخصوص رجحانات اور مزاج سے ہمیشہ متاثر ہوتا ہے۔ اور اس طریقے میں وہ تمام خامیاں موجود ہیں جو انسانی مشاہدہ میں موجود ہو سکتی ہیں۔ اس طریقے سے حاصل کیے گئے "تخمینے" کو بالعموم قابل اعتماد نہیں سمجھا جاتا۔ اسی لیے ایک ہی کتاب پرکھنے کے لیے ایک سے زیادہ پارکھوں کے پاس بھیجی جاتی ہے اور یہاں بھی یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ناقدین کے مزاج، نظریات، خیالات اور مذاق میں اختلاف معیار قرات کی پیش گوئی میں بھی اختلاف کا باعث بنتا ہے۔ اور اکثر ان کے اندازوں میں ہم آہنگی اور توازن نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے تخمینوں میں

تا ماتفاوت ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مضمون کو ایک صاحب چھٹی کے معیار کا ٹھہراتے ہیں اور دوسرے صاحب دسویں کا۔ اس طریقے میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں اس قطعیت کا ہونا ممکن نہیں جو الجبرے کے کسی فارمولے میں پائی جاتی ہے۔ بعض ماہرین لسانیات اس طریقے کو زیادہ موثر اور معیار قراءت کی پیش گوئیوں کو زیادہ قابل اعتماد بنانے کے لیے ماہرین کے علاوہ معیار قراءت کا اندازہ اسی سطح کے طالب علم سے کرواتے ہیں جس کے لیے وہ کتاب لکھی گئی ہو۔ یعنی اگر وہ بچے اس کتاب کو پڑھ لیں اور اس کے اکثر و بیشتر حصص کے مفہوم کو سمجھ لیں تو کتاب کا معیار قراءت درست ورنہ غلط۔ اس طریقے سے پہلے طریقے کی خامیوں کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ یہ طریقہ بھی داخلی ہے۔ اور اس میں بھی ہر بچے کی ذاتی پسند ناپسند کو دخل ہوتا ہے۔ اس میں ایک خامی یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مضمون یا کتاب بچوں کے معیار قراءت سے پست ہو تو اس کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہو جاتا ہے اور پھر کم علمی اور کوتاہ مایگی کے باعث بچے زبان کی حسن و خوبی یا بیان کی عمدگی و ناپختگی کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طریقے کے بارے میں Hunnicut of Iverson کہتے ہیں۔

Until very recently, individual opinion has been the only appraisal mechanism available. Authors made estimates, librarians made estimates, and readers made estimates. And of course all were different.

خارجی طریقہ: ۔ یہ وہ طریقہ ہے جس میں پارکھ کی داخلیت اور اس کے ذاتی رجحانات اور مزاج کو بالکل دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ عبارت اس کے لفظوں اور جملوں کے شماریاتی تجزیے (STATISTICAL ANALYSIS) کے ذریعے کسی ادب پارے کے معیار قراءت کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس میں کسی کے تعصب یا انسان کو یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ معیار قراءت کے فیصلے پر اثر انداز ہو سکے بلکہ یہ ایک ایسا پیمانہ ہے جو اعداد و شمار کے بل بوتے پر چلتا اور ضرب و تقسیم کے سہارے آگے بڑھتا ہے ہماری زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کا معیار قراءت معلوم کرنے کا ابھی تک کوئی ایسا کلیہ ایجاد

ہیں کیا جا سکا جو انسانی اندازوں کی خامیوں کو دور کر سکے اور کتابوں کے معیار کے بارے میں زیادہ قطعی اور قابلِ اعتماد رائے دے سکے۔ لیکن انگریزی میں پچھلے تیس سالوں میں مسلسل تجربات اور پیہم تحقیق و جستجو کے بعد ماہرین نے ایسے کلیات (فارمولے) معلوم کیے ہیں جو بڑی کامیابی کے ساتھ کتابوں کے معیارِ قراءت پرکھتے اور ان کے درجۂ اشکال کے بارے میں پیش گوئی کرتے ہیں۔ امریکہ میں ایسے بیس پچیس کلیات وضع ہو چکے ہیں اور ان میں پانچ سات خاصے معروف اور قابلِ اعتماد حد تک کامیاب ہیں۔

معیارِ قراءت معلوم کرنے کا کلیہ اسی مفروضے پر کام کرتا ہے کہ عبارت میں جتنے زیادہ نئے الفاظ آئیں گے عبارت اتنی ہی مشکل ہو گی اور فقرے کی اوسط لمبائی جس قدر زیادہ ہو گی عبارت اتنی ہی معیارِ قراءت کے لحاظ سے اونچی ہو جائے گی۔ کلیے کے اطلاق کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کسی کتاب کے چند ایک نمونے بلا تخصیص (RANDAM SAMPLING) لے لیے جاتے ہیں۔ مثلاً کتاب کا ہر دسواں بیسواں اور تیسواں صفحہ انتخاب کر لیا جاتا ہے اور ہر صفحے پر اندازاً سو حرفوں میں سے فقروں کی تعداد گن لی جاتی ہے اور تمام نمونوں میں سے فقروں کی تعداد گننے کے بعد فقرے کی اوسط لمبائی معلوم کر لی جاتی ہے۔ پھر ایسے الفاظ شمار کیے جاتے ہیں جو طلبا کے لیے نئے یا غیر مانوس ہوتے ہیں۔ کونسا لفظ مانوس ہے اور کونسا غیر مانوس۔ اس کا فیصلہ بالعموم آسان الفاظ کی ایک معیاری فہرست کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ جو لفظ اس فہرست میں موجود ہو گا وہ مانوس اور جو لفظ اس فہرست سے باہر ہو گا وہ غیر مانوس۔ غیر مانوس الفاظ کی کل تعداد جو کتاب کے تمام نمونوں میں دستیاب ہوئی ہو جمع کر لی جاتی ہے اور پھر ایسے الفاظ کا تناسب فیصد معلوم کیا جاتا ہے جب یہ دو چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر ایک فارمولے کی مدد سے کتاب کا معیارِ قراءت معلوم کر لیا جاتا ہے۔ انگریزی میں بعض کلیے ایسے بھی ہیں جن میں محض مانوس اور غیر مانوس الفاظ کا تناسب ہی نہیں دیکھتے۔ بلکہ یہ بھی گنتے ہیں کہ اسمائے ضمیر کتنے ہیں اور حروفِ جار کتنے ہیں اور پھر ان دونوں کے غیر مانوس الفاظ کے تناسب فی صد اور فقرے کی اوسط لمبائی کے ساتھ ایک فارمولے کی شکل دے کر معیارِ قراءت معلوم کر لیتے ہیں۔

کلیات وضع کرنے سے پیشتر ماہرینِ لسانیات نے مختلف کتابوں اور جماعتوں پر تجربے کیے ہیں۔ کسی نے بچوں کی کتابوں پر کام کیا کسی نے بالغوں کے لٹریچر پر چنانچہ جو کلیات بالغوں کی کتب پر مرتب

کیے گئے ہیں۔ وہ بالغوں کے لٹریچر کا معیار قرارت معلوم کرنے میں زیادہ کامیاب ہیں۔ بہ نسبت بچوں کی کتابوں کے اور جو کلیات بچوں کی کتابوں پر مبنی ہیں وہ بالغوں کے ادب کا معیار قرارت معلوم کرنے میں شاذ و نادر ہی کامیاب ہیں۔

افادیت :۔ انگریزی میں رائج کلیات مختلف طریقوں اور آزمائشوں کے ذریعے اپنی صحت اور اعتماد (VALIDITY OF RELIABILITY) کے لحاظ سے آزمائے جا چکے ہیں۔ اور اکثر و بیشتر مواقع پر یہ صحیح اور قابل اعتماد نتائج دیتے ہیں۔ ان کی افادیت کا یہ عالم ہے کہ آج امریکہ کی تمام درسی اور اضافی کتابیں خواہ وہ زبانداں سے متعلق ہوں یا دیگر مضامین سے اشاعت سے قبل کسی ایک سے زیادہ معیاری کلیات کی کسوٹی پر آزمائی جاتی ہیں کہ ان کا معیار قرارت طلباء کے استعداد قرأت سے کسی حالت میں بھی بلند یا پست نہ ہو۔ اس لیے کہ دونوں صورتوں میں طلباء کا نقصان ہوتا ہے۔ مصنفین ناقدین، ناشرین اور اساتذہ سبھی کو ان پر بھروسہ اور اعتماد ہے۔ صنعت کاروں نے انہی کلیات کی مدد سے اپنی مصنوعات کو عوام کی استعداد قرارت کے مطابق آسان زبان میں مشتہر کرنا شروع کر دیا ہے اور اس سے ان کی فروخت کی شرح بڑھ گئی ہے۔ بڑے بڑے تاجروں اور کارخانہ داروں نے اپنے ملازمین کے ہدایت نامے اور روزمرہ کے استعمال کے فارم اور گشتی مراسلوں کو کلیات کی روشنی میں از سر نو مرتب کیا ہے: تاکہ کم پڑھے لکھے ملازمین ان سے پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ امریکہ میں جس قدر سرکاری گزٹ اشتہارات اور اطلاع نامے چھپتے ہیں وہ اشاعت سے قبل کسی کلیے کی مدد سے اپنے معیار قرارت کے لیے پرکھ لیے جاتے ہیں کہ عوام کے لیے ان کا سمجھنا مشکل نہ ہو۔ FLESCH کا فارمولا تو امریکہ میں اس قدر مقبول ہوا کہ اخبار نویسوں صحافیوں، ادارتی عملے والوں اور ماہوار رسالوں کے مدیروں اور فلم سازوں نے کا ہے گا ہے اپنے اداریوں اور دیگر تحریروں کو اسی فارمولے پر پرکھنا شروع کیا اور جب اپنے اخبارات اور جرائد کا معیار قرارت بلند پایا تو انہیں آسان کر دیا۔ اس سے انھیں یہ فائدہ ہوا کہ ان کے اخبارات عوام الناس میں زیادہ مقبول ہو گئے اور اس طرح ان کی اشاعت بڑھ گئی۔

کلیات کا صرف یہی فائدہ نہیں کہ وہ ہمارے معیار قرارت کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ بلکہ یہ کلیات ایسی راہوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں جن پر گامزن ہو کر ہم اپنے رسالوں اخباروں اور کتابوں کا معیار قرأت

ضرورت کے مطابق بلند یا پست کر سکتے ہیں۔

اختصار کے ساتھ کلیات کے مندرجہ ذیل فوائد گنوائے جا سکتے ہیں۔

نمبر۱ ان کی مدد سے مصنفین کو اپنی کتابوں پر نظرثانی کرنے میں مدد ملتی ہے

نمبر۲۔ ان کی روشنی میں ہم اپنی تحریروں کو زیادہ دلچسپ مقروں اور آسان بنا لیتے ہیں۔

نمبر۳۔ بعض کلیات کتابوں کے معیار قرأت کی پیش گوئی اس قطعیت سے کرتے ہیں کہ ہمیں یہ پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں کتاب فلاں درجے کے درمیانی یا آخری حصے میں زیادہ کامیابی سے پڑھائی جا سکتی ہے۔

مندرجہ بالا فوائد سے قطع نظر ان کلیات کی کچھ خامیاں بھی ہیں۔ اور جب تک یہ خامیاں دور نہ ہو جائیں کلیات پر سو فیصد اعتماد کرنا درست نہ ہوگا۔ مثلاً:-

(i) کلیات کتاب کے معیار قرأت کو جانچتے وقت اس کی ہیئت تصاویر، گراف، نقشے وغیرہ کو پیش نظر نہیں رکھتے۔

(ii) کلیات میں ابھی تک یہ صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی کہ انسانی دلچسپی کے عنصر کو ٹھیک ٹھیک ناپ سکیں صرف FLESCH کا کلیہ ایسا ہے جو انسانی دلچسپی (HUMAN INTEREST) کو ماپنے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کے بارے میں بھی ناقدین کا خیال ہے کہ وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہیں۔

(iii) کلیات عبارتوں کے ادبی عناصر تشبیہات و استعارات کو ٹھیک طرح سے نہیں ناپ سکتے۔

(iv) کلیات تحریروں کی بندش اور مواد کی ترتیب کو پرکھنے سے قاصر رہے ہیں۔

(v) ہر کلیہ ہر قسم کے مواد کو پرکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ مثلاً :- آرٹس کی کتابوں پر STANDARDIZE کیا ہوا) یعنی فارمولا سائنس کی کتابوں پر پوری طرح حاوی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح بچوں کی کتابوں کے لیے کلیات اور ہوں گے اور بڑوں کے لیے اور۔ کلیات صرف اتنا بتاتے ہیں کہ یہ کتاب اپنے معیار قرأت کے اعتبار سے فلاں درجے کے طالب علم کے لیے قابل فہم ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اس درجے پر پڑھنے والا ہر طالب علم اسے پڑھنا پسند کرے گا۔

لیکن جب ہم کلیات کی خوبیوں اور خامیوں کا تقابلی موازنہ کرتے ہیں تو ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کلیات کی افادیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ اور یہ کلیات یقیناً معیارِ قرأت کے بارے میں انسانی اندازوں کی خامیوں کو دور کر سکتے ہیں، البتہ داخلی اور خارجی دونوں طریقوں کے استعمال سے معیارِ قرأت معلوم کرنے کا کام اور بھی زیادہ عمدہ اور صحیح ہو جاتا ہے۔

آخر میں میں اِس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ گذارش کروں گا کہ ہمیں بھی اس شعبے میں کچھ کام کرنا چاہیے اور درسی کتابوں کا معیارِ قرأت جانچنے کے لیے کوئی فارمولا تیار کرنا چاہیے۔ بلاشبہ ایسے کام انفرادی کوششوں سے زیادہ اجتماعی کوششوں کے محتاج ہوا کرتے ہیں اور ایسے کاموں کے لیے پیہم تحقیق اور مسلسل تجربات کی ضرورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اِس تحقیق و تجسس میں جو محنت صرف ہوگی اور ہمیں جو ریاض کرنا ہوگا۔ اس کا پھل یقیناً بہت میٹھا اور رسیلا ہوگا۔

بچوں کی ضروریات

مس اے ایم حسین لیکچرار نفسیات سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور

یوم پیدائش سے لے کر موت تک انسان مستعد اور مصروف کار رہتا ہے۔ اس کا ہر فعل کسی مقصد پر مبنی ہوتا ہے۔ اس غرض اور مقصد کی تکمیل اس کی تسکین کا باعث ہوتی ہے۔ بچے کی بہت سی بنیادی ضروریات ہیں جو اس کے کردار کی تشریح کرتی ہیں۔

غیر مرئی پوشیدہ طاقت بچے کے خیالات، جذبات، رویہ اور کردار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا اظہار بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں ہوتا رہتا ہے۔ بچے کا ماحول یہ فیصلہ کرتا ہے کہ بچہ اپنی ان ضروریات اور خواہشات کی تکمیل کس حد تک اور کیسے کرتا ہے۔

بچپن میں بچے کی ضروریات بہت سادہ اور اس کی ذات ہی سے متعلق ہوتی ہیں۔ لیکن اس کی نشوونما اور بلوغت کے ساتھ ساتھ یہ ضروریات پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں اور تعداد میں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ یہ ضروریات ان مواقع اور حالات کے ساتھ پرورش پاتی ہیں جو بچے کو پیش آتے ہیں۔

ہمارے کردار میں تمام آرزوئیں بیک وقت عکس ریز ہوتی ہیں اور ہمارا کردار ہنگامی ضروریات کے مطابق متاثر ہوتا رہتا ہے

۱۔ طبعی ضروریات

ایک بچے کو ہمیشہ یہ آرزو اور جستجو رہتی ہے کہ اسے آرام و آسائش مہیا ہو، مسرت حاصل ہو اور وہ تکلیف سے بچ جائے۔ اسے جب بھوک لگتی ہے تو وہ روتا ہے۔ جب اسے کچھ کھانے کو مل جائے تو اطمینان ہو جاتا ہے۔

طبعی ضروریات یہ ہیں۔ بھوک پیاس سونا اور اپنی حفاظت

ان طبعی ضروریات کا انحصار سماجی تقاضوں پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بھوک کے لیے کھانا۔ لیکن جب بھوک محسوس ہو اس وقت کھانا، یا دن میں چار بار کھانا۔ میز پر بیٹھ کر کھانا، دسترخوان پر کھانا۔ ہاتھ یا چمچے اور کانٹے سے کھانا اس معاشرہ پر منحصر ہے جس میں بچہ پرورش پاتا ہے۔

پیار محبت کی ضرورت

ہر انسان کا پند ایک افراد کے ساتھ ضرور تعلق ہوتا ہے جس سے اسے خوشی اور تسکین ہوتی ہے۔ یہ رشتہ گھر اور خاندان مہیا کرتا ہے۔ ماں سے محبت یا ماں کی محبت بچے کے لیے سرچشمۂ طمانیت ہے بدقسمتی سے بعض حالات میں بچہ ماں کی شفقت سے محروم ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں وہ اس کمی کو استاد کی شفقت پا کر پورا کرتا ہے یا رشتہ داروں اور خدمتگاروں سے تسکین پاتا ہے۔

بچے میں محبت کی نشوونما ماں کی ذات سے ہوتی ہے۔ اس کی موجودگی میں اسے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے احساس تحفظ و عافیت اور جذبۂ خود یگانگی کو تقویت پہنچتی ہے۔

بچہ جلدی ہی یہ محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے کہ ماں کی محبت بھی اسے اس شرط پر ملتی ہے کہ وہ اس کی توقعات پر پورا اترے۔ مثال کے طور پر ماں بچے کو اجابت ضروریہ کی تربیت دینا شروع کرتی ہے۔ کہ وہ ہر جگہ کو گندا نہ کرے۔ اگر وہ یہ نہیں مانتا اور کبھی کبھی غلطی کر بیٹھتا ہے تو ماں ناراض ہو جاتی ہے اور کئی دفعہ کہہ دیتی ہے کہ اگر میرا کہا نہ مانو گے تو میں پیار نہیں کروں گی۔ بچہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ماں کی محبت اس کے چال چلن پر منحصر ہے۔ اگر یہ ماں اور بچے کی پہلی کشمکش زیادہ تشویش اور بدمزگی کے بغیر گذر جائے تو بچے کا ماں کی محبت پر اعتماد قائم رہتا ہے۔ لیکن اس بات کا احساس اسے شدت سے ہو جاتا ہے کہ اگر وہ بڑوں کے کہنے کے مطابق کام نہیں کرتا تو ان کی شفقت سے محروم ہو جاتا ہے۔

پیار محبت کی ضرورت کے ساتھ ساتھ مقبولیت کی ضرورت بھی متعلق ہے۔ کیونکہ بچہ چاہتا ہے کہ اسے پسند کیا جائے اور اس سے محبت کی جائے۔ یعنی اگر وہ کبھی غلطی کر بیٹھے تو غلطی قابل نفرت ہے وہ نہیں۔

گھر کے ماحول میں کشمکش کا موجب ایک نیا بھائی یا بہن کی آمد بھی ہوتی ہے۔ بڑا بچہ محسوس

کرتا ہے کہ اسے پیار نہیں کیا جا رہا۔ ماں یا باپ اُس سے ناراض ہیں اور نومولود کو اس پر ترجیح دیتے ہیں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ ماں باپ کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے اپنی نمائش کرتا ہے۔ ضد کرتا ہے۔ روتا دھوتا ہے۔

استاد اپنے دوران درس میں ان بنیادی ضرورتوں کو ملحوظ رکھ سکتا ہے کہ بچوں کو قبول کرے ان سے محبت کرے منصف ہو اور ان سے ہمدردی کا سلوک روا رکھے۔ اگر کوئی بچہ کمرۂ جماعت میں شرارت کرتا ہے یا بار بار جماعت اور استاد کو تنگ کرتا ہے تو اس کا علاج سزا دینا نہیں بلکہ بچہ کی بنیادی ضرورت کا پتہ لگانا اور اس کی جائز طریقے سے تکمیل کرنا ہے۔

۳۔ اپنے سے بڑوں کی پسندیدگی کی ضرورت

اپنے سے بڑوں کی پسندیدگی کی ضرورت کا اظہار عمر کی منزل میں ہوتا ہے۔ بچہ ماں کو خوش کرنے کے لیے سب کچھ کرتا ہے۔ ایک استاد ہیڈ ماسٹر کی خوشنودی کی خاطر خوب محنت کرتا ہے۔ ایک شہری پولیس کے سپاہی کے پاس سے اپنی کار نہایت سلیقہ سے گذارتا ہے۔ بچہ کی اصل بنیادی ضرورت کا پورا اس وقت اٹھایا جا سکتا ہے جبکہ ان توقعات کا احاطہ کر دیا جائے جو کہ اس بچہ کے متعلق ہیں اور پھر ان کی تاکید کی جائے اور دیکھا جائے کہ بچہ ان پر عمل کرتا ہے۔

بچہ یہ بچپن ہی سے سیکھنا شروع کر دیتا ہے کہ جب وہ گھر کی چار دیواری کا چکر لگاتا ہے تو کئی ایک چیزوں کو ہاتھ لگانا یا چھونا منع ہے اور آہستہ آہستہ وہ اپنے عمل کو دوسروں کے مطابق کر لیتا ہے۔ کئی دفعہ وہ بغاوت بھی کرتا ہے۔ اگر اسے کامیابی ہو تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ بڑوں کے حکم کی تعمیل ہر حال میں ضروری نہیں۔ اگر پکڑا جائے تو پھر اپنی رائے بدل لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بڑوں کی حکم عدولی اچھی نہیں۔

یہاں پر یہ کہنا ضروری ہے کہ بچہ کو ہر کام "ڈر" کی وجہ سے نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اسے یہ سمجھ آ جائے کہ اس کے کرنے سے کیا تکلیف ہوگی یا خوشی حاصل ہوگی۔ مثلاً اگر بچے سے یہ کہیں کہ چاقو سے نہ کھیلو تو اس کے لیے کچھ معنے نہیں رکھتا۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اس سے انگلی کٹ جائے گی، اس میں خون

اور دنہ وہ گا تو وہ چاقو کو استعمال نہ کرے گا۔

بچے کو ہمیشہ یہ شوق ہوتا ہے کہ دیکھنے والے اُسے سراہیں وہ پہلا قدم اٹھاتا ہے تو سب کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر "شاباش" اور "بہت اچھا" اور مسکراہٹوں سے اس کی ہمت افزائی ہو تو وہ خوش خوش اور احتیاط سے قدم اٹھاتا ہے۔ حتیٰ کہ چلنا سیکھ لیتا ہے۔ سراہنے کے ساتھ ایک کام کو کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانا بھی وابستہ ہے۔

اگر ایک بچہ سیدھی طرح سے اپنی تعریف نہیں کروا سکتا تو وہ دوسرے راستے اختیار کرتا ہے وہ نشانہ باز بن جاتا ہے۔ بعض بچوں کو آسانی سے یہ خوشی میسر آجاتی ہے کہ سب اس کی تعریف کریں۔ اس کے اس کے برعکس ایسے بچے بھی ہوتے ہیں جو اپنی تعریف سننے کے بھوکے ہوتے ہیں۔ استاد ان کی بہت مدد کرسکتا ہے اگر یہ پتہ لگالے کہ بچے کی کس طرح تعریف کی جائے۔ تعریف کا صحیح استعمال شرط ہے۔ ورنہ یہ بےمعنی ہو جائیگی۔

تعلیم اور تدریس میں کامیابی حاصل کرنے کی ضرورت استاد کی بڑی معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ بچہ اگر اس کام میں کامیابی حاصل کرلیتا ہے تو اس کی حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے۔ اگر استاد بچے کو اس کی ذہنی استعداد کے مطابق کام دے تو وہ ناکامی کے احساس سے بچ سکتا ہے۔ جو استاد صرف "ناکامی" پر زور دیتا ہے وہ بچوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ ناکامی جراءت اقدام کو شل کر دیتی ہے۔ تدریس میں بچوں کے انفرادی تقاضوں کو مدنظر رکھا جائے۔

۷۔ اپنے ساتھیوں کی پسندیدگی کی ضرورت

بچہ بچپن ہی سے یہ سیکھ لیتا ہے کہ اس کی خوشی میں اس کے ساتھیوں کی پسندیدگی بہت ضروری ہے ورنہ اسے تکلیف اٹھانا پڑے گی۔ کھیل کے لیے اگر ساتھی نہ ہو یا اگر ساتھی اسے کھیل میں شریک نہ کریں تو زندگی کا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ اس کے لیے اپنے گروہ کے ساتھ وابستگی کا احساس بہت ضروری ہے۔ ہر بچے کا اپنے گروہ میں ایک مقام ہوتا ہے۔ مقام اسی طرح تعین ہوتا ہے اور ہر گروہ ایک نمونہ قائم کرلیتا ہے جسے گروہ کا ہر ممبر اپنا لیتا ہے۔ اگر اس گروہ میں مضبوط ہونا۔ نڈر ہونا۔ نشانہ لگانا ہی خوبی ہے تو بچہ بھی خوبیاں پیدا کرے گا۔

استاد ہر بچے کو اس کے گروہ سے متعارف کراتا ہے۔ اگر جماعت میں استاد بچہ کا مضحکہ اڑاتا ہے تو اس کا گروہ بھی اس کا مضحکہ اڑائے گا۔ اگر استاد اس کی خوبیاں جماعت میں بیان کرتا ہے تو گویا وہ اس بچے کا معاشرتی مقام متعین کر دیتا ہے۔

۵۔ آزادی حاصل کرنے کی ضرورت

ہر بچہ کسی نہ کسی وقت ایک ذمہ دار شخص ہوگا۔ معاشرہ بھی توقع رکھتا ہے کہ وہ قابل اعتماد فرد بنے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ معاشرہ یہ بھی توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کے قوانین کے مطابق پرورش پائے۔ اس کی تربیت بچہ کو شروع ہی سے ملتی ہے۔ آزادی حاصل کرنے کی ضرورت بچہ شروع ہی سے ظاہر کرتا ہے۔ ذرا بڑا ہوتا ہے تو اپنے تسمے خود باندھنا چاہتا ہے۔ کپڑے خود پہننا چاہتا ہے۔ اسے اس کی اجازت ہونی چاہیے۔

اُسے اپنی مرضی کے کھیل پسند کرنے اور اپنا وقت اپنی دلچسپی کے مطابق گذارنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔

بچے کو نئی اور انوکھی قسم کے کام کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ اسکول میں اس کی یہ بنیادی ضرورت بہت آسانی سے پوری ہو سکتی ہے۔ تصویروں کے ذریعے سبق پڑھانا اور کھیل کھلانا بچے کی خوشی کا باعث ہوتے ہیں۔

۶۔ ذاتی احترام کی تمنّا

ہر بچہ چاہتا ہے کہ اسے "اچھا بچہ" سمجھا جائے۔ اس کی قدر کی جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ماں باپ اور اُستاد اس کے کردار کا تجزیہ کرتے اور اسے قابل قدر بناتے رہیں۔ اس طرح وہ اُن کے معیار پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس کا کام پسند کیا جاتا ہے اور اس کی تعریف کی جاتی ہے تو ایسا کرنا ہی اس کا نصب العین ہو جاتا ہے۔

بچے کی ان بنیادی ضرورتوں کو سمجھ کر درس دینا زیادہ موثر ہو سکتا ہے ؟

ہجری کیلنڈر

شمشاد محمد لودھی لیکچرر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور

۱- وقت کے وقفے

انسان نے اپنی زندگی کو باقاعدہ بنانے کے لیے وقت کو برسوں، مہینوں، ہفتوں، دنوں، گھنٹوں منٹوں اور سیکنڈوں وغیرہ میں تقسیم کر لیا ہے۔ وقت کو وقفوں میں تقسیم کرنے کا یہ طریقہ کیلنڈر[1] (تقویم) کہلاتا ہے۔

وقت کے یہ وقفے دو قسم کے ہیں :-

(i) قدرتی وقفے (ii) بناوٹی وقفے

(i) قدرتی وقفے سیاروں مثلاً چاند اور زمین کی گردشوں کی میعاد پر منحصر ہیں۔ چناں چہ دنیا میں مندرجہ ذیل تین قسم کے قدرتی وقفے رائج ہیں۔

(۱) زمین کا اپنے محور کے گرد ایک چکر کاٹنے کا وقفہ جسے ہم دن کہتے ہیں

(۲) چاند کا زمین کے گرد ایک چکر لگانے کا وقفہ جس کو قمری مہینہ کہا جاتا ہے۔

(۳) زمین کے سورج کے گرد ایک چکر گھوم جانے کا وقفہ جو شمسی سال کہلاتا ہے۔

(ii) قدرتی وقفے مہذب زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ناکافی ہیں، اس لیے ان قدرتی وقفوں کو ہفتوں، پہروں، گھنٹوں، منٹوں اور سیکنڈوں وغیرہ کے بناوٹی وقفوں میں تقسیم کر لیا گیا ہے۔

---

[1] کیلنڈر لاطینی زبان کے لفظ کیلنڈز سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں وقت کو وقفوں میں تقسیم کرنا

۲۔ کیلنڈر کی قسمیں

ہر قوم نے اپنے اپنے عروج کے زمانے میں اپنا اپنا کیلنڈر ایجاد کیا۔ جن میں سے بعض کے نام تاریخ کے صفحات سے غائب ہو چکے ہیں۔ پھر بھی آج کل دنیا میں کئی قسم کے کیلنڈر موجود ہیں مثلاً :- رومن کیلنڈر، عبرانی کیلنڈر، فرانسیسی کیلنڈر، عیسوی کیلنڈر، ہجری کیلنڈر، بکرمی کیلنڈر۔

دنیا کے بیشتر ملکوں کی طرح ہمارے ملک میں بھی عیسوی کیلنڈر رائج ہے۔ لیکن پاکستان کی آبادی کا بڑا حصہ مسلمان ہے اور مسلمانوں کے تہوار ہجری کیلنڈر کے مطابق منائے جاتے ہیں۔ چنانچہ پیشِ نظر مضمون میں ہجری کیلنڈر ہی سے تفصیلی بحث مقصود ہے تاہم یہاں سال میں مہینوں اور دنوں کی تعداد کی تاریخ کا مطالعہ دلچسپ اور مفید مطلب ہوگا [illegible] کو لیتے ہیں۔

۳۔ سال میں دنوں کی تعداد

قدیم تہذیبوں میں یونانی تہذیب کا درجہ بہت اونچا ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے انھیں کو باقاعدہ کیلنڈر رکھنے کا خیال آیا اور انھوں نے نیا چاند نکلنے سے دوسرے تک کو ایک مہینہ [illegible] ۱۲ مہینوں کو یا ۳۵۴ دنوں کو ایک سال قرار دیا۔ لیکن بعض [illegible] یا کبھی ہوتا کہ چاند [illegible] آسمان پر بادل چھا جاتے اور چاند نظر نہ آتا۔ اس لیے انھوں نے اپنے مہینوں کا حساب [illegible] اور ۲۹ دن کا شمار کرنا شروع کر دیا۔

یونانیوں کے بعد رومیوں نے عروج حاصل کیا اور انھوں نے سال میں دنوں کی تعداد ۳۵۴ کی بجائے ۳۵۵[1] اور سال میں مہینوں کی تعداد ۱۲ کی بجائے [illegible] شمار کرنا شروع کر دی۔ لیکن چند سال کے بعد انھوں نے دوبارہ سال کے ۱۲ مہینے بنا لیے۔ رومی قدیم رومی کیلنڈر کے مہینوں میں دنوں کی تعداد مندرجہ ذیل تھی۔

۲۹، ۲۸، ۳۱، ۲۹، [illegible]، ۳۱، ۲۹، ۳۱، [illegible]، ۲۹، ۲۷، ۲۹، ۲۹

آج سے دو ہزار برس پہلے قیصر روم جولیس سیزر نے [illegible] رومی کیلنڈر کے مطابق موسم

---

[1] رومی طاق عدد کو اچھا سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے سال میں [illegible] ۳۵۵ دن شمار کرنا شروع کیے تھے۔

بہار کے تہوار سخت گرمی میں آتے ہیں۔ نیز فصلوں کا مالیہ وصول کرنے کے لیے کوئی مہینہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ چناں چہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ۴۷ سال پہلے جولیس سیزر نے شمسی کیلنڈر ایجاد کیا۔ جسے جولین کیلنڈر کہتے ہیں اور جو آج کل روس میں رائج ہے۔ اِس میں عام سال ۳۶۵ دن اور ہر چوتھا سال ۳۶۶ دن کا مانا گیا تھا۔ زمین کے سورج کے گرد چکر اور سال میں دنوں کی تعداد کو ایک دوسرے کے مطابق بنانے کے لیے اس وقت کے سال رواں کو ۴۴۵ دن کا شمار کیا گیا۔ جولیس سیزر نے آدھے سال کے بعد آنے والے مہینے کو اپنے نام پر جولائی کہلوانا شروع کیا۔ نیز دنوں کی تعداد باری باری ۳۱ اور ۳۰ رکھی البتہ فروری کا مہینہ عام سال میں ۲۹ اور لیپ سال میں ۳۰ دن کا شمار کرایا۔

۸ سال قبل از مسیح شہنشاہ آگستائن نے لگاتار ۱۲ سال تک لیپ کا سال شمار نہیں ہونے دیا۔ علاوہ ازیں اس نے جولائی کے بعد آنے والے مہینے کا نام آگسٹس (یا اگست) رکھا۔ اور اگست کو ۳۱ دن کا شمار کر کے ایک دن فروری میں سے کم کرا دیا۔ لیکن اِس طرح جولائی اگست اور ستمبر تین مہینے لگاتار ۳۱ دن کے بنتے تھے۔ اس لیے آگستائن نے اگست کے بعد آنے والے ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر کے مہینے ترتیب وار ۳۰، ۳۱، ۳۰، ۳۱ دن کے شمار کروائے۔

۴۔ ہجری کیلنڈر

۱۶ ستمبر ۶۲۲ء کو پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمانوں کو ساتھ لے کر مکہ سے مدینہ پہنچنا تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ مسلمانوں نے اِس واقعہ سے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا اور وہ ایک نئے کیلنڈر کے موجد بنے۔ چناں چہ آئندہ سے انھوں نے اپنی تاریخوں کا حساب ہجرت کے اِس یادگار سال سے کرنا شروع کر دیا۔ اب چونکہ عربی کیلنڈر کا یہ سال جولین کیلنڈر کے لحاظ سے ۱۶ جولائی ۶۲۲ء کو شروع ہوتا تھا۔ اس لیے مسلمانوں نے عربی سال کی مطابقت کے سبب ۱۶ جولائی ۶۲۲ء (بروز جمعرات) یکم محرم ۱ھ شمار کیا۔

یاد رہے کہ گریگیرین کیلنڈر کے مطابق (جوں کہ ۳ دن بڑھائے گئے تھے) یکم محرم ۱ھ کو ۱۹ جولائی ۶۲۲ء تھی۔

ہجری کیلنڈر کے سال قمری ہیں یعنی ایک سال میں ۱۲ قمری مہینے ہوتے ہیں۔ چناں چہ ہر نیا چاند نیا مہینہ لاتا ہے۔ اب چوں کہ نیا چاند کبھی ۲۹ دن بعد نمودار ہوتا ہے اور کبھی ۳۰ دن بعد اس لیے ہجری کیلنڈر کے مہینے ۲۹ اور ۳۰ دن کے ہوتے ہیں۔

مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ چاند زمین کے گرد ۲۹ دن ۱۲ گھنٹے ۴۴ منٹ ۲٫۸۷ سیکنڈ میں ایک چکر پورا کرتا ہے۔ اس حساب سے ایک سال میں ۳۵۴ دن ۸ گھنٹے ۴۸ منٹ ۳۴٫۴۴ سیکنڈ ہوئے۔ چناں چہ قمری مہینوں کو محرم سے شروع کرکے باری باری ۳۰ اور ۲۹ دن کا شمار کیا جاتا ہے لیکن اس طرح ایک سال میں ۸ گھنٹے ۴۸ منٹ ۳۴٫۴۴ سیکنڈ کی کمی رہ جاتی ہے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ۳۰ قمری سالوں میں ۱۱ لیپ سال لیے جاتے ہیں جن میں عیدالاضحیٰ (جو عام سال میں ۲۹ دن کا ہوتا ہے) ۳۰ دن کا شمار ہوتا ہے ——— کسی ہجری سال کے متعلق یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ لیپ سال ہے یا نہیں اس کو ۳۰ پر تقسیم کرتے ہیں۔ اگر باقی ۲، ۵، ۷، ۱۰، ۱۳، ۱۶، ۱۸، ۲۱، ۲۴، ۲۶، ۲۹ بچیں تو لیپ سال ہوگا ورنہ نہیں۔ یاد رہے کہ چاند رات کو اگر آسمان پر بادل چھا جائیں تو اکثر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ چاند نہیں نکلا۔

۵۔ ہفتے کے دن

ہم جانتے ہیں کہ ہفتے میں ۷ دن ہوتے ہیں۔ چناں چہ کسی مہینے کی یکم، ۸، ۱۵، ۲۲ اور ۲۹ تاریخوں کو ہفتہ کا ایک ہی دن ہوتا ہے اور اسی طرح کسی مہینے کی ۲، ۹، ۱۶، ۲۳، اور ۳۰، تاریخوں کو بھی ہفتہ کا ایک ہی دن ہوگا۔ چناں چہ اگر یکم رجب کو اتوار کا دن ہو تو ۱۷ رجب کو ۲ ہفتے اور ۲ دن گذر جانے کے بعد اتوار سے ۲ دن بعد والا دن یعنی منگل ہوگا۔

مثال:- اگر کسی سال ۸ شوال کو ہفتہ ہو تو اسی سال ۲۶ ذوالحجہ کو کیا دن ہوگا؟

۸ شوال سے ۲۶ ذوالحجہ تک گذریں گے ۶۸ دن ۹ ہفتے ۵ دن	شوال	۱۲
	ذیقعد	۳۰
۲۶ ذوالحجہ کو ہفتے سے ۵ دن بعد والا یعنی جمعرات کا دن ہوگا۔	ذوالحجہ	۲۶
		۶۸

۷) ۶۸ (۹ - ۵

۴ ۔ ہجری سن کی کسی تاریخ کو دن معلوم کرنا

چوں کہ { ۳۵۴ دن = ۵۰ ہفتے ۴ دن
۳۵۵ دن = ۵۰ ہفتے ۵ دن

اس لیے { ۳۵۴ دن گذرنے سے پورے ہفتوں سے ۴ دن بڑھتے ہیں۔
۳۵۵ دن گذرنے سے پورے ہفتوں سے ۵ دن بڑھتے ہیں۔

گویا پورا ایک سال گذرنے سے کسی تاریخ کو گذشتہ سال اسی تاریخ کے دن سے

(۱) عام سال کی صورت میں ۴ دن بعد والا دن ہوتا ہے اور

(۲) لیپ سال کی صورت میں ۵ دن بعد والا دن ہوتا ہے۔

مثلاً { اگر کسی سال ۵ ربیع الاول کو بدھ ہو۔
تو عام سال گذرنے کے ۵ ربیع الاول کو اتوار ہو گا۔

اور { اگر کسی سال ۷ شعبان کو جمعہ ہو
تو لیپ سال گذرنے کے بعد ۷ شعبان کو بدھ ہو گا

اسی طرح اگر ہمیں کسی خاص تاریخ کو ہفتہ کا دن معلوم ہو اور ہم کسی طرح یہ پتہ چلا سکیں کہ کسی دوسری تاریخ تک پورے ہفتے گذرنے کے بعد کتنے دن بڑھ جائیں گے تو ہم اس دوسری تاریخ کو ہفتہ کا دن معلوم کر سکتے ہیں۔

اب چوں کہ ہم جانتے ہیں کہ یکم محرم ۱ھ کو جمعرات تھی اس لیے کسی تاریخ کو

اگر پورے ہفتوں سے	کوئی	دن	زیادہ نہ ہو	تو وہ	جمعرات	کا دن	ہو گا
〃	ایک	〃	〃 ہو	〃	جمعہ	〃	〃
〃	۲	〃	〃 〃	〃	ہفتہ	〃	〃
〃	۳	〃	〃 〃	〃	اتوار	〃	〃
〃	۴	〃	〃 〃	〃	پیر	〃	〃
〃	۵	〃	〃 〃	〃	منگل	〃	〃
〃	۶	〃	〃 〃	〃	بدھ	〃	〃

چوں کہ عام سال میں پورے ہفتوں سے ۴ دن زائد ہوں گے۔ اس لیے :-

(i) ۳۰ سال میں پورے ہفتوں سے ۵ دن زائد ہوں گے۔

{ ۴ دن فی سال + ۱۱ دن لیپ سالوں کے
= ۳۰ × ۴ + ۱۱ = ۱۳۱ دن = ۱۸ ہفتے ۵ دن }

(ii) اسی حساب سے ۶۰ سال میں پورے ہفتوں سے (۲×۵ = ۱۰ = ۷+۳) ۳ دن زائد ہوں گے اور

(iii) ۹۰، ۱۲۰، ۱۵۰، ۱۸۰ سالوں میں بالترتیب پورے ہفتوں سے ۱ دن ۶ دن، ۴ دن ۲ دن زائد ہوں گے۔ نیز

(iii) ۲۱۰ سال میں پورے ہفتوں سے کوئی دن زائد نہیں ہوگا۔

پس ہجری سن کی کسی تاریخ کو دن نکالتے وقت

(۱) ۲۱۰ سالوں کے دور

(۲) باقی سالوں میں ۳۰ سالوں کے دور

(۳) باقی سالوں

(۴) سال رواں

میں پورے ہفتوں سے زائد دن لے کر جمع کرتے ہیں

مثال :- ۲۶ رمضان ۱۳۷۰ھ کو ہفتہ کا کونسا دن تھا؟

۲۶ رمضان ۱۳۷۰ھ تک یکم محرم ۱ھ سے شروع کرکے ۱۳۶۹ سال اور یکم محرم ۱۳۷۰ھ سے ۲۶ رمضان ۱۳۷۰ھ تک کے دن گذر چکے ہیں:-

۱۳۶۹ = ۲۱۰ × ۶ + ۳۰ × ۳ + ۱۹

= ۱۲۶۰ + ۹۰ + ۱۹

۱۲۶۰ سالوں میں پورے ہفتوں سے زائد دن = ۰ دن	۱۵ ÷ ۷ = ۲ − ۱
۹۰ 〃 〃 〃 〃 = ۱ دن	۷۶ + ۷ = ۸۳
۱۹ 〃 〃 〃 〃 = ۶ دن	۸۳ ÷ ۷ = ۱۱ − ۶
۱۳۷۰ھ 〃 〃 〃 〃 = ۳ دن	

= ۱۰ دن = ایک ہفتہ ۳ دن

محرم - صفر - ربیع الاول - ربیع الثانی - جمادی الاول - جمادی الثانی - رجب - شعبان - رمضان -

۲ + ۱ + ۲ + ۱ + ۲ + ۱ + ۲ + ۱ + ۲۶ = ۳۸

پس ۲۶ رمضان ۱۳۷۰ھ کو

۳۸ ÷ ۷ = ۵ − ۳

بدھ سے ۳ دن آگے والا دن یعنی ہفتہ کا دن ہوگا

۷. اختتامیہ

اگرچہ رُویت ہلال کی یہ بے قاعدگی کہ کسی مقام پر نظر آنا اور کسی مقام پر مطلع ابر آلود کی نظر ہو جانا ظاہر کوئی ایسا کلیہ معلوم کرنے کی کوشش سے متصادم ہے جو قطعیت کے ساتھ تاریخ رویت کی تعیین کر سکے۔ تاہم مندرجہ بالا طریق جو سن عیسوی کی کسی معلومہ تاریخ کو ہفتہ کا دن معلوم کرنے کے طریقے کی مطابقت میں سن ہجری کی تحقیق کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ مناسب ترمیمات کے بعد بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ مذکورہ صدر فارمولے کی رُو سے ایک سال میں محض ۴۴ ء ۳۴ سیکنڈ کا فرق رہ جاتا ہے جو ۲۵۰۸ سال میں پورے ایک دن کی کمی کو ظاہر کرے گا اور یہ ایک سال کا فرق (لیپ کے سال کی طرح) باحسن الوجوہ محسوب ہو سکتا ہے اور ملحوظ رکھا جا سکتا ہے ؎

اِصلاحِ انشاء

سیّد کوثر حسین لیکچرر سینئر ماڈل ٹریننگ کالج لاہور

مدرسے میں تحریری کام کی اصلاح پر جس قدر زور دیا جائے کم ہے۔ کیونکہ اصلاح میں تساہل برتنا غلط نویسی کی تربیت دینے کے مترادف ہے۔ اس طرح غلط نویسی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور آگے چل کر معلم و متعلم دونوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

عام طریقۂ اِصلاح

اس میں شک نہیں کہ تحریری انشاء کی تصحیح آسان کام نہیں۔ اس میں محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور صرف محنت سے بھی خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ عام طور پر معلم اپنے خالی وقت میں جماعت کی کاپیوں کا گٹھڑ لے کر بیٹھتا ہے اور رنگین پنسل یا سرخ روشنائی سے بچوں کے مضامین کی کاپیاں سرخ کر دیتا ہے۔ اسے پوری پوری سطریں یا بعض جملے کے جملے بدل ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ معلم (بشرطیکہ وہ اصولِ تعلیم سے ناواقف ہو) یہ سب کچھ کرتا ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر اسے آئندہ بھی ہر مرتبہ ایسا کرنا پڑتا ہے۔ یعنی وہی کاٹ چھانٹ۔ چھانٹ سے کاٹ کہنا چاہیے کیونکہ "چھانٹ" کی گنجائش ذرا کم ہی نکلتی ہے۔ دراصل اسی قسم کی اصلاح سے بچوں کی استعداد میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی قلمی کوششوں کا یہ حسرت ناک حشر دیکھ کر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور آئندہ مضمون لکھنے سے ہول کھانے لگتے ہیں۔ آخر میں خود معلم بھی اس طرح کی اصلاح سے جی چراتا اور اپنی عافیت کی خیر مناتا ہے۔ وہ مضامین کی تعداد ہی پوری کرنے کے لیے کبھی کوئی مضمون لکھوا دیتا ہے۔ غرض اصلاح کے اس طریق سے مضمون نویسی کی تربیت تو کیا ہو سکتی ہے۔ البتہ اس میں بچوں کے ضبط و تحمل کا سخت امتحان اور معلم کے کفارۂ گناہ کا اچھا خاصہ سامان ہے۔ تھوڑی بہت خوش فہمی جو اس اصلاح سے وابستہ

ہو سکتی ہے وہ اِس کے "فرصتِ طلب" انداز کو دیکھ کر بالکل ختم ہو جاتی ہے کیوں کہ یہ عظیم الشان کام فرصت میں چھٹی کے دن ہی انجام پا سکتا ہے اور اس طرح مضمون نویسی اور تصحیح کے درمیان کافی زمانہ گذر جاتا ہے۔ حالاں کہ غلطی کی اصلاح جلد از جلد اور طالب علم کے سامنے ہونی چاہیے۔ اصلاح کے بعد اصلاح کی مشق کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس قسم کی اصلاح کے بعد مشق کی افادیت بھی ختم ہو جاتی ہے طلباء معلم کی اصلاح کے نام سے بنائی ہوئی عبارت کو ایک بار اپنے ہاتھ سے لکھ لیتے ہیں جس سے درحقیقت کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مشق کا فائدہ اس وقت ہے جب غلط اور صحیح الفاظ و تراکیب کا صحیح مطالعہ ہو سکے مگر اس کا یہاں کوئی امکان نہیں رہتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی مضمون میں چند غلطیاں ہوں تو معلم آسانی سے بلکہ بچے کے سامنے ہی اصلاح کے کام سے عہدہ برا ہو سکتا ہے۔ اور بچہ اسے سمجھ کر یاد رکھ سکتا ہے۔ مگر بے شمار غلطیوں کی اصلاح کرنا معلم کیلئے ممکن ہو تو ہو اس کا سمجھنا اور یاد رکھنا بچے کے بس کی بات نہیں۔ ایسی اصلاح میں معلم کی دیانت غیر مشتبہ سہی مگر اس کی صلاحیت کا دیرضرور حرف آتا ہے۔ معلم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ غلطیوں کی اصلاح کرے۔ بلکہ وہ بچوں کو غلطی کرنے سے باز رکھے۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ معلم اپنے حسنِ تدبیر یا مہارتِ فن سے تحریری کام کے آغاز ہی میں، اغلاط کے بیشتر امکانات کا سدِ باب کر دے۔ گویا اصلاحِ اغلاط سے پہلے امتناعِ اغلاط کے اقدامات ضروری ہیں۔

امتناعِ اغلاط

امتناعِ اغلاط کی تدابیر، انشاء پردازی کی عملی مشق سے پہلے، یعنی بچوں کے لکھنا شروع کرنے سے قبل، بروئے کار لائی جاتی ہیں اور اس میں نفسِ مضمون و ہیئتِ مضمون ہر دو پر توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ نفسِ مضمون کی خاطر معلم کو چاہیے کہ مسلسل اور مربوط سوالات کرے جن کے جوابات سے مضمون کی تعیین اور حد بندی ہو جائے اس عمل کو مدرسی اصطلاح میں زبانی یا تقریری انشاء کہا جاتا ہے۔ اس کی بدولت بچے اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں کہ کس چیز کے متعلق لکھنا ہے۔ اور کیا کیا لکھنا ہے۔ معلم کے پہلے سے سوچے ہوئے سوالات بچوں کے ذہن میں، خیالات کی تخلیق کرتے ہیں۔ بلکہ اظہار کا اندازہ بھی متعین کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ معلم بچوں کے

زبانی جوابات میں زبان و بیان کی تمام غلطیاں دور کر دیتا ہے اور تکرار انگیز بعقو راز از سوالات کے ذریعہ ضروری مواد تحریر اخذ کر لیتا ہے۔

اگرچہ اس زبانی انشا سے تحریری کام بہت کچھ سہل ہو جاتا ہے۔ لیکن چھوٹی جماعتوں میں اور بالخصوص انشا کی ابتدائی مشقوں میں صرف زبانی انشا پر تکیہ کرنا کافی نہیں۔ چارٹ کی صورت میں ایک تحریری نمونہ بھی دکھانا چاہیے تاکہ بچے مضمون کی ہیئت یا صورت سے واقف ہو جائیں۔ لیکن انہیں بالکل اسی طرح لکھنے کی تاکید ضروری نہیں کیونکہ وہ غیر شعوری طور پر اسی نمونے کی تقلید کریں گے۔ یہ تحریری نمونہ جماعت کے سامنے کسی بچے سے پڑھ کر سنایا جائے۔ عنوان کی نشان دہی اور مضمون کی پیراگراف بندی کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے اگر تحریری انشا کسی خاص صنف مثلاً مراسلہ نویسی سے متعلق ہو تو مراسلے کے اجزا کا صحیح مقام بتایا جائے۔ بلکہ لفافہ اور پوسٹ کارڈ دکھا کر ان کے طریقِ استعمال پر سوالوں کے ذریعے روشنی ڈالی جائے۔ اس کے بعد تحریر کی نوبت آئے۔ مگر تحریری نمونہ ایسا معیاری ہونا چاہیے جو موضوع سے متعلق ضروری الفاظ اور موزوں تراکیب ضرور پیش کر دے۔ مگر بچوں کے فہم سے بالاتر نہ ہو اور جب بچے لکھنا شروع کریں تو نمونہ سامنے سے ہٹا لیا جائے بڑی جماعتوں میں نمونے کی بجائے مربوط سوالات کی مدد سے تختۂ سیاہ پر خاکہ تیار کیا جائے۔

یہاں اس وہم میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کہ خاکے کا پابند ہو کر طالب علم کا تخیل اپنی انفرادیت کے اظہار سے باز رہے گا۔ اور اس پر برا اثر پڑے گا۔ طلبا کو عام معقول اور مقبول نمونے سے آشنا کرنا نہایت ضروری ہے۔ آگے چل کر جب طلبا خود کسی موضوع پر قلم اٹھائیں گے تو اپنے لیے انفرادی طور پر خاکے تیار کریں گے اور وہ ان کے فطری و انفرادی انداز کے عین مطابق ہوں گے۔

مختصر یہ کہ تدریسِ انشا کی تیاری ہی طلبا کی اغلاط کو کم کر سکتی ہے۔ اور اسی صورت میں کسی مفید مطلب اصلاح کا سوال پیدا ہوتا ہے، ورنہ نہیں۔ مندرجہ بالا طریق کار اغلاط کی پیش قیاسی کرتا ہے اور امتناعِ اغلاط کا حکم رکھتا ہے۔ جب طلبا تحریری انشا میں خاطر خواہ مہارت حاصل کر لیں تو پھر وہ خود خاکہ تیار کر کے تخیلی مضامین اور طبع زاد مضامین بھی لکھ سکتے ہیں۔ مگر مذکورۂ بالا اقسام کی مشقوں سے پہلے طلبا سے تخلیقی یا تخیلی مضامین لکھوانا تضیعِ اوقات کے سوا اور کچھ نہیں۔

تجربہ شاہد ہے کہ امتناعی و انسدادی تدابیر کے باوجود بچے لکھتے وقت غلطیاں کر ہی جاتے ہیں کیوں؟ بچے جو ہوئے۔ دراصل ہر قابل انسداد غلطی جو تحریر میں ایک مرتبہ بچے سے سرزد ہو جاتی ہے تکرار کا میلان رکھتی ہے اور معلم کی اصلاح کے باوجود بچے کے حافظے سے نہیں نکلتی۔ تاوقتیکہ بچہ خود بھی اس سے بچنے کی کوشش نہ کرے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ تدریس انشاء کا عمل جلدی جلدی نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر اور ذرا سنبھل کر کیا جائے۔ انشاء کی ہر منزل یعنی مضمون کے ہر حصے کو ملحوظ رکھا جائے۔ معلم خاکے کی ترتیب میں پوری احتیاط برتے اور بچوں کو ہدایت کرے کہ ہر جملے کو سپرد قلم کرنے سے پہلے ذہن میں مکمل کرلیں۔ اور ہر نیا پارہ شروع کرنے سے پہلے آخری جملے کو پڑھ لیں۔

زبانی اصلاح یا تبصرہ

مندرجۂ بالا طریق کے مطابق جب تحریری انشاء کی تکمیل ہو جائے تو اس کی تصحیح کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لیکن قلمی اصلاح سے پہلے زبانی تبصرے کی منزل ہے۔ معلم دو تین طلباء سے ان کی انشاء باواز بلند پڑھوا کر سنے اور دوسرے طلباء اس انشاء کی خوبیوں اور خامیوں پر تبصرہ کریں۔ ظاہر ہے کہ طلباء کا یہ زبانی تبصرہ کسی لفظ کے تلفظ، کسی محاورے کے استعمال یا کسی جملے کی نحوی ترکیب یا کسی خیال کے بے محل یا برمحل ہونے کے متعلق ہوگا۔ اگر کوئی غلطی نظرانداز ہوتی نظر آئے تو معلم اس پر توجہ دلا سکتا ہے۔ اور ضرورت سمجھے تو تختۂ سیاہ پر لکھ کر اس کے حسن و قبح پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ مگر اس کی نوبت صرف اس صورت میں آئے گی جب کوئی بات طلباء کی فہم و فراست سے بالاتر ہو۔ ورنہ عام غلطیوں پر بہت سے طلباء ہاتھ اٹھائیں گے۔ خاموش خوانی کی صورت میں جن غلطیوں کے نظرانداز ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ بلند خوانی کی صورت میں وہ بھی آشکار ہو جایا کرتی ہیں۔

اس زبانی تبصرے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے طلباء میں تنقید کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور زبان و بیان کے خوب و زشت سے آگاہی ہو جاتی ہے جو آئندہ انشاء پردازی میں دلیل راہ بنتی ہے علاوہ ازیں اس طرح معلم کی قلمی اصلاح کا کام بھی قدرے کم ہو جایا کرتا ہے۔

باہمی اصلاح یا اغلاط کی نشان دہی:— معلم کی قلمی اصلاح سے پہلے، بہتر یہ ہے۔ کہ

جماعت کے تمام طلبا ایک دوسرے کی انشاء کا خاموشی سے مطالعہ کریں۔ اور اس میں جو لفظ یا جو بات غلط معلوم ہو اس پر پنسل سے نشان لگا دیں۔ اس عمل سے نہ صرف صحیح اور غلط کے پرکھنے میں مزید تربیت حاصل ہو گی بلکہ رفتہ رفتہ وہ اپنی اصلاح آپ کر لینے کے قابل ہو جائیں گے۔

قلمی اصلاح

مندرجہ بالا مراحل سے گذرنے کے بعد طلبا کے کام کی قلمی اصلاح ہونی چاہیے۔ مگر قلمی اصلاح مفید و مؤثر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اصلاح طالب علم کے سامنے انفرادی طور پر عمل میں آئے یا بعد اصلاح طالب علم کی انشا کو معلم اس کے سامنے پڑھے اور سمجھا سمجھا کر اصلاح کرے۔

اصلاح کا یہ طریقہ ہرگز ایسا ناقابلِ عمل نہیں جیسا کہ اسے عام طور پر سمجھ لیا جاتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ قلمی اصلاح سے قبل اجتماعی اغلاط اور زبانی و باہمی اصلاح کے اقدامات ضرور کر لیے جائیں۔

اصلاح کے معلمانہ انداز

اصلاح میں سہولت کے لیے ہر طالب کو اپنی انشا پردازی کی کاپی ہمیشہ اپنے پاس ڈیسک میں تیار رکھنی چاہیے۔ جب جماعت خاموش مطالعہ میں مشغول ہو یا دوسرے طلبا کی اغلاط کی نشاندہی میں مصروف یا کسی نئی تحریری انشا میں منہمک۔ تو معلم طلبا کے اپنے ڈیسک پر باری باری بلا کر قلمی اصلاح کر سکتا ہے۔

(۱) **عام اغلاط کی تصحیح**:۔ معلم کو قلمی اصلاح کے دوران میں کچھ ایسی غلطیاں بھی نظر آئیں گی جو جماعت کے اکثر و بیشتر طلبا کی انشا میں موجود ہوں گی۔ ایسی عام اور مشترک غلطیوں پر پوری جماعت کے سامنے روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ معلم ان غلطیوں کو ایک جگہ لکھتا جائے اور پھر کسی وقت مثلاً تحریری انشا کے آئندہ پیریڈ میں پوری جماعت کو زبانی سمجھا دے۔ اگرچہ غیر زبان مثلاً انگریزی یا فارسی کی صورت میں عام اغلاط کی اصلاح تختہ سیاہ پر ہونی چاہیے۔

(۲) **تصحیح میں اشاریت کا پہلو**:۔ انشا کی بعض غلطیاں طلبا کی بے پروائی کا نتیجہ ہوتی ہیں اور بعض ناقہمی کا نتیجہ۔ معلم خود ان اغلاط کی نوعیت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ وہ طلبہ کی استعداد سے واقف ہوتا ہے۔ اسے اس واقفیت سے اصلاحِ انشاء میں مدد لینی چاہیے۔ جو اغلاط ناقہمی کی

وجہ سے ہوں معلّم اپنے قلم سے ان کی پوری اصلاح کرے۔ مثلاً اگر کسی مشکل لفظ کا املا غلط ہو تو اسے کاٹ کر درست کرنا۔ گرامر کی غلطی کو دور کرنا۔ کسی جملے میں غلط تذکیر و تانیث کی تصحیح کرنا۔ غلط مرکبات، محاورات اور ضرب الامثال کو کاٹ کر صحیح لکھنا۔

جو غلطیاں طالب علم کی بے پروائی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہوں یا جن کا سمجھنا آسان ہے معلم اپنے قلم سے ان کی پوری اصلاح نہ کرے ان پر خط کھینچ کر یا سوالیہ نشان بنا کر چھوڑ دے۔ طالب علم اس کی اصلاح خود کرے گا۔

(iii) **استعمالِ رموز** :۔ مؤخر الذکر قسم کی غلطیوں کی نشان دہی کے لیے کچھ نشانات مقرر کر لیے جائیں تو زیادہ مناسب ہے۔ مثلاً اگر طالب علم بے پروائی کی وجہ سے حرفِ رابط یا کوئی اور معمولی لفظ چھوڑ گیا ہو تو اس کی جگہ سطر سے ذرا نیچے یہ نشان (۸) بنا دیا جائے لفظ کے بے محل استعمال پر سوالیہ نشان (؟) لگا دیا جائے۔ اگر جملے کے اجزا اپنے صحیح مقام پر موجود نہ ہوں تو ہر جُزو کے اوپر ایک خط کھینچ کر ان پر اس طرح نمبر ڈالے جائیں کہ اجزا کی صحیح ترتیب سمجھ میں آجائے اور طالب علم اپنے ہاتھ سے اس جملے کی تصحیح کر سکے۔ اگر طالب علم نے غیر ضروری طور پر نیا پارہ شروع کر دیا ہے تو اسے ایک زنجیر (~~~~~~) کے ذریعہ ملا دیا جائے۔ اگر ضرورت کے باوجود نیا پارہ شروع نہیں کیا تو اس جگہ یہ نشان (ن پ) بنا دیا جائے۔ علیٰ ہذا القیاس ہر معلم خود اپنی ضرورت کے مطابق چند ایسی علامات مقرر کر سکتا ہے جنھیں طلبا ایک بار دیکھ کر اچھی طرح سمجھ لیں بلکہ معلم کی قلمی اصلاح سے قبل متذکرۂ بالا یا ہمی اصلاح میں خود بھی استعمال کر لیا کریں۔

(iv) **رموز کا جواز** :۔ ان علامات کے استعمال سے ایک طرف معلم کو سہولت رہے گی۔ وقت کم خرچ ہوگا اور زیادہ خامہ فرسائی کی نوبت نہیں آئے گی۔ اور دوسری طرف طالب علم کو اس سے کہیں زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔ انشا میں بے پروائی برتنے کی عادت جاتی رہے گی۔ اور اپنی اصلاح آپ کرنے کا سلیقہ آجائے گا۔ یہی وہ مقصد ہے جس کی خاطر تدریسِ انشا کا اقدام اور اصلاح کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ صرف اسی اصلاح کو مفید و مؤثر کہا جا سکتا ہے جو طالب علم کی سمجھ میں

اچھی طرح آ جائے۔ لیکن جب طالب علم اپنے ہاتھ سے اپنی غلطی کی اصلاح کر لیتا ہے تو اصلاح کے سمجھ میں نہ آنے کا سوال باقی نہیں رہتا۔ اصلاح کی افادیت پر مہرِ تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ایسی اصلاح درست نویسی کی جانب راست اقدام کا حکم رکھتی ہے۔ اور تعلیم کو تربیت سے ہم کنار کرتی ہے۔ اپنی اصلاح آپ کرنے کا بار طالب علم کی تیسری جبلت کو بروئے کار لاکر مشق و مہارت کی طرح ڈالتا ہے۔

(۷) اشاریت کی حدود و قیود :۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اغلاط بھی جو طالب علم کی نافہمی کا نتیجہ ہیں اشاریت کے طریق پر طالب علم ہی کے ہاتھ سے کیوں نہ درست کرائی جائیں؟ مگر اس میں بڑی قباحت ہے کیوں کہ صرف نمائش سے نمائش کا مطلب نہیں لیا جا سکتا۔ نافہمی پر مبنی اغلاط کو صرف زبانی سمجھا کر چھوڑ دینا اصولِ تعلیم کی صریح خلاف ورزی ہے۔ ممکن ہے۔ بچہ زبانی اصلاح کو عملی جامہ پہنانے تک یاد نہ رکھ سکے اور جو غلط بات اس کے قلم سے نکل چکی ہے وہی یاد رہ جائے۔ علاوہ ازیں اس کی کیا ضمانت ہے کہ معلم کے صرف زبانی سمجھانے سے اس قسم کی غلطی کو طالب علم سمجھ ہی جائے گا؛ اس لیے معلم کو چاہیئے کہ زبانی سمجھانے کے ساتھ ساتھ ایسی اغلاط کو قلم زد کر کے صحیح لفظ یا جملہ اپنے قلم سے لکھ بھی دے جو "نوشتہ بماند سیاہ بر سپید"

(۷) قلمی اِصلاح کی مشق اور اِشاری اصلاح کی تکمیل : ۔ معلم کی قلمی اصلاح کے بعد اسکی مشق ضروری ہے۔ طالب علم کو تنبیہ کر دینا چاہیئے کہ وہ اصلاح کی علی الفور جلد مشق کرلے کیوں کہ معلم ہر وقت مشق کا معائنہ کر سکتا ہے۔ قلمی اصلاح کی مشق اور اشاری اصلاح کی تکمیل (جو طالب علم اشارات و علامات کی مدد سے خود کرتا ہے) باقاعدہ عمل میں آنی چاہیئے۔ تحریری انشاء کے مقابل کا پورا صفحہ اسی کام کے لیے مختص کر دیا جائے تاکہ طالب علم اس پر سہولت اور صفائی سے تبدیل شدہ لفظوں اور جملوں کو کئی بار لکھ سکے۔ مگر چند اصلاح شدہ لفظوں کی خاطر پوری انشاء کو دوبارہ نقل کرانا تضیعِ اوقات میں داخل ہے۔

معلم کو چاہیے کہ اپنی محنت کو رائگاں نہ جانے دے۔ ہر نئی انشاء کی قلمی اصلاح کرتے وقت اس سے پہلی انشاء پر ضرور ایک نظر ڈال کر یہ دیکھ لے کہ طالب علم نے اس کی باقاعدہ مشق کر لی ہے یا نہیں؟

انسدادِ اغلاط یا اصلاحِ اغلاط کے سلسلے میں جن تجاویز کا ذکر کیا گیا ہے ان پر عمل پیرا ہونے کیلئے یقیناً ذرا زیادہ وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ان سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ نہایت عظیم الشان ہیں۔

ید فارسی ——— ایک تاریخی جائزہ

ن لیکچرر سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور

زبانیں اہل زبان کے تمدنی حالات اور فکری رجحانات کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ دوسرے ممالک سے تہذیبی
تجارتی، سیاسی اور مذہبی تعلقات کا ہر ملک کی زبان پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ آج انسانیت اتنی وسیع
، کائنات پر قابض ہونے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی زندگی میں سمٹ کر ایک خاندان بن کر رہ گئی ہے
یسا خاندان جو ایک ہی مکان کے مختلف حصوں میں آباد ہو۔ لہٰذا ایک قوم اپنی زبان کو دوسری
سے الگ نہیں رکھ سکتی۔ ملک الشعرا بہار اپنی تالیف سبک شناسی میں یوں رقمطراز ہیں:۔

> دُر عالم ہیچ زبان نیست کہ بتواند از آمیختگی با زبانِ دیگر خود را برکنار دارد مگر زبانِ مردمی کہ ہرگز
> با مردم دیگر آمیزش نکنند و این نیز محال است چہ بوسیلۂ تجارت و سفر و معاشرت و حتّیٰ بوسیلۂ
> شنیدنِ افسانہ ہا و روایتِ مللِ دیگر لغاتی از آں مردم دریں مردم نفوذ میکند و ہمہ زبانہای عالم
> ازیں رواداری لغت ہائے دخیل است باید دید از آمیختنِ زبانی با زبانِ دیگر چہ نتائجی
> حاصل می شود آمیختنِ زبانہا ہر چند قسم است یکی اینکہ زبانی ہر چہ را ندارد بالطبع از ہمسایہ
> یا جائے دور تر بستاند و ملائم بہ لہجہ و سلیقۂ خویش نماید یعنی آں لغت را فرد کردہ و نشخوار کردہ
> و قابلِ ہضم سازد و از حالات و اختصاصاتِ اصلی آنرا بیندازد و حتّیٰ بمیل خود آنرا گاہی قلب کند
> گاہی تصحیف کند گاہی مفہوم آنرا تغییر دہد اگر جامد است مشتق کند و اگر مشتق است جامد کند
> الی آخر چنانکہ عربان بلغاتِ بیگانہ ہمیں کار را کردہ و میکنند و باہم با برخی از لغات عربی
> و لغات ترکی و فرنگی ایں عمل را نمودہ ایم ولی ایں کار در میانِ ما عمومیت نداشتہ است"

ں چہ جب عربوں نے ایران پر قبضہ کیا تو جہاں عربی زبان کا اثر فارسی پر ہوا وہاں عربی بھی فارسی سے

متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

ایران اپنی لسانی تاریخ اور تہذیبی زندگی میں دنیا بھر کے ممالک میں منفرد ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے وہاں انسانی زندگی کا ایک مہذب اور فعال معاشرہ ملتا ہے جس میں تصویری خط سے احساساتِ قلبی واضح کیے جاتے تھے اور میخی خط سے بھی تحریریں مخصوص مفہوم واضح کرتی تھیں زرتشت، مانی اور بہزاد کا یہ وطن آج بھی مسلمانوں میں شیعہ اسمٰعیلی تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ اور آج بھی وہاں بہائی یا بی علی اللہی شیطان پرست اور صابی موجود ہیں جن کا تمدن الگ الگ ہے۔ وہاں آج بھی پارسی اور مزدکی ملتے ہیں جو اپنی زندگی کا شعار ان سب سے مختلف رکھتے ہیں۔ اسلام کے آنے کے بعد بھی یہ منفرد ملک مختلف تہذیبی تحریکوں کا مرکز رہا ہے اور اس میں زندگی کے بے شمار روپ ملتے ہیں اور ہر روپ یا ان کے طلبہ کے لیے بجائے خود ایک الگ مکتب ہے۔

ایران لسانی اعتبار سے بڑا پُرپیچ ملک ہے۔ ایرانی زبان، فارسی باستان، اوستا سے پہلوی کے قالب میں ڈھلی۔ پہلوی نے دو شکلیں اختیار کیں ایک اشکانی دوسری ساسانی۔ ایرانی زبان پہ ایک ایسا دور بھی آیا کہ لکھنے کچھ تھے اور پڑھتے کچھ۔ ان حالات میں عرب نے ایران پہ فتح پائی تو فارسی نے اپنا سراپا بدل لیا۔ مشرق میں زبان اور رسم الخط کو مذہب سے تعلق ہے۔ اس لیے رسم الخط عربی ہوا، اور زبان عربی سے مالا مال ہونے لگی، اسلام سے شیفتگی نے اوستا اور زرتشت کی زبان بھلا دی، عربی کو اپنے مزاج اور ذوق کے مطابق ڈھالا۔ ایرانی مذہب میں عرب سے متاثر ہو کر علومِ اسلامیہ کی تحصیل میں آگے بڑھے۔ مذہب کے ساتھ مندرجہ ذیل الفاظ بے تکلف ان کے ذخیرہ میں آ گئے۔

زکوٰۃ، حج، مسلم، مومن، کافر، منافق، قرآن۔ اقامہ۔ قبلہ، محراب۔ منبر۔ منارہ۔ ابلیس، تسنیم، کوثر، سلسبیل، ہاروت، ماروت، یاجوج، ماجوج۔ حور۔ غلمان، دُعا وغیرہم۔

حتّیٰ کہ عربوں کے ذریعہ یونانی الفاظ بھی فارسی میں شامل ہوئے۔

دیہیم، دینار، فنجان، پیالہ، صندل، الماس،

کچھ آرامی الفاظ بھی عربوں کے توسط سے فارسی نے قبول کیے۔

جزیہ (گزیت)، مسجد (مزگت) چلیپا (صلیبا) کنشت (کنسیہ)
بعض دوسری زبانوں کے الفاظ بھی عربوں ہی کی وساطت سے ایران میں پہنچے۔
آبنوس۔ جاثلیق (کاتولیک) بطریق، قیصر، طلسم، کیمیا، قانون، تعلیم،
ان ملکوں کے الفاظ ایران نے یوں سینے سے لگا لیے جیسے اپنے ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر عربی الفاظ چوتھی اور پانچویں صدی میں ایران کے ذخیرۂ الفاظ میں پانچ فی صد سے زیادہ نہ تھے پانچویں صدی کے اواخر میں پچاس فی صد ہو گئے اور ساتویں اور آٹھویں صدی میں اسّی فی صد تک جا پہنچے۔ اس رفتار کے پیچھے ایران کی سیاسی اور معاشرتی زندگی تھی کہ جس کا ہر قدم عربی کی جانب اٹھتا تھا اور عربوں کے ساتھ اٹھتا تھا۔

پانچویں اور چھٹی صدی میں ایرانی زندگی کا رُخ بدلا۔ ملک عربوں سے صفاریوں، طاہریوں وغیرہ سے ہوتا ہوا، صفویوں کے دامن میں آ پڑا۔ صفوی آذربائیجان کے رہنے والے تھے۔ یہ لوگ ترکی زبان بولتے تھے، فوج میں ترکوں کی کثرت کے ساتھ عوام تک ترکی الفاظ پہنچے، صفویوں کا پہلا بادشاہ شاہ اسمٰعیل صفوی اوسط درجہ کا شاعر تھا، خطائی تخلص کرتا تھا اور ترکی میں شعر کہتا تھا۔ ترکی آمیز فارسی کے نمونے تاریخ وصّاف میں ملتے ہیں ملاحظہ فرمائیں ایک مختصر نمونہ۔

اے ترک نازنین کہ دل افروز و مہ وشی
ایناق دلربائی د امراق اینشی
کاکل بر آلن تو چو مشکست برسمن
خوئی بر عذار نغز تو چوں قطرہ پروشی
گل کنگلک بدست حسد چاک محما زند
برتو چو دید زینت تزلیک زرکشی
افتادہ گشت برتی قمر تا نہادہ ای
بیتاق آل بر زبر چہر آتشی

ایناق - مصاحب ، امراق - معشوق ، کاکل ، زلف ، الن - پیشانی ، کدگلک ، پیراہن زنبک - چھوٹی آستین اور کھلے گریبان کی قمیص ، برق - ٹوپی ، تعناق - گلوبند ، آل - سرخ آج بھی ایرانی ہنگامہ کو بوّہ بھیڑ شور و غل کے معنوں میں آتا ہے شلوق کہتے ہیں۔ اد آینائے کو بناز - بشقاب قاشق بھی ترکی الفاظ ہیں۔ کپ کے لیے اُرندو - ہم زلف کے لیے باجیا اور سالے کے لیے یزنہ۔

ہاں تو ایران کا تعلق برصغیر پاک و ہند سے اڑھائی ہزار سال پرانا ہے۔ داریوش کو سب سے زیادہ خراج اسی ملک سے جاتا تھا۔ اس نے پرسی پولس شہر میں اپنی رہائش کے محل کی جنوبی دیوار پر اپنے مقبوضہ کے نام کندہ کرائے تھے۔ ان چوبیس مقبوضات میں بیسواں نام تھا گوشی تھا جو پنجاب کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس نقطہ کی تحقیق ایران کے فاضلِ آثارِ قدیمہ علی سامی نے کی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ پنجاب اد سندھ دونوں ایرانی مقبوضات تھے۔ ساسانی عہدِ حکومت ۲۲۹ تا ۲۵۶ء میں مغربی پاکستان ایرا سلطنت کا حصہ تھا۔ اس زمانہ میں نہ صرف تجارتی مراسم ہی تھے۔ بلکہ معنوی اور علمی تعلقات بھی برقرار تھے۔ مکران اور سندھ ایران کا جزو تھے۔ پھر محمود غزنوی کے ساتھ فارسی زبان پاک و ہند میں پہنچی اور مغلوں کے زوال تک برصغیر کی تہذیب کا تاج محل رہی۔ مغلوں کے زوال کے بعد بھی پاکستان کے تخیل کا خالق فارسی کی آبیاری اپنے خون جگر سے کرتا رہا۔

پاکستان کی تخلیق تک ہم کلاسیکی فارسی سے آشنا رہے۔ ہم نے علمی زبان کی تحصیل کی اور بولنے اور سمجھنے سے نابلد رہے۔ ادھر فارسی نے صفویوں سے لے کر رضا شاہ پہلوی تک عظیم انقلابات دیکھے۔

فارسی ایک زندہ زبان ہے اور ہر زندہ زبان الفاظ محاورات مرکبات اور اصطلاحات میں تنو کے لیے اپنی آغوش وا رکھتی ہے سنسکرت کے مردہ زبانوں میں شمار ہونے کی وجہ یہی ہے کہ سنسکرت والے اسے چھونا بھی گوارا نہیں کرتے، اور زبان جب تک زندگی کے ساتھ ساتھ آگے نہ بڑھے زندہ نہیں رہ سکتی۔ جرمن سائنسدان لوئی بوکنز نے زبان کے ارتقا کو ڈارون کے نظریۂ ارتقاء سے تشبیہ

دی ہے، زبان ترقی کرتی ہے اور ہر لحظہ اس کی کائنات بدلتی رہتی ہے۔ انسانی زندگی کے جہد للبقا کی طرح زبان بھی حالات کا مقابلہ کر کے حالات کے مطابق ڈھل کر اپنے لوچدار اور جاندار والے عنصر کے ذریعہ زندہ رہتی ہے، وہی الفاظ زندہ رہ سکتے ہیں جو زندگی کا دامن تھام کر چلیں یا زندگی جن کا دامن تھامے چلے۔ اور جن میں حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے قوت موجود ہو۔ فارسی زبان نے اس راز کو خوب سمجھا ہے۔ برصغیر میں فارسی ادب اور حکومت کی زبان تھی۔ عوامی اور قومی زبان نہ تھی۔ اس لیے ہم کلاسیکی اور جامد زبان سے آشنا رہے۔ ادھر ایران متحرک رہا۔ اس پر سیاسی مذہبی ثقافتی انقلاب آئے تجارتی علمی اور تہذیبی تعلقات کا اثر پڑا۔ اس لیے جب قیام پاکستان کے بعد ہم نے ایران کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ایک صد پچاس سالہ حجاب اٹھا لیکن زبان کا نقش ہمارے تصور اور تجربے بالکل مختلف تھا۔

صفویوں سے قاچاریوں تک زبان مختلف مراحل سے گذر چکی تھی۔ قاچاریوں نے فرانس اور انگلستان سے تعلقات بڑھا لیے تھے اور سائنس دواسازی معدنی علوم اور فنون جنگی میں فارسی میں فرانس کی مستند کتب منتقل ہوئیں۔

فتح علی شاہ قاچار اور محمد شاہ قاچار نے اہل یورپ سے تعلقات بڑھائے یورپی آداب حیات ایران میں آئے۔ ایرانی زندگی پر یورپی رسموں کا اثر پڑا۔ مظفر الدین شاہ قاچار کے زمانہ میں ایرانی انگریزوں سے مغرب کی تقلید میں بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ اسی دوران مشروطیت کا اعلان ہوا۔ مشروطیت اگر سیاسی انقلاب تھا لیکن شعر مضامین اور تصانیف نے بھی ہیئت بدلی۔ لوگوں کو عربی سے وحشت ہونے لگی فارسی کا آہنگ بگڑا۔ بے ضرورت آرائشی جملے بھرتی کی ترکیبیں خارج ہونا شروع ہو گئیں۔ صحیح اور فصیح آ گئی۔ رضا شاہ کبیر کے زمانہ میں فردوسی کی طرح قومیت کا جذبہ پیدا ہوا۔ لوگ عمارتوں اور برتنوں سے تمدن کے نشان ڈھونڈنے لگے۔ عربوں کے خلاف زہر چکانی ہوئی۔ ڈاکٹر ظہور اپنی کتاب ایران شناسی میں فرماتے ہیں:-

کہتے ہیں انگریزوں نے بھی اس ملی تعصب کو پھیلانے میں ہوا دی، تاکہ ایرانی ہمسایہ عربی ممالک

سے سیاسی جنگی معاہدے کرنے سے باز رہے۔" (صلا)

آج نژادِ نو اسلامی ناموں سے بھی وحشت کرتی ہے اور ایرانی رستم ہوشنگ تہمورث خسرو کیکاؤس اور پوران وغیرہ نام رکھتے ہیں۔

یہ جان کر روح کو تکلیف ہوتی ہے کہ ایرانی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ ممد کرتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں زبان کو عربی اثرات سے پاک کرنے کی بھرپور کوشش کا آغاز تھا۔ اس دور میں امیر فراہانی، شوریدہ شیرازی۔ بہار، دہخدا۔ رشید یاسمی، خرسند شیرازی اور بہروز ساوی نے عربی کے خلاف مقالات لکھے۔ اس تحریک کا نام "فارسی سرہ" ہے۔

مشروطیت کے آغاز میں ابوالقاسم آزاد مراغی نے نامہ پارسی نکالا جس میں ایک لفظ بھی عربی کا نہ تھا لیکن بڑے لوگوں نے اس تحریک کی مخالفت کی علامہ قزوینی اس اختلاف میں پیش پیش تھے۔ پہلوی دور میں مزید رسالے اور اخبار نکلنے لگے۔

۱۹۳۱ء میں پیرنا آشتی نے تہران سے فارسی سرہ میں نمکدان نکالا۔ یہ پرچہ پانچ سال تک جاری رہا۔ اس کے تین سال بعد سیف آزاد نے طہران ہی سے ایران باستان نکالا۔ اس میں بھی سیاسی اقتصادی موضوعات فارسی سرہ ہی میں لکھے جاتے تھے۔

اس دور میں احمد کسروی عربی کی مخالفت میں توازن کھو بیٹھے۔ وہ تمام شعرا کی کتابوں کو قوم کو گمراہ کرنے والی قرار دیتے تھے۔ لہٰذا ان کا خیال تھا کہ ان سب کو نذرِ آتش کر دیا جائے۔ انہوں نے فارسی سرہ کی بھی مخالفت کی وہ حافظ اور سعدیؒ کی زبان کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے کافنامہ، زبان فارسی اور زبانِ پاک کتابیں خود لکھیں۔ لیکن وہ آلات اور اشیاء کے لیے خارجی الفاظ کو بعینہٖ قبول کر لینا جائز سمجھتے تھے۔

تلگراف تلفون رادیو اور اتومبیل وغیرہ سے انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ بلکہ وہ تلگراف سے تلگرافیدن اور تلگرافندہ اور تلفون سے تلفونیدن اور تلفونندہ تک کو جائز سمجھتے تھے۔ ان کا مستقل نظریہ یہ تھا کہ اوستا اور پہلوی الفاظ میں

پیشوند اور پسوند لگا کر ذخیرۂ الفاظ نیا بنالیا جائے۔ مثلاً ہی کو لیجیے۔

خور سے خوراک ، پوش سے پوشاک ، آموز سے آموزاک۔ لیکن یہ جدّت طرازی اتنی پُرکیف ثابت نہ ہوئی۔

فارسی سرہ والے دری اور پہلوی زبان کے امتزاج کے قائل تھے۔ فارسی سرہ کے جنون میں لسانی کاروان اپنی منزل کھو بیٹھا تھا۔ ادھر قدیم مکتب کے والا وشیدا عربی کی بجائے اوستا اور پہلوی کو زندہ کرنا چاہتے تھے بسطحی طور پر یورپ زدہ لوگ فرانسیسی اور انگریزی الفاظ کے جا و بیجا استعمال پر مُصر تھے۔ محمد علی جمال زادہ نے ان لوگوں کا اپنے لازوال مضمون فارسی شکر است میں یوں مذاق اڑایا ہے۔

"۔۔۔۔ در روئی این سوژہ یک آرتیکل درازی نوشتہ ام و با روشنی کور کنندہ ای ثابت نمودہ ام کہ ہیچ کس جرأت نمی کند روئی دیگران حساب کند و ہر کس باندازۂ ۔۔۔۔۔ باندازۂ پوسیبلیتہ اش باید خدمت بکند وطن را کہ ہر کس بکند تکلیفش را این است راہ ترقی را را لا دکا دانس ہا را تہدید می کند۔۔۔۔"

(سوژہ ۔ سبجکٹ موضوع ، آرتیکل ۔ آرٹیکل ، پوسیبلیتہ اش ۔ پوسی بی لیٹی ۔ دکادانس ۔ ڈی کاڈنس)

ایک اور گروہ آگے بڑھا یہ عربی کو فارسی پر مسلط کرنا چاہتا تھا۔ اس گروہ کا بھی مذاق اڑا گیا اب فارسی پر سخت پریشانی کا دور تھا۔ ۱۹۳۵ء میں ایران کے وزیر اعظم محمد علی فروغی اور وزیر فرہنگ علی اصغر حکمت نے شاہ سے التفاتِ خصوصی کی درخواست کی۔ چناں چہ ملک کے دانشوروں کی ایک اکادمی ترتیب دی گئی۔ یہ دانشور عصری تقاضوں کے تحت زبان کی آرائش و تہذیب میں مصروف ہو گئے۔ اس ادارے کا نام فرہنگستان رکھا گیا۔ (باقی آئندہ)

اسکول میں امورِ خانہ داری کی تعلیم

نینسی ایلمر کے قلم سے

چار لڑکیاں پنیر تیار کرنے کے لیے مکھن اور میدہ کے آمیزوں کو احتیاط کے ساتھ پھینٹ رہی تھیں ان کے چہرے چولہے کی تپش سے تمتما اٹھے تھے۔ وہ اگرچہ کام کے دوران باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن ان کی نظریں چولہے پہ لگی ہوئی تھیں کہ کہیں ان کا پنیر گٹھلیوں میں تبدیل نہ ہو جائے یا ذائقہ میں کچا اور میدہ جیسا نہ بن جائے۔ ان کے پیچھے طشتریوں میں اُبلے ہوئے انڈے رکھے تھے۔ کمرہ کشادہ اور ہوا دار تھا، اور اس میں اسی طرح کے دوسرے گروپ بھی انڈے کا پنیر بنانے میں مشغول تھے۔

لڑکیوں نے اسکول کا آدھے دن کا کام ختم کر لیا تھا۔ وہ اور دوسری لڑکیاں اپنی کلاس میں کھانا پکانا اور غذا فراہم کرنا سیکھ رہی تھیں، انہیں خانہ داری کا طریقہ سکھایا جا رہا تھا جس کے لیے مشاقی کی ضرورت ہے۔ عمارت کے دیگر حصوں میں ان کی سہیلیاں صنعت، سائنس یا تعلیم سے متعلق کام کر رہی تھیں۔

مفت تعلیم

یہ دراصل جنوب مغربی لندن کے گیرٹ گرین اسکول کا گھریلو دست کاری کا شعبہ تھا۔ یہ اسکول ۱۰ ایکڑ رقبہ کے ایک کھلے میدان میں واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف سرسبز کھیت اور شاہ بلوط کے درخت ہیں۔ لندن کے کسی اسکول کے لیے یہ دیہاتی ماحول بے حد غیر معمولی ہے۔ اس اسکول میں گیارہ سال سے اٹھارہ سال کی دو ہزار سے زائد لڑکیوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔

پہلے تین سال میں انہیں ثانوی تعلیم کے عام طریقے سے گذرنا پڑتا ہے اور وہ سائنس سے لے کر موسیقی تک تمام مضامین کی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اس کے بعد ان کاموں کے اعتبار سے جنھیں وہ بہترین طریقے سے سر انجام دے سکتی ہیں دوبارہ گروپ بنائے جاتے ہیں اور پھر وہ خانہ داری تجارت اور تعلیم سے

ی کورس اختیار کرتی ہیں، لیکن اس منزل پر مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی عام تعلیم بھی جاری ہے۔ گھریلو دست کاری کے شعبہ کی بعض لڑکیاں ہر ہفتہ اپنے مضمون کی سات کلاسوں تک میں شریک ہوتی ہیں۔

گھریلو دست کاری کے آٹھ کمرے ہیں اور ہر کمرہ کی ایک اپنی الگ معلمہ موجود ہے۔ ہر کمرے کے ساتھ یا تو ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے یا کھانے کا کمرہ ہے۔ جہاں لڑکیوں کو مہمانوں کی تواضع کرنا اور گھر کی آرائش اور دیگر گھریلو کاموں کی تربیت دی جاتی ہے۔

یونٹ

کمرہ کا ایک اور حصہ چار یونٹوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر یونٹ کا اپنا رنگ اور اپنا ساز و سامان ہے۔ ہر ایک میں یونٹوں کی ایک الماری (جس کے نیچے ساز و سامان رکھا جاتا ہے) ایک اور الماری جس میں خشک اشیاء ہوتی ہیں) اور ایک چولھا (برقی یا گیس کا) ایک میز اور کرسیاں ہوتی ہیں۔ ایک یونٹ میں چار لڑکیاں کام کرتی ہیں اور جس رنگ کا یونٹ ہوتا ہے۔ ہر لڑکی کے پاس اسی رنگ کا برتنوں کا اپنا سیٹ ہوتا ہے۔ ہر کمرہ میں ایک ایک ریفریجریٹر بھی موجود ہے۔

لڑکیاں جس درجہ میں ہوتی ہیں اسی کے لحاظ سے سبقوں میں تبدیلی کی جاتی ہے۔ معلمہ بورڈ پر لکھ کر دکھاتی ہیں کہ لڑکیوں کو کھانے کس طرح تیار کرنے چاہئیں۔ اس کے بعد لڑکیاں خود تمام کام کرتی ہیں اور ہر گروپ میں سے ایک لڑکی حسب ضرورت اشیاء اکٹھی کر لیتی ہے۔ پھر کھانا پکانے کا آغاز ہوتا ہے اور یہی عام طور پر سبق کا سب سے ہر دلعزیز حصہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد کھانے کے برتن اٹھانے، دھونے اور سلیقہ سے آراستہ کرنے کا کام شروع ہو جاتا ہے جس کی پذیرائی ذرا کم ہی کی جاتی ہے۔ پھر ان لڑکیوں کو ایک مختصر سا سبق پڑھایا جاتا ہے جس میں غالباً یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے کھانے کا معیار کیا رہا ہے۔

تحریری کام

سبق کے دوران لڑکیوں کو اپنے سوالات کے جوابات ملتے ہیں، انہیں تحریری کام بھی دیا جاتا ہے جیسے کھانوں کی فہرست تیار کرنا۔ شعبہ گھریلو دست کاری کی صدر مس سکمن کا کہنا ہے کہ اس سے ان میں

سوچ بچار کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

جوں جوں بچیاں اسکول کے مدارج طے کرتی ہیں ان کے سبقوں کا طریقہ بدل جاتا ہے۔ ہر گروپ مضامین کے ایک سلسلہ سے گزر کر کام کرتا ہے۔ لیکن گھر کی عملی دیکھ بھال پر ہمیشہ زیادہ زور دیا جاتا ہے مجھے ایک غسل خانہ، باورچی خانہ اور بیٹھنے کا کرہ بڑے فخر سے دکھایا گیا جو لڑکیوں نے ابھی ابھی سجایا تھا۔ انہیں کھانے کا آرڈر دینا اور سمجھداری کے ساتھ عمدہ گوشت اور سبزیوں کی خریداری کرنا بھی سکھایا جاتا ہے ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کھانا پکانے سے پہلے اپنی حسب ضرورت اشیا کا آرڈر دیں گی۔ اور جن چیزوں کا وہ آرڈر نہیں دیتیں ان کے بغیر ہی انہیں کھانا پکانا پڑتا ہے۔

عملی مشق

لڑکیوں کو اکثر و بیشتر عملی مشقیں دی جاتی ہیں۔ مثلاً والدہ اپنے بستر پر بیمار پڑی ہیں۔ آپ ان کی مدد کیلئے گھر کے کپڑے دھو رہی ہیں اور اپنے والد، بھائیوں اور بہنوں کے لیے رات کا کھانا تیار کر رہی ہیں۔ کپڑے دھونے کی مختلف مدوں اور رات کے کھانے کی تجویز تیار کرو اور انتظام مکمل کیجیے۔"

ایک غیر محتاط خانہ دار لڑکی نہ بننے اور ہر چیز کو وقت پر تیار کرنے پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ لڑکیاں کتنے سبقوں کی گھر پر عملی مشق کرتی ہیں۔ میں نے یہ بات سنہرے بالوں والی جینی سے ان کی تھیوری کی کلاس میں کہی۔ وہ نشاستہ کے آمیزہ کے ساتھ دو چٹپٹے اور دو میٹھے کھانے تیار کرنے کا منصوبہ بنا رہی تھیں۔ ان کا ایک بھائی صرف نو مہینے کا ہے اور اس کے علاوہ تین بہن بھائی اور بھی ہیں۔ جینی نے کہا کہ جب ان کی والدہ چھوٹے بچے کی دیکھ بھال کرتی ہیں تو وہ اکثر و بیشتر ان کی مدد کے لیے شام کا کھانا اور اتوار کی شب کا کھانا تیار کرتی ہیں۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ——————— شعبۂ سکول

ج۔ غلام علی بی اے بی۔ ٹی کو جو گورنمنٹ ہائی سکول خانپور میں بطور ہیڈ ماسٹر کام کر رہے ADMN
تھے تاریخ حاضری سے ہیڈ ماسٹر کی ایک نئی آسامی پر بشاہرہ خود گورنمنٹ ہائی سکول چک ۱۰۶۳
نمبر ۳/۱۷۳ میں بطور ہیڈ ماسٹر متعین کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۶۲ء

م۔ محمد لطیف ولد محمد دین میٹرک I جے وی II ایس وی I ایک امیدوار کو موسم گرما کی تعطیلات ADMN
کے بعد م۔ بشیر احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے بشاہرہ -/۷۲ روپے علاوہ الاؤنس ۱۰۷۵۲
قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول علی پور مقرر کیا گیا۔ ۱ستمبر ۱۹۶۲ء

چودھری اللہ داد چیمہ ایم۔ اے بی اے ایڈ (ایک امیدوار) کو تاریخ حاضری سے ایک موجودہ ADMN I
خالی اسامی پر بشاہرہ -/۱۷۰ روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ۱۰۸۷
ٹیوٹ گکھڑ مقرر کیا گیا۔ ۱۰ستمبر ۱۹۶۲ء

م۔ محمد شفیع بی۔ ایس سی۔ ایم اے بی ٹی کو جو گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی سکول بہاولپور میں بطور ADMN I
ہیڈ ماسٹر کام کر رہے تھے۔ تاریخ حاضری سے ج۔ غلام علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۱۰۸۱۵
اپنی تنخواہ پر گورنمنٹ ہائی سکول خانپور میں بطور ہیڈ ماسٹر متعین کیا گیا۔ ۱۰ستمبر ۱۹۶۲ء

م۔ نور محمد ولد جان دین (ایک امیدوار) کو تاریخ حاضری سے م۔ خوشی محمد ورنیکلر ٹیچر ADMN I
کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے بشاہرہ -/۷۲ روپے علاوہ الاؤنس عارضی ورنیکلر ٹیچر ۱۰۸۲۵
گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی گارڈن لاہور مقرر کیا گیا۔ ۱۲ستمبر ۱۹۶۲ء

م۔ محمد اسمٰعیل بی اے۔ بی۔ ٹی قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ایس۔ ڈی ہائی سکول ADMN I ۱۱۰۸۸
بہاولپور کو تاریخ حاضری سے ایک اضافی ٹیچر کی حیثیت سے اپنی تنخواہ پر قائم مقام ۱۳ستمبر ۱۹۶۲ء

سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی سکول بہاول پور مقرر کیا گیا۔ یہ اپنی اسامی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

A - ۱۲۰۷۱ م۔ نثار احمد ولد سعید احمد میٹرک جے ڈی پی ای (ایک امیدوار) کو تاریخ حاضری سے پی ٹی آئی
۱۹ ستمبر ۱۹۶۲ء کی ایک خالی اسامی پر بمشاہرہ -/۶۰ روپے علاوہ الاؤنس قائم مقام پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول پاک پٹن مقرر کیا گیا۔

ADMN I
۱۲۲۲۹
۲۰ ستمبر ۱۹۶۲ء
م۔ عبدالوکیل میٹرک جے ڈی (پی) ای عارضی پی ٹی آئی کو جنھیں گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ جانے کا حکم ہوا تھا۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر قائم مقام پی ٹی آئی گورنمنٹ ہائی سکول شجاع آباد مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد یعقوب ولد ولی محمد میٹرک جے۔ ڈی۔ پی ایس (ایک امیدوار) کو جنھیں عارضی پی ٹی آئی گورنمنٹ ہائی سکول شجاع آباد مقرر کیا جانے کا حکم ہوا تھا۔ تاریخ حاضری سے م۔ محمد اکبر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے بمشاہرہ -/۶۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول احمد پور شرقیہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد یعقوب ولد رکن دین میٹرک جے ڈی پی ای سابق پی ٹی آئی ڈی سی مڈل سکول ملٹری فارم اوکاڑہ کو یکم جولائی ۱۹۶۲ء سے ایک نئی اسامی پر بمشاہرہ -/۶۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی پی، ٹی، آئی، گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

E - ۱۲۲۲۹ م۔ رشید احمد ایم اے بی ایڈ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول شکر گڑھ
۲۰ ستمبر ۱۹۶۲ء کو تاریخ حاضری سے م۔ غلام مصطفٰے شاہ (جو رخصت پر ہیں) کی جگہ اپنی تنخواہ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول پسرور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ فقیر محمد بی اے۔ بی ایڈ قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورونانک ہائی سکول ننکانہ کو تاریخ حاضری سے م۔ رشید احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے بمشاہرہ -/۱۲۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول شکر گڑھ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ احمد خاں بی اے بی ایڈ قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول شجاع آباد کو عبدالقیوم کی جگہ تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م رئیس محمد اکرم بی اے۔ بی ایڈ جونیئر کلرک چک ۱۳۲/۹-R کو تاریخ حاضری سے م مختار احمد بھٹی کی جگہ جو حاضر نہیں ہوئے تھے۔ بمشاہرہ -/۱۴۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ سمابہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد اشرف تاج بی ایس سی۔ بی۔ ایڈ (ایک امیدوار) کو م عبدالستار کی جگہ جو حاضر نہیں ہوئے تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ سمابہ مقرر کیا گیا (بمشاہرہ -/۱۴۰ روپے علاوہ الاؤنس)

ایضاً م۔ عبدالقیوم بی۔ ایس سی بی ایڈ (ایک امیدوار) کو م شبیر احمد کی جگہ (جو لمبی رخصت پر روانہ ہو چکے ہیں) تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ گکھڑ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ غلام حیدر بی ایس سی بی ایڈ (ایک امیدوار) کو م محمد شجاع کی جگہ (جو حاضر نہیں ہوئے تھے) بمشاہرہ -/۱۴۰ روپے تاریخ حاضری سے عارضی سینئر ٹیچر جی ایس ڈی ہائی سکول بہاولپور مقرر کیا گیا۔

۱۲۶۷۵ — ADMN I ۲۲ ستمبر ۱۹۶۲ء م۔ غلام رسول قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول فیروزہ کو اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں م۔ محمد اکبر کی جگہ تاریخ حاضری سے قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری مقرر کیا گیا۔

۱۲۴۳۶ ADMN I ۲۳ ستمبر ۶۲ء م محمد اقبال بیگ ایم اے بی ایڈ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول اُچ شریف کا استعفیٰ یکم ستمبر ۱۹۶۲ء سے منظور کیا گیا۔

۱۳۷۲۹-A-T ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء م برات محمد ایف ایس سی۔ سی۔ ٹی قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر چک نمبر ۱۱۷ D.B ضلع بہاولپور کو تاریخ حاضری سے م دوست محمد خاں ایف اے سی۔ ٹی کی جگہ جو ۱۲ اگست

مستعفی ہو چکے ہیں۔ اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول راجن پور مقرر کیا گیا۔

یضاً — م محمد شفیع بی اے سی ٹی (ایک امیدوار) کو م برات محمد کی جگہ (جن کا تبادلہ ہو چکا ہے) تاریخ حاضری سے عارضی جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول، چک ۱۱ D.B/۱۷ ضلع بہاولپور مقرر کیا گیا (بمشاہرہ -/۱۰۰ روپے علاوہ الاؤنس)

ADMI ۱۴۴۰ نومبر ۱۹۶۲ء — م محمد صادق بی اے بی ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول تونسہ کو تاریخ حاضری سے م غلام قاسم بی اے بی ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس ڈیرہ غازی خاں مقرر کیا گیا (اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں)

ایضاً — م غلام قاسم بی اے۔ بی۔ ٹی۔ اے۔ ڈی۔ آئی ایس ڈیرہ غازی خاں کو م محمد صادق جن کا تبادلہ ہو چکا ہے کی جگہ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول تونسہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م غوث محمد قریشی بی اے بی ایڈ عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ سمابہ کو م محمد سعید اختر کی جگہ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م ابرار حسین بی اے۔ بی۔ ٹی قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول صادق آباد کو م محمد علی پیر کی جگہ تاریخ حاضری سے، بمشاہرۂ خود قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ محمد صفدر علی بی، ایس سی بی ٹی۔ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ کو تاریخ حاضری سے م بشیر احمد ایم اے بی۔ ٹی کی جگہ بمشاہرۂ خود قائم مقام اے ڈی آئی ایس شرقپور ضلع شیخوپورہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م محمد صدیق میٹرک ایس وی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی گارڈن لاہور کو تاریخ حاضری سے

بشاہرہ خود و رمیکلز ٹیچر سنٹرل ماڈل سکول لاہور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م عبدالخالق بی اے بی ایڈ جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول چک ۲۹۷ H.R ضلع بہاولنگر کو م عبدالرشید ارشد بی اے بی ایڈ کی جگہ تاریخ حاضری سے بشاہرہ -/۱۲۰ روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی سکول بہاولپور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م منظور احمد اختر بی اے بی ایڈ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ مڈل سکول چک ۴۳ B.R کو م غوث محمد قریشی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بشاہرہ -/۱۲۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ سمابہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م محمد سلیم ایم اے بی ایڈ جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چک ۱۲۲ ج.R کو م ابرار حسین کی جگہ (جن کا تبادلہ ہو چکا ہے) تاریخ حاضری سے بشاہرہ -/۱۷۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول صادق آباد مقرر کیا گیا۔

ایضاً م بشیر احمد عرشی بی اے۔ بی ایڈ قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول قصور کو م شوکت علی صدیقی بی اے۔ بی ایڈ کی جگہ تاریخ حاضری سے بشاہرہ -/۱۳۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م محمد برکت محمود بی اے بی ایڈ جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی گارڈن لاہور کو تاریخ حاضری سے م محمد صدیق احمد ایم اے بی ٹی کی جگہ بشاہرہ -/۱۳۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی گارڈن لاہور مقرر کیا گیا۔

ایضاً ق سجاد احمد ایم اے بی ایڈ قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول وحدت کالونی لاہور کو م امدادالدین انصاری ایم اے بی ٹی کی جگہ بشاہرہ -/۱۷۰ روپے تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول وحدت کالونی لاہور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م منیر احمد خاں بی اے بی ایڈ جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ گورونانک ہائی سکول ننکانہ کو م افتخار احمد آفتاب ایم ایس سی بی ایڈ کی جگہ بشاہرہ -/۱۳۰ روپے تاریخ حاضری سے

عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چونیاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً م بشیر احمد کامران بی اے بی ایڈ قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول سانگلا کو م منظور حسین بھٹی بی ایس سی بی ٹی کی جگہ (جن کا تبادلہ ہو چکا ہے) تاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول سانگلا مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔عبداللہ خاں بی اے بی ایڈ قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈی جی خاں کو م رحیم بخش سادھل کی جگہ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رنگ پور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م مسعود احمد کھوکھر ایم اے بی ایڈ (ایک امیدوار) کو جنھیں گورنمنٹ ہائی سکول نورپور نورنگا میں بحیثیت سینئر انگلش ٹیچر کام کرنے کا حکم ہوا تھا۔ تاریخ حاضری سے م عبدالحی انور ایم اے ایم ایڈ کی جگہ بمشاہرہ /-۱۷۰ روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ گکھڑ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔عبدالرؤف خاں بی اے بی ایڈ (ایک امیدوار) کو م بشیر احمد کھوکھر کی جگہ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول قتا بدرہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م محمد عالم بی ایس سی بی ایڈ (ایک امیدوار کو) ایک نئی عارضی آسامی پر (جو پہلے م سعید احمد کو پیش کی گئی تھی اور جس پر وہ حاضر نہیں ہوئے تھے) تاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول خانپور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م اختر حسین زیدی بی اے بی ایڈ (ایک امیدوار کو) ایک نئی عارضی آسامی پر (جو پہلے م مسعود احمد کھوکھر کو پیش کی گئی تھی) تاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول نورپور نورنگا مقرر کیا گیا۔

ایضاً م مشتاق احمد بی اے بی ایڈ (ایک امیدوار) کو م محمد نواز کی جگہ (جو لیکچرر مقرر کر دیئے گئے ہیں) تاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ گکھڑ

مقرر کیا گیا۔

ADMN ۱۴۰۹۳ ۴ ستمبر ۱۹۶۷ء — م محمد رفیق ولد اللہ دتا ایس وی میٹرک I (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بمشاہرہ -/۱۲۷ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول اکال گڑھ مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م محمد شکر گل ولد غلام محمد میٹرک I ایس وی I (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بمشاہرہ -/۱۲۷ روپے تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ لاہور مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م محمد رفیق ولد محمد ابراہیم میٹرک I ایس وی I (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۱۲۷ روپے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول شجاع آباد مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م فخر علی شاہ ولد روشن علی میٹرک I ایس وی I (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۱۲۷ روپے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول لیہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م محمد اشرف ولد سلطان احمد میٹرک ایس وی (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بمشاہرہ -/۱۲۷ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م نذیر احمد ولد عمر الدین میٹرک ایس وی (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بمشاہرہ -/۱۲۷ روپے تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول تونسہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م محمد یوسف ظفر ولد جان محمد میٹرک ایس وی (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بمشاہرہ -/۱۲۷ روپے تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ ادو مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م محمد شفیع ولد محمد ابراہیم میٹرک ایس وی (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بمشاہرہ -/۱۲۷ روپے تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول خانیوال مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م عبدالمجیب ولد محمد لطیف میٹرک ایس وی (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بمشاہرہ -/۱۲۷ روپے تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً — عنایت حسین ولد وزیر علی میٹرک ایس وی (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بشاہرہ -/۷۲ روپے تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈی جی خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م محمد صادق ولد عمر دین (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بشاہرہ -/۶۰ روپے (علاوہ الاؤنس) تاریخ حاضری سے عارضی ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول شجاع آباد مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م محمد جمیل ولد ابراہیم (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بشاہرہ -/۶۰ روپے علاوہ الاؤنس۔ تاریخ حاضری سے عارضی پی ٹی آئی گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م محمد جمیل ولد ابراہیم (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بشاہرہ -/۶۰ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی پی۔ ٹی آئی گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ADMN I 14614 ۴ اکتوبر ۱۹۶۲ء — م امام الدین ولد رحمت خاں میٹرک ایس وی I (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بشاہرہ -/۷۲ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م محمد یعقوب ولد م عبدالکریم میٹرک I ایس وی I (ایک امیدوار) کو م محمد سعید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے بشاہرہ -/۷۲ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م الٰہی بخش ولد میاں پلیہ میٹرک I ایس وی I (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بشاہرہ -/۷۲ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م عبدالمجید ولد محمد شریف میٹرک I ایس وی I (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر بشاہرہ -/۷۲ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول تلونڈی موسے خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م نذیر احمد ولد محمد ابراہیم میٹرک I ایس، وی I (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر

بتشاہرہ -/۷۲ روپے علاوہ الاؤنس، تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا ۔

ایضاً م۔ محمد رمضان ولد نور الدین میٹرک I ایس وی I (ایک امیدوار) کو م غلام نبی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے بتشاہرہ -/۷۲ روپے علاوہ الاؤنس، عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بہاولپور مقرر کیا گیا ۔

ایضاً م۔ شیر محمد ولد فتح محمد میٹرک I ایس وی I (ایک امیدوار) کو ایک نئی اسامی پر تاریخ حاضری سے بتشاہرہ -/۷۲ روپے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول نور پور نورنگا مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ مراد علی بلوچ ولد لشکر دین میٹرک I ایس وی I کو ایک نئی اسامی پر تاریخ حاضری سے بتشاہرہ /۷۲ روپے علاوہ الاؤنس عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول نور پور نورنگا مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ فخر الدین ولد ولی محمد میٹرک I ایس وی I (ایک امیدوار) کو ایک نئی اسامی پر بتشاہرہ -/۷۲ روپے علاوہ الاؤنس۔ عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول نور پور نورنگا مقرر کیا گیا ۔

ایضاً م۔ روشن دین ولد عمر دین ایچ اے او ٹی (ایک امیدوار) کو ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے بتشاہرہ -/۱۰۷ روپے علاوہ الاؤنس عارضی ایچ اے او ٹی گورنمنٹ ہائی سکول تلونڈی موسے خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً محمد اسلام ایچ پی او ٹی قائم مقام او ٹی گورنمنٹ ہائی سکول چک نمبر ۱۲۲/۹-R کو بتشاہرہ خود ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے قائم مقام اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول تلونڈی موسے خاں مقرر کیا گیا۔

I ۱۴ ۶ ۱۳ / ۸۵ ۱۱ ۱۱ تجویز م۔ محمد حسین ولد میاں احمد بخش ایچ پی او ٹی (ایک امیدوار) کو تاریخ حاضری سے م محمد اسلم

کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ عارضی اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چک ۱۳۲ ۔ ۷ مقرر کیا گیا
ان کا مشاہرہ -/۶۰ روپے ہوگا اور الاؤنس اس کے علاوہ۔

ایضاً م۔ محمد اسحاق ولد م فضل دین ایچ پی او ٹی ایک امیدوار کو ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۶۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول روہیلانوالی مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبدالرحمٰن خالد ولد معری خان ایچ پی او ٹی ایک امیدوار کو م۔ منیر الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے بمشاہرہ -/۶۰ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چک ۲۷۲ EB مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ نذیر مسیح ولد عنایت اللہ ایک امیدوار کو ایک نئی آسامی پر بمشاہرہ -/۶۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً ایم سردار محمد ولد محمد صدیق ایک امیدوار کو ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے بمشاہرہ -/۶۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول روہیلانوالی مقرر کیا گیا۔

۱۵۳۹۵ ADMN-I-3 ۹ اکتوبر ۱۹۶۳ء م۔ اقبال حسین بی اے بی ایڈ قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کسووالی کو م۔ محمد صفدر علی قریشی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً رانا محمد اکبر ایم اے بی ایڈ عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول چشتیاں کو (جنھیں جامعہ عباسیہ بہاولپور جانے کا حکم ہوا تھا) م۔ محمد صدیق ایس وی ٹیچر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ بمشاہرہ -/۱۷۰ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی لاہور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد حسین ایم اے بی۔ ایڈ ایک امیدوار کو م اقبال حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

تاریخ حاضری سے بشا ہرہ -/۷۰ روپے علاوہ الاؤنس قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کسو والی مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد جعفر بی اے۔ بی ایڈ ایک امیدوار کو رانا محمد اکبر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے، تاریخ حاضری سے قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر جامعہ عباسیہ بہاولپور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد اسلم بی اے بی ایڈ۔ ایک امیدوار کو م۔ نذر محمد کی جگہ تاریخ حاضری سے قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول دھاراں والا مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ شبیر عالم بی ایس سی بی ایڈ ایک امیدوار کو م۔ رشید حسین بی ایس سی بی ایڈ کی جگہ جو تاحال اس آسامی پر حاضر نہیں ہوئے تاریخ حاضری سے عارضی سائنس ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول احمد پور شرقیہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عاشق محمد بی اے۔ بی ایڈ ایک امیدوار کو م۔ محمد شریف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول صادق آباد مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ غلام رسول اختر بی ایس سی بی ایڈ ایک امیدوار کو م۔ محمد رفیق بی ایس سی بی ایڈ کی جگہ جو تاحال اس اسامی پر حاضر نہیں ہوئے عارضی سائنس ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈھاراں والا مقرر کیا گیا۔

ایضاً حافظ محمد اکرم بی اے بی ایڈ ایک امیدوار کو م۔ ذوالفقار احمد کی جگہ تاریخ حاضری سے سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول اُچ شریف مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ فاروق سلیم ایف، ایس سی، بی اے، بی ایڈ ٹیچر کالونی پرائمری سکول بہاولپور کو م۔ نور حسین بی ایس سی، بی ایڈ کی جگہ جو تاحال اس آسامی پر حاضر نہیں ہوئے تاریخ حاضری سے عارضی سائنس ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول صادق آباد مقرر کیا گیا ÷

آموزش

۱۵ شماره ٦ لاهور دسمبر ۶

اس شمارہ میں

آموزش

لاہور

دسمبر ۱۹۶۲ء

جلد ــــــــــ ۱۵

شمارہ ــــــــــ ۶

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

پبلشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی۔ لاہور

آر۔ ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۱۹۷ انارکلی لاہور سے شائع کیا

اداریہ

دوسرے ملکوں کی طرح پاکستان میں بھی تربیتِ معلّمین کا نصاب دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصّے میں تعلیم کے اصُول و نظریات ہیں، دوسرے حصے میں تدریس کی عملی مہارت۔ پہلے حصّے کی تکمیل کے لیے تربیت آموز کالجوں میں لیکچروں کا اہتمام کیا جاتا ہے، دوسرے حصّے کی تکمیل کے لیے معلّمین زیرِ تربیت کو مختلف مدارس میں تدریسی مشق کا موقع دیا جاتا ہے۔ تاکہ انہیں معلّمی کے فن سے عملی واقفیت ہو جائے۔ دراصل یہ عملی تجربہ ہی نظریاتِ تعلیم کو تصوّریت سے واقعیت میں لاتا ہے اور کلیاتِ تعلیم کو معانی پہناتا ہے۔ وہ مدرسے جن میں "تدریسی مشق" کا انتظام کیا جاتا ہے معلّمین زیرِ تربیت کے لیے معمل یا لیبارٹری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں کالج میں پڑھے ہوئے قاعدوں اور اصولوں کو تجربات کی کسوٹی پرکس کر پرکھا اور اپنایا جاتا ہے۔

تربیتِ معلّمین کے پروگراموں کی تنظیم و تکمیل کے سلسلے میں سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو تمام صوبے میں مرکزیت حاصل رہی ہے۔ یہاں طلبہ کی تعداد بھی پونے چارسو کے لگ بھگ ہوتی ہے جو پاکستان کے تربیت آموز کالجوں میں سے ہر ایک کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن پاکستان کے ثانوی مدارس میں پچیس ہزار تربیت یافتہ معلموں کی کمی کچھ اسی امر کی متقضی ہے کہ معلّمین زیرِ تربیت کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے۔ سنٹرل ٹریننگ کالج کے ہر دورۂ تربیت میں "تدریسی مشق" کے دو مواقع آتے ہیں۔ پہلا موقع آغازِ تربیت کے کچھ دن بعد، اور دوسرا موقع اختتامِ تربیت سے کچھ دن پہلے پہلی مشق دو ہفتے لیتی ہے۔ دوسری پورے ایک ماہ جاری رہتی ہے۔

امسال پہلی تدریسی مشق کے موقع پر سنٹرل ٹریننگ کالج کے پرنسپل اے جی بٹ صاحب کے ہاتھوں ٹریننگ کالج اور مقامی مدارس کے درمیان اشتراکِ عمل کا ایک نیا باب وا ہوا۔ پرنسپل صاحب

موصوف نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں تدریسی مشق کی ضرورت کے ساتھ ساتھ صدر معلموں کے تعاون کی اہمیت پر بطور خاص روشنی ڈالی۔ ان کی گراں بہا خدمات کو سراہا اور اُن کے وسیع علم اور وقیع تجربے کے واسطے دے کر انہیں مستقبل کے معلموں کی رہنمائی کا سرگرم حامی بنالیا۔ بلکہ "تدریسی مشق" کے اختتام پر معلمین زیر تربیت کو نمبر دیتے وقت بھی متعلقہ مدارس کے صدر معلموں کی رائے لی گئی۔ سنٹرل ٹریننگ کالج کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ٹریننگ کالج کے پروفیسروں اور تدریسی مشق مہیا کرنے والے صدر معلموں نے جمع ہو کر پرنسپل کی صدارت اور ڈویژنل انسپکٹر کی موجودگی میں "تدریسی مشق" کے طریقہ کار پر تبادلۂ خیالات کیا اور اس میں ترمیم و ترقی کے امکانات زیر غور لائے۔ پروفیسروں اور صدر معلموں کی یہ کانفرنس نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے زیر اہتمام ۲۸ نومبر ۱۹۶۲ء کو سنٹرل ٹریننگ کالج میں منعقد ہوئی تھی۔ اس موقع پر میاں سلطان محمود صاحب ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول کٹڑہ خزانہ، میاں عبدالعزیز صاحب ہیڈ ماسٹر مسلم ماڈل ہائی سکول، حاجی گلزار محمد صاحب ہیڈ ماسٹر کارپوریشن ہائی سکول مزنگ، اور دوسرے صدر معلم صاحبان نے فرداً فرداً سنٹرل ٹریننگ کالج کی نئی جمہوری پالیسی پر دلی اطمینان اور مسرت کا اظہار کیا۔ جیسا کہ جناب عبدالغفور صاحب طاہر قریشی ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول معصوم شاہ کی اُس تقریر سے واضح ہوگا جو آموزش کے زیر نظر شمارے میں شائع کی گئی ہے۔

پرنسپل صاحب موصوف کی جمہوریت پسندانہ تحریک تعاون کا یہ نتیجہ ہے کہ ثانوی مدارس کے صدر معلمین وقتاً فوقتاً بڑے خلوص سے ٹریننگ کالج کے طلبہ کو خطاب کرتے اور انہیں اپنے تعلیمی تجربات سے استفادہ کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ اس سلسلے کی تقاریر بھی انشاء اللہ آموزش کے صفحات کی زینت بنیں گی۔ میاں سلطان محمود صاحب ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول کٹڑہ خزانہ اور شیخ عبدالسلام صاحب ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ لاہور، کی تقاریر اس شمارے میں موجود ہیں۔

اُردو قاعدہ پر تنقیدی نظر

پروفیسر مختار علی جعفری سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور

یہ قاعدہ پرائمری مدارس کے ننھے منھے مبتدی طلبہ کے نصاب میں داخل ہے۔ یہ قاعدہ ایک تجربے کی حیثیت رکھتا ہے جس کو فاضل مدیران نے خود تسلیم کیا ہے اور یہ امید ظاہر کی ہے کہ اس تجربہ کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں معلمین کی گراں قدر رائے آئندہ ترمیم و ترتیب میں ان کی راہ نمائی کرے گی۔ اس گزارش کے پیش نظر اس قاعدے پر صحیح تنقید و تبصرہ تو پہلی جماعت کے معلمین ہی کر سکتے ہیں اور اُن کی رائے سب سے زیادہ وقیع ہو سکتی ہے اور ہونی بھی چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عمل تعلیم کی تین منازل ہوتی ہیں منزل اول نظریاتی ہے اور نظریہ قائم کرنے والے اصحاب عملی کام کرنے والے اصحاب سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ نظریہ قائم کرنے والے حضرات مجوزہ مقاصد یا نصب العین کے پیش نظر نصاب کی ترتیب و تدوین کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ دوسری منزل پر منتظمین آتے ہیں۔ ان حضرات کا کام زیادہ تر نظم و نسق مدارس اور اس بات کی دیکھ بھال ہوتا ہے کہ آیا مجوزہ مقاصد یا نصب العین کے حصول کے لیے جو ذرائع اختیار کئے گئے ہیں ان کا صحیح صحیح استعمال کیا جا رہا ہے یا نہیں۔ تیسری منزل پر معلمین کا گروہ آتا ہے جو عملی طور پر اُن مقاصد کے حصول کے لیے کام کرتے ہیں۔ صحیح معنوں میں ہم ماہر تعلیم اسی ہستی کو کہہ سکتے ہیں جو متذکرہ بالا تینوں کی حامل ہو۔ لیکن عمل کی دنیا میں یہ تینوں کام علیحدہ علیحدہ بٹ جاتے ہیں۔ اس معلم کے لیے جو درس و تدریس کے عملی کام میں مشغول ہے یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ فلاں نظریہ بیکار ہے اور محض اس بنا پر کہ وہ نظریہ اس معلم کی مشق یا مزاولت کے مطابق نہیں ہوتا اور محض اس غیر مطابقت یا تصادم کی بنا پر وہ اس نظریہ کو نہ قبول کرتا ہے اور نہ قابل عمل سمجھتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ نظریہ قائم کرنیوالے

حضرات کو بھی اُن عملی دقتوں اور مشکلات کا احساس نہیں ہوتا جو معلمین ان حضرات کے نظریات کو عملی جامہ پہنانے میں پیش آتی ہیں۔

طریق تدریس کو ایک ایسا عمل تصور کیا جائے جس کا معلم عادی ہو جاتا ہے اور یہ عادت یا تو روایت یا تربیت یا غور و فکر کے بعد منتخب کردہ اصولوں پر مبنی ہوتی ہے۔ روایت پر مبنی طریق کی منزل پہلی ہے۔ تربیت کے بعد اکتساب کردہ طریق کی دوسری منزل ہے اور یہ پہلی منزل سے کچھ بلند منزل ہے۔ تیسری منزل پر پہنچ کر معلم اپنے اور دوسروں کے تدریسی طریقوں کا جائزہ لیتا ہے اور اُن پر تنقید و تبصرہ کرنے کا انداز فکر پیدا کر لیتا ہے اس سے بھی بلند تر منزل وہ ہے کہ معلم خود ایسے تدریسی طریقے تجویز کرے جو اصولوں پر مبنی ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ معلم تربیت یافتہ ہو اور اُسے ان تمام تدریسی طریقوں کا علم ہو جو سابق میں وقتاً فوقتاً استعمال ہوتے رہے ہوں۔ وہ بندھے ٹکے اصولوں اور ان طریق ہائے تدریس سے بھی واقف ہو جن سے معلمین روز مرہ کام لیتے ہوں۔ وہ ان طریقوں کی لکیر کا فقیر بن کر نہ رہ جائے بلکہ اُن میں حسب ضرورت تغیر و تبدل بھی کر سکے اس لیے جہاں معلم کو نظریات کا علم ہو وہاں وہ مشقی طریق ہائے تدریس پر بھی عبور رکھتا ہو اور ایسا معلم ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہمارے ملک میں پہلی جماعت کے پڑھانے والے اساتذہ بالعموم مڈل-جے۔ وی یا زیادہ سے زیادہ میٹرک ایس۔ وی حضرات ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ تمام طریق ہائے تدریس سے مکمل واقفیت رکھتے ہوں یا نصاب میں جو خامیاں رہ گئی ہوں ان کو تدریس کے دوران میں دور کر سکیں اور جہاں ضرورت محسوس ہو از خود اس کمی کو پورا کر سکیں۔ میرا مقصد یہاں مذکورۃ الصدر اساتذہ کی تنقیص کرنا نہیں بلکہ قارئین کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرانا ہے کہ ان حالات میں اساتذہ میں سے بہت ہی کم ایسے ہوں گے جو اپنے تاثرات یا مشاہدات کو باقاعدگی سے ترتیب دے کر اپنی رائے کو فاضل مدیران تک پہنچائیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ نصابی کتب کچھ ایسی ہوں کہ ان سے اساتذہ ہی نہیں بلکہ طلبا بھی مکمل استفادہ حاصل کر سکیں۔

قاعدے کی تصنیف یا تالیف کرتے وقت مندرجہ ذیل امور کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ بچہ کے ماحول اور نفس مضمون میں تعلق ہو۔

۲۔ الفاظ کا ذخیرہ اور طرز نگارش بچہ کی عمر کے مطابق ہو۔

۳۔ جملوں یا اسباق میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہو وہ بچہ کی ذہنی عمر کے مطابق ہو۔

۴۔ کاغذ عمدہ اور لکھائی چھپائی دیدہ زیبا ہو۔

۵۔ تشریحی تصاویر صحیح اور جاذب نظر ہوں۔

اردو قاعدہ کا جائزہ لیتے وقت مندرجہ بالا امور کے علاوہ پڑھنا سکھانے کے تدریسی طریق پر تبصرہ کرنا بھی ضروری ہے۔

لاہور ریجن کے مبتدی طلبہ کی اکثریت ایسے گھرانوں سے آتی ہے جہاں اُردو نہیں بلکہ پنجابی بولی جاتی ہے۔ ہماری آبادی کا بیشتر حصہ دیہات پر مشتمل ہے اور لاہور ریجن کے دیہات میں بلا شک وشبہ عوام کی روزمرہ اور کاروباری زبان پنجابی ہے۔ البتہ تعلیم یافتہ طبقہ یا اردو بولنے والے ماں باپ کے بچے مدرسے میں داخل ہونے سے پہلے بھی اردو میں گفتگو کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ مگر ان بچوں کی تعداد اُن بچوں کے مقابلہ میں جن بچوں کی مادری زبان پنجابی ہے بہت ہی قلیل ہے۔ لہذا اردو قاعدے کے لیے لسانی مواد کا انتخاب کرتے وقت اس امر کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

تدریس اُردو کے مقاصد میں اُردو کا سمجھنا۔ بولنا۔ پڑھنا، اور لکھنا شامل ہیں۔ نفسیاتی پہلو سے اُن مقاصد میں سے اُردو کا سمجھنا سب سے پہلا قدم اور دوسرا اُردو بولنا ہے۔ اُردو پڑھنا یا لکھنا بعد کی چیزیں ہیں۔ اگر بچہ کی مادری زبان پنجابی ہے تو وہ اُردو سمجھنے اور بولنے میں دقت محسوس کرے گا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ پنجابی زبان کی آوازوں۔ اُس کے الفاظ اور لب ولہجہ سے آشنا ہے۔ اس لیے جب وہ اردو سیکھنا شروع کرتا ہے تو اُس کی مادری زبان کی آوازیں۔ الفاظ کا تلفظ اور اندازِ تکلم اُردو زبان کے سیکھنے میں حارج ہوتے ہیں۔

تلفظ

: روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ پنجابی میں عموماً "خ" کو "ک" یا "کھ" سے بدل دیتے ہیں تخت کو تکھت

اور خبر کو کھبر، اور اللہ بخش کو اللہ بشکا شوقاً عوام کی زبان سے سننے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ "ر" اور "ڑ" کی آوازیں باہم بدل جاتی ہیں۔ مثلاً پوری کو "پوڑی" اور چوڑی سڑک کو "چوری سرک"۔ اس کے علاوہ "ش" کی بجائے "س" "غ" کی بجائے "گ"۔ "ق" کی بجائے "ک"۔ "ص" کی بجائے "چ" مثلاً قمیص کو "قمیچ" وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ حروف کی آواز کے تقدم و تاخر میں رد و بدل مثلاً اللہ بخش کی بجائے اللہ بشکا یا حکیم کی بجائے "کھیم"۔ بعض الفاظ میں کچھ حروف کی آواز کا اضافہ مثلاً گھنٹہ کی بجائے "گھینٹہ" اور مٹھائی کی بجائے "مٹھیائی"۔ مشدّد الفاظ کو غیر مشدّد اور غیر مشدّد کو مشدّد مثلاً مہتاب الدین کو متاب دین اور لفظ کی بجائے لفّظ۔ سلطنت کی بجائے "سلطّنت"۔

اسی طرح وہ الفاظ جن پر زیر ہو اُن کو زبر کے ساتھ بولنا مثلاً کِتاب کی بجائے "کَتاب" یا مُسلم کی بجائے "مَسلم" اور "بہن" کی آواز "بھین" اور آخری آواز جھٹکے سے ادا کی جاتی ہے مثلاً "چل"۔ بل میں "ل" کی آواز جھٹکے سے ادا کی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر استاد کا تلفّظ اور لب و لہجہ صحیح ہے تو بچہ اردو زبان کے الفاظ صحیح تلفظ اور لب و لہجہ کے ساتھ ادا کر سکے گا۔ تاہم مندرجہ بالا امور کے پیش نظر ابتدائی الفاظ اُن حروف کی آوازوں پر مشتمل ہوں جن کو پنجابی بچہ آسانی سے صحیح طور پر ادا کر سکتا ہے۔ مثلاً راجا۔ تارا وغیرہ جو صفحہ نمبر ا پر استعمال کئے گئے ہیں ان کو بچہ صحیح تلفّظ کے ساتھ ادا کر سکے گا۔ مگر صفحہ نمبر ۹ پر بابا۔ مالا۔ کے صحیح تلفظ کی ادائے گی میں اس کا پنجابی لب و لہجہ اور آوازیں حارج ہوں گی۔ اس لیے استاد کو اس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ ابتدا ہی سے بچہ صحیح تلفّظ سیکھے۔ اسی طرح دُھن۔ رَس۔ دِق۔ چھت۔ بھلا ہنس وغیرہ وغیرہ۔ الفاظ پڑھاتے وقت استاد کو کافی دقت کا سامنا ہوگا۔

اس دقت کو دور کرنے کے لیے صفحہ "ل" پر معلمین سے گذارش کے تحت مندرجہ ذیل سفارش کی گئی ہے سلیبس میں مندرجہ ذیل ہدایات کے مطابق پہلے چھ سے آٹھ ہفتے تک زبانی تعلیم دی جائے گی مقصود یہ ہے کہ بچوں میں مشاہدے اور سماعت کی عادات استوار کی جائیں۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل

طریق کار تجویز کیا گیا ہے۔

۱۔ تصویریں اور ماڈل دکھا کر بات چیت کو غور سے سننے کی مشق کرائی جائے۔

۲۔ گھر، مدرسے اور ماحول سے متعلق جانی پہچانی چیزوں، کھلونوں اور تصویروں، اور بچوں کی دلچسپی کی دیگر اشیاء کے بارے میں گفتگو اور مکالمے کرائے جائیں۔

۳۔ جانوروں اور پرندوں کی کہانیاں سنی اور سنائی جائیں۔ ان میں تکرار کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

۴۔ بچوں کے گیت اور مختصر آسان نظمیں سنی اور سنائی جائیں"۔

زیر نظر قاعدہ انھیں ہدایات پر مبنی ہے۔ ابتدائی چار صفحات پر تصاویر دی گئی ہیں اور یہ خیال رکھا گیا ہے کہ یہ تصاویر زبانی تعلیم میں اساتذہ کی ممد ثابت ہوں گی۔ اساتذہ سے یہ توقع بھی کی گئی ہے کہ وہ ان تصاویر کے علاوہ اس قسم کی اور تصاویر اور ماڈل وغیرہ استعمال کریں۔ تصاویر کے متعلق مندرجہ ذیل ہدایات صفحہ "ا" پر درج ہیں۔

تصاویر یا ماڈل دکھا کر بچوں سے اس کے بارے میں گفتگو کی جائے۔ لفظ کی درست آواز کا خاص طور سے خیال رکھا جائے۔ آپ کی رہنمائی سے بچے نہ صرف صحیح تلفظ سیکھ جائیں گے بلکہ کھل کر بات کرنے میں ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی جائے گی۔ اور ساتھ ساتھ اسباق سے دلچسپی بھی بڑھتی جائے گی۔ بچوں میں کہانی سننے اور سنانے کا شوق فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔ اس شوق کو اجاگر کر کے آپ اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں

تصاویر

بچوں کے لیے لسانیات کی کتابوں میں تصاویر کا استعمال زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ سب سے پہلی کتاب جس میں تصاویر کا استعمال کیا گیا تھا وہ "آربس پکٹس" تھی جسے "کومینیس" نے مرتب کیا تھا اور ۱۶۵۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

پروفیسر گرنلس طلبہ پر تجربات کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ تقریباً نوے فی صد طلبہ بصری تصورات سے کام لیتے ہیں۔ نیومن کا کہنا ہے کہ سمعی کی نسبت بصری اعانت زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ چیزیں بچے کے ذہن نشین کرانے اور تدریسی عمل کو موثر بنانے میں تصاویر بہت مفید

ثابت ہوتی ہیں۔

تصاویر کے دو اہم استعمال ہو سکتے ہیں۔ ایک تو خوب صورتی کا استحسان پیدا کرنا۔ دوسرے معلومات بہم پہنچانا اور اُن کا ذہن نشین کرانا۔ نیز خیال آفرینی میں مدد ثابت ہونا اور اس کی مشق کے لیے مواقع بہم پہنچانا۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ کسی شے کی تعریف یا تشریح کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ اس کی فوٹو یا تصویر پیش کر دی جائے۔ اس لیے جب کسی شے کو جماعت کے کمرے میں طلبہ کے سامنے پیش نہ کر سکتے ہوں تو تصاویر کے ذریعہ ہم اُس شے اور اس کے لیے مستعمل لفظ میں براہِ راست رشتہ پیدا کر دیتے ہیں

تصاویر کے سلسلہ میں ایک بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ تصاویر ہو بہو ویسی ہی ہوں جیسی کہ اصل اشیا یا تصاویر سے جو کام ہم لینا چاہتے ہوں یا ان کے دکھانے سے جو مقصد ہمارے پیش نظر ہو، اس کے حصول میں اُن تصاویر سے پوری پوری مدد مل سکے تاکہ اصل اشیاء کے تعارف یا ادراک میں کسی غلطی یا کمی کا امکان باقی نہ رہے۔ ایسا نہ ہو کہ تصاویر سے طلبہ کے ذہن میں دھندلا سا خاکہ مرتسم ہو کر رہ جائے۔

قاعدہ میں تصاویر احتیاط سے کھینچی گئی ہیں۔ تاہم جو تصاویر قاعدہ میں دی گئی ہیں اگر وہ رنگین ہوتیں تو اُن چیزوں کا جن کی وہ تصاویر ہیں صحیح رنگ روپ بچوں کے ذہن نشین کرایا جا سکتا۔ اس کے علاوہ وہ رنگین تصاویر زیادہ جاذبِ نظر بھی ہوتیں۔

۱۔ قاعدہ کی تصاویر پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ صفحہ نمبر ۱ پر تصویر نمبر ۵ میں کتاب کی تصویر بنائی گئی ہے۔ مگر وہ تصاویر کی کتاب ہے اور اس قسم کی کتاب سے ہمارے ملک کے بچوں کی اکثریت ناآشنا ہوگی۔ نیز۔ دائیں صفحہ پر جو پھول کی تصویر بنائی گئی ہے۔ اس میں رنگ نہ ہونے کی وجہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ گلاب ہے یا کوئی اور پھول۔

۲۔ صفحہ نمبر ۳ پر جو پہلی تصویر ہے اُسے دیکھ کر بچے یہ پہچان نہیں سکتے کہ یہ کیا چیز ہے۔

۳۔ صفحہ نمبر ۴ پر تصویر نمبر ۳ میں یہ تفریق کرنا مشکل ہے کہ آیا اس تصویر میں ایک لڑکی گڑیا یا کسی ننھے بچے کو گود میں لیے ہوئے ہے۔

۴۔ اسی طرح اس صفحہ پر آخری تصویر کو دیکھ کر بچے مالا کا تصوّر ذہن میں پیدا نہیں کر سکتے اور

یہ پتہ لگانا تو بہت ہی مشکل ہے کہ اس لڑی میں موتی ہیں یا سونے یا لکڑی یا کسی اور شے کے منکے ہیں۔

۵۔ صفحہ نمبر ا پر تصویر نمبر ۲ دوسرے صفحہ پر تصویر نمبر ا، اور صفحہ نمبر ۴ پر تصویر نمبر ۲ و ۴ فعالی تصویریں اس قسم کی تصاویر زیادہ ہوتیں تو بہتر ہوتا۔ تاکہ گفتگو کرنے میں زیادہ مدد ملتی اور جملوں میں مختلف افعال استعمال کرنے کے زیادہ مواقع ہوتے۔

۶۔ صفحہ نمبر ۵ سے ۸ تک جو تصاویر دی گئی ہیں ان کے نیچے اگر اُن کے نام لکھ دیئے جاتے تو بہت اچھا رہتا، اِس طرح تصاویر کے ساتھ ساتھ بچے کے ذہن پر اُن الفاظ کی شکل بھی مرتسم ہوتی رہتی۔

۷۔ صفحہ نمبر ۵ تا ۸ پر یہ ——— ہے ، وُہ ——— ہے کی درمیانی خالی جگہ تصویریں بنائی گئی ہیں۔ لیکن "یہ" اور "وُہ" کے لیے کوئی اشارہ جس سے قریب یا بعید کا تصور ذہن میں آجائے نہیں دیا گیا۔ پہلا جملہ یہ طوطا ہے (لفظ طوطا ہم نے لکھا ہے) قاعدہ میں طوطے کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اِس جملہ میں انگلی کی شکل طوطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اگر بالکل قریب بنا دی جاتی، اور "وُہ آم" ہے (قاعدہ میں آم کی تصویر بنی ہوئی ہے) میں اُنگلی کی شکل آم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آم سے فاصلہ پر بنا دی جاتی تو یہ اور وہ کا مفہوم نیز ان الفاظ کی مخطوطی اشکال کی پہچان میں بچوں کو بصری امداد مل جاتی۔

راقم الحروف نے تجربہ کے طور پر ایک نہایت ہی ذہین بچی کو قاعدہ میں دیئے ہوئے طریق سے اور پھر اشارہ کے ساتھ دیئے ہوئے طریق پر اِن جملوں کو پڑھوانے کی سعی کی۔ بلا اشارہ کی صورت میں بچی یہ اور وہ میں جلدی تمیز نہ کر سکی۔ مگر اشارہ کے ساتھ بچی ہر مرتبہ یہ اور وہ صحیح طور پر کہتی رہی۔

قاعدے کے صفحہ نمبر ۵ سے ۸ تک "یہ" "ہے" "وُہ" "ہے" تین الفاظ کی مخطوطی اشکال ذہن نشین کرائی جانے کا اہتمام کیا گیا ہے اور سرورق پر "ڈائرکٹ میتھڈ" یا "دیکھو بولو" درج ہے۔

معلمین سے گذارش کے تحت صفحہ "د" پر مندرجہ ذیل ہدایت درج کی گئی ہے۔

. . . . . "ڈائرکٹ میتھڈ یا بین وگز کے طریق سے یہ - وہ اور ہے کی الفاظ کی مخطوطی اشکال ذہن نشین کرائی جائیں۔ اور حسب دستور تصویریں اور ماڈل اس غرض کیلئے استعمال کیے جائیں"

جہاں تک تصویر کا تعلق ہے یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ، وہ، اور ہے کی مخطوطی اشکال بچے کی نظر کے سامنے ہوں گی۔ ماڈل کے استعمال کی صورت میں اگر سہل انگار اساتذہ ڈائرکٹ میتھڈ کے طریق پر یہ اور وہ کے لیے قریب اور بعید کا اشارہ انگلی سے اور لفظ ہے زبان سے ادا کردیں تو یہ ۔ وہ اور ہے کی مخطوطی اشکال بچے کی نظر کے سامنے نہ ہوں گی بلکہ محض سمعی امداد ملے گی۔ ورنہ ماڈل کی صورت میں استاد کو علیحدہ علیحدہ کاغذوں پر 'یہ' 'وہ' اور 'ہے' لکھنا پڑے گا۔ اور ان کو گتوں کے ٹکڑوں پر چسپاں کرنا ہوگا۔ اور پھر ان الفاظ کو ماڈل کے دائیں اور بائیں طرف رکھ کر بچے کو پڑھانا ہوگا۔ میرا ناقص خیال یہ ہے کہ ہمارے پہلی جماعت کے اساتذہ کی اوّل تو سمجھ ہی میں نہیں آئے گا کہ ماڈل کے ساتھ اِس طرح پڑھائیں اور اگر ان کی سمجھ میں آ بھی جائے تب بھی وہ الفاظ کو مندرجہ بالا طریق پر لکھ کر پڑھانے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں گے۔

"ڈائرکٹ میتھڈ"

ڈائرکٹ میتھڈ دراصل کسی خاص طریق تدریس کا نام نہیں بلکہ اس اصطلاح کا اطلاق ان تمام طریقوں پر ہوتا ہے جن میں بچوں کی مادری زبان استعمال نہیں ہوتی۔ اِس معنی میں ڈائرکٹ میتھڈ کے استعمال سے یہاں یہ مراد لی جاتی ہے کہ استاد اور طالب علم دونوں پنجابی کا کوئی لفظ استعمال نہ کریں۔ لیکن جب ہم صفحات نمبر ۵ تا ۸ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں محض یہ ۔ وہ اور ہے تین الفاظ کی مخطوطی اشکال ذہن نشین کرائی گئی ہیں اور ان کے ذہن نشین کرانے کے لیے دیکھو اور بولو (بین گو طریق) کے استعمال کی ہدایت کی گئی ہے۔ اگر ہم مدیران کا مقصد صحیح طور پر سمجھ سکے ہیں تو اِس صورت میں ڈائرکٹ میتھڈ کے استعمال کا موقع و محل سمجھ میں نہیں آتا۔

پہلی جماعت کا استاد جو صحیح معنی میں نہ ڈائرکٹ میتھڈ کو سمجھتا ہے اور نہ طریق بین وگو کو وہ ایک قسم کی الجھن کا شکار ہو جائے گا کہ یا ڈائرکٹ میتھڈ کا ارد میں "دیکھو اور بولو" تو نہیں کہتے اور اس کے اِس خیال کو دونوں کے درمیان لفظ "یا" کے استعمال سے تقویت ضرور پہنچے گی۔

ہمارے خیال میں معلمین سے گذارش کے تحت محض طریق بین وگو کی سفارش کی جانا ہی کافی تھی،

ىدد ہاں بھی ڈائرکٹ میتھڈ کا ذکر بے محل نظر آتا ہے۔ نیز صفحہ نمبر ۵ کے سرورق پر ڈائرکٹ میتھڈ یا دیکھو اور بولو لکھا جاتا کیوں کہ صفحہ "ل" پر بالکل واضح طور پہ درج ہے کہ یہ ۔ وہ اور ہے کی مخطوطی اشکال دیکھو اور بولو کے لق سے ذہن نشین کروائی جائیں۔

صفحہ نمبر ۵ پہ ڈائرکٹ میتھڈ یا دیکھو اور بولو کے نیچے دوسری سطر میں یہ۔وہ۔ ہے یعنی یہ وہ تین غاظ درج ہیں جن کی مخطوطی اشکال کی پہچان کرانا مقصود ہے اور اگر ویسے دیکھا جائے تو یہ وہ ہے" بلے جملہ بھی ہے اور جس طرح ڈائرکٹ میتھڈ یا دیکھو بولو لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ وہ ہے لکھنے کی ھی ضرورت نہیں۔ اور اگر ان الفاظ کا لکھا جانا ہی ضروری تھا تو کم از کم نقطہ "وہ" کے گرد خطوط واحدانی لگا دیئے جاتے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس قاعدہ کی تصنیف کے وقت مدیران کے ذہن میں انگریزی زبان سکھانے کا بس منظر تھا۔ ڈائرکٹ میتھڈ کے طریق پر استاد جب انگریزی کا پہلا سبق پڑھاتا ہے تو مادری زبان کا استعمال ہیں کرتا۔ بلکہ جماعت میں جو چیزیں (مثلاً میز کرسی وغیرہ) موجود ہوتی ہیں ان کی طرف اشارہ کرتا ہے اور گر یہ چیزیں نزدیک ہوں تو (THIS IS A TABLE / CHAIR) اور اگر دور ہوں تو (THAT IS A TABLE/CHAIR زبان سے کہا جاتا ہے۔ اور بچے اس کے بعد ان جملوں کو دہراتے ہیں س طرح انگریزی سیکھنے والا بچہ ایک تو چند ایک اشیا کے لیے انگریزی الفاظ سیکھ لیتا ہے اور دوسرے ایک بنیادی ساخت کا جملہ BASIC STRUCTURE یعنی .... THIS (THAT) IS بھی ایسے رواں ہو جاتا ہے۔

زبانی مشق کرانے کے بعد استاد جب بچوں سے انگریزی کا قاعدہ پڑھنے کے لیے کہتا ہے تو کتاب میں ...... THIS IS A یا ...... THAT IS A چھپا ہوا ہوتا ہے اور جہاں ہم نے خالی جگہ چھوڑی ہے۔ وہاں ان اشیاء کی تصویریں ہوتی ہیں جن کے لیے بچوں کو انگریزی الفاظ کی زبانی مشق کرائی گئی ہے۔ اور ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان تصاویر کو دیکھ کر سیکھے ہوئے انگریزی الفاظ زبان سے ادا کریں گے۔ اور اس طرح پورا جملہ ...... THIS IS A دیکھ کر پڑھیں گے نیز

THIS (یہ) کے لیے قریب کا اشارہ اور THAT (وہ) کے لیے بعید کا اشارہ ہاتھ کی انگلی کی تصویر کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے۔ نیز .... THIS IS A والے جملے میں اشیاء کی تصویر .... THAT IS A .. والے جملوں میں دی ہوئی تصاویر کی نسبت انگلی کی تصویر کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ یہ بصری اعانت بچے کے ذہن میں THIS (یہ) اور THAT (وہ) کا صحیح مفہوم ذہن نشین کرانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

اس پس منظر کے پیش نظر یہ (وہ) ہے جو ...... THIS (THAT) IS A انگریزی کی بنیادی ساخت کا اردو ترجمہ ہے جو صفحہ نمبر ۵ پر درج کیا گیا ہے اور اسی بنا پر غالباً ڈائرکٹ میتھڈ درج کیا گیا ہے کیوں کہ ڈائرکٹ میتھڈ سے انگریزی پڑھانے والوں کا عموماً پہلا سبق ... THIS (THAT) IS ہوتا ہے لیکن چوں کہ قاعدہ کو مِن و عَن طریق پر پڑھایا جانا مقصود ہے۔ اس لیے ڈائرکٹ میتھڈ یا دیکھو بولو کے نیچے یہ وہ ہے درج کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہماری سمجھ میں اس کی کوئی اور تاویل نہ آسکی۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ انگریزی زبان کے ماہرین نے اپنی زبان پر بنیادی ساخت (BASIC STRUCTURE) کی ایک ایسی فہرست مرتب کر لی ہے۔ جن کو اگر کسی فرد کو سکھا دیا جائے تو وہ انگریزی کو صحیح طور پر بولنا اور لکھنا سیکھ سکتا ہے۔ لیکن ہماری زبان میں اس طرح کا کام اب تک کسی نے نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ (وہ) ہے کے علاوہ قاعدہ میں کسی اور ساخت کا ذکر نہیں بلکہ اسی ایک ساخت (جملہ) کو چار صفحات پر پھیلا دیا گیا ہے۔

یہ ——— ہے۔ وہ ——— ہے کے درمیان جو تصویریں دی گئی ہیں۔ وہ سب کی سب ماسوائے صفحہ ۷ پر لڑکا یا لڑکی کی تصویر کے وہی تصاویر ہیں جو صفحہ نمبر ۱ تا نمبر ۴ پر دی گئی ہیں۔ اس لیے استاد کو ان تصاویر کے لیے اردو الفاظ خود بتانے ہوں گے۔ اگر یہ الفاظ نہ بتائے گئے تو پنجابی بولنے والے بچے وہ منڈا ہے اور یہ کڑی ہے کہیں گے۔

تدریسی طریقے

کسی زبان کو پڑھانے کے لیے طریقے دو مختلف گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں:۔

۱- ترکیبی طریقے
۲- تحلیلی طریقے

ترکیبی طریقے سے ایسے تمام طریقے مراد ہیں جو ابتدا ہی سے الفاظ کے حروف اور ان کی آوازوں کے سکھلانے پر زور دیتے ہیں۔ ان طریقوں میں سے ایک تو طریق ابجد دوسرا صوتی طریقہ ہے۔

طریق ابجد میں پہلے حروف تہجی کی شناخت کرائی جاتی ہے۔ اس کے بعد الفاظ کی شناخت کرائی جاتی ہے یہ طریق ابجد اہل یونان واہل روم کے ایام سے عہد وسطیٰ تک عالمگیر حیثیت رکھتا تھا۔ اور ہمارے ملک میں آج بھی اکثر و بیشتر مدارس میں اساتذہ طلبہ کو اُردو پڑھنا اسی طریق سے سکھاتے ہیں۔ لیکن یہ طریق جس میں جزو سے کل کی طرف جاتے ہیں خلاف فطرت ہے۔ کیونکہ بچہ ابتدا میں اشیاء اور خیالات کل کی حیثیت سے کرتا ہے۔ خواہ اس کا یہ تصور کتنا ہی مبہم کیوں نہ ہو اور اس کے بعد تدریجاً ان کی تفاصیل یعنی جزو اکو پہچاننے لگتا ہے۔ یہ طریقہ غیر دلچسپ بھی ہے۔ کیونکہ اس طریقے کے حامی حروف کی شناخت پر زور دیتے ہیں اور اس طرح پڑھنے کا عمل معنی خیز نہیں بلکہ طوطے کی طرح رٹنے کے مترادف ہوتا ہے۔

صوتی طریق کے حامی یہ کہتے ہیں کہ الفاظ، حروف یا صوتی ارکان کی آوازوں سے مل کر بنتے ہیں اور اگر بچہ ان آوازوں کو پہچان سکتا ہے تو پھر آسانی سے الفاظ پڑھ سکتا ہے۔ ماہرین تعلیم نے اس طریق تدریس کی افادیت کو تسلیم کیا ہے۔ منزل (MENZEL) نے بالخصوص اس بات پر زور دیا ہے کہ اس طریق تدریس سے صوتی زبان سکھانے میں بڑی آسانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔

صحیح معنی میں صوتی زبان کہلانے کی وہی زبان مستحق ہو سکتی ہے جس میں ایک حرف کی ایک ہی آواز ہو اور ہر منفرد آواز کے لیے ایک حرف ہو۔ اس لحاظ سے تو اردو زبان کو صوتی زبان نہیں کہا جا سکتا۔ مگر انگریزی زبان کے مقابلے میں ہماری زبان بہت حد تک صوتی زبان ہے۔ اردو میں محض چند ایک آوازیں ہی ایسی ہیں جن کے لیے ایک سے زیادہ حروف ہیں مثلاً (ت۔ط) ث، س، ص)(ذ، ز، ض) (ع ء) ان سے پڑھنا سیکھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ البتہ لکھتے وقت دقت ضرور ہوتی ہے

تحلیلی طریقے: ۔ تحلیلی طریقوں میں وہ تمام طریقے شامل ہیں جو ابتدا ہی سے معنی پر زور دیتے ہیں

اس لیے ابتدا میں مکمل اور با معنی الفاظ یا جملے سکھائے جاتے ہیں۔ ان طریقوں کے ماہرین کا کہنا ہے کہ بچہ الفاظ کو پہچاننا اسی طرح سے جلدی سیکھ سکتا ہے جس طرح وہ مختلف چہروں کی پہچان کر لیتا ہے اور ان میں امتیاز کرنا سیکھتا ہے اور جلدی ہی وہ کافی الفاظ کا ذخیرہ فراہم کر لیتا ہے جس کی مدد سے وہ پڑھ سکتا ہے۔

ابتدا ہی سے معنی پر زور دینا اس لیے ضروری ہے کہ الفاظ کی شناخت کے ساتھ ساتھ معنی سمجھنا بھی ضروری ہیں۔ الفاظ کے معانی کا تعامل الفاظ کو شناخت کرنے کی قابلیت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے ابتدائی مراحل میں اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ قاعدہ میں وہ الفاظ پیش کیے جائیں جن سے بچہ پہلے سے آشنا ہو، اور ان کے معنی سمجھتا ہو کیوں کہ بچہ اس لفظ کو پہچاننا جلدی سیکھ لیتا ہے، جس کے معنی واضح ہوں جو بچہ کے لیے اہمیت رکھتا ہو یا جس سے بچہ کی دل چسپی وابستہ ہو۔ ایسے لفظ پر بچہ زیادہ توجہ دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لفظ بچے کے ذہن میں بہت دیر تک محفوظ رہتا ہے اور تکرار سے اس میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے اس جگہ مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ میں ایک بچی کا ذکر پہلے کر چکا ہوں اس کا نام عُفت جعفری ہے۔ اس کی عمر ابھی چار سال سے کم تھی کہ راقم الحروف نے اس بچی کو اس کا نام پڑھنا اور لکھنا سکھایا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس وقت وہ بچی اُردو کے مطبوعہ چارٹوں کی تصویریں دیکھ کر چند ایک الفاظ اور چند ایک حروف تہجی سیکھ چکی تھی ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ وہ اپنی بہن کے ہمراہ فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں گئی۔ ان دنوں وہاں ریڈ کراس کا ہفتہ منایا جا رہا تھا۔ اس بچی کی بہن نے دو روپے چندہ دیا، جس پر ایک خاتون نے اسے دو رسیدیں ایک ایک روپے والی دیں اور ایک پر بچی کا نام اور دوسری پر اس کی بڑی بہن کا نام انگریزی میں لکھ دیا۔ بچی نے کہا میرا نام اردو میں لکھیے، جس پر اس خاتون نے "عفت جافری" بچی پکار اُٹھی میرا نام ع سے ہے اور فوراً قلم لے کر جعفری لکھ کر دکھایا۔

طریق بین گو

طریق بین دگو تحلیلی طریقہ ہے۔ اس طریق سے پڑھنا سیکھنے والے بچہ کو با معنی الفاظ، مرکبات یا جملے

ابتدا میں سکھائے جاتے ہیں۔ جب وہ بچہ الفاظ کی شناخت کرنا سیکھ لیتا ہے تو ان کی توجہ ان اجزا کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جن پر وہ الفاظ مشتمل ہوتے ہیں۔ مثلاً جب بچہ لفظ "یہ" کو شناخت کرنا سیکھ لیتا ہے تو استاد بچے کو ی، اور ہ کی شناخت کرنا سکھاتا ہے۔ اس طرح بچہ کل سے جز کی طرف جاتا ہے اور یہ طریق فطرت کے عین مطابق ہے۔

طریق بین و گو کے تحت الفاظ کو معنی خیز ماحول میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان الفاظ کو پہلے استاد بولتا ہے اور بچے سنتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ان الفاظ کو دیکھتے ہیں اور پھر ان کو اپنی زبان سے ادا کرتے ہیں۔ یعنی بولتے ہیں تو دراصل طریق بین گو کا صحیح مفہوم "سنو۔ دیکھو اور بولو" سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

اس طریق کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی گئی ہے کہ ہر لفظ کی شکل معین ہوتی ہے اور اس لفظ کو اس کی معینہ شکل سے یاد رکھا جا سکتا ہے۔ بچہ اونچی آواز میں ان جملوں کو بار بار دہراتا ہے اور جملوں کو دیکھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس بچے کو ان الفاظ کی پہچان اس حد تک ہو جاتی ہے کہ ادھر لفظ آنکھ کے سامنے آیا اور ادھر بچے نے پہچانا۔ معنی کا تلازم پیدا کرنے کے لیے اکثر تصاویر سے بھی کام لیا جاتا ہے اور پھر جوں جوں بچہ نئے الفاظ سیکھتا جاتا ہے۔ ان کو بار بار جملوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس طرح بچے کو ابتدا ہی سے سمجھ کر پڑھنے کی عادت ہو جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ بچہ کی توجہ الفاظ کی تفصیل یا تحلیل۔ مثلاً حروف اور ان کی آوازوں کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے۔ اور ان حروف اور آوازوں کے ذریعہ بچہ کو از خود الفاظ کی شناخت کرنے اور ان کا تلفظ ادا کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس طریق میں ابتدا میں ایسے الفاظ جملوں میں استعمال کرنے چاہئیں جو اس زبان کی بنیادی آوازوں پر مشتمل ہوں۔ تاکہ بچہ جلد ہی اس زبان کے اصواتی عناصر پر عبور اور مہارت حاصل کر سکے۔

طریق بین گو کے خلاف اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ طریق بچوں میں لفظوں کی پہچان اور صحت لفظی کی استعداد کے پیدا کرنے میں اکثر ناکام رہتا ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔

(۱) بچہ معانی آفرینی کی مہارت حاصل کرنے میں، الفاظ کی شناخت کی طرف اتنی توجہ نہیں دیتا۔

(۲) بہت سے اساتذہ لفظوں کی شناخت کی مشق نہیں کراتے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مہارت بچوں میں خود بخود پیدا ہو جائے گی۔

(۳) وہ اساتذہ جنھوں نے اپنی تربیت کے زمانے میں ترکیبی طریق ہائے تدریس سے پڑھنا سیکھا ہو۔ ان کے لیے تحلیلی طریق سے پڑھانا بہت مشکل امر ہے۔ اس لیے یا تو وہ طریق بینِ گو کا صحیح استعمال نہیں کر سکتے یا کم از کم اس کے استعمال کرنے میں انہیں بہت دقت پیش آتی ہے۔

الفاظ کی تحلیل میں مہارت

اگر بچہ چاہے کہ وہ بغیر کسی کی مدد کے نئے لفظ خود پڑھ سکے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مندرجہ ذیل مہارتیں حاصل کرے۔

(۱) وہ ہر نئے لفظ کا مشاہدہ اور تجزیہ کرنا اس طرح سیکھے کہ اس لفظ میں اسے ایسی علامات (حروف) کا پتہ چل جائے جس سے اور نئے الفاظ کی شناخت میں مدد ملے۔

(۲) وہ نئے الفاظ کا تلفظ اور معانی نکالنے کی ترکیبیں سیکھے تاکہ جب کوئی نیا لفظ آئے تو وہ بغیر کسی اور کی مدد کے اسے پڑھ سکے۔

جب بچے میں یہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے تو بہت سے نئے الفاظ بغیر پڑھائے خود بخود سیکھ لیتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ لفظ کا تجزیہ کرنے سے پہلے وہ تمام لفظ پر نگاہ ڈالے اور پھر اس میں سے ہجی یا صوتی رکن کو نگاہ میں رکھے اور اس طرح صوتی ارکان کا تجزیہ کرنے سے وہ لفظ کو جلدی شناخت کر سکے گا۔ مثلاً باجا میں اگر وہ صوتی رکن "با" اور "جا" شناخت کر سکتا ہے تو "بابا" خود بخود پڑھ سکتا ہے۔ اور اسی طرح "بابا جا" اور "جا بابا جا" بھی پڑھ سکتا ہے۔ لیکن ان صوتی ارکان کی مشق الفاظ یا جملوں کے ذریعے کرائی جانی چاہیے نہ کہ الفاظ سے علیحدہ۔ تاکہ بچہ کی دلچسپی قائم رہے اور معنی آفرینی کا پہلو بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اس طریق سے ابتدا میں پڑھنے کا عمل ذرا سست رہتا ہے۔ مگر بچہ نئے الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ آسانی سے شناخت کر سکتا ہے۔ انگریزی زبان میں تو حروف کی آواز مختلف صوتی ارکان میں مختلف ہوتی ہے

مثلاً "C" کی آواز کبھی "S" کی اور کبھی "K" کی ہوتی ہے۔ اس لیے صوتی طریقہ انگریزی پڑھانے میں اتنا کامیاب نہیں ہوتا جتنا اردو پڑھانے میں۔ کیوں کہ اردو زبان میں حروف تہجی کی آواز مختلف صوتی ارکان میں اکثر و بیشتر یکساں رہتی ہے۔ اور جن الفاظ مثلاً "ڈ" اور "ی" کی آوازیں مختلف ہوتی ہیں وہاں اعراب کی موجودگی یعنی زبر، زیر اور پیش کے لحاظ سے ایک بندھے ٹکے قانون کے تحت ایک قسم کے صوتی ارکان میں ہمیشہ یکساں رہتی ہیں۔ مثلاً "و" سے پہلے اگر پیش ہو تو و کی آواز دُور۔ چُور۔ طُور سب میں یکساں ہے گی اور بچے کو ان آوازوں کے سیکھنے میں چنداں دقت پیش نہیں آتی۔ اس لیے اُردو پڑھانے میں صوتی طریقہ زیادہ موزوں ہے اور کامیاب رہتا ہے۔ اور ابتداء میں اگر حروف تہجی کی شناخت کے لیے طریقِ ہجا کو استعمال کیا جائے تب بھی بعد میں صوتی طریق سے کام لینا پڑے گا۔

حروف کے پیوند

انگریزی الفاظ میں حروف علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔ جب انھیں ملاکر کوئی لفظ ملایا جاتا ہے تو اُن حروف کی شکل میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اِس کے برعکس اُردو زبان میں حروف سے جب ہم الفاظ بناتے ہیں تو بعض الفاظ تو علیحدہ علیحدہ حروف سے بنتے ہیں مثلاً دادا۔ دارا۔ دے۔ دو۔ رب۔ رس وغیرہ۔ ان الفاظ میں حروف کی اصلی شکل قائم رہتی ہے۔ مگر اکثر و بیشتر الفاظ حروف کے پیوند سے بنتے ہیں۔ ان حروف کے پیوند میں حروف کی شکل قائم نہیں رہتی۔ بلکہ یا تو ان کی جزوی شکل رہ جاتی ہے۔ یا ان کی شکل مختلف ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ساتھ جب ہم حروف کا پیوند لگاتے ہیں تو ب کی مندرجہ ذیل شکلیں مثلاً "با" "بابا" اور بت میں "بہ" جیسے بچ میں "بہ" اور "لب" لبس میں پیدا ہوتی ہیں اور اِس صورت میں ایسے حروف کی شناخت میں ابتدا میں بچے کو دقت ہوتی ہے۔ مگر ایک دفعہ اگر حروف کے پیوند ذہن نشین ہو جائیں تو پھر ان حروف کی شناخت اور اِس کی مدد سے نئے الفاظ پڑھنے اور ان کا صحیح تلفظ ادا کرنے میں دقت محسوس نہیں ہوتی۔

قاعدہ کے صفحہ نمبر ۱۲ پر حروف کے پیوند بتائے گئے ہیں۔ پیوند کرتے وقت حروف کی جو مختلف اشکال بنتی ہیں ان کو علیحدہ انفرادی طور پر بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ اور مرکب حروف کی شکل میں بھی۔ مگر بعض مرکب

حروف سے با معنی الفاظ نہیں بنتے۔ غالبًا یہ صفحات استاد کی رہبری کے لیے ہیں۔ بچہ ان سے زیادہ مستفیض نہیں ہو سکتا۔

الفاظ

لسانی کتاب کا جائزہ لیتے وقت اِس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ آیا جن الفاظ کو اِس کتاب میں استعمال کیا گیا ہے۔ ان کا انتخاب کس بنا پر ہوا ہے۔ مثلاً ابتدائی قاعدے میں اُن الفاظ کا انتخاب کیا جانا زیادہ ضروری ہے جن کے پڑھانے یا سکھانے میں آسانی ہو۔ یا وہ الفاظ جو بچوں کی ذہنی ارتقا سے مناسبت اور موزونیت رکھتے ہوں۔ یا وہ الفاظ جن سے اور الفاظ بنانے میں مدد ملے وغیرہ

الفاظ کا انتخاب لسانی کتاب کا اہم جزو ہے۔ انگریزی زبان میں جو قاعدے لکھے جاتے ہیں۔ ان میں اس امر کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ الفاظ کا انتخاب صحیح ہو۔ انگریزی زبان میں خوش قسمتی سے الفاظ کے انتخاب کے سلسلے میں بہت کام ہو چکا ہے۔ اور ایسے الفاظ کی فہرستیں (مثلاً ڈاکٹر مائیکل ویسٹ کی جنرل سروس لسٹ) موجود ہیں جو ہزارہا بچوں پر تجربات کرنے اور متعدد کتب کے کروڑوں الفاظ گننے کے بعد بڑی احتیاط سے تیار کی گئی ہیں۔ ہمارے ملک میں اُردو زبان پر کسی نے الفاظ کے انتخاب کے سلسلہ میں کوئی کام نہیں کیا۔ اور اگر کسی صاحب نے کیا ہے تو راقم الحروف کی نگاہ سے نہیں گذرا۔ اس لیے ہماری کتابوں کا تو یہ حال ہے کہ ان میں مستعمل الفاظ کے انتخاب کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان کے الفاظ تو ایک تھیلے میں بند ہیں اور کتاب کا مصنف یا مدیر اپنا ہاتھ تھیلے میں ڈالتا ہے اور جو الفاظ اِس کے ہاتھ میں آجاتے ہیں اُن کو کتاب کے صفحات پر پھیلا دیتا ہے۔ اِس لیے الفاظ کے انتخاب کے متعلق تبصرہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہماری زبان میں کسی مستند فہرستِ الفاظ کی عدم موجودگی میں ہر شخص الفاظ کے انتخاب میں اپنی ذاتی اور انفرادی رائے رکھتا ہے۔ البتہ ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس سلسلہ میں بھی پہلی جماعت کے معلمین کی رائے زیادہ صحیح اور وقیع ہوگی کیونکہ ان حضرات کو یہ علم ضرور ہے کہ کون کون سے الفاظ ایسے ہیں جنھیں بچہ آسانی سے سیکھ لیتا ہے۔ یا اُستاد آسانی سے پڑھا سکتا ہے۔ مثلاً پڑھنا سکھاتے وقت پہلے تو ایسے الفاظ پڑھائے جائیں جن میں حروف کا پیوند نہ ہو بلکہ حروف اپنی انفرادی اور اصلی شکل میں موجود ہوں ایسے

الفاظ سے بچے کو حروفِ تہجی کی شناخت میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوگی۔ ہم یہاں ایسے الفاظ کی فہرست درج کرتے ہیں جو اسی اُردو قاعدے میں موجود ہیں۔

دادا - دادی - دد - دے - آج - آم - آپ - دہ - دس - رب - رٹ - ڈر - آڑو
ڈول - دس - دِل - دم - دُم - دہ - دِن - درزی - وردی - دری - دوا - رُک - رُت - اُس
اِس - اُن - اِن - اِک - دی - دِق - آگ - آپ - دُکھ - رُکھ - دوڑ - اور

اسباق کی ترتیب اِس طرح ہوتی کہ مندرجہ بالا الفاظ سب سے پہلے آتے۔ تاکہ علیحدہ علیحدہ حروف والے الفاظ استعمال کیے جاتے۔ اِس کا فائدہ یہ ہوتا کہ حروف کی اصل اَشکال بچوں کے ذہن نشین ہو جاتیں۔ ذیل میں مندرجہ بالا الفاظ کی مدد سے جملے بنانے کی سعی کی گئی ہے۔

(۱)
دادا آم دو
دادا دو آم دو
دادا دو آم دے دو

(۲)
دادی آم دو
دادی دو آم دو
دادی دو آم دے دو

(۳)
دادا دس آم دو
دادی دس آم دو
دادی دس آم دے دو

(۴)
دادا اِک آم دو
دادا اِک آم دے دو
دادا اور آم دو
دادا اِک اور آم دو
دادا اِک اور آم دے دو

(۵)
دادا اَب آم دو
دادا اَب اِک آم دو
دادا اب اک آم دے دو
دادا اب اِک اور آم دے دو

(۶)
دادا اِک آم دے دو
دادا اِک اور آم دے دو
دادی اِک اور آم دے دو
دادا اِک اور آم دے دو

(۷)
دادا چھ آم دو
دادی چھ آم دو
دادا چھ آم دو
دادا اب چھ آم دو
دادی اور چھ آم دو

(۸)
دادا آٹھ آم دو
دادی آٹھ آم دو
دادا آٹھ آم دو

۹

دادا دَس آم دے دو
دادی دَس آم دے دو
دادا دَس آم دے دو

۱۰

دادی دَس آم دو
دادی اِک اور آم دو
دادا چھ اور آٹھ آم دو

۱۱

وہ آم دو
دادا وہ آم دو
دادا وہ آم دے دو

۱۲

رَس دو
رس دے دو
دادی رس دے دو
دادا اور رَس دو
دادا اور رَس دے دو

۱۳

اِک دِن رہ
دو دِن رہ
دَس دِن رہ
چھ دِن رہ
آٹھ دِن رہ

۱۴

دری دے دو
وہ دری دے دو
اب وہ دری دے دو

۱۵

آج دری دے دو
آج اِک دری دے دو
آج وہ دری دے دو
دادا وہ دری دے دو

۱۶

آڑو دو
آڑو دے دو
دادا آڑو دے دو
دادا آج آڑو دے دو
دادا آج اِک آڑو دے دو

۱۷

ڈول دے دو
اب ڈول دے دو
دادا وہ ڈول دے دو
دادا آج ڈول دے دو

۱۸

ڈول رکھ دو
اب ڈول رکھ دو
دادا اب ڈول رکھ دو

۱۹

رَس دے دو
اب رَس دے دو
آج رَس دے دو
آج اور رَس دے دو

۲۰

اِک دری دے دو
آج دری دے دو
آج اِک اور دری دے دو

۲۱

دادا رَس دو
دادا رَس دے دو
دادا اب رَس دے دو
دادا اب اور رَس دے دو

۲۲

دادی آگ دے دو
دادا آج آگ دے دو
دادی آج آگ دے دو

۲۳

وردی دو
وردی دے دو
اب وردی دے دو

۲۴

درزی وردی دو
درزی وردی دے دو
درزی اب وردی دے دو
درزی آج وردی دے دو

(۲۵)
دوا دے دو
اب دوا دے دو
اب اور دوا دے دو

(۲۶)
دادا دوا دے دی
دادی دوا دے دی
دادا دوا دے دی

(۲۷)
دودھ دے دو
اب دودھ دے دو
اب اور دودھ دے دو
دادا آج اور دودھ دے دو

(۲۸)
دوا دے دو
دودھ دے دو
دادا اور دودھ دے دو

(۲۹)
دوا رکھ دو
دودھ رکھ دو
اب دودھ رکھ دو

(۳۰)
آؤ دوڑو
اب آؤ اب دوڑو
آؤ اور دوڑو

(۳۱)
دادا دوڑے
دادا اور دادا دوڑے
وہ دوڑے

(۳۲)
دادا آگئے
دادا اور دادا آگئے
وہ آگئے

(۳۳)
رب رب رٹ
اب رب رب رٹ
آج رب رب رٹ

مندرجہ بالا جملوں میں اکثر ایسے جملے ہیں جن کو بچے کھیل کھیل میں سیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح بچے کی فعالی قوت بھی کام میں آئے گی۔ ان جملوں سے بچے مندرجہ ذیل حروف صحیح شکل میں سیکھ سکتے ہیں

ا، ب، ٹ، ج، د، ڈ، ز، س، ک، گ، ل، م، ن، و، ہ، د، ی، بھ، ٹھ، چھ، کھ

اب چوں کہ بچے ب، ج، ل کی صحیح شکل شناخت کر سکتے ہیں تو ان حروف کے پیوند کی شناخت میں اُن کے لیے آسانی ہوگی۔ اس لیے باجا لا وغیرہ اس کے بعد سکھائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً

(۱)
دادا آم لا
دادا باجا لا
جا بابا جا
جا بابا جا۔ باجا لا

(۲)
بابا مالا لا
جا بابا جا۔ مالا لا
بابا مالا لا دو
بابا مالا دے دو وغیرہ

اِس کے بعد حروف "یہ" اور "ہے" جن کی مجموعی شکل ابتدا میں سکھائی گئی ہے۔ سکھائے جا سکتے ہیں۔ بچے 'یہ' اور 'ہے' پڑھنے سے پہلے ہ اور ی کی علیحدہ علیحدہ شناخت کر سکتے ہیں اور اب پیوند کی شکل میں اُن کو سکھائی جا سکتی ہیں مثلاً۔

یہ آم ہے
یہ آلو ہے
یہ مالا ہے
وہ آم ہے
وہ باجا ہے
وہ جالا ہے   وغیرہ وغیرہ

ان اسباق کے ساتھ ساتھ حروف کا پیوند بچوں کو سکھایا جائے، اور اِس کی شناخت کرائی جائے۔ اسباق اس طرح ترتیب دیا جائے کہ تقریباً تقریباً سب حروف کے پیوند لفظوں کے ذریعے سکھائے جائیں اور لفظوں کو جملوں میں استعمال کرنے سے لسانی سیاق و سباق کے ذریعے ہم ان الفاظ کے مفہوم و معانی کو بچے کے ذہن نشین کرا سکتے ہیں۔ نیز اِس طرح بچوں کو محض پڑھنا ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ لکھنا بھی سکھایا جا

اسباق کی ترتیب میں اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ پہلے وہ الفاظ استعمال کئے جائیں جن ما صوتی ارکان دو حرفی پیوند پر مشتمل ہوں۔ اِس کے بعد تدریجاً۔ پیوند کے حروف کی تعداد۔ نیز الفاظ حروف کی تعداد کو بڑھایا جائے۔ تاکہ بچہ از خود بھی نئے الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ سکے۔

نقل الفاظ

قاعدہ کا جائزہ لیتے وقت یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ بچے پر نئے الفاظ سیکھنے کا بوجھ کس حد تک ڈالا گیا ہے۔ اور ہر نئے سبق میں کتنے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ابھی تک یہ طے نہیں پایا کہ پہلی جماعت میں بچے کو کتنے الفاظ سکھائے جائیں۔ اس میں بھی ہر شخص ذاتی رائے کا اختیار رکھتا ہے۔ اور اگر ہم انگریزی قاعدوں میں مستعمل الفاظ کی تعداد کے مطابق اُ

قاعدوں میں بھی الفاظ کی اتنی ہی تعداد مقرر کردیں تو سوائے نقالی کے اس سے کچھ اور فائدہ نہیں ہو سکتا ضرورت اِس امر کی ہے کہ اس سلسلے میں بھی تجربات کرنے کے لیے وسیع میدان رہے۔ ٹیکسٹ بک بورڈ کی تشکیل کے بعد یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہماری زبان میں بھی اس قسم کا کام ہو سکے گا۔

قاعدہ میں کل ۴۲ صفحات ہیں جن میں سے اسباق کے صفحات انتیس ہیں الفاظ کی مجموعی تعداد ۴۳۴ ہے اور اس طرح اوسطاً الفاظ فی صفحہ پندرہ ۱۵ آتی ہے۔ الفاظ کی تعداد تو مناسب معلوم ہوتی ہے۔ مگر الفاظ کو مختلف صفحات پر برابر بانٹا نہیں گیا۔ ذیل میں ہم مختلف صفحات پر نئے الفاظ کی تعداد درج کرتے ہیں۔

صفحہ	نئے الفاظ
۵ تا ۸	۳
۹	۷
۱۰	۵
۱۱	۱۱
۲۰	۵
۲۷	۳۰
۳۷	۳۴
۳۸	۳۶
۴۱	۴۲
۴۲	۲۰

تکرار

نئے الفاظ کو بار بار استعمال کرنے سے وہ لفظ صحیح طور پر ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر مائیکل ویسٹ

کا کہنا ہے کہ نیا لفظ جب پہلی بار پڑھایا جائے تو وہ کم از کم اس سبق میں تین دفعہ استعمال کیا جائے اور اس کے بعد اسباق میں وہ لفظ کچھ وقفوں کے بعد پھر استعمال کیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ لفظ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے اور اس کے استعمال کی ضرورت نہ رہے اور زبان میں الفاظ کی تکرار سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جب لفظ بچے کی آنکھوں کے سامنے بار بار آئے گا تو اس لفظ کے ہجے (یعنی حروف تہجی جن سے وہ لفظ مرکب تھا) بھی اس بچے کے ذہن نشین ہو جائیں گے۔ ہماری زبان میں چند ہم آواز حروف مثلاً ت ط یا ث س ص یا ز ذ ض ظ یا ع ء موجود ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ الفاظ کی صحیح صحیح شکل اگر بچے کے ذہن میں موجود نہ ہو تو پھر وہ طوطا۔ ط سے لکھنے کی بجائے ت سے بھی لکھ دے گا۔ اسی طرح بچہ قاعدہ کے وزن پر قاعدہ یا پھر فائدہ کے وزن پر فائدہ لکھ دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو پڑھاتے وقت اساتذہ طریق تہجی پر زور دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اُردو زبان تدریس میں ہجوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

اسی سلسلہ میں ہم یہ گذارش کریں گے کہ لکھنے میں بچوں کی غلطیاں عموماً وہی طلبہ کرتے ہیں جو پڑھنے میں بھی کمزور ہوتے ہیں۔ اس لیے بچوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ اسباق کو بار بار پڑھیں۔ اس طرح بار بار پڑھنے سے ان کے ذہن میں یہ بات مرتسم ہو جائے گی کہ طوطا، ط سے ہے نہ کہ ت سے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم طریق تہجی کی افادیت سے قطعی انکار کر رہے ہیں۔ لیکن ہم اس خیال کی بھی تائید نہیں کر سکتے کہ اُردو پڑھانے میں طریق تہجی سے کام لیا جا سکتا ہے۔

قاعدہ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نئے الفاظ کی تکرار کا اہتمام ضرور کیا گیا ہے۔ مثلاً صفحہ پانچ سے لے کر آٹھ تک محض یہ۔ دہ اور سے تین الفاظ ہی بار بار دہرائے گئے ہیں۔ مگر بعد کے اسباق میں ہر لفظ تین بار نہیں دہرایا گیا۔ بعض الفاظ ایک بار سے زیادہ استعمال نہیں ہوئے اور بعض الفاظ محض لکھ دیئے گئے ہیں مگر جملوں میں استعمال نہیں کیے گئے۔ مثلاً:

۱۔ صفحہ نمبر ۱۱ پر لفظ "تایا" درج ہے۔ مگر جملوں میں کہیں درج نہیں کیا گیا اور نہ ہی اسباق میں کسی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ صفحہ نمبر ۱۲ پر یاتا۔ تاکا۔ کاتا۔ تاجا درج ہیں۔ مگر جملوں میں استعمال نہیں کیے گئے۔

سی طرح

۳ - صفحہ نمبر ۱۳ پر جالا ۔ بیاٹا ۔ مالا ۔ جملوں میں استعمال نہیں کیے گئے ۔

۴ - صفحہ نمبر ۱۹ پر ان ۔ دی ۔ اُن ۔ رُت جملوں میں استعمال نہیں کئے گئے ۔

۵ - صفحہ نمبر ۲۳ پر تصاویر کے نیچے جو الفاظ درج ہیں ان میں سے تین الفاظ "تھیلا" ۔ "جھنڈا" ۔ اور "چھتری" قاعدہ میں کسی سبق میں جملوں میں استعمال نہیں کیے گئے ۔ حالاں کہ صفحہ نمبر ۱۴ پر جہاں "اب موسلا دھار بارش ہونے لگی" درج ہے ۔ وہاں چھتری کا لفظ آسانی سے استعمال کیا جا سکتا تھا ۔ اسی طرح صفحہ ۲۵ پر پاکستان ہمارا وطن ہے کے سلسلہ میں لفظ جھنڈا بھی استعمال کیا جا سکتا تھا ۔

۶ - صفحہ نمبر ۲۵ پر گھی درج ہے ۔ مگر تمام قاعدے میں کہیں جملوں میں استعمال نہیں کیا گیا ۔

۷ - صفحہ نمبر ۲۷ پر کھوٹ درج ہے ۔ مگر تمام قاعدہ میں کہیں جملوں میں استعمال نہیں کیا گیا ۔

۸ - صفحہ نمبر ۳۲ پر جائے ۔ کھائے ۔ جہاں ۔ کہاں ۔ وہاں بالکل استعمال نہیں کیے گئے ۔

بہتر ہوتا اگر یہ الفاظ جملوں میں بھی استعمال کر دیئے جاتے ۔ لسانی سیاق و سباق کے بغیر الفاظ کا پڑھانا بالکل بے معنی سا عمل بن کر رہ جاتا ہے ۔

بعض الفاظ ایسے ہیں کہ درج کسی صفحہ پر ہیں اور ان کا استعمال کسی اور صفحہ پر کیا گیا ہے ۔ مثلاً

۱ - صفحہ نمبر ۱۱ پر لفظ ناچا درج ہے ۔ مگر اس کا استعمال صفحہ نمبر ۱۲ پر کیا گیا ہے ۔

۲ - صفحہ نمبر ۱۹ پر لفظ اِس درج کیا گیا ہے مگر صفحہ نمبر ۲۸ پر پہلی بار جملہ میں استعمال کیا گیا ہے ۔ اور محض ایک بار اور ۔ اسی صفحہ ۱۹ پر لفظ دُم درج ہے ۔ مگر صفحہ نمبر ۲۳ پر اگلے سبق میں استعمال کیا گیا ہے اور وہ بھی ایک بار

ترتیب الفاظ

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ الفاظ اِس طرح پیش کیے جائیں کہ پہلے اسباق میں دو حرفی پیوند پر مشتمل الفاظ آئیں اور بعد کے اسباق میں تدریج پیوند کے حروف کی تعداد بڑھتی چلی جائے ۔ مگر قاعدے میں بعض جگہ اِس کا خیال نہیں رکھا گیا ۔ مثلاً

صفحہ ۳۷ پر چھ حروف کے الفاظ "چنبیلی" اور "تیتلیاں" استعمال ہوئے ہیں ان کے مقابلہ میں صفحہ ۳۸، ۱۰ پر کوئی لفظ چھ حروف سے مرکب نہیں صفحہ ۱۳ پر الفاظ کا پڑھنا آسان ہے اور اس کے برعکس صفحہ ۲۴ پر دھاڑتا۔ چنگھاڑتا چھ حرفی اور ہنہنانا یا سات حرفی الفاظ آئے ہیں البتہ صفحہ ۲۶ پر جو قاعدہ کا آخری صفحہ ہے "پاکستان" سات حروف سے مرکب اور پاکستانی آٹھ حروف سے مرکب الفاظ آئے ہیں جو ترتیب کے لحاظ سے صحیح ہیں۔

لسانی مواد

لسانی مواد بالنفس مضمون کے لحاظ سے اگر قاعدہ کا مطالعہ کیا جائے تو فاضل مدیران نے اس امر کا پورا پورا خیال رکھا ہے کہ نفس مضمون بچہ کے ماحول سے متعلق ہو۔ الفاظ کا ذخیرہ اور طرز نگارش بھی بچہ کی عمر اور ذہنی ارتقا کے مطابق ہو۔ اور اس سلسلہ میں ان کی سعی قابل صد ستائش ہے۔ خصوصاً صفحہ نمبر ۲۰ پر دونوں نظمیں بچوں کے لیے بہت ہی موزوں ہیں اور راقم الحروف نے اکثر و بیشتر بچوں کو نظمیں مزے لے لے کر پڑھتے اور گاتے سنا ہے۔ ان نظموں کے لیے تصاویر بھی دی گئی ہیں جو بچوں کی مزید دلچسپی کا باعث ہیں۔

صفحہ نمبر ۴ پر الفاظ کی جگہ تصاویر دی گئی ہیں اور بچے سے توقع کی گئی ہے کہ وہ تصاویر کی جگہ الفاظ استعمال کرے۔ انگریزی قاعدوں میں تو یہ ترکیب اکثر و بیشتر استعمال ہوتی ہے۔ مگر اردو قاعدہ میں اب تک عام طور سے یہ طریقہ کام میں نہیں لایا جاتا تھا۔ اس سے بچوں کی قوت مشاہدہ اور قوت بیان کو بروئے کار لانے کے لیے مواقع ملتے ہیں۔ اگر اس طریق کے اسباق کچھ اور بھی ہوتے تو بہتر ہوتا۔ غالباً یہ سبق استاد کی رہبری کے لیے ہے۔ تاکہ وہ اس طرح کے اسباق تختہ سیاہ پر لکھ کر بچوں میں دلچسپی پیدا کرے۔

دو ایک جگہ ہمیں فاضل مدیران سے اختلاف ہے مثلاً صفحہ نمبر ۹ پر ماما کا لفظ درج ہے۔ ہم اردو میں ماموں کہتے ہیں۔ "ماما" پنجابی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر ماما سے مراد ملازمہ لی جائے جو گھروں میں عموماً کھانا پکانے کا کام کرتی ہے تو یہ لفظ بچوں کے ماحول کے مطابق نہیں، اس لیے غیر موزوں ہے۔ اسی طرح صفحہ نمبر ۱۱ پر چاچا کا لفظ ہے۔ پنجابی گھروں میں عموماً بچے چچا کو چاچا کہتے ہیں اور اس طرح

ان کے اِس خیال کو تقویت پہنچے گی کہ لفظ چاچا، چچا کے معنی میں اردو میں بھی مستعمل ہے۔ اور تایا کے بعد اس لفظ کا استعمال اسی امر پر دلالت کرتا ہے کہ اسے چچا کے معنی میں استعمال کیا گیا۔ ویسے چاچا کا لفظ اس سبق میں استعمال نہیں کیا گیا۔ البتہ صفحہ ۲۰ پر نظم میں ضرور استعمال کیا گیا ہے۔ مگر وہاں اس لفظ سے چچا کا مفہوم نہ نکلتا ہے نہ لیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ مصرعہ میں اس سے پہلے 'چی چوں، چی چوں' آوازوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں اسی طرح چاچا بھی آواز کو ظاہر کرتا ہے یعنی چا ایک آواز اور چا دوسری آواز۔

اسی طرح صفحہ نمبر ۳۱ پہ 'دارا دانا ہے' میں 'دانا' عقلمند کے معنی میں بچوں کی ذہنی عمر کے لحاظ سے موزوں نہیں۔

صفحہ نمبر ۳۴ پہ ایک سے دس تک گنتی اشعار کے ذریعہ سکھائی گئی ہے۔ ان اشعار کو بھی بچے خوب مزے لے کر گاتے ہیں۔ ہمیں ان اشعار میں سے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ 'یار' کے استعمال پر اعتراض ہے۔ اگر یہ قاعدہ محض بچوں کے لیے ہی ہوتا تو اِس مصرع میں لفظ یار پر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ لیکن بچیوں کے لیے بھی یہی قاعدہ ہے۔ اور جب ہم یہ تصوّر کرتے ہیں کہ ایک ننھی سی بچی آ دُمل کر بیٹھیں یار پڑھے گی یا گائے گی تو ہمیں اس تصوّر سے ہی ایک ذہنی کوفت پیدا ہونے لگتی ہے کیوں کہ ہماری زبان میں لفظ یار کا مفہوم کسی طریق سے بھی سہیلی کا نہیں لیا جاسکتا اور ایک ننھی سی بچی اگر یہ پوچھ بیٹھے کہ یار کے کیا معنی ہیں یا اِس سے کیا مراد ہے تو پھر اس کی توضیح یا تشریح کرنا استانی کے لیے بہت دقت طلب نہیں بلکہ تکلیف دہ بھی ہے۔ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ وہ بیچاری اِس لفظ کے معنی ننھی سی بچی کو سمجھا ہی نہیں سکتی۔

حروف تہجی کی شناخت

صفحہ نمبر ۹ سے صفحہ ۱۳ تک مختلف الفاظ کے ذریعے حروف تہجی سکھائے گئے ہیں۔ ان اسباق میں ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو چار حروف سے مل کر بنتے ہیں۔ لیکن یہ الفاظ دو حرفی ہجے تکرار پر مشتمل ہیں مثلاً بابا، باجا - تارا، چارا - راجا، رانا - بعض ایسے الفاظ ہیں جن میں چاروں حرف علیحدہ ہیں۔ مثلاً دارا - دادا

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ابتدائی اسباق میں اگر دادا ، دارا کی طرح کے الفاظ سکھائے جاتے تو بہتر ہوتا کیوں کہ ان الفاظ کے ذریعہ حروف کی صحیح اور اصلی شکل بچہ کے ذہن نشین کرائی جا سکتی۔

ان اسباق میں جن حروف کی پہچان کرائی گئی ہے۔ یا یوں کہیے کہ الفاظ کے ذریعے جن حروف کی آواز سکھائی گئی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

ا ، ب ، پ ، ت ، ج ، چ ، د ، ر ، ڑ ، س ، ک ، گ ، ل ، م ، ن ، و ، ہ ، ء ، ی

چوں کہ صفحہ نمبر ۹ سے ۱۳ تک تمام حروف تہجی کی پہچان الفاظ کے ذریعہ نہیں کرائی جا سکی اس لیے صفحات نمبر ۱۴ سے ۱۷ تک الفاظ سے حروف اور حروف سے آواز کی پہچان تصاویر کے ذریعہ کرائی گئی ہے اور تصاویر کے اوپر الفاظ درج کیے گئے ہیں۔

اب تک عموماً قاعدوں میں تصاویر کے اوپر یا نیچے ایسے الفاظ درج کئے جاتے تھے جن کا ابتدائی حرف اس حرف تہجی سے شروع ہوتا تھا۔ مثلاً "ا" سے "آم" "ب" سے "بلی"۔ مگر ان الفاظ میں وہی دقت پیش آیا کرتی تھی جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں یعنی حروف تہجی کی اصلی شکل بچوں کے سامنے نہیں آئی تھی۔ فاضل مدیران نے اس دقت کو دور کرنے کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن کے آخر میں اُس حرف کی آواز آتی ہے جس کی پہچان کرانا مقصود ہے۔ مثلاً

"ڑ" کے لیے گھوڑا ۔ "ب" کے لیے کتاب محض دو الفاظ ایسے رہے ہیں جن میں حرف ابتدا میں استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً "ژالہ" اور "ظروف" مگر ان دونوں الفاظ میں حروف کی اصلی شکل قائم رہتی ہے۔

حروف تہجی میں سے ذ اور ز دو ایسے حروف ہیں جن کی پہچان نہیں کرائی گئی۔ ان حروف کی پہچان کے لیے دو تصاویر ایک "باز" اور دوسری "ذخیرہ" کی اگر بنا دی جاتی اور ان کے اوپر لفظ باز اور ذخیرہ درج کر دیا جاتا تو الفاظ سے تمام حروف تہجی اور حروف سے آواز کی پہچان کرائی جا سکتی تو حروف تہجی کی الفاظ کے ذریعے پہچان کرانے کے بعد صفحہ نمبر ۱۸ پر تمام حروف تہجی انفرادی شکل میں

مدرج ہیں۔ غالباً اِس منزل پر حروفِ تہجی کا اندراج اس لیے کیا گیا ہے کہ استاد اس امر کا جائزہ لے سکے کہ آیا طلبہ تصاویر کی مدد کے بغیر اِن حروف کو پہچان سکتے ہیں یا نہیں۔

پاکستان کے قیام کے بعد جتنے قاعدے چھپے ہیں ان میں یہ قاعدہ اپنی نوعیت کا واحد قاعدہ ہے کیوں کہ یہ قاعدہ ایک تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس لیے اِس قاعدہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے فاضل مدیران نے اِس قاعدہ کو اس طرح ترتیب دینے کی سعی کی ہے کہ پہلی جماعت کے اساتذہ ننھے ننھے پاکستانی بچوں کو اپنی زبان سکھانے کے لیے پرانے اور دقیانوسی طریقِ تدریس کو چھوڑ کر جدید اور دل چسپ طریقِ تدریس سے کام لے سکیں۔ تاکہ ان بچوں میں اپنی قومی زبان سیکھنے کے لیے دل چسپی اور شوق پیدا ہو۔ بچوں کی دل چسپی برقرار رکھنے کے لیے معلّمین سے گذارش کے تحت یہ سفارش کی گئی ہے کہ بچوں کو جانوروں اور پرندوں کی کہانیاں سنائی جائیں۔ لیکن اس قاعدہ میں فاضل مدیران نے کوئی کہانی درج نہیں کی۔ ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ ننھے ننھے بچوں کو کہانیاں سننے اور سنانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ اس اصول کے پیشِ نظر بچوں کے قاعدے میں کہانیوں کا نہ ہونا ایک بہت بڑی کمی ہے اور قاعدہ کا مطالعہ کرنے پر اِس کمی کا احساس بڑی شدت سے ہونے لگتا ہے ۔

جدید فارسی ——— ایک تاریخی جائزہ

محمد خان لیکچرر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور

سلسلے کے لیے آموزش نومبر ۱۹۶۲ء کا شمارہ نمبر ۵ ملاحظہ فرمائیے :۔

(——— ملک کے دانشوروں کی ایک اکادمی ترتیب دی گئی ——— اس

ادارے کا نام فرہنگستان رکھا گیا۔ سلسلہ نمبر ۲

فرہنگستان کی تشریح استاد پور داؤد نے یوں فرمائی ہے۔

فرہنگ اور ستان

فرؔ یا فرا اوستائی زبان میں پیشوند یا پسوند کو کہتے ہیں فرارفتن اور فرارسیدن

ہنگ قصدونیت (شائد اسی لیے سعدیؒ نے انہی معنوں میں استعمال کیا

دونوں مل کر ہوئے دانش و ادب { چو آہنگِ رفتن کند جان پاک

ستان کے معنی جگہ { چہ بر تخت مردن چہ بر روئے خاک

پس اس ادارے نے الفاظ تراکیب اور محاورے بنائے اور ان کا نام ”واژہ ہائے نو رکھا“ ———

قوم نو سال تک اس ادارے کی خدمات سے مستفیض ہوتی رہی۔ اس ادارہ نے قومی زبان سے ہیجان

اور افراتفری شادی۔

فرہنگستان نے پیشوند اور پسوند (ادات) سے خوب فائدہ اٹھایا۔

مد ، مند ، گر ، سار ، گیں ، ناک ، بار ، ، در ، بر ، فرا ، فرد ، باز ۔ نا ، با وغیرہ

پیشوند

باز سے بازرس ، انسپکٹر ۔ بازگشت ، احیا

〃 بازنشستہ ، ریٹائرڈ بازداشت ، ترقیف

〃 بازجوئی ، تفتیش

نا ،

ناشناس - اجنبی

نابہنگام - بےموقع

نادرست - بےایمان

ناراحت - پریشان

ہم ،

ہمکار -

ہمکیش - ہم عقیدہ

ہمدلی - ہمدردی

پیوند - دار ،

شہردار - رئیس بلدیہ میئر

کتاب دار - لائبریرین

دریادار - امیرالبحر درجہ سوم

کاردار - ناظم الامور

حساب دار اکاؤنٹینٹ

صندوق دار - خزانچی

باردار - حاملہ

مہماندار - میزبان

گاہ ،

دانشگاہ - یونیورسٹی

باشگاہ - کلب

بان ،

دریابان امیرالبحر درجہ دوم

گروہبان سارجنٹ

شہربانی پولیس

مند ،

ہنرمند فنکار

کارمند کلرک

دانشمند فاضل

ستان ،

بیمارستان ہسپتال

تیمارستان پاگل خانہ

ہنرستان آرٹ سکول

آرائش گاہ	سینٹوریم	دبیرستان	ہائی سکول
فرودگاہ	ہوائی اڈہ	شہرستان	ضلع
پائگاہ	اڈہ	کودکستان	بچوں کا سکول
زائش گاہ	میٹرنٹی ہوم		
ایستگاہ	اسٹیشن		
آزمائش گاہ	لیبارٹری		
فروشگاہ	دکان		
درمانگاہ	کلینک		

نئے اسم فاعل

گوئندہ	مقرر	فرستندہ	ٹرانسمیٹر
خوانندہ	گویا	جنگندہ	شکاری ہوائی جہاز
نوازندہ	سازندہ	رانندہ	ڈرائیور

نئے الفاظ بنانے میں یائی مصدری سے بہت مدد لی گئی ہے۔ اس سے پیشہ یا حرفہ مراد لی جاتی ہے۔

مسافربری	ٹرانسپورٹ کمپنی	کہنہ فروشی	پرانے سامان کی دکان
رنگرزی	کپڑا رنگنے کی دکان	عکاسی	فوٹو کی دکان
لباس شوئی	ڈرائی کلینرز	کفاشی	جوتوں کی دکان
سقط فروشی / عمدہ فروشی	تھوک کی دکان	درزندگی / خیاطی	درزی کی دکان
خردہ فروشی	پرچون کی دکان	ماشین نویسی	ٹائپ کرنے کا کام

مختلف الفاظ کی آمیزش سے نئی اصطلاحات بن گئیں۔

دانش — شناس

دانش جو	یونیورسٹی کا طالب علم	روان شناس	ماہر نفسیات

دانشیار	لیکچرر		ہواشناس	ماہرموسمیات
دانشکدہ	کالج		خاورشناس	مستشرق
			زباں شناس	ماہرلسانیات
			صوت شناس	ماہرصوتیات
			کارشناس	ماہر

اسی طرح سنج ، کار ، یار ، نامہ ، نویس ، رو ، کن ، بین ، سہ ، صورت ، زیر ، جو ، پیش ، نما وغیرہ سینکڑوں تراکیب بنائی گئیں۔

اب عوام میں قدیم زبانوں کا شوق بڑھا ، عربی کی تحصیل لازمی ہوگئی - زبان کی ترقی کے لیے انجمن ایران شناسی ، انجمن آثار ملی اور انجمن ایران ویج کی تشکیل ہوئی - (ایران ویج بقول زردشت وہ ملک ہے جہاں سے ایرانی آئے تھے) پہلے ترکی کا زور رہا پھر مغربی الفاظ فارسی کا جز دین گئے۔ ایران کے سیاسی ، اقتصادی ، تجارتی اور ثقافتی تعلقات مغربی ملکوں سے ہیں۔ اس لیے اب اُن کی زبانوں کا زمانہ ہے ۔ فرانسیسی اور انگریزی سے سائنس ، فنی ادبیات کی اصطلاحات لی گئیں ۔

اگر ہم آج اپنی اور ایرانی فارسی کا تقابلی مطالعہ کریں تو ہمیں ایک بالکل الگ زبان ملے گی ۔ ہم جہاں خالص فارسی الفاظ بولتے ہیں وہاں ایرانی ، عربی ، فارسی کا آمیزہ استعمال کرتے ہیں۔ یا خالص عربی۔ مثال کے طور پر

فارسی	عربی	اور	فارسی	عربی + فارسی
گفتگو	صحبت - اختلاط		سنگتراش	مجسمہ ساز
کامیاب	موفق		خوانده	باسواد
سرشام	غروب		ناخوانده	بےسواد
پرده	حجاب		زرخیز	حاصل خیز
ذمہ داری	مسئولیت		ناخوش	ناراضی

سنگ تراشی	حجّاری	امیدوار	دادطلب
سربرآوردہ (لوگ)	رجال	خاکی	قہوہ ای
بیمار	مریض	پائدار	بادوام

بعض جگہ ہم عربی اور فارسی کا آمیزہ استعمال کرتے ہیں وہاں صرف عربی بولی جاتی ہے

عربی	عربی+فارسی
احتکار	ذخیرہ اندوزی
مقصر	قصوروار
مزاحم	دخل انداز
صرفِ نظر	نظر انداز
حُسنِ تفاہُم	خیر سگالی
سوءِ تفاہُم	غلط فہمی
واردات	اشیائے درآمد
صادرات	اشیائے برآمد
مرموز	پُر اسرار

بعض قدیم الفاظ صدیوں کے استعمال کے بعد اپنے معانی کے اعتبار سے بدل گئے ہیں ۔

لفظ	معنے	لفظ	معنے
خودداری	پرہیز	نشانی	پتہ - ایڈریس
دستگیر کردن	گرفتار کرنا	نوازش	پیار کرنا
گرفتار	مشغول	رہا کردن	آزاد کرنے کے علاوہ چھوڑ دینا
عکس	فوٹو، تصویر	بومی	مقامی
بخش	حصّہ	بیخود	فضول ، بیکار

سرکشی	تلاش	گذارش	رپورٹ
درست کردن	بنانا پکانا	شوخی	لطیفہ

تمدنی اور ثقافتی تقاضوں سے فارسی کے اکثر الفاظ نیا رنگ اختیار کر چکے ہیں۔

خیابان	سڑک	کفش	بوٹ
تیغ	بلیڈ	دامن	سکرٹ
قہرمان	ہیرو	پیراہن	فراک
زنِ قہرمان	ہیروئن	داور	اسپائر
پرستار	نرس	ظہور	فوٹو کا نیگیٹو
لباس	کوٹ اور پتلون	تیر	گولی
کلاہ	ہیٹ		
شلوار	بُوٹ		

اب ایرانی الفاظ کی ایک فہرست ملاحظہ فرمائیے جو پاکستان میں مختلف معنوں میں آتے ہیں اور وہ بھی قومی زبان اردو میں۔

ایرانی	پاکستانی	ایرانی	پاکستانی
خوش حال	خوش	ہوا پیما	ہوا باز
چاق	فربہ	نگران	پریشان
نمک پاش	نمکدان	پست	کمینہ
رومیزی	میز پوش	چادر نشین	خانہ بدوش
شہر نشین	شہری		

بعض معطوف الفاظ کی ہیئت کی جانب دیکھیں تو ایران اور پاکستان میں غیر معمولی فرق نظر آئے گا۔

پاکستانی	ایرانی
آمد و رفت	رفت و آمد
دل و جان	جان و دل
رنج و غم	غم و رنج
دل را بہ دل راہ راست	دل بدل راہ دارد
چشم ما روشن دل ما شاد	چشم ما روشن
بسر و چشم	بچشم یا چشم

ہم ایران کے بے تکلف جملوں سے نا واقف ہیں
خواہش می کنم ۔ لطفاً ۔ بے زحمت ۔ تینوں ، از راہِ کرم یا پلیز کے معنی ہیں ۔
خواہش می کنم کا مفہوم "نو منشن" اور "ناٹ ایٹ آل" کا بدل ہے ۔
اختیار دارید ، مختلف موقعوں پر بولا جاتا ہے ۔

ا ۔ بعد ادب اختلاف پر
ب ۔ اپنی تعریف سننے پر
ج ۔ سیاسی یا سماجی مسئلہ پر اختلاف کی صورت میں

بفرمائید شروع کرنے سے پہلے پلیز کے معنوں میں
یا اللہ (ا) مہمان اور نو وارد کے آنے پر اور اپنی جگہ بیٹھ جانے پر
(ب) عجلت کے موقعہ پر
(ج) کھڑے ہو جانے کا تقاضا کرنا ہو ۔

چرا سے مراد "کیوں" کے علاوہ کیوں نہیں بھی لیتے ہیں ۔
آپ ایران میں 'بادہ' اور 'مے' کہہ کر شراب طلب کریں بیرا جسے "گارسن" کہتے ہیں کچھ نہیں سمجھے گا حتیٰ کہ آپ مشروب کہیں گے ۔

آج مغربی زبانوں کے الفاظ فارسی کا جزو بن گئے ہیں. فرانسیسی اور انگریزی الفاظ کا اثر بے پناہ ہے. جدید فارسی اصطلاحات میں ان زبانوں کا بڑا حصّہ ہے - علوم میں یہ موجود ہیں -

کراوات	ٹائی	ماتیکور	نیل پالش
فکل	کالر	پدر	پاؤڈر
مایو	نہانے کا صابن	کرم	کریم
کاسشکول	مفلر	فرچہ	شیو کا برش
روبان	ربن	مد	فیشن
پلور	سویٹر	استیل	سٹائل
پالتو	اوورکوٹ	املت	آملیٹ
ژاکت	جیکٹ	شکلات	چوکلیٹ
کت	کوٹ	بیسکویت	بسکٹ
ماتیک	لپ اسٹک	سودا	سوڈا

یہ فہرست بہت طویل بن جاتی ہے. فرنگی مآب حضرات نے اس میں بہت کورانہ تقلید کا ثبوت دیا ہے -

جدید فارسی میں ہندی کے – کنارہ ، چندر ، موری ، بالاہل ، انبہ ، چمپا ، بیر ، نارگیل ، جوگی ، دارچینی ، بھی شامل ہیں -

فرہنگستان نے عربی الفاظ کی جگہ فارسی الفاظ وضع کئے ہیں. لیکن ابھی تک عربی ہی رائج ہے اور فرہنگستان کی فارسی مقبول نہیں ہو سکی -

عربی	فارسی	عربی	فارسی	عربی	فارسی
تاویل	گزارش	ساحل	کنارہ	ساحل	کنارہ
توزیع	پخش	شفاہی	زبانی	مستخدم	خدمت گزار

جمع افزائش غیر مستقیم ناراستہ درود درآمد
سالقہ پیشینہ قسمت پارہ نقلیہ بارکشی
کفیل پابنداں تجہیزات سازوبرگ

اب ہم مختصر طور پر جدید فارسی کے مزاج پر کچھ کہیں گے۔ جدید فارسی ایرانیوں کی فعال زندگی کی دلیل ہے۔ ہمیں لہجہ و آہنگ سے واقف ہونے کے لیے ایرانی لوگوں سے رابطہ پیدا کرنا چاہیے تاکہ ہم مروّج اور متداول زبان جان سکیں۔ زندہ زبانوں کا کتابی علم انسان کو مکمل طور پر عالم نہیں بناتا لسانی علم حاصل کرنے کے لیے عوام کو بولتے ہوئے سننا چاہیے۔ تاکہ سمجھنے اور خود بولنے کی منزل آسان ہو۔ جہاں تک تلفظ کا تعلق ہے آئیے کچھ حروف کے تلفظ پر غور کریں۔

ایران میں مجہول یائے کی آواز نہیں بلکہ معروف کی ہے۔ شیر درندہ ہو یا دودھ دونوں شِیر ہیں۔

صبر کو صابر گنبد کو گونباد چرا کو چیرا کہیں گے۔ تاکہ اعراب کا تلفظ واضح ہو۔

نون غنہ فارسی سے خارج ہو چکا ہے۔ اب مکمل نون ہے۔

الف پیش از نون یا میم کا تلفظ نہیں ہوتا۔

بادام کو بادم۔ ایشاں را۔ ایشن۔ نان کو نون۔ جان کو جون۔ جانم کو جُونم۔

الف کا تلفظ آ نہیں بلکہ الف اور واؤ کے درمیان ایک آواز ہے جس کو او کہہ سکتے ہیں۔

کار کو کور

ک اور گ عربی یا اردو کا نہیں

ک چ میں کتاب چتیاب

گ ج میں گراں جیروں

ق کو غ کی طرح اقبال کو اغبال

'ہ' کی بجائے ک جیسے بندہ کو بندک۔ جامہ کو جامک۔ نامہ کو نامک۔ سادہ کو سادک

مبارزه ، مباحثہ ، مغالطہ میں چوتھا حرف بالکسر ہوگا ۔
ابدًا ، اصلًا کا ملًا کو ابدا ، اصلا ، اور کاملا کہیں گے ۔

می گویند می گنْد	، می گوئم کو گُمْ
می روم میرم	می روی کو میری
است کو اے	شود کو شے یک کو یہ

فروزانفر نے بھی جدید زبان کی مخالفت کی وہ سعدیؒ اور حافظؒ کی زبان کو فروغ دینا چاہتے ہیں
پورداؤد نے کہا نئے ایجاد شدہ الفاظ زیادہ دیر تک نہ رہیں گے ۔
وحید دستگیر نے فرمایا ۔ زبانِ فردوسی و نظامی و سعدی لائیے ۔ "زبان پارسی دریا ہیلہ"
آقائی دکتر پارسا نے فرمایا ۔ اخبار نویس بے سروپا الفاظ لا رہے ہیں ۔ ہم مجبوراً برداشت کر رہے ہیں ۔
آموزگار نے فرمایا ۔
فرنگی مآب لوگ خوامخواہ غیر ملکی الفاظ گھسیڑ رہے ہیں ۔
مصاحبہ موجود ہے لیکن انٹرویو کہتے ہیں
تظاہر موجود ہے لیکن دمونستراسیون کہیں گے ۔
ان دنوں تین گروہ ایران میں جدید زبان کے مخالف ہیں ۔
پہلا گروہ تو عالم اخوندوں کا ہے جو عربی کا پرچار کرتے ہیں ۔
دوسرا گروہ قدیم فارسی کو زندہ کرنے کے درپے ہے ۔ یہ لوگ دری پہلوی کا احیاء چاہتے ہیں ۔
تیسرا گروہ ۔ یہ لوگ زبان کے قیمتی سرمایہ کو پس پشت ڈال کر نئی زبان لا رہے ہیں ۔ مفروس کو نالازم نہیں جانتے ۔

لاؤڈ سپیکر کے لیے بلندگو ہے } نہایت موزوں ہیں
ریفریجیٹر کے لیے یخچال ہے }

فرہنگستان کی کاوش کے باوجود انگریزی الفاظ کے مفرس فرہنگستان کی اصطلاحات کی نسبت زیادہ مقبول ہیں، حالاں کہ فرہنگستان کی کوشش زیادہ موزوں ہے۔

متداول	فرہنگستان		
آژدوپلان	ہواپیما	نظمیہ	شہربانی
آئرولوژی	ہواشناسی	بلدیہ	شہرداری
اوتوماتیک	خودکار	عدلیہ	دادگستری
نسلاً بعد نسلاً	پشت در پشت	مالیہ	دارائی
حدید الاحداث	نوبنیاد	پروفیسر پورداؤد نے مندرجہ بالا تجاویز کی بیحد	
ابدالدہر	جاوداں	تعریف کی ہے۔	

اب فیصلہ کر لیجیے کہ فارسی زبان کی ارتقائی تاریخ پڑھنے والے سے کسقدر زندہ و بیدار رہنے کا تقاضا کرتی ہے۔

کتابیات

اس مقالہ کی تکمیل میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی۔

سبک شناسی اوّل — ملک الشعرا بہار
پارسیٔ نغز — علی اصغر حکمت
تاریخ تمدن ایران ساسانی — سعید نفیسی
زبانِ پاک — احمد کسروی
کاف نامہ — ”
زبان فارسی — ”
ادبیات معاصر — رشید یاسمی
دریائی گوہر — (مجموعہ انتخابات)
یکی بود دیکی نبود — محمد علی جمال زادہ
واژہ ہائے نو
غیاث اللغات
ایرانشناسی — ڈاکٹر ظہور
ادب نامہ ایران — مرزا مقبول احمد بدخشانی

جدید تعلیمی اصلاحات

ڈاکٹر عبدالرؤف ڈائرکٹر ویسٹ پاکستان بیورو آف ایجوکیشن لاہور

دورِ غلامی میں ہمارے برطانوی حکمرانوں نے سرزمین پاک و ہند میں ایک ایسے نظامِ تعلیم کی داغ بیل ڈالی تھی، جو ہر اعتبار سے ناقص تھا۔ اس مریضانہ نظامِ تعلیم کی واضح ترین ترجمانی لارڈ میکالے کی تحریروں میں ہوتی ہے۔ میکالے ۱۸۳۴ء میں سپریم کورٹ کے قانونی مشیر کی حیثیت سے ہندوستان تشریف لائے تھے ان کا ایمان تھا کہ برطانوی ہندوستان میں تعلیم کا چرچا کرنے کا واحد مقصد ایسے وفادار قسم کے لوگ پیدا کرنا ہے جو انگریزی بول سکتے ہوں اور سرکار کے دفتروں میں کام کر سکتے ہوں۔ اس مجبر العقل نظامِ تعلیم میں فکر و اخلاق کی بلندی اور علم و ہنر کی ترقی کے امکانات کو کمال عیاری سے یکسر بے دخل کر دیا گیا تھا۔ انگریز کے اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے یہ طریق تعلیم بے حد کامیاب رہا۔ چناں چہ ہمارے مذہب، تہذیب اور ثقافت کی جو گت انگریز کے دورِ حکومت میں بنتی رہی۔ اس کی نظیر ہماری تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی۔

عہد غلامی میں بھی ہمارے متعدد روشن دماغ طبقے اس مریضانہ نظامِ تعلیم کی مخالفت کرتے رہے مگر ان کی کاوشیں بیشتر ناکام رہیں کیوں کہ مروجہ نظامِ تعلیم کو برطانوی سرکار کی سرپرستی حاصل تھی اس کے علاوہ مختلف قسم کے چند ناخوش گوار سیاسی اور اقتصادی حالات بھی اسی مسموم نظامِ تعلیم کی ترویج کا باعث بنتے رہے۔ ان سب باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزی اقتدار کے دوران میں ہمارے اسکول، کالج یونیورسٹیاں ایسے تنگ نظر اداروں کی صورت اختیار کر گئے جن کا واحد مقصد سرکاری دفاتر کو چلانے والے بابو اور افسر پیدا کرنا تھا۔ ان نام نہاد تعلیمی اداروں اور ان کے پڑھنے اور پڑھانے والوں کے ذہنوں سے قوم کی فلاح و بہبود اور زندگی کے مختلف شعبوں کی ضروریات پورا کرنے کا خیال بالکل غائب تھا۔

طلبہ کو امتحان پاس کرنے اور اساتذہ کو نصاب ختم کرنے کا جنون سوار رہتا تھا۔ تخلیقی فکر و کردار بالکل معطل تھے۔

آزادی کے فوراً بعد پاکستانی ماہرینِ تعلیمات کو اپنے فرسودہ نظامِ تعلیم کی اصلاح کا فکر دامن گیر ہوا۔ چنانچہ اس کی خامیوں کا جائزہ لیا جانے لگا اور متعدد نئی تجاویز اور اصلاحات پر غور و خوض شروع ہوا۔ چند ایک اصلاحات کو عملی جامہ بھی پہنایا گیا۔ مگر اس سلسلہ میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی زیادہ تر اس وجہ سے رونما نہ ہو سکی کہ قوم کی زیادہ توجہ وقت کے چند اہم امور پر مرکوز رہی۔

انقلاب اور تعلیمی بیداری

ہماری حقیقی تعلیمی بیداری کی تاریخ انقلاب ۱۹۵۸ء سے شروع ہوتی ہے۔ انقلاب کے بعد جن لوگوں نے عنانِ اقتدار سنبھالی انہیں تعلیمی اصلاحات میں حقیقی دلچسپی تھی۔ اقتصادی اور سیاسی بحران کے ختم ہو جانے کی وجہ سے انہیں اس سمت میں ٹھوس خدمات سرانجام دینے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۵۸ء میں ایک قومی تعلیمی کمیشن کا قیام عمل میں آیا جس میں ملک کے بیشتر ماہرینِ تعلیم شامل تھے۔ تعلیمی کمیشن نے ۱۹۵۹ء میں اپنی رپورٹ شائع کر دی جس میں موجودہ تعلیم کا کڑا جائزہ لیا گیا۔ اور تعلیم کے تمام شعبوں میں مفید تبدیلیوں کے مکمل خاکے پیش کئے گئے۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں ہمارے مروجہ نظامِ تعلیم کے تقریباً تمام شعبوں میں انقلابی اصلاحات رائج کرنے پر بہت زور دیا۔ ہمارے نظامِ تعلیم کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ محض امتحان پاس کرنے کی بجائے شخصیت اور کردار کے نشوونما و ارتقاء کو تعلیم کا مطمعِ نظر قرار دیا گیا۔

کمیشن نے طلبہ میں اجتماعی فکر و عمل کو ترویج دینے کے معاملہ پر بہت سنجیدگی سے غور کیا۔ چنانچہ تعلیمی اداروں میں گروہی مشاغل کو مقبول بنانے کے لیے بہت مفید تجاویز پیش ہوئیں۔ اسی طرح شخصیت کے بہتر اوصاف مثلاً دیانت داری اور راست گوئی کی ترویج کے لیے متعدد عملی اقدام تجویز کئے گئے۔ مثلاً مدرسوں میں "آونسٹی روم" (HONESTY ROOM) اور اونسٹی شاپ وغیرہ کا قیام۔ جہاں سے طلبہ اپنی روزمرہ زندگی کی چیزیں بغیر کسی نگرانی کے خرید سکیں۔ اسی طرح سے کھلی الماریوں والے کتب خانوں کا قیام تجویز ہوا۔ جہاں سے طلبہ خود ہی کتابیں نکال سکیں اور پڑھنے کے بعد خود ہی انہیں ان کی متعلقہ جگہوں

پرواسپس رکھ سکیں۔

تعلیم سے خشک کتابیت کے عنصر کو خارج کرنے کے لیے محنت و مشقت کی اہمیت واضح کی گئی تعلیمی اداروں کے اوقات اور کاموں میں جسمانی محنت و مشقت کے مخصوص گھنٹے وضع کیے گئے جن میں طلبہ اپنے کمروں اور فرنیچر وغیرہ کی صفائی اور دیکھ بھال خود کر سکیں۔ محنت و مشقت کے اس قسم کے پروگراموں میں شمولیت پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک کے تمام طلبہ کے لیے لازمی قرار دے دی گئی۔

طلبہ کی رہ نمائی کی تعلیم

یہ ایک حقیقت ہے کہ تعلیمی زندگی کے دوران میں اکثر طلبہ انواع و اقسام کی جسمانی، جذباتی اور اقتصادی الجھنوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ الجھنیں خفیف بھی ہوتی ہیں اور دقیق بھی۔ ان چھوٹی بڑی الجھنوں سے طلبہ اساتذہ اور والدین کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پرانے نظام تعلیم میں ان الجھنوں کے حل کے لیے کوئی باضابطہ مداوا موجود نہ تھا۔ نئے نظام تعلیم نے طلبہ کی زندگی کے اس اہم پہلو کی طرف بھی خصوصی توجہ دی۔ تمام تعلیمی اداروں میں طلبہ کی رہ نمائی کے لیے باضابطہ اہتمام کی سفارش کی گئی چناں چہ اب ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے متعدد یونیورسٹیوں، کالجوں، سکولوں اور تعلیمی دفاتر میں طلبہ کی رہ نمائی کے ماہرین اور خصوصی سٹاف کا تقرر ہو چکا ہے۔ طلبہ کی رہ نمائی کے کام کو اور زیادہ منظم طریق سے سرانجام دینے کے لیے مزید اقدام کیے جا رہے ہیں۔

ان معاشرتی اور تمدنی اصلاحوں کے علاوہ گزشتہ تین سالوں میں بے شمار تعلیمی انقلابات بھی رونما ہوئے ہیں۔ عصر جدید کے سائنسی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم میں اصلاح اور وسعت ہوئی ہے۔ انجینئرنگ اور ایگریکلچر یونیورسٹیوں کا قیام۔ جا بجا ٹیکنیکل سکولوں اور پولی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا اجراء اس بات کا وافر ثبوت ہیں کہ تعلیم کے ہر درجہ اور ہر شعبہ میں نئے تجربوں۔ نئے معلین اور نئے علوم و فنون کا اضافہ ہو رہا ہے۔

تعلیمی نظم و نسق کی تنظیم نو

تعلیمی اداروں میں اصلاحات کے نفاذ کے علاوہ تعلیمی نظم و نسق کے دفاتر میں بھی متعدد مفید

تغیر رونما ہوئے ہیں۔ اور نظم و نسق کو سرعتِ رفتار بخشنے کے لیے تعلیم کا صوبائی ڈائرکٹوریٹ توڑ دیا گیا ہے اور اس کی بجائے مختلف ریجنوں کے تعلیمی ڈائرکٹروں کو مزید اختیارات سونپ دیئے گئے ہیں۔ تاکہ ہمارے تعلیمی معاملات میں مختلف قسم کے روائتی فیتوں میں تخفیف ہو اور کام کی رفتار تیز ہو۔ مغربی پاکستان کو تعلیمی اعتبار کے چھ ریجنوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ یعنی کراچی، حیدرآباد، کوئٹہ، لاہور، راولپنڈی، اور پشاور۔ ہر ایک علاقے کے بیشتر تعلیمی امور کا فیصلہ ریجن کے ڈائرکٹر خود ہی کر سکتے ہیں۔ اور بہت کم امور کے لیے سیکرٹریٹ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

چند نئے تعلیمی دفاتر

نظم و نسق کے میدان میں تعلیمی اصلاحات کا سب سے نمایاں پہلو چند مفید دفاتر کا قیام ہے جو اس وقت اپنے اپنے مخصوص حلقۂ عمل میں بیش بہا خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

۱۔ **بیورو آف ایجوکیشن**: اس ادارے کا کام صوبائی تعلیم سے متعلق تمام اعداد و شمار کا فراہم کرنا۔ انہیں کتابی شکل میں شائع کرنا اور تعلیم کے تمام شعبوں سے متعلق ہر قسم کا معلوماتی مواد شائع کرنا ہے۔ بیورو آف ایجوکیشن ایک خاص قسم کا وسیع کتب خانہ بھی تعمیر کر رہا ہے جس میں پاکستان اور دنیا کے تمام ملکوں کی تعلیمی دستاویزات، کتابیں، رپورٹیں، شماریات وغیرہ جمع کی جا رہی ہیں۔ اسی قسم کا ایک ادارہ مشرقی پاکستان میں بھی کھل چکا ہے۔ اور ایک مرکزی ادارہ کراچی میں بھی کام کر رہا ہے جو یہی کام ملی سطح پر سرانجام دیتا ہے۔

۲۔ **ایجوکیشن ایکسٹنشن سروس سنٹر**: اس ادارے کا قیام بھی ہماری تعلیمی اصلاحات میں سنگِ میل کا مقام رکھتا ہے۔ اس ادارے میں مدارس کے اساتذہ کے لیے ایسے ایسے تربیتی کورس اور لیکچروں کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے جو ان کے زاویہ نگاہ میں وسعت اور جدت کا باعث بنتے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں اس قسم کے دو ادارے کام کر رہے ہیں جن میں سے ایک مشرقی اور ایک مغربی پاکستان میں واقع ہے۔

۳۔ **فزیکل ایجوکیشن اینڈ سپورٹس سنٹر**: اس ادارے کی تشکیل کا مقصد ہمارے

تعلیمی اداروں میں جسمانی تعلیم کے تمام امور کی دیکھ بھال کرنا اور جسمانی صحت اور کمال کو فروغ دینا ہے۔

۴ - بیورو آف ایگزامینیشنز: اس ادارے کے سپرد ٹیکنیکل امتحانوں کے نظم و نسق کا کام ہے۔

۵ - بیورو آف پبلیکیشنز: تعلیمی کتب کی تحریر و تدوین اور طباعت و اشاعت کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔

۶ - انسپکٹوریٹ آف ڈیف، ڈمب اینڈ بلائینڈ: اس شعبے کا کام معذور بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا ہے۔ یہ دفتر اندھے، گونگے، بہرے اور اپاہج بچوں کے تعلیمی پروگراموں میں اصلاح و ترقی کے سامان پیدا کر رہا ہے۔

ٹیکسٹ بک بورڈ کا قیام

ابھی کچھ عرصہ ہوا حکومت نے عمدہ اور سستی نصابی کتابوں کی تحریر اور تقسیم کے لیے ٹیکسٹ بک بورڈ بھی قائم کیے ہیں۔ چنانچہ اس اسکیم کے تحت لاہور میں ویسٹ پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ قائم ہو چکا ہے۔ بورڈ ایک نیم سرکاری ادارہ ہے جس کے چند اہم فرائض یہ ہیں:-

۱ - درسی کتابوں کی تیاری اور اشاعت اور دیگر تعلیمی کتب اور معاونتی مواد کی تیاری اور اشاعت کے ذریعہ سے حکومت کی تعلیمی پالیسی کو عملی جامہ پہنانا۔

۲ - نصاب کے مسائل اور درسی کتابوں سے متعلق مواد تیار کرنا اور ان موضوعوں پر ٹھوس علمی تحقیق کرنا

۳ - درسی کتابوں کی تیاری اور اشاعت کے معیار مقرر کرنا

۴ - درسی کتابوں اور دیگر تعلیمی سامان کی تقسیم کا اہتمام کرنا اور اس مقصد کے لیے باضابطہ ایجنسیوں کی منظوری اور تقرری کی پالیسی وضع کرنا۔

۵ - درسی کتب کے مصنفین کے لیے مناسب تربیتی کورسوں کا اہتمام کرنا۔

۶ - تعلیم کے جدید طریقوں سے متعلق مواد کی تیاری اور اشاعت کا اہتمام کرنا۔

۷ - درسی کتابوں اور دیگر متعلقہ تعلیمی سامان کی بلند پایہ نمائشوں کا اہتمام کرنا۔

۸ - درسی کتابوں اور تعلیم و تدریس کے جدید سامان کو جمع کرنا۔ اور اس مواد پر ایک جامع

کتب خانہ کی داغ بیل ڈالنا وغیرہ

اس بورڈ نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ بورڈ کی زیر ہدایت نصابی کتب کی تحریر و تدوین اور طباعت و اشاعت کے کام میں ایک نمایاں انقلاب رونما ہوگا۔

اصلاح کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔

تعلیمی اداروں اور تعلیمی دفاتر میں اصلاح اور جدتوں کے اس مختصر سے جائزہ سے اس حقیقت میں شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ہم نے ان چند سال میں تعلیمی میدان میں کافی کچھ حاصل کر لیا ہے۔ ہمارا موجودہ نظام تعلیم سابقہ نظام تعلیم سے بدرجہا بہتر ہے۔ مگر یہ کہنا بھی قرین مصلحت نہ ہوگا کہ اس صف میں مزید ترمیم و اصلاح کی اب ضرورت نہیں رہتی۔ تعلیم و تربیت ایک ایسا نازک اور وسیع معاملہ ہے جس میں حالات اور ضرورت کے مطابق نت نئے تجربوں، تحقیقوں اور انقلابوں کا رونما ہونا اشد ضروری ہے۔

اساتذہ اور والدین کا اشتراکِ عمل

۱۰ نومبر ۱۹۶۶ء کو میاں سلطان محمود صاحب ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول کٹڑہ خزانہ لاہور نے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں "اساتذہ اور والدین کے اشتراکِ عمل" کے موضوع پر معلمین زیرِ تربیت کے سامنے اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار فرمایا۔ کالج کے پرنسپل جناب اے جی بٹ صاحب نے اس جلسے کی صدارت کے فرائض انجام دیئے ذیل میں ہیڈ ماسٹر صاحب موصوف کی تقریر کا مکمل متن پیش کیا جاتا ہے۔ (مدیر)

یہ ایک مشہور بات ہے کہ موتی جیسی قیمتی چیز صدف یا سیپی کے دونوں حصوں کے اندر پرورش پاتی ہے۔ اگر دونوں حصوں میں سے ایک حصہ موجود نہ ہو تو موتی کی تخلیق ممکن نہیں۔ بالکل اسی طرح بچے کی تعلیمی ترقی اساتذہ اور والدین کے اشتراکِ عمل کے بغیر ناممکن ہے اور ان دونوں کی متحدہ کوششوں کے بغیر خاطر خواہ اور متوقع نتائج معرضِ وجود میں نہیں آ سکتے۔

ان حالات میں پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ اساتذہ اور والدین کا تعاون کس طرح مفید نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ عام طور پر یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ ہر وہ شخص، خواہ وہ معلم ہو، بچے کا والد ہو یا سرپرست، جب مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے والے بچے کی تعلیمی ترقی میں خامیاں پاتا ہے تو وہ بچے کی ان ناکامیوں کی ذمہ داری مروجہ تعلیم کے نقائص پر ڈالتا ہے۔

اگر اس معاملے میں غور سے دیکھا جائے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی کوشش کی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہمیں نظامِ تعلیم پر نکتہ چینی کرنے کی بجائے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، جو ایک نظامِ تعلیم پر عمل درآمد کرنے، اس میں تغیر و تبدل کرنے یا موجودہ نظامِ تعلیم سے بہتر ایک ایسا نظامِ تعلیم بنانے کے لیے ملا ہے جو ہمارے مناسب حالات ہو۔ اس اہم کام میں اساتذہ اور والدین کا اشتراکِ عمل ضروری ہے۔

اساتذہ کو چاہیے کہ وہ ایک کانفرنس کے ذریعے طلبہ کے والدین پر یہ امر واضح کریں کہ ان کے باہمی تعاون سے کیا کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ سطور ذیل میں اس ضمن میں چند تجاویز سپرد قلم کی جاتی ہیں۔

عام مشاہدات

تربیت اطفال:- مدرسے میں تعلیم دلانا اور گھر پر تربیت کرنا یہ ابتدائی کام ہیں جو بچوں کی طرف سے ان کے والدین کے ذمہ ہیں۔

۱۔ بچے کے مدرسے میں داخل ہو جانے کے بعد والدین کو یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اب ان کی ذمہ داری ختم ہو گئی ہے۔

۲۔ بعض والدین محض داخلے اور اگلی جماعت میں ترقی ملنے کے موقع پر بچوں کی تعلیم میں دلچسپی لیتے ہیں۔ انھیں بچے کی تعلیم کے ہر مرحلے پر اس کی خبرگیری کرنی چاہیے۔

۳۔ بچوں کی تعلیم و تدریس بلاشبہ ایک مقدس فریضہ ہے۔ اس لیے والدین کو اس پیشے کے افراد کی مدد کرنی چاہیے۔ تاکہ اساتذہ کے منصب کا وقار برقرار رہے۔

۴۔ دوسرے اداروں کی طرح مدرسے کے کام کی رہنمائی بھی تعلیمی قوانین سے ہونی چاہیے اور والدین کو مدرسے کے قوانین کی پابندی کرنے کے لیے مکمل تعاون کرنا چاہیے۔

۵۔ معلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے زیر نگرانی ہر بچے کو اپنا بچہ سمجھ کر اس کی فلاح و ترقی میں دلچسپی لے اور اپنے آپ کو اپنے ملک کے بچوں کا ہمدرد و مصلح خیال کرے۔ بنی نوع انسان کی تعلیمی خدمت معلم کا منتہائے مقصود ہونا چاہیے۔

۶۔ یہ درست ہے کہ ذہانت کوئی بکاؤ شے نہیں۔ یہ ایک خداداد نعمت ہے جو کسی قیمت پر بھی خریدی نہیں جا سکتی۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدرت نے بچے میں بے پناہ قوتیں ودیعت کی ہیں اور تعلیم ان قوتوں کو آشکار کرتی ہے۔ جہاں ذہانت کی کمی محسوس ہو وہ معلم کی کوشش سے دور ہو سکتی ہے۔

۷۔ دوران تعلیم میں معلمین کے لیے مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔

(الف) تعداد طلبہ (ب) تعداد مضامین (ج) اوقات مدرسہ (د) طالب علم کی اضافی قابلیت (س) سال بھر کے تعلیمی پروگرام کا جائزہ (س) معیار تعلیم قائم رکھنے کی دشواریاں اور دیگر خامیاں۔

بچوں کی امداد کے عملی طریقے

والدین کے لئے : ۔ اگر والدین کسی حد تک تعلیم آشنا ہوں تو انہیں چاہیے کہ وہ بچے کے نصاب کتب نظام الاوقات اور اس کے مطالعے کے قواعد کا مناسب جائزہ لیتے رہیں۔ نیز تعطیلات کے کام کی رپورٹ اور ترقی سے باخبر رہنے کی کوشش کریں۔ سکول میں بچے کی غیر حاضری اور بیماری کی اطلاع دیں۔ بچے کو اپنا کام آپ کرنے کا عادی بنائیں، لیکن ہر وقت کام ہی کام کرنے اور کھیل میں حصہ نہ لینے سے بچے کی صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ والدین کی یہ خواہش کہ کسی نہ کسی طرح بچے کو اگلی جماعت میں ترقی ملتی رہے۔ بچے کے ساتھ یقیناً بے انصافی ہے۔ جب تک بچہ ترقی کا اہل نہ ہو، اس وقت تک اسے ترقی نہیں ملنی چاہیے۔ مدرسے سے جو اطلاع بچے کے متعلق ملے اس پر توجہ ضروری ہے۔ مثلاً

(الف) غیر حاضری : ۔ بیمار نہ ہونے کی صورت میں مدرسے سے متواتر غیر حاضر رہنا۔ کچھ وقت مدرسے میں گذار کر غائب ہو جانا اور مدرسے میں مشکل کاموں کے اوقات میں مسلسل عدم موجودگی، ہر وقت کھیل کود میں مصروف رہنا وغیرہ۔

(ب) مدرسے کا کام : ۔ بدخطی۔ املا میں بے پروائی۔ ناقص تلفظ، گھر پر اسباق کی تیاری نہ کرنا پڑھنے میں مشق کی کمی۔ ذہنی کاموں میں خاص بے پروائی۔

(ج) صحت و صفائی : ۔ میلے کچیلے کپڑے۔ میلا جسم اور گندے بال، دکھتی آنکھیں۔ میلے دانت بہتے کان، زخم، خارش، کھانسی، بخار، درد سر، درد شکم، بدہضمی وغیرہ۔

(د) بری عادتیں: کتابیں چرانا، جھوٹ بولنا، دوسروں کو ستانا۔ نقل اتارنا۔

مذکورہ بالا باتوں کے علاوہ کچھ اور امور بھی والدین کی توجہ کے طالب ہیں۔ مثلاً وہ دن بھر میں کوئی وقت اپنے بچے کے ساتھ گذارنے کا معمول بنائیں۔ کھیلنے اور کام کرتے وقت بچے کا مطالعہ کریں ناگزیر حالات میں بچے کی تعلیم کے لیے گھر پر پڑھانے کے لیے استاد مقرر کر دیں یا اس کے کسی ذہین

اور قابل ہم جماعت کو اِس کا رفیق درس بنا دیں، جو روزانہ کام میں اور مدرسے سے غیر حاضری کی صورت میں معاون و مخبر ثابت ہو سکے ۱۰۔ اپنے بچے کے ساتھیوں کے کردار اور چال چلن کی نگرانی بھی ضروری ہے۔ تاکہ بچہ بُرے بچوں سے بُری عادتیں نہ سیکھے۔ اگر ایسی صورت ہو تو اپنے بچے کو فوراً علیحدہ کر لیں۔ اگر کسی بات پر بچے کو سزا بھی دینا پڑے تو یہ سزا کم ہونی چاہیے، جو صرف تادیب کے لیے ہو۔ سزا کے تواتر سے احتراز ضروری ہے۔ اگر کبھی سزا ضرورت سے زیادہ دے بیٹھیں تو اس پر دل میں افسوس کریں۔ سزا کا مقصد ہر حال میں اصلاح ہونا چاہیے۔ اِس لیے جسمانی سزا کی بجائے ضمیر کا احساس پیدا کریں۔ جسمانی سزا اکثر جرم کا عادی بنا دیتی ہے۔

عربی زبان کا مشہور مقولہ "خیر الامور اوسطہا" ہے کہ بہترین کام درمیانی ہوتے ہیں۔ اِس لیے تعریف کرتے وقت انعام دیتے وقت، ترغیب کے موقع پر، نفرت کے وقت اور کھانے پینے میں اعتدال کو سامنے رکھیں۔ تفریحی مشاغل میں دلچسپی پیدا کریں۔ عام تہذیب پر توجہ دیں اور اس کی ترقی کے لیے سہولتیں بہم پہنچائیں۔ کہانیوں کی کتابیں پڑھنے نظمیں یاد کرنے، نصائح ازبر کرنے، مذہبی کتابیں سمجھنے اور حفظ کرنے کا شوق پیدا کریں۔

قابلِ توجہ تعلیمی مسائل

تعطیلات: مختلف تقاریب اور تہواروں میں بچوں کی موجودگی کی ضرورت ہے۔ ہفتے میں ایک دن بچے کی تفریح کے لیے ضروری ہے۔ تاکہ مدرسے کے روزانہ کام کی چکی سے طبیعت اکتا نہ جائے کھیل میں بچے کی رہنمائی کریں اور اسے آسانی سے سوچنے کا موقع دیں۔

طویل تعطیلات گرما بچوں اور معلمین دونوں کے لیے ضروری ہیں۔ کیوں کہ

بچہ	معلّم
(الف) سال کے گرم ترین حصے میں بچے کا دھوپ میں آنا جانا خطرے سے خالی نہیں۔	(الف) (ب) (ج) بچوں کی مانند۔
(ب) سخت گرمی میں بچے کا دماغ کام نہیں کرتا۔	(د) مدرس کا دماغ اور پھیپھڑے آرام چاہتے ہیں۔
	(ہ) تعطیلات میں مدرس کو اپنے تدریسی کام کے

(ج) اِس موسم میں میلے ٹھیلے بھی لگتے ہیں۔ اور اکثر لوگ صحت افزا مقامات پر بھی جاتے ہیں۔ اس طرح بچے بھی اپنے والدین کے ساتھ مختلف مقامات پر سیر کو جا سکتے ہیں۔

نا کے کی تکمیل کا موقع مل جاتا ہے

(د) مدرس کو اپنے روزانہ کام سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور مطالعہ سے کئی مفید باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔

داخلہ

بچے کو مدرسے میں داخل کرتے وقت امتحان لے کر بچے کی قابلیت معلوم کرنی چاہیئے۔ تاکہ معلوم ہو سکے۔ کہ بچہ کس جماعت میں داخل ہونے کا اہل ہے۔ ایک دِن کا امتحان کامیاب ثابت نہیں ہو سکتا۔ دوران سال میں ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی یا تنزّل کا مقصد بچے کی اہم خدمات سرانجام دینا ہوتا ہے۔ تنزّل کا غلط مطلب نہ سمجھ لیا جائے۔

ترقی

سال کے آخر میں بچے کو ترقی دیتے وقت اِس کا معیارِ تعلیم دوران سال میں امتحانات کے نتائج، حاضری، طویل غیر حاضری، بیماری اور سالانہ امتحان میں کارگزاری کا خاطر خواہ خیال رکھا جائے۔ ناکامی کی صورت میں نہ تو بچے کی دِل شکنی کی جائے اور نہ اسے دھمکیاں ہی دی جائیں، والدین کو بھی زیادہ پریشان نہ ہونا چاہیے۔ ایسے حالات میں بچے کو دلداری کی ضرورت ہے۔ ورنہ مایوسی تنزل کی طرف لے جائے گی۔

امتحان

یہ تعلیم کا مقصد یا انعام نہیں ہے۔ اساتذہ اِس کے بعض خراب نتائج سے واقف ہیں۔ لیکن امتحان یک قلم موقوف بھی نہیں کئے جا سکتے۔ امتحان سکول میں بچے کی عام قابلیت اور ترقی کو جانچنے کا طریقہ ہے بالفاظ دیگر یہ سست رفتار گھوڑے کو ایڑ لگانے کے مترادف ہے۔

تحریری کام

تحریر آدمی کا زیور ہے۔ انفرادی ترقی تحریر کی بدولت معلوم ہوتی ہے۔ تحریری کام کی عادت سے امتحان کا خوف جاتا رہتا ہے۔ کیوں کہ اِس طرح وہ ایک لحاظ سے روزمرہ کا کام بن جاتا ہے۔

گھر کا کام

گھر کے کام کی بدولت آموختے کا اعادہ آسانی سے ہو جاتا ہے۔ یہ عادت انفرادی کام کا موقع بہم پہنچاتی ہے۔ گھر کا کام کرنے سے والدین کو بھی بچے کی قابلیت اور ترقی کی رفتار کا علم رہتا ہے۔ گھر کا کام بڑی صفائی اور دلچسپی سے کرنا چاہیے۔ شروع میں یہ کام سلیٹ پر کیا جائے۔ بعد میں کاغذ استعمال کرنا شروع کر دیں۔ بشرط ضرورت گھر کا کام کرنے کے لیے مدرس کی امداد حاصل کی جا سکتی ہے جتنی الوسع بچے کو خود کام کرنے کا خوگر بنائیں۔ استاد یا والدین کا کیا ہوا کام بچے کا کام نہیں کہلا سکتا۔

نقل

یہ چوری ہی کی ایک قسم ہے۔ یہ اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ مدرس صرف ایک ہی بچے پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکتا۔ نقل کی عادت حقیقی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

باہمی اشتراک عمل کیسے ترقی کر سکتا ہے.... ؟

(الف) اساتذہ

۱۔ اساتذہ والدین سے مل کر باہمی کانفرنس کا انعقاد کریں اور والدین پر تعلیم اطفال اور گھر کی تربیت کی اہمیت واضح کر کے ان کی ہمدردی اور تعاون حاصل کرنے کی بھی سعی کریں۔

۲۔ سال میں ایک دن "یوم والدین" کی تقریب منعقد کی جائے جس میں بچوں کی کھیلوں کا انتظام کیا جائے اور اچھے بچوں کو انعامات تقسیم کئے جائیں

۳۔ مدرسین اپنی جماعتوں کے طلبہ کے متعلق تعلیمی کوائف کے چارٹ تیار کریں اور حسب ضرورت تفصیلات کی اطلاع والدین کو کرتے رہیں۔

۴۔ والدین سے رابطہ پیدا کریں اور بچے کی فلاح و بہبود میں دلچسپی کا اظہار کر کے والدین کا تعاون اور ہمدردی حاصل کریں۔

(ب) والدین

۱۔ والدین وقتاً فوقتاً اساتذہ سے ملاقات کرتے رہا کریں۔ تاکہ باہمی واقفیت پیدا ہو جائے

اور جو اطلاعات مدرسے کی طرف سے بچے کے متعلق پہنچیں ان کے جواب بھی دیا کریں۔

۲۔ والدین جہاں تقریبات میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو مدعو کرتے ہیں ان کو چاہئے کہ بچے کے استادوں کو بھی باقاعدہ مدعو کریں اور اس طریقے سے ان کی عزت افزائی کریں۔

۳۔ مدرسین کی فلاح و بہبود میں والدین کو بھی دلچسپی لینی چاہیے۔

۴۔ بچوں کی صحیح نگرانی اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ضروری ہے کہ والدین حتی الامکان سکول سے کم فاصلے پر رہائش اختیار کریں۔ اس طرح طلباء میں اساتذہ کی عزت بڑھتی ہے اور خوف دور ہو جاتا ہے۔

(ج) اساتذہ اور والدین

۱۔ دونوں کا فرض ہے کہ بچوں کے کھیلنے کے لیے میدان کا انتظام کریں۔

۲۔ گلی کوچے صاف رکھے جائیں۔

۳۔ بچوں کو مساجد میں جانے کی تلقین کریں اور یہ خیال رکھیں کہ ایسا کرنے سے مساجد کی تعظیم و تقدیس پر حرف نہ آئے۔

۴۔ کھیل کے میدان میں بچے، استاد اور والدین کی نگرانی میں کھیلیں۔

بچوں میں کھیلوں کی صحیح ترویج کے لیے مدرسے کو ان حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے، جن حلقوں میں بچوں کی اکثریت رہائش پذیر ہے۔ مدرسین کی ڈیوٹی لگائی جائے کہ وہ ان مختلف حلقوں میں جا کر والدین کے اشتراک عمل سے بچوں کی کھیلوں میں رہنمائی کریں۔

خاتمۂ کلام

والدین کو اساتذہ سے کیوں تعاون کرنا چاہیے۔؟

اس لیے کہ استاد ایک مقدس اور شریفانہ قومی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اساتذہ کی جماعت ان پاک بازوں کی جماعت سے تعلق رکھتی ہے جو مادر وطن کے بچوں کے لیے بہت کچھ قربان کر دیتے ہیں۔

ہمیں استادوں پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ اِن کے اس مشکل کام میں جب تک والدین تعاون نہ کریں گے

خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکے گی۔ اساتذہ کی ضروریات زندگی ان کے قلیل مشاہروں کی وجہ سے باسانی پوری نہیں ہو سکتیں۔ ان کی زندگی کی کش مکش اور ذہنی پریشانی والدین کے تعاون سے دور ہو سکتی ہے ان کا پیشہ ان کے لیے ایک زبردست آزمائش ہے۔ اگر بچوں کے والدین اساتذہ کی عزت کریں گے اور ان کی اہانت کو بطیب خاطر قبول کریں گے تو ان کی عسرت دور ہو جائے گی اور معاشرے کے باعزت رکن کی حیثیت سے باوقار زندگی بسر کریں گے اور دل و جان سے بچوں کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہیں گے ؂

تدریسِ معاشرتی علوم

۳ دسمبر ۱۹۶۲ء کو سوشل سٹڈیز سوسائٹی سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کا ایک اجلاس کالج کے پرنسپل جناب اے جی بٹ صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں جناب شیخ عبدالسلام صاحب ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ۔ لاہور نے تدریسِ معاشرتی علوم پر مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار فرمایا۔ (مدیر)

جناب پرنسپل صاحب اور معزز حضرات!

مجھ جیسے آدمی کے لیے جس کی تمام زندگی ریاضی کی تدریس میں گذری ہو معاشرتی علوم کی افادیت اور اہمیت پر کچھ کہنا ذرا مشکل کام ہے۔ تاہم تدریسی زندگی میں جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے۔ مختصراً عرض کرتا ہوں۔

حضرات! تاریخ، جغرافیہ اور شہریت کے مضامین کا مجموعی نام معاشرتی علوم ہے۔ چوں کہ یہ تینوں مضامین بقیہ مضامین کے مقابلہ میں ہماری روزمرہ زندگی کے زیادہ قریب اور متعلق ہیں۔ اسی لیے انہیں نصاب میں ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ ہر فرد اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ اور جب تک یہ ماحول صحت مند نہ ہو اس وقت تک تعلیم و تربیت ممکن نہیں۔ اس لیے بچوں کو مناسب صحت مند ماحول مہیا کرنے کے لیے ان کی بود و باش اور ان کے مشاغل پر گہری نظر رکھی جائے تاکہ غیر صحت مند ماحول کی زہریلی ہوا بچوں کے اذہان کو مسموم نہ کر سکے۔ ہر مضمون کی اپنی افادیت و اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں بچوں کو ایسی تعلیم سے ہمکنار کرنا ہے جس کی بدولت وہ اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کر سکیں، اس لیے ضروری ہے کہ ماضی کے تجربات، حال کے مسائل اور مستقبل کے منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے ان کے سامنے وہ تمام تجربات ہوں جن کے ذریعے وہ کامیابیوں کے اسباب اپنائیں اور ناکامیوں کی غلطیوں کا اعادہ نہ کریں۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ تاریخ جغرافیہ، شہریت ایسے مضامین ہیں، جن میں جاذبیت، وسعت اور ہمہ گیری کا ہے جو طلبہ کی موجودہ ضروریات اور ملکی و ملی ذمہ داریوں کو اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے ہیں۔ تاریخ جغرافیہ اور شہریت ہی ایسے مضامین ہیں جو بیک وقت ہماری کامرانیوں اور ہماری غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہیں اور مسائل اور حل پیش کرتے ہیں۔ خواہ یہ مسائل سیاسی ہوں یا اقتصادی یا معاشرتی۔

حضرات!

تاریخ ہمیں ماضی کے ان گنت تجربات سے روشناس کراتی ہے۔ جو ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے سالہا سال کی آزمائشوں کے بعد حاصل کئے۔ تاریخ کے مضمون ہی کے ذریعے ہم بچوں میں حب الوطنی کے جذبات پیدا کر سکتے ہیں۔ اور یہی مضمون ماضی کے درخشاں ستاروں کی ان ہولناک غلطیوں پر سے بھی پردہ اٹھاتا ہے اور ان سے اجتناب کا درس دیتا ہے اور یہی مضمون ہمیں حکومت پر اعتماد کرنے اور مستقبل کے سیاستدان پیدا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ دیگر مضامین اپنے محدود دائرے میں تو بلاشک و شبہ نفع بخش ہیں، مگر اجتماعی زندگی پر ان کی گرفت نہیں ایک بہترین انجینئر یا ڈاکٹر دیانتداری اور عوامی خدمت کے جذبہ سے سرشار ہے تو وہ یقیناً محروم ہوگا۔ لیکن یہ دیانت و اخلاص کا جوہر اسے تاریخی مطالعہ ہی سے ملے گا کیونکہ جہاں دیانت و اخلاص کے مثبت نتائج اس کی حوصلہ افزائی کا موجب ہوں گے وہاں ان خود غرض، بددیانت افراد کے کارناموں کا سراغ بھی ملے گا جن پر تاریخ نفرین بھیجتی ہے۔ تو حضرات لازمی ہے کہ ہم طلبہ میں تاریخ کے مطالعہ کا زیادہ سے زیادہ ذوق پیدا کریں۔ تاکہ وہ ماضی کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک وملت کی صحیح خدمت کر سکیں۔ تاریخ کی تدریس کے بارے میں آگے چل کر کچھ عرض کروں گا۔

حضرات! معاشرتی علوم کی دوسری اہم شاخ جغرافیہ ہے۔ تاریخ و جغرافیہ کا رشتہ ابدی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو الگ نہیں کر سکتے کیونکہ ایک کے بغیر دوسرا زندہ نہیں رہ سکتا۔ جغرافیہ کا مضمون نیا نہیں لیکن یہ کبھی پرانا بھی نہیں ہوا، یہ ہمیشہ نشوونما پاتا رہتا ہے۔ اور جوں جوں اس دنیا میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں نئے ممالک بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ جغرافیہ کے نئے بابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

آج سے صدیوں پہلے جب ہمارے اسلاف تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں دور و دراز ممالک میں گئے۔ وہاں کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ان ممالک کے جغرافیائی حالات سے بھی متاثر ہوئے چناں چہ انہوں نے نئے راستوں کی دریافت، دریاؤں سمندروں پہاڑوں اور وہاں کی مخصوص آب و ہوا کا ذکر بھی کیا۔ اور باقی لوگوں کی رہنمائی کے لیے ان معلومات کو کتابی شکل میں منتقل کیا اور "المالک و الممالک" کے نام سے مشہور ہوئیں۔ یہ جغرافیہ کی ابتدائی کتاب تھی۔ آج کے زمانہ میں کوئی قوم یا ملک جغرافیہ کے مطالعہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جو جغرافیائی اثر سے آزاد ہو۔ انسانی تربیت، نشوونما کام کرنے کی صلاحیت۔ کام کی نوعیت اور مختلف منصوبوں کا آغاز و اختتام جغرافیائی حالات کے مطابق رکھا جاتا ہے۔ اور جب جغرافیہ ہماری زندگیوں پر آنا محیط ہو تو حضرات ہم کیوں کر اس مضمون سے اغماض برت سکتے ہیں۔ یہ تو آج کا سائنسی دور ہے۔ سینکڑوں سال پہلے ہلاکو جیسے خون فشاں حکمران نے بغداد میں ایک عظیم الشان رصدگاہ قائم کی تھی۔ جدید دور میں جغرافیہ کی افادیت سے کوئی ذی فہم شخص انکار نہیں کر سکتا۔ جغرافیہ بطور نصابی مضمون کے انیسویں صدی میں شروع ہوا۔

موسم کا حال۔ بحری اور ہوائی جہازوں کی آمدورفت، آبدوز کشتیوں کی نقل و حرکت، زلزلوں اور سیلابوں کے متعلق تمام پیشگوئیاں جغرافیہ کے علم کی محتاج ہیں۔ ملکی قدرتی و زرعی پیداوار درآمد برآمد کا تمام تر انحصار جغرافیہ پر ہی ہے۔ جغرافیہ ہی کی بدولت ہم مختلف قوموں اور ملکوں کے مزاج اور ماحول سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں گویا جغرافیہ مولف العلوم ہے۔ یہ مضمون دیگر جملہ مضامین سے مواد حاصل کر کے ان پر بحث کرتا ہے۔ جغرافیہ سطح ارض پر مختلف مظاہر کے تعلقات اور ان کے ایک دوسرے پر اثرات کی تشریح ہے۔

جغرافیہ ہی بچوں میں مشاہدہ کا شوق اور سیاحت کا ذوق پیدا کرتا ہے۔ فوجی منصوبے بناتے وقت سب سے پہلے جغرافیائی حالات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں کیا یہ ضروری نہیں کہ اس مضمون کو مدارس میں اپنے بہترین وسائل اور دلچسپی سے پڑھائیں۔ تاکہ آج کے بچے جو مستقبل کے شہری ہیں قوم و ملک کی صحیح رہنمائی کر سکیں۔

معاشرتی علوم کی تیسری بڑی شاخ شہریت ہے۔ یہ مضمون بچوں میں ایک دیانتدار، پرخلوص اور شہری بننے میں مدد دیتا ہے اور جملہ مضامین کی نوک پلک سنوارتا ہے۔ جو وہ پڑھتا ہے۔ ایک قابل ضی دان، ایک انجینئر، ایک ڈاکٹر، اپنے دائرہ عمل میں خواہ کتنا ہی اونچا مقام رکھتا ہو اس وقت تک ایک اچھا شہری نہیں کہلا سکتا جب تک اپنے گھر، محلے یا شہر میں وہ ان تمام شہری اصولوں کی پابندی نہ کرے یا اخلاقاً اس پر عائد ہوتی ہیں۔ شہریت ہی سے بچے مملکت کی ماہیت، طرز حکومت اور مختلف شعبہ ہائے حکومت کے اغراض و مقاصد سے روشناس ہوتا ہے۔ سوسائٹی کی ذمہ داریوں اور ملکی ضروریات سے اس وقت ہی وہ عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ آداب شہریت ہی بچے کو اس بات پر تیار کرتے ہیں کہ وہ صحت مند ماحول میں زندگی بسر کرے اس پر حکومت کی ذمہ داریاں ہیں تاکہ اوصاف حمیدہ سے متصف ہو کر معاشرے کا ایک نہایت اعلیٰ رکن بن سکے۔ اور مثبت اور مفید کردار ادا کر سکے۔ قومیں افراد سے بنتی ہیں، اگر افراد صحت مند ہوں گے تو قوم بھی صحت مند ہو گی۔ پھر اسی مضمون کی بدولت طلبہ کو حکومت کے ہر شعبہ کی ہیئت و فرائض سے روشناس کرایا جاتا ہے تاکہ آئندہ زندگی میں وہ اپنے مزاج اور رجحان طبع کے مطابق حکومت کے کسی محکمہ کا مفید رکن بن سکیں۔ آغاز شہریت ہی مختلف طرز فکر اور طرز حکومت سے روشناس کراتی ہے۔ سکول اور کالج ہی تمام محکمہ جات کو مختلف پیشہ ور انہ افراد مہیا کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ بچوں کو شہریت کی تعلیم سے ہر ممکن طریقہ سے تعلیم دی جائے۔ تاکہ وہ مستقبل میں کوئی ابہام و پیچیدگی محسوس نہ کریں۔ اسی مضمون کے توسط سے طلبہ لوکل باڈیز، ادارہ یا ہی، ڈسٹرکٹ کونسل پنچایت سسٹم آئینی تدوین اور مردم شماری وغیرہ سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ انہیں پتہ چلتا ہے۔ گھریلو بجٹ کی طرح حکومت کس طرح آمدنی حاصل کرتی ہے اور کس طرح خرچ کرتی ہے اسی وجہ سے موجودہ نصاب میں اسے ایک علیحدہ مضمون کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔

جہاں تک ان مضامین کی تدریس کا تعلق ہے مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی اہمیت کے پیش نظر اساتذہ کرام نے ویسی توجہ نہیں کی جس کے یہ مضامین مستحق ہیں۔ طلبہ محض ان کو رٹنے کی کوشش کرتے ہیں کیوں کہ وہ انہیں خشک مضامین سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ اساتذہ کرام اگر تھوڑی بہت محنت سے کام لیں

ان مضامین میں خاصی دل چسپی پیدا ہو سکتی ہے۔ طلبہ ماضی کے متعلق اندازہ نہیں لگا سکتے اس لیے ماضی کی کاسی چارٹ اور تصاویر سے پوری طرح کی جا سکتی ہے۔ ثانیاً استاد کو ایک اچھا داستان گو بھی ہونا چاہیے اغور فرمائیے ہمارے آبا و اجداد کتنے عمدہ قسم کے داستان گو تھے ان کی زبان سے نکلے ہوئے مقولے ہانیاں، آج بھی ہماری نوک زبان ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ تاریخ کے استاد کو ایک ایکٹر بھی ہونا چاہیئے مثال ے طور پہ اگر راجہ پورس اور سکندر اعظم کے مکالمہ کو ایک بہترین استاد ایک خاص انداز سے بیان کرے طلبہ کو یہ منظر کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔ تختہ سیاہ ایک بہترین مدد تصور کی گئی ہے اس پر سنوں کے سلسل کے چارٹ آسانی سے بن سکتے ہیں۔

تاریخ کے استاد کے لیے تاریخی تسلسل کو قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے ا ستاد کو طلبہ سے ہمدردی ہو اور محبت ہو۔

جغرافیہ کے مضمون کی تدریس کے لیے سب سے پہلے نقشہ جات اور گلوب کا استعمال لازمی ہے ہر طالب علم کے پاس اٹلس ضروری ہونی چاہیئے۔ تاکہ دنیا کے مختلف ممالک کے محل وقوع کے متعلق صحیح طور پر سمجھ سکے۔ اس کے علاوہ جغرافیہ کے استاد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ جماعت کو سمندر، دریا، جنگل پہاڑ اور کھیتوں کا مشاہدہ کرائے۔ تاکہ بچوں میں اس کائنات کی مختلف چیزوں کو بچشم خود مشاہدہ کرنے کا موقع ملے۔ تختہ سیاہ کا استعمال یہاں ضروری ہے۔ استاد کا فرض ہے کہ وہ جغرافیہ کے ہر سبق کے لیے پہلے خود تیاری کرے۔ کیوں کہ جغرافیہ بچوں میں ایک دل چسپی اور جستجو کا مادہ پیدا کرتا ہے۔ اور وہ تمام مسائل یا الجھنیں جو ان کے اذہان میں پیدا ہوں ان کے حل کے لیے استاد تیار رہے STEREOSCOPE کا استعمال بھی جغرافیہ کے سبق میں دل چسپی کا باعث ہے۔

جادو کی لالٹین کی سلائیڈوں اور تصاویر کی نمائش سے بچوں کی دل چسپی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر بجٹ اجازت دے تو پروجیکٹ کا استعمال تو نہایت ہی کامیاب ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ ملکی جرائد اور رسائل کی تصاویر سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ مختلف طلبہ سے اگر کہا جائے کہ وہ مختلف قسم کے پتے وغیرہ جمع کریں تو یہ بھی ان کی جغرافیائی معلومات میں دل چسپی کا باعث ہو سکتا ہے۔

گتوں کے کارڈوں پر مختلف قسم کے نقشے بنائے جا سکتے ہیں۔

اگر استاد RESOURCEFUL ہے تو مختلف کھیلوں کے ذریعہ سبق کو دلچسپ بنایا جا سکتا ہے۔

جہاں تک شہریت کے مضمون کی تدریس کا تعلق ہے۔ یہ فرضی ڈرامے یا کسی نزدیکی میونسپل آفس محصول چنگی کے دفتر یا کسی عدالت میں طلبہ کو عملی کام کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ استاد اپنی نگرانی میں انتخاب کرا سکتا ہے۔ طلبہ کی عدالت کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ اسے وہ نظام عدلیہ کے فرائض سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ پولیس کے فرضی کردار ادا کرنے سے پولیس کی کارکردگی سے واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔

محترم حضرات! اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ معاشرتی علوم کی اہمیت اور اس کی تدریس جتنی اہم اور ضروری ہے اتنے ہی مدارس میں اس کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں دی جا رہی۔ اس لیے میں اساتذہ کرام کی خدمت میں التماس کروں گا کہ وہ اپنی تمام سعی کو بروئے کار لاتے ہوئے ان مضامین کی تدریس میں پوری توجہ دیں قوم و ملت کی یہ بہت بڑی خدمت ہو گی ؎

گل بانگِ تعاون

معلمینِ زیرِ تربیت کی تدریسی مشق کے سلسلے میں ایجوکیشن فیلوشپ کے اہتمام سے ۲۸ نومبر ۱۹۶۲ء کو سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں جناب پرنسپل اے جی بٹ صاحب کے زیرِ صدارت ایک کانفرنس ہوئی جس میں جناب عبدالغفور صاحب طاہر قریشی ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول مصری شاہ نے اس طرح اظہارِ خیال فرمایا (مدیر)

جناب بٹ صاحب، شاہ صاحب، میرے بزرگوار اور عزیزو!

آج کے اجلاس کا انعقاد اِس بات کی ایک واضح دلیل ہے کہ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کا وجود سکولوں کے لیے اور سکولوں کا وجود اِس کالج کے لیے ناگزیر ہے۔ اور یہ دونوں ادارے ایک دوسرے سے جدا ہو کر انفرادی طور پر تعلیمی میدان میں کوئی مفید خدمت سرانجام نہیں دے سکتے۔ اور پھر اس لازوال حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دونوں ادارے جب تک انفرادی اور اجتماعی طور پر سرگرم عمل نہ ہوں اس وقت تک ہماری قوم سے جہالت کی تاریکیاں دور نہیں ہو سکتیں۔ پھر اِس بات کا اعادہ کتنا حوصلہ شکن معلوم ہوتا ہے کہ ٹریننگ کالج سکولوں پر احسان کر رہا ہے، یا سکول کالج پر احسان کر رہے ہیں۔ در اصل یہ دونوں ادارے باہمی اشتراک و تعاون سے جس انداز میں تعلیمی میدان میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں، ان کے لیے قوم ان کی احسان مند ہے۔ لیکن قوم پر احسان کرنا اپنے اوپر احسان کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے جذبۂ احسان کو درمیان سے نکال کر بے لوث خدمت کے پاکیزہ جذبے کی پرورش کرنی چاہیئے۔

جناب بٹ صاحب! آپ نے اپنے کالج کے زیرِ تربیت اساتذہ کو امسال جن خوش گوار پابندیوں اور مستحسن ہدایات کے ساتھ سکولوں میں بھیجا ہے ان کی وجہ سے ان زیرِ تربیت اساتذہ کی حسنِ کارکردگی اور فرض شناسی بہت حد تک قابلِ ستائش ہے۔ امسال میں نے ان اساتذہ کی سرگرمیوں کو خلوص و اشتیاق سے لبریز پایا اور ان کے ہر اقدام میں زندگی اور ہر ارادے میں بلندی کا احساس نظر آیا۔ اگر ہم ان کی کسی کوتاہی کو نظر میں رکھیں تو اِس میں حقیقتاً ہماری اپنی کوتاہی کی جھلک نظر آئے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی یہ امانت دس بارہ روز تک

ہمارے سپرد رہی۔ اور اگر ہم نے اس امانت کی کما حقہٗ رہنمائی نہیں کی تو یہ ایک ایسی افسوسناک کوتاہی ہے جس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑے گا۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان اور اساتذہ کرام کی معمولی ماہرانہ توجہ بھی ان زیرِ تربیت اساتذہ کے لیے بہت بڑی کامیابی کی ضامن ہو سکتی ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ بالخصوص لاہور کے اسکولوں کے سربراہوں کی گوناگوں سرگرمیاں یکسوئی، اطمینان اور غیر منقسم توجہ کی راہ میں حائل رہتی ہیں مگر اس پر بھی مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارے زیرِ تربیت اساتذہ پختہ کار ہیڈ ماسٹروں کے تجربوں سے ضرور مستفید ہوئے ہوں گے۔

حضرات محترم! یہ بات میرے لیے فخر و مباہات کا باعث ہے کہ جس اسکول کی سربراہی کا مجھے شرف حاصل ہے وہاں آپ کے طلباء کو مشقی اسباق کے علاوہ اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ اسکول کے چند اساتذہ نے مختلف مضامین میں زیرِ تربیت اساتذہ کی رہنمائی کے لیے نمونے کے ایک درجن اسباق دیئے، مجھے امید ہے کہ ہمارے نوآموز اساتذہ نے ان اسباق سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہو گا۔ نمونے کے ان اسباق کے علاوہ تفریح کے وقفے میں باقاعدگی کے ساتھ چند معلومات افزا لیکچروں کا انتظام بھی کیا گیا۔ یہ لیکچر نظامِ مدرسہ کے جملہ گوشوں پر حاوی تھے، مثلاً سکول کا جملہ ریکارڈ، طلباء کے مختلف فنڈز، طلباء کی صحت کا جائزہ لینے کے مختلف طریقے۔ مدرسہ میں صفائی کا معیاری انتظام، مجالسِ مضامین، سمعی و بصری طریقہ ہائے تعلیم کے وسائل اور ان کا استعمال۔ طلبہ کے وظائف کی رقوم حاصل کرنے کا طریقہ اور ان کی تقسیم، کھیلوں کی افادیت اور کھیل کے سامان کا اندراج، اساتذہ کے کام کے جائزے کا رجسٹر، بزم ہائے ادب کا انعقاد۔ جنرل اٹنڈنس بورڈ اور اس کی اہمیت۔ نظم و ضبطِ مدرسہ۔ بچوں کی وہ سرگرمیاں جو سکول کی چار دیواری سے باہر بروئے کار آتی ہیں وغیرہ۔ مجھے امید ہے کہ لانگ ٹرم پریکٹس کے دوران ہمارے نوآموز اساتذہ کے سامنے محولہ بالا امور کا اعادہ ان کے لیے نقشِ ثانی کا کام دے گا۔

چراغِ لالہ میں جلتا رہا ہے خونِ بہار
یہ اور بات ہے گلشن میں روشنی نہ ہوئی

شکریہ۔

ؔ

آموزش

نمبر ۱۵ ، شمارہ نمبر ۸ | لاہور

اس شمارے میں

مدیر : پرنسپل اے - جی بٹ

معاونین | نذیر احمد
سید کوثر

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش لاہور

فروری ۱۹۶۳ء

سالانہ چندہ

جلد ـــــــ ۱۵

شمارہ ـــــــ ۸

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

پبلشر

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ایچ۔ڈی،خالد پرنٹر و پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۱۹۴، انار کلی لاہور سے شائع کیا

اداریہ

کسی ملک کے نظامِ تعلیم کا مفید و مؤثر ہونا اِس بات پر منحصر ہے کہ حکومت وقت اُس کے قیام واستحکام کا کیا اہتمام کرتی ہے اور اِس نظام کی تشکیل میں فنِ تعلیم کے ماہروں اور تدریس و تربیت کے کارپردازوں کی رائے کو کہاں تک دخل ہے۔ کیوں کہ تعلیم، حکومت کی پشت پناہی کے باوجود، معلّمین کی پُرخلوص اعانت سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ تعلیم اپنی زندگی و تابندگی کے لیے حکومت سے جلال اور فنِ تعلیم کے صناعوں سے جمال کی صفات حاصل کرتی ہے۔ چنانچہ ہر تعلیمی نظام اپنے قیام میں حکومت کا مرہونِ منت ہوتا ہے اور حُسنِ قبول کے حصول میں اپنے فنکاروں یا معلموں کا دست نگر۔

پاکستان میں جب صدرِ حکومت کے ایماء سے تعلیمی کمیشن بنایا گیا اور نصاب کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی تو ماہرینِ تعلیم کے مشوروں کو پوری اہمیت دی گئی۔ معاشرے کے مقتضیات کے پیشِ نظر تعلیمی اصلاحات کا نفاذ ہوا۔ اور نصاب کی تفصیلات میں حکومت و اساتذہ کی ذمہ داریاں واضح طور پر متعیّن کر دی گئیں۔ تعلیمی رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ نصاب بذاتِ خود کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بلکہ اساتذہ ہی اُسے زندگی عطا کرتے اور جسدِ تعلیم کے لیے روح و رواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ منصب اساتذہ پر بڑی ذمہ داریاں عائد کرتا ہے۔ اسی لیے کمیشن نے معلّمین کے تذکرے میں اُن کی خدمت کی عظمت کو اس قدر سراہا ہے اور اُنھی کو قوم کے مستقبل کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ حکومت نے اُن کے لیے اپنے اوپر بہت سی ذمہ داریاں عائد کر لی ہیں۔ مثلاً اساتذہ کی تربیت کا انتظام اور تربیت میں اعانت کا بندوبست، ریفریشر کورسز کا اہتمام، بیرونی ممالک سے مفید کتابوں اور استادوں کی فراہمی، اور جدید آلاتِ تدریس کا مہیا کرنا۔

عالمی تعلیم کے روز افزوں علوم و فنون کا اقتضا تھا کہ طلبہ کے نصاب کے مواد و تعدادِ مضامین کے لحاظ سے، ہر منزل میں مناسب وسعت دی جائے۔ نصاب کمیٹی نے ایسا ہی کیا۔ اگرچہ کمیٹی کی بعض سفارشات جو یقیناً تعمیری اصولوں پر مبنی تھیں اِبہام و تفہیم کی راہوں سے بہ آسانی نہ گذر سکیں اور انھیں خاطر خواہ

قبولیت حاصل نہ ہوئی۔ لیکن اُن کی ضرورت واہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ پاکستان کی تاریخِ تعلیم کا ایک عظیم کارنامہ ہے جس کے نتیجے کے طور پر تمام مدارجِ تعلیم میں نہ صرف موادِ تعلیم بدلا بلکہ مطالعے کے مختلف اَدوار اور اُن کی مدت کا سابقہ تعین بھی متاثر ہُوا۔ ابتدائی تعلیم کی مدت پانچ سال کی بجائے آٹھ سال کر کے اُسے عام افرادِ ملک کے لیے اپنی جگہ ایک معقول و مکمل منزل قرار دیا گیا۔ پندرہ سال کی مدت میں تمام ملک کے لیے آٹھویں جماعت تک کی لازمی تعلیم کا انتظام کر دینا اور ہر منزلِ تعلیم کے لیے بہترین مقاصد کے تحت موزوں پروگرام مرتب و مدوّن کر لینا معمولی کام نہیں ہے۔ پھر نصاب میں طلبہ کی تعمیرِ شخصیت اور بھرپور نشو و نما کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اب پاکستان کا نظامِ تعلیم تعمیری نقطۂ نظر سے نہایت امید افزا ہے۔ اور قوم کے نونہالوں کو بامِ عروج تک لے جانے کی پیش قیاسی کرتا ہے کمیشن کی سفارشات کے مطابق ملک میں تعلیمی و تربیتی اداروں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے اور افرادِ قوم میں تعلیم کی ضرورت و افادیت کا احساس بھی بڑھتا جاتا ہے۔ ہمارا کاروانِ تعلیم بفضلہ تعالےٰ روز بروز آگے بڑھ رہا ہے ؎

قدم بڑھائے ہوئے۔ آستیں چڑھائے ہوئے
بڑھے چلو، سرِ مقصد سے لَو لگائے ہوئے

ترمیمِ نصاب کے محرکات

اے۔جی بٹ پرنسپل سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور۔

نصابی تعمیر

تعلیمی کمیشن نے پاکستان کے تعلیمی نصاب و نظام کو نئی صورت دینے کے لیے جو سفارشات پیش کی ہیں وہ بڑے غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔

سب سے پہلے انھوں نے اپنی ملکی ضرورتوں کو مدِنظر رکھا ہے کیوں کہ انھیں یہ احساس تھا کہ انگریز سے جو نصابِ تعلیم ورثے میں ملا ہے وہ آزاد پاکستان کی ضرورتوں کے مطابق نہیں۔ بلکہ اس کے اغراض و مقاصد غالب قوم کے مفاد سے وابستہ ہیں۔ چنانچہ اس نصاب اور نظام سے اسی قسم کے لوگ تیار ہو رہے تھے جو انگریز حکومت کی مشینری چلانے میں مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ اس میں تعلیم حاصل کرنے والے ملکی لوگوں کی شخصی اور معاشری ضروریات کو دخل نہ تھا لیکن ملکی آزادی ملنے کے بعد ملک اور قوم کا فائدہ سب سے پہلی چیز تھی اب نہ غیریت تھی نہ غیر حکومت۔ اب اپنا ملک تھا، اپنے لوگ تھے اب سب کچھ اپنا تھا اور تعلیم سے خود اپنے ملک کی بہتری مقصود تھی۔ اپنے لوگوں کو اپنے ملک اور اپنی قوم کی بھلائی کی خاطر تیار کرنا تھا۔ اب اِس بات کا احساس تھا کہ ہر بچہ اور ہر فرد اِس طرح نشوونما پائے کہ وہ ایک طرف بذاتِ خود اپنی شخصیت کی تکمیل کرے، اور اپنی صلاحیت و قابلیت کے مطابق اپنی زندگی سے پورا پورا فائدہ اٹھائے اور دوسری طرف وہ قوم کا مفید اور قابلِ فخر رکن بنے، اور اپنے معاشرے کو جتنا فائدہ پہنچا سکتا ہے پہنچائے۔ چناں چہ اسی احساس کے ساتھ تعلیمی کمیشن نے نئے تعلیمی نصاب اور نظام کی بنیاد مندرجہ ذیل امور پر رکھی۔

۱۔ **انفرادی ضروریات:** تعلیمی نصاب اور نظام ایسا ہو کہ بچہ اپنی مخصوص صلاحیت اور فطری

دل چسپی کے مطابق نشوونما پائے، ماحول سے استفادہ کرے اور اس طرح اپنی شخصیت کی تکمیل کر کے ہر طرح سے خوش حال اور مکمل زندگی بسر کر سکے۔

۲۔ اجتماعی ضروریات

تعلیمی نصاب اور نظام ایسا ہو کہ قوم کا ہر فرد معاشرے کا مفید رکن اور پیداکار شہری بنے، اور ملک کی مختلف ضرورتوں میں سے جس ضرورت کے پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو اسے اپنی محنت سے پورا کر دکھائے۔

۳۔ ملت کی دیرینہ آرزوئیں

تعلیمی نصاب اور نظام ایسا ہو کہ اس کے ذریعے پاکستان اور پاکستانیوں کی وہ ملکی، ملی، اور اخلاقی آرزوئیں اور ارادے پورے ہوں جن کی خاطر پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے۔

۴۔ ملکی قدریں اور اُن کا تحفظ

تعلیمی نصاب اور نظام ایسا ہو کہ اس کے ذریعے پاکستان کے فلسفۂ حیات کا احترام اور اُن قدروں کی حفاظت ہو سکے جن پر پاکستانیوں کی ملی شان قائم ہے۔ ساتھ ہی پاکستان کی مضبوطی اور دفاع کا صحیح اہتمام ہو سکے۔ ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان اتحاد اور یگانگی پیدا ہو جائے اور ملک کا ہر فرد قومیت کے جذبے سے سرشار نظر آئے۔

۵۔ اسلامی طرزِ معاشرت

پاکستان کے عام لوگ مسلمان ہیں اور ان کو متحد رکھنے کا اہم ذریعہ اسلام ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ نظام اور نصابِ تعلیم اسلام کے بنیادی اصولوں یعنی صداقت، عدل اور اخوت کے سمجھنے اور ان کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنے میں مدد دے اور پاکستانیوں کو یہ توفیق ہو کہ وہ اپنی عملی زندگی میں اسلام کے اصولوں کی جھلک دکھا سکیں۔

۶۔ معیارِ معیشت کی بلندی

عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا بھی تعلیم ہی کا ایک فریضہ ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ نظام

اور نصابِ تعلیم ایسا ہو جو پاکستانیوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے میں مدد دے اور انھیں اس قابل بنائے کہ وہ خوش حال اور فارغ البال زندگی بسر کر سکیں۔

۷۔ مختلف شعبوں کے لیے کام کرنے والوں اور ماہروں کی تیاری

ملکی ضرورتیں بے شمار ہیں اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مختلف شعبے، مختلف کارندے مختلف قسم کے ماہر اور مختلف قسم کے عملے کی ضرورت ہے۔ اس لیے نصاب اور نظامِ تعلیم کا ایک کام یہ بھی ہے کہ ملکی ضرورتوں کے مطابق انجینئر، ڈاکٹر، افسر، تاجر، سائنس داں، مستری اور صنعت و حرفت وغیرہ کے ماہر تیار ہوتے چلے جائیں۔

۸۔ ہاتھ سے کام کرنے کا شوق

قوم کے افراد ہاتھ کے کام سے جی چُراتے اور محنت و مشقت سے دامن چھڑاتے ہیں۔ دراصل یہ صورتِ حال دَورِ غلامی کی یادگار ہے۔ آزاد ملک کی خوش حالی کے لیے ضروری ہے کہ اُس کا کوئی فرد ہاتھ سے کام کرنے کو عار نہ سمجھے، بلکہ محنت و مشقت کا عادی ہو۔ چناں چہ وقت کی یہ بھی اہم ضرورت ہے کہ نصاب اور نظامِ تعلیم ایسا ہو کہ ہاتھ سے کام کرنے کا جذبہ پیدا کرے۔

۹۔ اخلاقی حالت کی بہتری

قوم اور ملک کی بھلائی کے لیے معاشری اور اقتصادی حالت کی طرف توجہ دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کے افراد کی اخلاقی حالت بھی بہتر بنائی جائے۔ جس قوم میں بددیانتی، دغا بازی، چور بازاری، کام چوری، سستی، کاہلی اور اسی طرح کے دیگر عیوب پیدا ہو جائیں۔ اس کا اُبھرنا اُس وقت تک مشکل ہے جب تک کہ اِس کی اخلاقی تعمیر اور روحانی ارتقا کی خاطر خصوصی تدابیر نہ کی جائیں۔ چناں چہ پاکستان کے نئے نصاب اور تعلیمی نظام کے سلسلے میں یہ نکتہ بھی بطورِ خاص توجہ طلب تھا کہ اخلاقی حالت کے سنوارنے اور روحانی اقدار کے قائم رکھنے کے لیے کیا کیا جائے۔

۱۰۔ علم و فن کی ترقی

ترقی پذیر ملکوں اور قوموں کا ایک نشان یہ بھی ہے کہ وہ علم و فن کے میدانوں میں پیش قدمی

رہے ہیں کیونکہ علمی ترقی قوم یا ملک کے لیے طرۂ امتیاز کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے نصاب و نظامِ تعلیم کا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ ملک و قوم میں علمی ترقی کا علمبردار بنے۔

۱۱۔ سمجھ دار اور خواندہ شہری

علم و فن کی خصوصی ترقی تو خواص تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن قوم اور ملک کی عام خوش حالی اور فارغ البالی امن اور استحکام کے لیے اس چیز کی اشد ضرورت ہے کہ اس کے عام شہری سمجھ دار اور خواندہ ہوں۔ بُرے بھلے اور صحیح و غلط میں تمیز کرنے والے ہوں۔ اپنے مسائل اور حالات کو سمجھ سکتے ہوں اور وطن دوستی کے جذبے کے ساتھ عمل کی صحیح راہ اختیار کر سکیں۔ اس لیے نصاب میں یہ خوبی ہونی چاہیئے کہ ملک میں عقلمند اور سوجھ بوجھ والے شہری تیار کرے۔

۱۲۔ قومی خدمت کا جذبہ

قومی بھلائی خود غرضی سے کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ افراد میں قومی خدمت کا شوق موجود ہو۔

تعلیمی کمیشن نے ان تمام نکتوں کو تعلیم کی تین اہم منزلوں میں مدِ نظر رکھا ہے۔

اولاً۔ جہاں عوام کی تربیت مفید، خواندہ اور عقلمند شہریوں کی حیثیت سے مقصود ہے۔

دوسرے، جہاں معاشرتی زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والے وطن دوست کارکن تیار کرنے ہیں۔

تیسرے، جہاں ہر شعبے کے مفکروں، رہنماؤں اور منتظموں کی تربیت کا سامان کیا گیا ہے۔

مفید، خواندہ اور عقلمند شہریوں کی تربیت کا گہوارہ ابتدائی تعلیم ہے۔ تعلیمی کمیشن نے اس کی پختگی اور تکمیل کے لیے آٹھ سال ضروری سمجھے ہیں۔ چنانچہ پرائمری کو آٹھویں جماعت تک وسعت دینے کا پندرہ سالہ پروگرام تجویز کیا ہے۔

معاشرتی زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والے وطن دوست کارکنوں کی تیاری کا گہوارہ ثانوی تعلیم ہے۔ تعلیمی کمیشن نے اس منزل میں یہ ضروری قرار دیا ہے کہ مختلف شعبوں میں قابلیت پیدا کرنے کے لیے قسم قسم کے بے شمار مضامین پیش کئے جائیں۔ تاکہ طلبہ اپنی پسند اور صلاحیت کے مطابق

انتخاب کر سکیں۔

مفکرین، منتظمین اور رہنما تیار کرنے کی کارگاہ وہ منزل ہے جو اعلیٰ اور پیشہ ورانہ تعلیم کے نام سے موسوم ہے اور جس کا اہتمام یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ جہاں تفصیلی بحثیں اور تحقیقیں نمایاں صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

ابتدائی منزل کے مقاصد یہ ہیں کہ بچے عملی طور پر خواندہ بن جائیں یعنی وہ پڑھ لکھ سکیں۔ روزمرہ کا ضروری حساب کتاب کر سکیں۔ علم و فن کے ابتدائی ضروری امور سے واقف ہوں اور تعلیم کے سلسلے میں ان کی ایسی بنیاد پڑے جو انہیں آگے تعلیم حاصل کرنے کے لیے تیار کرے۔ وہ اس قابل ہو جائیں کہ شہری ذمہ داریوں کو سمجھیں، وطن سے محبت کریں اور اس کو ترقی میں برضا و رغبت کوشاں ہوں، ان میں محنت خلوص اور تجسس کی عادات پیدا ہوں اور ان کی اچھی طرح جسمانی نشوونما ہو جائے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے کمیشن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ جو نصاب تجویز کیا جائے وہ بچوں کی ذہنی سطح کے عین مطابق اور زندگی کے عام مشاغل سے مربوط ہو تاکہ بچے اس میں دلچسپی لے سکیں اور اس کی ترکیب ایسی ہو کہ بچے پڑھنے، لکھنے اور روزمرہ کے ضروری حساب کتاب میں مہارت حاصل کر سکیں۔ ان میں ہاتھ سے کام کرنے کا شوق پیدا ہو۔ وطن دوستی کے جذبات اُبھریں اور مذہبی اقدار کا شعور پیدا ہو۔ اس منزل تعلیم کے لیے جس نصاب کی تشکیل کی گئی ہے وہ تمام مذکورہ مقاصد و ہدایات کے مطابق ہے۔ اس میں مذہبی تعلیم لازم ہے۔ قومی زبان پر زور ہے۔ معاشرتی علوم کا مطالعہ اہم قرار دیا گیا ہے۔ جسمانی تعلیم کو مناسب مقام حاصل ہے۔ ہاتھ سے کام کرنے کے لیے عملی فنون کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اور نصاب کی تفصیلات میں اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ تعلیم کا روزمرہ زندگی سے گہرا ربط رہے اور کسی مقام پر طلبہ کی ذہانت اور صلاحیت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

ملکی و ملی ضروریات کے تحت نصاب میں جن چیزوں کی طرف توجہ مبذول کی گئی ہے آئندہ ان پر اور زیادہ زور ہوتا چلا جائے گا اور تجربات کے ساتھ ساتھ ان میں ضروری اور مفید اصلاحات جاری رہیں گی۔

ثانوی منزل میں تعلیم کے مقاصد فطری ضرورتوں کے مطابق معین کئے گئے ہیں۔ اس سطح پر بچے کی عمر کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انفرادی حیثیت سے شہری کی حیثیت سے، کارکن کی حیثیت سے، اور ایک وطن دوست کی حیثیت سے، مکمل نشوونما پائے۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے کمیشن نے ضروری سمجھا ہے کہ اس منزل میں انتخابی مضامین کی کثرت ہو تاکہ بچہ مختلف تجربات حاصل کرے اور علم کے ہر اُس ضروری شعبے سے کسی حد تک مستفید ہو سکے جس کی اُسے عملی زندگی میں ضرورت ہے۔ چناں چہ اس منزل کے نصاب میں لازمی مضامین کو تبدیریج کم کیا گیا ہے۔ اور انتخابی وعملی مضامین کی تعداد بڑھا دی گئی ہے۔ سطانی درجے میں قومی زبان، انگریزی زبان، ریاضی، معاشرتی علوم، مذہبی تعلیم، فنون عملی اور جسمانی تعلیم کو لازمی اور عربی یا فارسی یا ڈرائنگ اور موسیقی کو انتخابی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی عملی مضامین کا اہتمام کیا گیا ہے اور ہر طالب علم کے لیے ایک عملی مضمون کا لینا فرض ہے۔ یہ مختلف عملی مضامین مختلف سالوں میں لیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح طلبہ مختلف شعبوں اور فنون میں اپنی قابلیت آزما سکتے ہیں۔ ہائی سکول میں لازمی مضامین کی تعداد کم ہے اور انتخابی مضامین کی تعداد زیادہ۔ جن میں سے طالب علم اپنے مذاق کے مطابق انتخاب کر سکتا ہے۔ یہ مضامین عملی زندگی سے زیادہ قریب ہیں۔ ان میں سے اکثر ملک کی معاشرتی اور اقتصادی حالات و وسائل سے متعلق ہیں اور طلبہ کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ ان کے متعلق اپنی سمجھ کے مطابق رائے قائم کر سکیں۔ ایجادات کے استعمال کرنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے جس قسم کے بنیادی سائنسی علم کی ضرورت ہے۔ وہ بھی ان مضامین میں شامل ہے۔ اس منزل میں قومی زبان۔ انگریزی زبان، عام حساب۔ معاشرتی علوم۔ جنرل سائنس اور جسمانی تعلیم لازمی ہیں اور کئی انتخابی مضامین میں سے ہر طالب علم تین سے پانچ تک انتخابی مضامین لے سکتا ہے۔

ہائر سیکنڈری کی منزل عام تعلیم کی آخری منزل ہے۔ اس میں لازمی مضامین کی تعداد صرف دو تک رہ جاتی ہے۔ انتخابی مضامین کے گروپ بنائے گئے ہیں۔ تاکہ یہ منزل پیشہ ورانہ تعلیم کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ اس میں مضامین کی تعداد تو کم ہے۔ لیکن ہر مضمون میں معلومات نسبتاً زیادہ گہری کر دی گئی ہیں۔ لا

اور صرف معلومات حاصل کرنے کے بجائے تنقید پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

ثانوی تعلیم کی تینوں منزلوں میں دستی کام پر زور ہے۔ اخلاقی تعمیر کی طرف خاص توجہ ہے۔ شہریت کی ذمہ داری، وطن دوستی، شخصیت کی ہمہ گیر تعمیر، ترقی پسندانہ نظریات اور اسلامی اقدار اس کے نمایاں پہلو ہیں۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے اس نصاب پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو ماضی کے مقابلے میں یہ ایک بڑا انقلابی اقدام معلوم ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد تبدیلی و تغیّر کے اس فلسفے پر استوار ہے کہ جس معاشرے میں مسلسل تبدیلی ہوتی جارہی ہو اس میں تعلیم کسی ایک مقام پر نہیں ٹھہر سکتی۔ پیش روی اور آگے بڑھنے کی سعی ضروری ہے اسی میں قومی ترقی کا راز مضمر ہے۔ ماحول کا پاس و لحاظ ضروری لیکن ترقی کی جانب مناسب حرکت اور قومی و انفرادی ضروریات کا سرانجام ہر اُس نصابِ تعلیم کی خصوصیات ہونی چاہئیں جو کسی ترقی پذیر معاشرے کے لیے تجویز کیا گیا ہو۔

نیا نصاب تغیّر کے آغاز کا آئینہ دار ہے۔ ترقی کے لیے مناسب اور موزوں اوقات پر تبدیلی ضروری ہوگی۔ یعنی کل کو جدید ضرورتوں کے مطابق ہر اُس نئے شعبے کی توسیع کرنی ہوگی جس کی آج ابتدا کی گئی ہے۔

لیکن اس تغیّر کی کامیابی استاد کے ذہنی رجحان پر موقوف ہے۔ جب تک اُستاد کا ذہنی رجحان نہیں بدلے گا تغیّر بے سود ثابت ہوگا۔ اس نئے نصاب اور قوم کی نئی تعلیمی ضرورتوں نے استادوں پر اہم ذمہ داریاں عائد کی ہیں۔ مقاصد کی تکمیل انھی کے ہاتھ ہے۔ انھیں پرانی عادات کو الوداع کہنا پڑے گا اور نئی ذمہ داریاں سنبھالنی ہوں گی۔ صحیح قسم کی قومی تعمیر کے لیے اندازِ تعلیم بدلنے پڑیں گے۔ قومی اخلاق و کردار کی صیانت اور اسلامی اقدار کی حفاظت کے لیے خود نمونہ بنانا پڑے گا۔ بچوں کو قومی مشینری کا مفید پرزہ بنانا پڑے گا۔ بلکہ ہر وقت سوچنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کمیشن نے اساتذہ کی تربیت کے لیے بھی نصاب میں تبدیلیاں چاہی ہیں۔ چوں کہ نئے مقاصد کے پیشِ نظر ہر مضمون کی تدریس میں اندازِ تدریس بدلنا پڑے گا۔ اس لیے استاد پر لازم ہے کہ اپنے مضمون پر پورا عبور حاصل کرے۔ بچوں کی نفسیات اور مختلف عمروں میں ان کی جسمانی نشوونما، کردار اور ذہنی کیفیات سے واقف ہو۔ اور جدید ترین اندازِ تحریر سے

متعارف ساتھ ہی وہ اپنی منصبی اخلاقیات اور اہم ذمہ داریوں سے بھی آگاہ ہو۔

معلّم معمارِ قوم ہے۔ وہ جس ڈھب کی معماری کرے گا، اسی ڈھب کی قوم بنے گی۔ قوم کو جس ڈھب پر ڈالنا ہے اس ڈھب سے معلم کو واقف ہونا ضروری ہے۔ معلم کے ذہن میں تعمیرِ قوم کا صحیح نقشہ اتر جائے اور وہ خلوص کے ساتھ معماری کے فرائض سرانجام دے تو عمارت حسبِ منشا تیار ہوگی۔ وقت کی بڑی ضرورت صحیح اور مخلص معلّم ہے۔

بچوں کی شخصیت اور اخلاق

پر

والدین کے روزمرّہ کردار کا اثر

ڈاکٹر عبدالرؤف ڈائریکٹر بیورو آف ایجوکیشن لاہور

بچے حقیقی سرمایۂ قوم

کسی قوم کا حقیقی سرمایہ سیم و زر نہیں بلکہ اس کے افراد اور خاندان ہوتے ہیں۔ مگر محض افراد کی تعداد اور خاندانوں کی وسعت ہی کسی قوم کے لیے باعث افتخار نہیں ہو سکتی۔ بلکہ روشن دماغ افراد اور متوازن خاندانوں سے قومیں بنتی ہیں۔ روشن دماغ اور کارآمد افراد کے معرضِ وجود میں آنے اور متوازن خاندانوں کی داغ بیل پڑنے کے لیے گھریلو تربیت کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ گھریلو تربیت میں والدین کے روزمرّہ کردار اور طرزِ عمل کے مروجہ طریقوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بچہ گھریلو زندگی کے ان عناصر سے بے حد متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اس کی شخصیت اور اخلاق کے بننے اور بگڑنے میں والدین کے ذاتی اطوار و کردار کو بہت دخل ہے۔

والدین کے غیر مستحسن کردار کے چند عام نمونے

ذیل میں ہمارے ہاں والدین کے غیر مستحسن کردار کے چند عام نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ بچوں پر ان کا مخرب اخلاق اثر محتاج وضاحت نہیں۔

(۱) **روزمرہ جھوٹ اور مبالغہ آمیزی کی چاٹ:** ہمارے عام گھروں میں جھوٹ اور مبالغہ آمیزی اس قدر عام ہو چکی ہے کہ اس کے بلا تکلف استعمال میں کسی کو بھی حیرت نہیں ہوتی۔ کئی باپ اپنے بچوں کو کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ کہہ دو کہ ابا جان گھر پر نہیں ہیں۔ اسی طرح، عمر، تنخواہ، اخراجات اور روزمرہ معاشرتی معاملوں سے متعلق بھی ہم بچوں کی موجودگی میں انواع و اقسام کے جھوٹ نہایت بے تکلفی سے بولنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم نے شاذ و نادر ہی اس بھیانک حقیقت پر غور کیا ہوگا۔

کہ ہماری ان بری عادات سے بچوں کی شخصیت اور اخلاق کس بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔

(۲) **نوکروں، افرادِ خانہ اور ہمسایوں سے بد سلوکی:** نوکروں پر ظلم و ستم، میاں بیوی کی تلخ کلامی، بہن بھائیوں کے جھگڑے اور پڑوسیوں کی نکتہ چینی بھی ہماری معاشرتی زندگی میں مستقل فیچر کا مقام رکھتے ہیں۔ جب یہ ناخوشگوار باتیں بچوں کی موجودگی میں رونما ہوں تو ان کی قباحت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۳) **جسمانی اور ماحولی صحت سے غفلت:** اکثر والدین بچوں کی صفائی، غسل، لباس کی تبدیلی، سیر و تفریح، ورزش اور اپنے ساز و سامان کی رکھ رکھاؤ میں مجرمانہ تساہل سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے عام گھر گندے اور ہمارے گلی بازار متعفن نظر آتے ہیں۔ ہمارے گاؤں مچھر، مکھی اور جراثیم کے مرکز بن چکے ہیں۔ اس کی بیشتر ذمہ داری ان بالغوں پر عائد ہوتی ہے جو صحت و صفائی کے بنیادی اصولوں سے نہ صرف غفلت برتتے ہیں بلکہ کردار کے اس غیر مستحسن پہلو کا بچوں کے سامنے مظاہرہ کر کے آئندہ نسل کو بھی ان ناخوشگوار عادات و اطوار سے ملوث کر دیتے ہیں۔

(۴) **ناقص اور غیر متوازن تفریحیں:** ہمارے بڑوں نے ریڈیو کے مستقل (یعنی چوبیس گھنٹے) استعمال، ناول بینی، اور لچر فلموں، خصوصاً کھیل اور عیاشی کے متنوع اڈوں میں بس جوش و خروش سے دلچسپی لینی شروع کر دی ہے اس سے ہماری نئی پود کے بچنے کی رہی سہی آس بھی جاتی رہی ہے۔

(۵) **اخلاقی اور مذہبی ضابطوں سے غفلت:** ویران مسجدیں، بے نماز خاندان، جنسی بے راہ روی اور اخلاقی بے اعتدالیوں کے عام مظاہروں نے ہماری معاشرت کو درہم برہم کر رکھا ہے۔ ہمارے بچے ہمارے کردار کے اس افسوسناک پہلو سے بہت بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔

(۶) **قانون کی تذلیل و تحقیر:** ٹریفک کے قوانین، آمدنی ٹیکس، پانی ٹیکس، مکان ٹیکس، اور زکوٰۃ وغیرہ سے بچنے کے لیے جو حیلے بہانے ہم نے تراش رکھے ہیں ان سے عقل حیرت میں پڑ جاتی ہے۔ بچے جب والدین کو قانون کا یوں تمسخر اڑاتے دیکھتے ہیں تو رفتہ رفتہ ان میں بھی فکر اور کردار کے یہ مریضانہ انداز راسخ ہوتے چلے جاتے ہیں۔

۷) **گھروں میں پیشہ ورانہ بے اعتدالیوں کے تذکرے:** ہم لوگ وقت سے پہلے دفاتر سے کھسکنے سرکاری چیزوں کو اڑانے، دفتری کام میں گڑبڑ کرنے، سازشوں اور جوڑ توڑ میں حصہ لینے اور "اللہ کے فضل" (رشوت) کے کارناموں کا بچوں کی موجودگی میں فخریہ ذکر کرنے میں قطعی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے مسموم ماحول میں پلے ہوئے بچے بڑے ہو کر خود بھی اس قسم کی پیشہ ورانہ بداعتدالیوں کو شعار بنا لیتے ہیں۔

(۸) **مریضانہ انداز فکر و عمل:** والدین کے غیر مستحسن کردار کے ان خصوصی پہلوؤں کے علاوہ ان کے مریضانہ انداز فکر و عمل کے چند عمومی پہلو بھی توجہ طلب ہیں۔ عمومی فکر و عمل کے ان قابلِ اعتراض پہلوؤں کی چند ایسی انواع جو بچوں کا نشوونما پر مُضر اثر ڈالتی ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(ا) **خود مرکزیت:** اکثر والدین اپنے من کی کائنات میں ہی الجھے رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی بالغ امنگوں اور خواہشوں کی تشفی کے لیے تو ہر قسم کے ساز و سامان مہیا کر رکھے ہوتے ہیں۔ مگر بچوں کے نقطۂ نگاہ کو کبھی بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا ہوتا۔

(ب) **فقدانِ اعتدال:** ہمارے اکثر بالغ فکر و عمل کی کائنات میں اعتدال سے تجاوز کرنے کے عادی ہیں۔ ہم یا تو حد درجہ رفاقت یا حد درجہ عداوت کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ درمیانی راستوں پر سوچنے اور چلنے سے ہمیں عار آتی ہے۔

(ج) **معاشرتی سنگدلی:** بسا اوقات ہم تشدد، جبر اور ظلم کے واقعات کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھتے ہیں تو کوئی مناسب قدم اٹھانے کی بجائے منہ موڑ کر دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ ایسے بالغوں کی بھی کمی نہیں ہے جو بدی کی طاقت کے ساتھ الحاق کر کے معاشرتی صحت میں مزید خلل کا باعث بنتے ہیں۔

(د) **معاشرتی منافقت:** اسی طرح کئی لوگ محسوس کچھ کرتے ہیں اور فعل و عمل میں کسی اور سمت نکل جانے کے عادی ہوتے ہیں انہیں کسی مخصوص معاشرتی صورتِ حال سے متعلق تاثر اور تجویز تو عموماً صحیح سوجھتی ہے، مگر عمداً عمل کا ایک ایسا راستہ اختیار کر لیتے ہیں، جو اصل احساسات کے بالکل

منافی ہوتا ہے۔

(۴) غیر سائنسی اندازِ فکر و استدلال : ولادت، وفات، نشوونما، حوادث، بارش، سیلاب خوشحالی، تہی دستی، صحت و بیماری وغیرہ کے روزمرہ کے ذکر میں ہمارا عموماً طرزِ فکر اور استدلال غیر سائنسی بلکہ بسا اوقات توہماتی ہوتا ہے۔ ہم اسباب و علل پر غور کرنے کی بجائے توہم اور طبع آزمائی کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں

(۵) مادہ پرستی کی ترویج اور روحانیت کا ڈھونگ : اپنی مشرقی روحانیت کے ڈھول پیٹنے کے باوجود ہم میں مادہ پرستی کی ایک بے حد ناقص اور سطحی قسم روز افزوں ترقی پکڑتی چلی جارہی ہے۔ چنانچہ ہم اپنے فکر و عمل میں انسانوں کی بجائے کاروں اور کوٹھیوں، زمینوں اور باغوں اور مال و زر کو زیادہ احترام کی نگاہوں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

والدین کے غیر مستحسن فکر و عمل کے ان زاویوں کا بچوں کی سیرت اور اخلاق پر بے حد ناگوار اثر پڑتا ہے۔ اپنے بزرگوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی کردار کے ان مریضانہ پہلوؤں کے جنگل میں پھنس کے رہ جاتے ہیں۔ اگر بچوں کے ان ناخوشگوار رجحانوں کی تشخیص اور علاج سے غفلت برتی جائے تو ان میں صحیح سوچ بچار، مطالعہ اور محنت کی صلاحیتیں سلب ہوتی جاتی ہیں۔ ان کی معاشرتی اور اخلاقی صحت خطرات سے دوچار ہو جاتی ہے۔ ایسے میں ان کی آوارگی، ٹیڈیت، اور جرائم کی دنیا میں داخل ہو جانے کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں۔

والدین کی چند خطرناک غلط فہمیوں کا تجزیہ

مجھے اس امر پہ بہت حیرت ہوتی ہے کہ والدین کی خواہش تو یہ ضرور ہوتی ہے کہ ان کا بچہ صحت مند، مفید اور کارآمد شہری کی صورت پروان چڑھے۔ مگر ان کا روزمرہ گھریلو کردار اس خواہش کے عموماً منافی ہوتا ہے۔ اکثر والدین کو اپنی اس بنیادی خواہش اور اپنے غیر مستحسن کردار میں بھیانک تضاد کا احساس بھی ہوتا ہے مگر وہ اس تضاد کو سلجھانے میں مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ والدین کی اس بے بسی کی سب سے بڑی وجہ چند غلط فہمیاں اور خوش فہمیاں بھی ہیں۔ جو انہیں اس سمت میں فکرِ سلیم سے معذور رکھتی ہیں۔

اس قسم کی چند مقبول عام غلط فہمیاں درج ذیل ہیں۔

(۱) بعض والدین اس غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ "بچے کی عقل اور مشاہدہ اتنے تیز نہیں کہ وہ ہماری بھلی بُری بات سمجھ جائیں اور ہمارے کردار کے غیر مستحسن پہلوؤں سے بُری طرح ہی متاثر ہوں"۔ ظاہر ہے یہ غلط فہمی بچوں کی نفسیات کے عام فہم مبادیات سے حد درجہ ناواقفیت پر مبنی ہے۔ بچے بہت تیز طبع اور کافی سمجھ دار ہوتے ہیں۔ بڑوں کی بُرائی میں بچوں کی دلچسپی کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور ہوتا ہے، اس لیے وہ اس سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔

(۲) اکثر والدین اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ "ہمارے کردار کے بُرے اثرات کو زائل کرنے کے لیے ہمارے پند و نصائح کافی ہیں"۔ یہ خیال بھی ناقص ہے۔ بچوں کی زندگی میں الفاظ اور سماع کی نسبت حرکت اور مشاہدہ فوری اور دیرپا تاثیر رکھتا ہے اور ویسے بھی بچوں کو گڑگڑانے سے منع کرنے والا اگر خود بھی گڑگڑاتا ہو تو بچوں پر خالی نصیحتوں سے کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہو سکتا۔

(۳) "بچوں کی نشوونما کی بیشتر ذمہ داری آیا، آتالیق اور معلم پر عائد ہوتی ہے"۔ یہ غلط فہمی ان والدین کی منطقی عیاری کا شاخسانہ ہے۔ جو اس حقیقت کو سمجھنے سے دانستہ گریز کرتے ہیں کہ بچوں کی نشوو ارتقا میں والدین کی ذمہ داری، آیا، آتالیق، معلم اور مولوی کی مجموعی ذمہ داریوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔

(۴) ایسے والدین کی بھی کمی نہیں جو سمجھتے ہیں کہ بچے جب بڑے ہو جائیں گے تو خود ہی سنبھل جائیں گے۔ اگر وہ بچے اپنے گرد و پیش کے انسانی المیوں کا عمیق جائزہ لیں تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہو سکتی ہے کہ ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

(۵) نکتہ ناشناس والدین کی ایک نوع ایسی بھی ہے جو اپنے غیر مستحسن کردار کو یہ کہہ کر سراہتے ہیں کہ اگر بچوں کو "دنیا داری" کی تربیت نہ ملی تو وہ بھولے بھالے بالکوں کی صورت پروان چڑھیں گے اور آئندہ زندگی میں نقصان اٹھائیں گے"۔ ایسے والدین کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آج کا معاشرہ واقعی کچھ بے ڈھنگا سا ہے اور اس میں دنیاداری کی تربیت واقعی کافی کام آتی ہے۔ مگر اس حقیقت

میں بھی قطعی شک نہیں کہ حالات بہت سرعت سے بدل رہے ہیں۔ اور کل کا معاشرہ جس میں ہمارے بچوں نے اہم فرائض ادا کرنے ہیں۔ یقیناً بہتر اور خوش گوار ہوگا۔ اس لیے والدین کے لیے بہترین لائحہ عمل یہ ہے کہ بچوں کو کل کے اِس بہتر معاشرہ میں آبرومندانہ مقام تلاش کرنے کے لیے تیار کرائیں نہ کہ ہمارے اِس سسکتے ہوئے معاشرہ میں متعفن زندگی کو فروغ دینے کے لیے۔

(۶) اونچے طبقے کے اکثر گھرانوں میں بچوں کی کج روی کی بیشتر ذمہ داری والدین کی اس بنیادی غلط فہمی کا نتیجہ ہوتی ہے کہ اگر ہماری ناقص تربیت کی وجہ سے ہمارے بچوں میں کوئی خامی رہ گئی اور بالغ ہوکر انہیں اس وجہ سے کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال پیدا ہوا تو ہم اپنی دولت و ثروت، اثر و رسوخ، گٹھ جوڑ اور سفارش سے ہر خامی کا کفارہ کرلیں گے۔ یہ تخیل کس قدر ناقص اور مجرمانہ ہے۔ اس قسم کی بے جا سرپرستی کے ماحول میں پلے ہوئے بچے بالغ ہوکر والدین کے لیے مستقل دردِ سر بن جاتے ہیں۔ اور اگر والدین انہیں گٹھ جوڑ سے کوئی اعلیٰ اعزاز دلوانے میں کامیاب بھی ہوجائیں تو ایسے بالغ اپنی ناقص بنیادی تربیت اور مربیانہ گھریلو ماحول کی وجہ سے اپنی ذات اپنے خاندان اور سارے وطن کے لیے باعثِ زحمت بن جاتے ہیں۔

(۷) بعض مفلس گھرانے اِس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ بچوں کی معتدل تعلیم و تربیت اور گھریلو فضا کو سازگار رکھنے کے لیے سرمایہ اور آسائش کا ہونا لازمی ہے۔ اِس قسم کے والدین اِس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ اگر ان کا یہ خیال صحیح ہوتا تو تمام سرمایہ داروں کے بچے کار آمد اور متوازن بالغ ثابت ہوتے تھوڑا بہت سرمایہ بچوں کے لیے سازگار ماحول مہیا کرنے کے لیے واقعی ضروری ہے۔ مگر بچوں کی صحیح نگہداشت اور معقول رہنمائی کے لیے فکر سلیم، احتیاط اور وقت اور توجہ کی قربانی کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔

خاندان کی صحت کی اہمیت

والدین کو یہ حقیقت کبھی بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اُن کی روزمرہ زندگی اور گھریلو کردار کے تمام اچھے بُرے پہلو اُن کے بچوں کی سیرت اور اخلاق پر بہت عمیق اور مستقل اثر ڈالتے ہیں۔ والدین

اگر اس بنیادی نکتہ پر غور و خوض کریں تو وہ بچوں کے بگڑنے کے اسباب و علل اور سد ھرنے کے رموز و نکات بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

صورتِ حال سے نپٹنے کا ایک راستہ تو یہ ہے کہ ہم اپنی نازیبا حرکتوں میں مگن رہیں اور اپنے بچوں کو قسمت اور ماحول کے سپرد کر دیں لیکن اگر ہمیں اپنے بچوں، اپنے خاندان اور اپنے وطن کی ٹھوس تعمیر میں حقیقی دلچسپی ہو تو پھر ہمیں اپنے کردار کا کڑا جائزہ لینے اور اپنے اندازِ فکر کا ناقدانہ محاسبہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اِس اہم معاملہ کو اِس زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ہمارے سامنے ذاتی کردار کے فقط دو راستے دکھائی دیتے ہیں۔ یا تو اپنی روزمرہ زندگی اور گھریلو کردار کے تمام شعبوں میں توازن اور صحت کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کر لیا جائے اور اُن پر ہر صورت میں شدت سے عمل کے لیے حتی الوسع کوشش کی جائے: تاکہ ہمارے بچے اپنے گھروں میں ماں اور باپ کی طرف ایک قابلِ تقلید نمونہ کی صورت دیکھ سکیں۔ لیکن اگر ہم اپنے ناخوشگوار فکر و عمل کے چنگل سے نکلنے میں بہت ہی مجبور ہوں اور اپنی شخصیت میں یہ تمدنی انقلاب لانے کے قابل نہ ہوں تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ ہم کم از کم بچوں کی موجودگی میں اپنے بُرے اور بُرے قول و فعل کے اظہار سے اجتناب کی عادت ڈالیں۔ تاکہ ہمارے بچے بیماری بدی کے جراثیم سے محفوظ رہیں۔ والدین کے کردار کی مؤخر الذکر نوع سے بچوں کے بگڑنے کے امکان گھٹ جاتے ہیں۔ مگر اول الذکر لائحہ عمل سے نہ صرف بچوں کے بھٹکنے کے امکانات میں کمی واقع ہوتی ہے۔ بلکہ ایسے پُروقار بالغوں کی داغ بیل پڑتی ہے۔ جن کی زندگی میں صحت، توازن اور عظمت کا دور دورہ ہوتا ہے۔ جو اپنے خاندان کے نام کو روشن کرتے ہیں۔ اپنے وطن کی ترقی اور خوشی میں اضافہ کرتے ہیں، اور ساری کائنات کے لیے امن اور رحمت کے علمبردار ثابت ہوتے ہیں۔

نظم و ضبط

محمد صدیق احمد لکچرر کالج آف ایلومیلیو ایجز لائل پور

نظم و ضبط کیا ہے ؟

حال ہی میں نظم و ضبط کے تصور میں چند بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ڈسپلن کا مفہوم یہ سمجھا جاتا تھا کہ استاد کس حد تک جماعت میں بچوں کو خاموش اور باادب رکھ سکتا ہے۔ ماہرین تعلیم کے خیال میں بچوں کو تعلیم دینے سے پہلے کمرۂ جماعت میں موثر نظم و ضبط کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں بچوں کی نفسیات پر زور دیا جانے لگا اور نظم و ضبط کا فرسودہ تصور آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کھوتا چلا گیا: بچوں کی نفسیات پر زور دینے والوں نے نفسیات کا یہ مطلب اخذ کیا کہ "ہمیں بچوں کو مایوسی کا شکار ہونے سے بچانا چاہیئے" اور یہ کہ "ہمیں بچے کو اپنے جذبات اور احساسات کے اظہار کا موقع دینا چاہیئے"۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ ہمیں چاہیئے کہ بچہ جو چاہے کرے اسے نہ روکا جائے۔ ورنہ وہ کا جلے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈسپلن کے بہت سے مشکل مسائل پیدا ہو گئے جن کا حل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف سمجھا جانے لگا۔ بعض حالات میں یہ نقطۂ نظر پہلے نقطۂ نظر سے بہتر تھا۔ مگر بیشتر صورتوں میں یہ غیر موزوں اور نامناسب ثابت ہوا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موزوں اور مناسب نظم و ضبط کیا ہے اور کس طرح بروئے کار لایا جا سکتا ہے؟ کسی ایک شخص کے نقطۂ نگاہ سے نظم و ضبط کا مطلب یہ ہے کہ وہ کس طرح اپنی زندگی اچھی طرح گذارنے کے لیے اپنی آپ رہنمائی کر سکتا ہے۔ ایک استاد کے خیال میں موثر اور مفید نظم و ضبط اس امر پر منحصر ہے کہ کس طرح وہ بچوں میں خودی اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرتا ہے میرے خیال میں استاد کے لیے یہی نقطۂ نظر اختیار کرنا بہتر ہے۔ اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ ہر فرد تجربات سے ہی کچھ سیکھتا ہے۔ مثل مشہور ہے دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عادت کی بنیاد کسی نہ کسی تجربے پر رکھی ہوتی ہے: ظاہر ہے کہ تجربات تنہائی میں وقوع پذیر نہیں ہوتے. اس کے لیے فرد کا رابطہ دوسرے افراد سے پڑتا ہے. اس جگہ افراد کے آپس کے تعلقات پر معاشرے کی بنیاد رکھی گئی ہے مؤثر نظم و ضبط معاشرے کی صحت مندی کی نشانی ہوتا ہے ماہرین تعلیم کے خیال میں افراد کے آپس میں ربط و ضبط اور مل جل کر کام کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنے سے انہیں نظم و ضبط کی مناسب تربیت دی جاسکتی ہے۔

(۲) انسان غلطی کا پتلا ہے غلطیاں کرنا انسان کی فطرت ہے اور غلطیاں کرکے ہی وہ کچھ سیکھ سکتا ہے غلطیوں پر انسان کو ٹوکنا یا برا بھلا کہنے سے اس کی اصلاح ممکن نہیں۔

(۳) بچوں کو کچھ سکھانے اور پڑھانے کے لیے ان کی مناسب رہ نمائی ضروری ہے۔ رہ نمائی کے لیے ہمدردانہ اور مشفقانہ رویہ کی ضرورت پڑتی ہے. سختی کرنے یا سزا دینے سے بچوں کے اذہان انتشار میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ بد نظمی کی شکل میں رونما ہوتا ہے ۔

(۴) بچہ اس وقت تک کچھ نہیں سیکھتا جب تک کہ اس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ جذبہ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے عمل کی آزادی حاصل ہو. اور وہ اپنے طور پر خود کام کرے غلطیاں کرکے سیکھے. اس طرح حاصل کیا ہوا علم دیرپا اور مفید ثابت ہوتا ہے ۔

مؤثر نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ بچوں کو ایسا ماحول فراہم کیا جائے جس میں وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو مناسب رہ نمائی کے تحت کام میں لاسکیں. اور ان میں ایسی عادات جڑ پکڑ سکیں جو ان کی آئندہ زندگی میں انہیں معاشرے کا ایک مفید اور باعزت شہری بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوں. استاد ہونے کے اعتبار سے ہمارا فرض ہونا چاہیے کہ ہم جماعت میں ایک صحت مند اور بامقصد ماحول پیدا کرنے کی ذمہ داری قبول کریں ۔ صرف اسی طرح ہم تحصیل علم اور اچھی عادات کی تشکیل میں بچوں کی مدد کر سکتے ہیں. اس مقصد کے لیے ہمیں ہر بچہ پر توجہ دینی ہوگی ۔ ہمیں ہر بچہ کو ایک مکمل وحدت کے طور پر قبول کرنا ہوگا. جس مہارت اور فن کا ہم جس حد تک ثبوت دیں گے اسی قدر ہم اس فرض کو نبھائیں گے. اسی قدر ہماری جماعت میں مؤثر اور مفید نظم و ضبط قائم ہوگا ۔

مؤثر نظم و ضبط کے بنیادی اصول

(۱) مؤثر نظم و ضبط کا مقصد بچوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی تربیت دینا ہے۔

بعض استاد مؤثر نظم و ضبط کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ بچے جماعت میں اپنے اوپر قابو رکھیں۔ انکا خیال کسی حد تک صحیح ہے لیکن اس بات پر بہت زیادہ زور دینا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اپنے اوپر قابو رکھنے کا مطلب اکثر یہ لیا جاتا ہے کہ کوئی نامناسب حرکت کرنے سے بچوں کو روکا جائے۔ یہ تو نظم و ضبط کا ایک پہلو ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بچوں میں ایسی عادات پیدا کی جائیں کہ وہ خود بخود کسی بیرونی دباؤ کے بغیر اپنے اوپر قابو رکھ سکیں۔ سختی کرنے سے زبردستی بچوں کو اپنے اوپر قابو رکھنے پر مجبور کیا جائے تو ان کے دلوں میں ضد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور بسا اوقات اس کا نتیجہ بغاوت کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ یا پھر اگر بچہ اپنے جذبات کو بے جا طور پر دبانے پر مجبور ہو جائے تو اس کی شخصیت کو ابھرنے کا اور اس کی فعال اور تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ ایسا بچہ اپنی آئندہ زندگی میں دوسروں کی مدد کا محتاج رہتا ہے وہ ذرا اپنے دماغ سے کچھ سوچ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی قابلِ ذکر کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے استاد کو چاہئے کہ اپنے خیالات بچوں پر ٹھونسنے کی بجائے انہیں موقع دے کہ وہ ان خیالات کو سمجھیں اور پرکھیں، جب وہ دیکھ لیں گے کہ وہ خیالات ان کے لیے اچھے اور مفید ہیں تو خود بخود وہ ان خیالات کو برضا و رغبت قبول کریں گے۔

(۲) مؤثر نظم و ضبط بچے کو اپنی صلاحیتوں سے واقف کرانے میں مدد دیتا ہے۔

ہمارے ملک میں مدرسوں کے اربابِ نظم و نسق میں عموماً یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ قوانین کی سختی سے پابندی اور جماعت میں یکساں ماحول پر حد سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ وہ تمام طلبہ کو ایک سانچے میں ڈھالنے کی ناکام کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں کہ فطرتاً تمام بچے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان میں سے ہر ایک الگ منفرد شخصیت کا مالک ہوتا ہے اور اسی اختلافِ فطرت میں ان کی قوت کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں

کہ بچے دوسرے بچوں کی منفرد شخصیت کا احترام کرنا سیکھیں تو سب سے پہلے ہمیں چاہیے کہ ہم بچوں میں خود اپنی فطرت سمجھنے کا شعور پیدا کریں۔ اپنی کمزوریوں، خامیوں نیز صلاحیتوں کو پہچاننے کے بعد ہی بچہ دوسرے بچوں کی فطرت سمجھنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ جتنے موثر انداز سے ہم بچوں کے ساتھ کام کریں گے اتنی ہی یہ انفرادی صلاحیتیں اُبھریں گی۔ مثال کے طور پر اگر ہم چاہتے ہیں کہ جماعت کے تمام بچے خاموشی کے ساتھ ایک قطار میں جماعت کے کمرے سے باہر نکلیں تو اس کے واسطے ہمیں چاہیے کہ ہم بچوں کو موقع دیں کہ وہ خود آپس میں باہم مشورے کے بعد کمرۂ جماعت سے باہر نکلنے کا موزوں ترین طریقہ معلوم کریں اور اس پر عمل کریں۔ ممکن ہے کہ ابتداء میں وہ کچھ غلطیاں کریں۔ مگر استاد کی مناسب رہنمائی میں وہ کمرۂ جماعت سے باہر نکلنے کا منظم طریقہ اخذ کر کے اس پر عمل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اس طرح ان کی طبیعتوں پر بار بھی نہیں پڑے گا۔ اور ایک اچھی عادت کسی بیرونی دباؤ کے بغیر ان کی فطرت میں جگہ پا جائے گی۔ ہمیں بچے کو یہ سوچنے کا موقع دینا چاہیے کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اور کب اور کیسے کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو پہچاننے کے قابل ہو سکے گا۔ اگر اس نے اپنے آپ کو پہچان لیا تو وہ اپنے ہم جماعتوں کی فطرت اور خواہشات کو سمجھنے اور ان کا احترام کرنے کے قابل بھی ہو سکے گا۔

بچہ کبھی بھی اپنی عزت کرنا نہیں سیکھ سکتا جب تک کہ ہم خود اس کی عزت نہ کریں۔ صرف ہمارا لہجہ اور چہرے کے تاثرات ہی بچہ پر یہ ظاہر کر دیتے ہیں کہ ہماری اس کی بابت کیا رائے ہے اس لیے بول کر جتلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگر ہم بچے کو برا بھلا کہیں گے طعنے دیں گے۔ اس کی قدر و قیمت کو کم ظاہر کریں گے تو بچہ اپنے آپ کو حقیر محسوس کرنے لگے گا۔ اس طرح اس کی فطرت میں ایک خلاء پیدا ہو جائے گا وہ محسوس کرنے لگے گا کہ وہ ایک نکمی اور بے مصرف ہستی ہے اور کوئی قابلِ فخر کارنامہ سر انجام نہیں دے سکتا۔

ہم اپنے بچے کو اپنی عزت آپ کرنا اسی صورت میں سکھا سکتے ہیں۔ اگر کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کر لیں کہ بچہ اپنی نشو و نما کے دوران میں غلطیاں کرتا ہے اور اگر اس سے غلطی سرزد ہو جائے تو اس کے لیے اسے مورد الزام ٹھہرانا اور سزا دینا ہرگز مستحسن نہیں۔

(۳) موثر نظم و نسق کی بنیاد آزادی، انصاف اور مساوات پر استوار ہوتی ہے۔

جمہوریت نہ صرف معاشرے کے لیے ضروری ہے بلکہ جماعت کے ماحول میں بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ جو کچھ بچے مدرسے میں سیکھتے ہیں۔ بڑے ہو کر اسی پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ اگر مدرسے میں جمہوریت کا تصور پختہ نہ ہو سکا تو وہ بڑے ہو کر سوسائٹی میں اپنا جمہوری کردار نبھانے سے قاصر رہیں گے۔ صحیح قسم کی جمہوریت کی درس گاہ سکول ہی ہو سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں جمہوریت کی جو مٹی پلید ہوتی رہی ہے اور قیام پاکستان کے بعد جو ناگفتہ بہ سیاسی الٹ پھیر ہوتے رہے اس کا اصل سبب یہ تھا کہ مدرسوں میں ہمیں اصل جمہوریت کی صحیح تعلیم نہ مل سکی اور ہمارے لیڈر ذاتی مفادات کو ہی جمہوریت کی بنیاد بنا کر اپنا الو سیدھا کرتے رہے۔

جمہوریت کا ابتدائی اصول آزادی رائے ہے، استاد کو چاہیئے کہ وہ اپنی رائے آزادی سے ظاہر کرنے کا موقع دے ممکن ہے کہ اس طرح نظم و نسق میں کچھ خرابیاں پیدا ہوں۔ لیکن استاد کی باہمت اور انتھک کوششوں اور طلباء کے غلطیاں کر کے سیکھنے کے بعد صحیح قسم کی عادات قائم کرنے سے اس نقصان کی تلافی کی جا سکتی ہے۔

جمہوریت کا دوسرا اصول انصاف ہے۔ عدل و انصاف کے متعلق بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ غالباً ہمارے ذہنوں میں انصاف کا تصور مبہم ہے۔ کچھ لوگ اس کا غلط مطلب سمجھتے ہیں۔ استاد اگر کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ کرتا ہے تو یہ عین ممکن ہے کہ وہ فیصلہ مبنی بر انصاف نہ ہو۔ اگرچہ استاد کے اپنے خیال میں وہ انصاف کے عین مطابق ہوتا ہے۔ اصل انصاف تو وہ ہے جسے وہ بچے بھی انصاف سمجھیں جن کی بابت وہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہم کسی فیصلہ کو منصفانہ نہیں سمجھتے تو بلا شبہ وہ ہمارے لیے منصفانہ نہیں ہے۔ اگر وہ فیصلہ ہم پر ٹھونسا گیا تو ہم یقیناً اسے اپنے لئے ناانصافی تصور کریں گے۔ اسی لیے استاد کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی فیصلہ محض اس بنا پر صادر نہ کرے کہ وہ اسے مبنی بر انصاف سمجھتا ہے۔ بلکہ اسے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کے شاگرد اس فیصلہ کو عادلانہ سمجھتے ہیں یا نہیں۔ ہمیں بچوں کو موقع دینا چاہیئے کہ وہ اپنے افعال کو پرکھ کر نا سیکھیں کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط اس طرح

وہ اپنے افعال کو جانچ کرے، صحیح قسم کے فیصلہ کرنے کے قابل ہوں گے اور جمہوریت کو فروغ حاصل ہوگا۔

جمہوریت کا تیسرا اصول مساوات ہے۔ استاد کو چاہیئے کہ وہ جماعت کے ہر بچے کو برابر اہمیت دے اور اس کی توجہ کا مرکز چند ہوشیار اور ذہین بچے ہی نہ ہوں۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر بچے میں کچھ قابلیتیں اور قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ کوئی بچہ پیدائشی طور پر نکما نہیں ہوتا۔ البتہ ہر بچہ دوسرے بچے سے الگ اپنی منفرد شخصیت و کردار کا مالک ہوتا ہے۔ استاد کا فرض ہے کہ وہ ہر بچے کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق پڑھنے اور پھلنے پھولنے کے مساوی مواقع فراہم کرے۔ صحیح مساوات اسی کا نام ہے جو جمہوریت کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

(۴) موثر نظم و ضبط کے لیے بے جا کنٹرول زہر کا اثر رکھتا ہے۔

اگر ہم گستاخی کی سزا بچے کو نہیں دیتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے۔ بلاشبہ گستاخی ایک قابلِ مذمت فعل ہے۔ اور اس قبیح عادت کے سدباب کے لیے کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا ضروری ہے۔ ہمیں مناسب حدود کے اندر رہ کر طلبہ کی گستاخی یا کسی اور بری عادات کو کنٹرول کرنا چاہیئے۔ تعمیری اعتبار سے کنٹرول کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ اور ہر استاد اپنے تجربات کی بنیاد پر ضرورت کے مطابق یہ طریقے اخذ کر سکتا ہے۔ ایک مفید طریقہ تو یہ ہے کہ بچے کی توجہ کو کسی دوسری سرگرمی کی طرف منعطف کرا دیا جائے۔ مثلاً بچہ سے یہ کہنے کے بجائے کہ تم بہت گستاخ ہو، بہتر یہ ہے کہ اس سے کہا جائے کہ ذرا یہ کھڑکی کھول دینا۔ یہاں کمرے میں بڑی گرمی ہو رہی ہے۔ شکریہ۔ پھر جب کھڑکی کھول کر واپس اپنی سیٹ پر پہنچے گا تو بھول چکا ہوگا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا یا کیا کر رہا تھا۔ اگر پھر بھی اس کی اصلاح نہ ہو تو استاد کو اس کے پاس جا کر کوئی چٹکلہ یا لطیفہ سنا کر اسے ہنسانے کی یا اس کے کام کی بابت کوئی تعریفی کلمہ کہہ کر اسے خوش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس طرح غیر شعوری طور پر اس کی بری عادت کا سدِّباب کرنا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

جماعت کے کمرے میں کچھ بچے خیالی تعمیر کرنے رہتے ہیں اور اپنے خوابوں کی دنیا میں گمن رہتے ہیں

نہیں جماعت کے کام اور استاد کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس قسم کے بچوں کو سادہ بیان کے ذریعہ ہوش میں لایا جاسکتا ہے۔ اکثر اُن کو نام لے کر پکارنا ہی انہیں ہوش میں لانے کے لیے کافی ہوتا ہے اس سلسلے میں ایسے بچوں کو برا بھلا کہنا یا طعنے دینا ٹھیک نہیں۔ اور جسمانی سزا تو ہرگز مستحسن نہیں ہے جسمانی سزا پانے کے بعد بچے میں ضد کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے اور اسے پڑھنے لکھنے سے نفرت ہوجاتی ہے۔ استادوں کو اکثر بچوں سے اس قسم کے فقرے کہتے ہوئے سنا جاتا ہے۔ میں نے تمہیں کتنی مرتبہ بتایا ہے۔ مگر تم اپنی حرکت سے باز نہیں آتے۔ میں نے ایک بار منع کیا، دوبار منع کیا، مگر تمہارے کانوں پر تو جیسے جوں تک نہیں رینگتی۔ اس کان سنتے ہو، اس کان اڑا دیتے ہو۔ بالکل چکنے گھڑے بن گئے ہو کہ پانی گرا اور بہہ گیا۔ اس قسم کے بیانات بچوں پر منفی اثر ڈالتے ہیں۔ انہیں تعمیری اقدامات سے کسی طرح بھی تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کا طرز عمل ہمیشہ نقصان دہ ہی ہوتا ہے۔ اس قسم کے الفاظ کہنے کے بجائے اگر کہا جائے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں کوئی فکر لاحق ہے۔ اگر تمہیں کوئی تکلیف ہے تو مجھے بتا دو کہ اس کے دور کرنے کی تدبیر کی جائے"۔ اس مقام پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اگر بچوں پر کسی قسم کا کنٹرول نہ کیا جائے تو وہ راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ اکثر استاد اور والدین بچوں پر حد سے زیادہ نرمی کرتے ہیں اور کسی قسم کا کنٹرول ضروری نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ بھی بچوں کے اتنے ہی دشمن ہیں جتنے کہ سزا دینے والے اساتذہ اور والدین۔ کنٹرول نہایت ضروری چیز ہے لیکن یہ اس طرح عمل میں لایا جائے کہ بچوں کی طبیعتوں پر بار نہ گذرے اور ان کی مناسب اصلاح بھی کرسکے۔ ہمیں کنٹرول کرتے وقت یہ خیال رکھنا چاہئے کہ گناہ سے نفرت کرو مگر گناہ گار سے نہیں"۔

کنٹرول کرتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہئے:۔

۱۔ جتنا حالات کا تقاضا ہو صرف اتنا ہی کنٹرول عمل میں لایا جائے۔

۲۔ کنٹرول کا مقصد سزا دینا یا برا بھلا کہنا نہیں ہونا چاہئے۔

۳۔ بچوں کو جن کاموں سے روکنا مقصود ہو ان کا ذکر موثر پیرائے میں پہلے سے کر دیا جائے۔

۴۔ کنٹرول اس طرح کیا جائے کہ بچوں کے جذبات میں ہیجان یا اشتعال پیدا نہ ہو۔ انہیں غصہ نہ آئے

اور نہ ہی ضد پیدا ہو۔

۵ مؤثر نظم و ضبط کے اصول ہمیشہ ایک سے ہی رہنے چاہئیں ۔

سب لوگ عام طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اصول بدلتے رہیں تو وہ اپنی قدر و قیمت کھو دیتے ہیں نظم و ضبط کے اصول بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ قرار نہیں دیئے جا سکتے ۔ یہ اصول کافی غور و خوض کے بعد بنائے جانے چاہئیں۔ ایک مرتبہ بن جانے کے بعد ان میں ترمیم صرف اسی صورت میں کی جائے جبکہ اس کی انتہائی ضرورت درپیش ہو اور اس کے بغیر چارہ نہ ہو۔ ایسے اصول جو ہر ہفتے یا ہر دن بدلتے رہیں کسی حالت میں بھی مفید ثابت نہیں ہوتے ۔ مثلاً ایک بچہ کو اگر ایک مرتبہ جھوٹ بولنے پر نظر انداز کر دیا جائے اور دوسری مرتبہ اس کو سخت سزا دی جائے تو اس بچے کے ذہن میں بے چینی اور انتشار پیدا ہو گا۔ اور وہ یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکے گا کہ آئندہ جو کچھ وہ کرے گا ، اس کا اس کے استاد پر کیا ردِ عمل ہو گا۔ یہ غیر یقینی حالت اس کے لیے بہت تکلیف دہ احساس پیدا کر دے گی اور وہ کوئی بھی تعمیری کام نہ کر سکے گا۔ اس کا زیادہ تر وقت یہی سوچنے میں صرف ہو گا کہ اسے کیا کرنا چاہئے، کیا نہیں کرنا چاہئے، جس سے وہ اپنے استاد کو خوش رکھ سکے ۔

۶ ۔ موثر نظم و ضبط بچوں میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے ۔

جماعت میں نظم و ضبط کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ بچوں کو زیادہ سے زیادہ عمل کی آزادی دی جائے تاکہ وہ خود غلطیاں کریں اور اس طرح اپنے علم کے دائرے کو وسیع سے وسیع کرتے چلے جائیں ۔ نظم و ضبط کے کام کو خود ان کے اوپر چھوڑ دینے سے ان میں احساس ذمہ داری پیدا ہو گا ۔ پہلے ان کو بتا دینا چاہئے کہ ان کے لیے کونسی عادات مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ پھر جمہوری طریقے سے ہر طالب علم کو آزادی رائے کا حق دے کر نظم و ضبط کے اصول اخذ کئے جائیں۔ پھر ان پر عمل کرایا جائے جو ان اصولوں کو توڑے۔ اس پر خاص طور پر نگاہ رکھی جائے اور اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ بچوں کو اچھے اور برے میں تمیز کرنے کی عادت پیدا کی جائے اور ان میں خود اپنے اعمال کو پرکھنے کی تعلیم دی جائے۔ اس طرح ان کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گا ۔

۷ ۔ موثر نظم و ضبط کے لیے استاد کے قول و فعل میں مطابقت ضروری ہے ۔

جو استاد جماعت میں کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں۔ ان کی عزت بچوں کے دل میں کم ہو جاتی ہے ایسے اساتذہ جماعت کو مؤثر طور پر کنٹرول نہیں کر سکتے۔ اگر استاد چاہتا ہے کہ بچے باادب، راست گفتار اور بااخلاق بنیں تو اسے چاہیئے کہ وہ خود کو ان اوصاف کا حامل بنائے، اور پھر بچوں سے ایسا بننے کی توقع ظاہر کرے بصورت دیگر وہ کلاس میں نظم و ضبط قائم رکھنے میں دشواریاں محسوس کرے گا۔ اس کی اور جماعت کے بچوں کی مشکلات میں اضافہ ہو گا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلیم پر برا اثر پڑے گا اور بچے کچھ سیکھنے کے بجائے بگڑ جائیں گے۔

۸۔ موثر نظم و ضبط قائم کرنے کے لیے صرف سزا کو ذریعہ نہیں بنانا چاہیئے۔

بچوں کو سزا دینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو خاص رعائتوں اور حقوق سے محروم کر دیا جائے جو ان کی مناسب نشوونما تعلیم و تربیت کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ سزا جسمانی بھی ہو سکتی ہے اور ذہنی بھی۔ ہر صورت میں یہ فرد کی عزت نفس کو کم کر کے اس میں احساس کمتری پیدا کر دیتی ہے۔ تعلیم و تربیت کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی ہے کہ وہ بچے کو خودی و خود شناسی کا درس دے۔ اور سزا کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ظاہر ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سزا دیئے بغیر بچے کی اصلاح ممکن نہیں۔ اور وہ اصحاب سزا کو ضروری تصور کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سزا کے ذریعہ وہ بچے کو ایسے معیاروں پر پورا اترنے پر مجبور کرتے ہیں جو ان کے اپنے خود ساختہ ہیں اور جن کو بچے زبردستی اپنانے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔ اس طرح کوئی بچہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اور اس کی قوت فیصلہ کمزور ہو جاتی ہے۔ وہ دوسروں کے رحم و کرم پر جینا سیکھ جاتا ہے۔

بعض حالات میں گوشمالی کرنا، مورد الزام ٹھہرانا اور سزا دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ سزا سرے سے دی ہی نہ جائے غلط ہے۔ لیکن ان کا استعمال انتہائی ضرورت کے وقت کیا جائے تو بہتر ہے۔ جب اس کے بجائے اور کوئی صورت ممکن نہ ہو اور یہ کہ اس سے اصلاح احوال کی صورت نکل سکتی ہو تو ان طریقوں کو بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ زیادہ تر سزا دینا یا بالکل سزا نہ دینا دونوں ہی برے طریقے ہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ بچوں کی اس طرح نگرانی اور رہنمائی کی جائے کہ سختی کرنے یا سزا دینے کی ضرورت ہی

نہ پڑے، بفرضِ محال صورتِ احوال اتنی بگڑ جائے کہ سزا دیئے بغیر چارہ نہ رہے تو تلخ دوا کے طور پر اس علاج کو کبھی آزمایا جا سکتا ہے ۔

۹ ۔ موثر نظم و ضبط کے لیے استاد کو چاہیے کہ وہ تحسین اور انعامات کے ذریعہ بچوں کی ہمت افزائی کرتا رہے ۔ اکثر بچے استاد کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ وہ بچے بھی جو استاد کے جابرانہ رویہ کی وجہ سے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں ۔ استاد کے ہمدردانہ الفاظ سن کر پگھل جاتے ہیں اور ان کی نفرت بہت حد تک کم ہو جاتی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام بچے استاد کی طرف سے ہمدردی اور شفقت کے خواہشمند ہوتے ہیں ۔ اس طرح استاد کا چند تعریفی کلمے کہہ دینا ان کی ہمت افزائی کے لیے کافی ہوتا ہے ۔ تعریفی کلمے کہنے کے لیے بھی استاد کو بچے کی نفسیات سے واقف ہونا ضروری ہے ۔ اکثر اوقات استاد کے تعریفی کلمات کو بچہ اپنے لیے طعنہ سمجھتا ہے ۔ تعریف و تحسین کے لیے مناسب لہجہ اور الفاظ کا انتخاب کرنا چاہیے ۔ ایسا بچہ جس کو اکثر نظر انداز کیا جاتا رہا ہو ، اس کی توجہ کام کی طرف مبذول کرانے کے لیے چند تعریفی کلمات ہی کافی ہیں ۔ اکثر اوقات استاد کے تعریفی کلمات بچے کے لیے مصیبت بھی بن جاتے ہیں ۔ استاد کا جماعت کے سامنے یہ کہنا کہ فلاں بچہ بڑا با ادب ہے ، وہ وقت پر اسکول آتا ہے ۔ اپنا کام دل لگا کر کرتا ہے ۔ استادوں کا کہنا مانتا ہے وغیرہ وغیرہ ۔ اس بچہ کو اپنے ہم جماعتوں کی نظروں میں گرا دیتا ہے ۔ وہ اسے استاد کا منظورِ نظر سمجھ کر اس سے کترانے لگتے ہیں ۔ اس کو استاد کا جاسوس قرار دیتے ہیں اس طرح اس کی زندگی اجیرن ہو کر رہ جاتی ہے ۔ بچے کی تعریف اور تحسین کا اس سے بھی بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس کو کچھ کہنے کی بجائے اس کی مشکلات میں مدد کی جائے ۔ اپنے رویہ سے اس پر یہ ظاہر کر دیا جائے کہ استاد اس پر مہربان ہے ۔ اس طرح مندرجہ بالا صورتِ حال پیدا ہونے سے روک جا سکتی ہے ۔

۱۰۔ موثر نظم و ضبط کا مقصد بچے میں صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے ۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہر فرد کسی صورتِ حال کو اپنے ہی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ استاد کا نقطۂ نگاہ اس کے شاگردوں کے نقطۂ نگاہ سے مختلف ہوتا ہے ۔ سب سے زیادہ حقیقت پسندانہ اور سب سے زیادہ موثر طریقۂ تعلیم وہ ہے جس کے ذریعے بچوں میں صورتِ حال کو سمجھنے اور اس سے عہدہ برآ

ہونے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اور ان میں بھی وہ نقطۂ نگاہ پیدا کیا جائے جو استاد جیسے تجربہ کار آدمی کا ہوتا ہے۔ صرف یہ کہنا «تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے بجائے تم وہ کرو» تعمیری اقدام نہیں کہلایا جا سکتا۔ استاد کو چاہیئے کہ پہلے وہ بچوں میں تجربات اور رہنمائی کے ذریعہ وہ نقطۂ نگاہ پیدا کرے جو اس کا اپنا ہے اور جسے وہ اس خاص صورتِ حال میں بچوں کے لیے انتہائی مفید تصور کرتا ہے۔ جب بچے اس کو اپنا کر اسے مفید پائیں گے تو یقیناً ہمیشہ کے لیے وہ اس نقطۂ نگاہ کو اپنا لیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نقطۂ نگاہ کوئی مستقل چیز نہیں ہوتی۔ حالات کے ساتھ ساتھ اس کا بدلتا رہنا ضروری ہے۔ اس لیے اس میں ترمیم کرنے کے لیے بھی بچوں میں اس کی صلاحیت پیدا کرنا ضروری ہے۔ یہ صرف تجربات کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔

بہت سے کام ایسے ہیں جن کو ہم بچوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں تو فطری طور پر ہم بچوں کو وہ کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی طرح نظم و ضبط سے متعلق بہت سی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں اگر ہم کو بچوں کی فطرت اور نفسیات سے واقفیت ہو تو ہم صورتِ احوال سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہو سکیں گے ورنہ نہیں۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ کو کچھ مشکلات کا سامنا ہے تو اس صورت میں بہتر یہی ہے کہ ہم بچے کو جیسا بھی فطرتاً وہ ہے قبول کرلیں۔ اگر فطرتاً اس میں خوف، دشمنی اور تخریب کے جذبات موجود ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ بچوں کو ان کے اظہار کا موقع دیں۔ اس کی ہمت شکنی کی بجائے ضبط و تحمل سے کام لیں تو اس بات کا امکان ہے کہ بچے کی فطرت کے اچھے پہلو پس منظر سے نکل کر سامنے آجائیں گے پھر اس طرح ان تعمیری اور مثبت رجحانات کی تربیت کی جائے کہ وہ بچے کو مفید فرد بنانے میں مدد دے سکیں۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ استاد کس حد تک اس قسم کا ماحول تخلیق کرنے پر قادر ہے۔ اکثر اساتذہ یہ نہیں جانتے کہ کمرۂ جماعت میں اس طرح کا ماحول کس طرح پیدا کریں۔ اگر کسی بچے کے جذبات اس حد تک مشتعل ہو گئے کہ ان کو جماعت کے کمرہ میں کنٹرول کرنا ممکن نہ ہو تو استاد کو چاہیئے کہ وہ اس بچے کو جماعت سے باہر علیحدگی میں کنٹرول کرے۔ لیکن بچے کو احساس نہ ہونے دے کہ اسے سزا کے طور پر کمرہ سے باہر بھیجا جارہا

علیحدگی کے ماحول میں استاد بچہ کے بہت نزدیک ہو کر اس کی اصلاح کی کوشش مناسب طریقہ پر کر سکتا ہے استاد کو چاہئے کہ پرائیویٹ طور پر بچے کو اپنے جذبات کے اظہار کا موقع دے اور اس طرح کی تدابیر اختیار کرے کہ بچہ خود اپنے سیکھنے پر نادم ہو کر اپنی اصلاح اپنے آپ کرنے کے قابل ہو جائے۔ بچوں کے شدید جذبات کے اسباب معلوم کرنا استاد کا اولین فرض ہے۔ اس طرح بچے کی مشکلات معلوم کی جاسکتی ہیں اور ان کے سدِّباب کی راہیں دریافت کی جاسکتی ہیں۔ اکثر اوقات کسی خاص مشکلات کے ایک سے زیادہ اسباب ہو سکتے ہیں جو آپس میں خلط ملط ہوتے ہیں اور ان میں تمیز کر کے انہیں علیحدہ علیحدہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ جتنا بچہ عمر میں بڑھتا جاتا ہے اتنے ہی اس کے مسائل زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ بہرحال تمام حالتوں میں استاد کو چاہیے کہ وہ بچوں کی فطرت و نفسیات کو پہچاننے کی کوشش کرے اور ہر بچے کو اچھی طرح سمجھنے کی تدابیر اختیار کرے۔ جب بھی کوئی بچہ کوئی غلط قدم اٹھاتا ہے، استاد کو چاہئے کہ ان بنیادی سوالات کے جواب معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ آخر اس طرزِ عمل یا غلطی کا سبب کیا ہے؟ اس طرزِ عمل سے اس کا کیا مقصد ہے؟ وہ کیا چاہتا ہے۔ اگر استاد نے ان سوالات کے جوابات معلوم کر لیئے تو وہ مسئلے کی بنیاد کو پالے گا اور اپنی دریافتوں کی روشنی میں بچہ کی اصلاح احوال کی کوشش کر سکے گا۔

اس سلسلے میں یہاں پر ایک مثال دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اختر ایک پانچویں جماعت کا طالب علم ہے۔ وہ حساب کے کام سے اپنا جی چراتا ہے۔ جبکہ دوسرے بچے اپنے حساب کے سوالات حل کرنے میں لگے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی کہانی کی کتاب کھول کر پڑھنے میں مشغول ہوتا ہے۔ اس کے استاد کا خیال ہے کہ وہ جماعت میں سب سے کمزور طالب علم ہے اگر اس کی یہی حالت رہی تو اس کا امتحان میں کامیاب ہونا ممکن نہ ہوگا۔ وہ بار بار بچے کو سمجھاتا ہے۔ پیار سے اسے کام کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ مگر اختر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ اختر کی مشکلات کا اصل سبب معلوم کرنے کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ شروع سال میں اختر کلاس میں عارضی طور پر غیر حاضر رہا۔ جب استاد سوال سکھاتا تھا تو وہ کھیل کود کی باتیں سوچتا رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی بنیاد کمزور رہی اور اس کے بعد وہ روز بروز حساب میں کمزور ہوتا چلا گیا۔ جب استاد کو اصل سبب معلوم ہو گیا تو اس نے اختر کو جماعت سے الگ کر کے شروع سے اسے حساب پڑھانا شروع کر دیا۔

اور کچھ عرصے میں اختر حساب میں ہم جماعتوں کے برابر پہنچ گیا۔ اور امتحان میں حساب میں اچھے نمبر لے کر پاس ہوا۔ ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔

محمود غصّہ میں لال پیلا کمرہ میں داخل ہوا۔ استاد نے اس سے کہا محمود آج تم بہت غصّہ میں معلوم ہوتے ہو! خیریت تو ہے؟

محمود نے جواب دیا۔ "ہاں مجھے غصّہ آ رہا ہے۔"

ذرا ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ غصّہ کیوں اور کس پر آ رہا ہے"؟ استاد نے پوچھا۔

محمود نے کہا۔ جناب میرے ہم جماعت میرے بوڑھے اور اندھے باپ کا مذاق اڑا کر مجھے چھیڑ رہے ہیں۔

واقعی بہت برا کر رہے ہیں شریر لڑکے۔ اچھا اب تم کام کرو میں انھیں سمجھا دوں گا"۔ استاد نے کہا۔

اس طرح استاد نے بچے کو اپنے جذبات کے اظہار کا موقع دے کر اس کے بھڑکے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کرنے میں مدد دی۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح اس نے بچے کی پریشانی کا اصل سبب بھی معلوم کر لیا۔ ممکن تھا جذبات دبائے جانے کی صورت میں مزید پیچیدگیاں پیدا کر دیتا۔

۱۱۔ مؤثر نظم و ضبط کے لیے صحیح رہنمائی اور مناسب ہدایات کی ضرورت ہوتی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ بچہ غلطی کر کے سیکھتا ہے۔ اس کی کام کرنے کی قابلیت آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ جیسے جیسے اسے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ ویسے ویسے وہ ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے علم و معلومات میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ اس طرح نئے نئے تجربات اسے بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ ان تجربات کے لیے اسے صحیح رہنمائی اور مناسب اور بروقت ہدایات کی ضرورت ہوتی ہے۔ استاد کو چاہیے کہ رہنمائی اور ہدایات دینے میں بڑی احتیاط سے کام لے اور اس مقصد کے لیے پہلے ہی سے کچھ حدود مقرر کر لے۔ پھر ان حدود میں رہ کر مصروفِ عمل ہو جائے۔ یہ نگرانی اور ہدایات بچوں کے لیے قابلِ قبول ہوں ضروری ہیں۔ بچے کو یہ بھی علم ہونا چاہیئے کہ اسے کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر استاد پہلے بچوں سے یہ کہے کہ انھیں عمل کی آزادی حاصل ہے۔ اور پھر ان پر پابندیاں عائد کرے تو اس کا نتیجہ

ضرور اضطراب پیدا ہوگا اور بچے کچھ سیکھنے کے بجائے الجھن میں پھنس جائیں گے اور اپنے استاد پر سے ان کا اعتماد اُٹھ جائے گا۔ حدود مقرر کرتے وقت ہمیں بچوں کی ضروریات کا لحاظ رکھنا اور ہر بچے کی انفرادیت کا احترام کرنا چاہیئے۔ یہ کہنا کہ بچے اپنے لیے کسی قسم کی پابندی کو پسند نہیں کرتے غلط ہے۔ جب بچے دیکھتے ہیں کہ پابندی ان کے حق میں مفید ثابت ہو رہی ہے تو وہ بہر صورت اس کا احترام کرتے ہیں اور اسے پسند بھی کرتے ہیں لیکن پابندی صرف اس وقت تک رہنی چاہیئے جب تک اس کی ضرورت ہو۔ ضرورت پوری ہونے کے بعد اسے جاری رکھنا مضر ثابت ہوتا ہے۔

بچے کو کام پر آمادہ کرنے کے لیے اس کی اپنی رائے کو بھی وقعت دینی چاہیئے۔ اس کی دلچسپیوں، مرغوبات اور خواہشات کو دھیان میں رکھنا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے بچوں میں خود اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینے کی عادت پڑے گی۔ جامد نظریات اور پابندیاں ان کی قوت فیصلہ کو مفلوج کر دیں گی۔ اور وہ بڑے ہو کر معاشرے کیلئے عضو معطل بن کر رہ جائیں گے، اور یہ بہت بڑا قومی سانحہ ہوگا۔

غرضیکہ مؤثر نظم و ضبط (ڈسپلن) ہر مدرسے اور ہر جماعت کے لیے ضروری ہے۔ اس کے حصول کے لیے استادوں کو اُن تھک محنت اور فہم و فراست سے کام لینا چاہیئے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے اور یہ کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا کہ نظم و ضبط صرف سزا دینے سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے انہیں اپنے نقطۂ نگاہ میں بنیادی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ ہمیں بچے کو انفرادی طور پر ایک مکمل شخصیت تصور کر کے اس کی نفسیات سے واقفیت حاصل کرنا ہوگی اور ایسا لائحہ عمل مرتب کرنا پڑے گا جو نونہالان قوم کی صحیح رہنمائی اور تربیت کر سکے صرف اسی طرح ہم اپنے آپ کو صحیح طور پر معمار قوم کے لقب کے مستحق بنا سکتے ہیں۔

ہماری روزمرہ زندگی اور تعلیمی تقاضے

پروفیسر فرحت اللہ خاں نیو مسلم کالج لاہور

۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بحیثیت ایک آزاد مملکت کے وجود میں آیا۔ اسلامی حکومتوں میں یہ سب سے بڑی اور اہم حکومت ہے مرحوم قائداعظم محمد علی جناح نے جو اس نوزائیدہ مملکت کے بانی اور پہلے گورنر جنرل۔ ایک باعمل اور نیک نیت قائد کی حیثیت سے پاکستان کی بنیادوں کے لیے تین بنیادی اصول یا ستون۔ اتحاد، اور تنظیم تجویز کئے۔

اس عظیم اسلامی سلطنت کو انھیں تین ستونوں پر قائم کرنا تھا۔ لیکن قائداعظم ایک سال کی جدوجہد کے بعد خدا کو پیارے ہوئے۔ اور وہ نیک کام جو ان کی جدوجہد سے قلیل ترین عرصہ میں پروان چڑھا پاکستان کے دوسرے رہنماؤں کے لیے ایک مسئلہ لاینحل بن کر رہ گیا۔

برطانوی نظام تعلیم

اگرچہ پاکستان آزاد ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا نظام تعلیم برطانیہ کی یادگار تھا، جو تقریباً سو سال سے رگ و ریشے میں اثر کر رہا تھا۔ سرسید مرحوم نے علی گڑھ کالج کی تعلیمی درس گاہ کی بنیاد رکھ کر مسلمان قوم کو نظام سے روشناس کرانے کی کوشش کی تھی۔ مغربی پاکستان کے تمام درسی اداروں میں بھی تعلیم کے اس نظام تعلیم کو اپنایا جا رہا تھا۔ اور انجمن حمایت اسلام اسلامیہ کالج پشاور اور سندھ مدرسہ نے بھی اسی کو جاری رکھا، جو وقتی تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ پاکستان کے ابتدائی دور میں اس کی گنجائش ہی نہ تھی کہ ٹھنڈے دل سے بیٹھ کر غور کیا جائے اور اپنے پرانے تجربات کی بنا پر مستقبل کے لیے کوئی پروگرام بنایا جائے۔

ہاں قائداعظم مرحوم کی نظروں میں اس کی بھی بڑی وقعت تھی اور وہ چاہتے تھے کہ

آزاد حکومت کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے کچھ بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ انھوں نے جناب ڈاکٹر ذا
خانصاحب سے اس کی خواہش بھی کی۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین اور خواجہ غلام السیدین جواب بھی اسی قسم کے
ہندوستان میں سرانجام دے رہے تھے پاکستان نہ آسکے اور ہمارے نظامِ تعلیم کو نیا روپ نہ دیا جا

نئے پاکستان کے نئے مسائل

پاکستان بننے کے بعد سب سے اہم اور نیا مسئلہ جس نے دونوں ملکوں کے نظامِ تعلیم کو درہم
مسئلہ نوآبادکاری تھا۔ ایک بہت بڑی آبادی کا سیلاب یہاں سے گھر بار چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا
بہت سے مسلمان پاکستان میں آکر آباد ہو گئے۔ خیال ہے کہ پچاس لاکھ ہندو سکھ ہندوستان میں
اور ایک کروڑ کے لگ بھگ مسلمان پاکستان میں آئے۔ ان کے لیے نوآبادکاری سب سے
تھا۔ جہاں جہاں نوآبادکاری میں نہ صرف آدمیوں کو آباد کرنا پڑا بلکہ ان کی خاطر زمین کی تقسیم۔ مکانوں کی تق
کی تقسیم۔ تجارتی اداروں کی تقسیم اور نظامِ حکومت میں عہدہ داروں کی تقسیم بھی عمل میں آئی۔ ہنگا
نے کچھ ہنگامہ سا مچا دیا۔ آبادکاری اور آسائش کے لیے بدعنوان لوگوں نے رشوت ستانی کا بازار گرم
قائداعظم کے اللہ کو پیارا ہوتے ہی آبادکاری کے محکمے بدعنوانیوں اور بددیانتیوں کا
رہ گئے۔ چوربازاری اور تجارتی مال کی سمگلنگ عام ہو گئی، ایماندار لوگ گھروں میں جا چھپے، ا
کر آدھے رہ گئے۔ نودولتی معاشرے کے ہر شعبہ میں پیش پیش نظر آنے لگے۔ جن کے رہنے
دہ تین تین لاکھ کے کلیم جیبوں میں رکھے دنیا کے سودے کرتے پھرنے لگے۔ دولت ہی ترقی کا
اور ایمان، اتحاد اور تنظیم، جن کی بنیادوں پر پاکستان کی تعمیر ہوئی تھی ایک خواب بن کر رہ گیا۔ نودو
اخلاقی معیار بدل دیئے۔ چوربازاری، رشوت، سمگلنگ اور خوشامد ہنر سمجھے جانے لگے اور ملک
پرانے اخلاقی اقدار کی بجائے بدانتظامی، موقع شناسی، ناجائز خوشامد، رشوت ستانی، بدعہ
اور صوبہ پرستی نے لوگوں کے دل میں گھر کر لیا۔ اور جن لوگوں کو پرانا معاشرہ ٹھکرا دیتا تھا۔ وہ آ
رہبر اور سردار بن بیٹھے۔ الغرض کچھ عرصہ کے لیے اخلاقی اور قومی تمدن پر تاریکی چھا گئی۔ ہم نے
کوٹھیاں تو بنا ڈالیں۔ لیکن ہمارے پڑھے لکھے لوگوں نے بھی ہندوؤں اور تعمیری کاموں میں

یت زیادہ بھرمادی۔ آج ایک معمولی اکاؤنٹس کلرک سے لے کر اور سیٹھ تک بڑی سے بڑی
کے مالک ہیں، یہ سب اسی دور کی پیداوار ہیں جو آج کل بھی گلبرگ کے ہر کونے میں بڑھ رہی
ور کوئی ان کو روک نہیں سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری اخلاقی اور قومی زندگی خود ساختہ اندھیرے غاروں
کھڑا رہی ہے۔ اس کو حرکت دینے کے لیے بجائے نئے نظریات کے پرانے عملی تقاضوں کی ضرورت
جنھوں نے مسلمانوں کو ملکوں کا رہنما بنا دیا تھا۔ ایسے اقدار کوئی مجدد عالم یا رہنما ہی پیدا کر سکتا ہے۔ پاکستان
شرہ اور لوگوں کی زندگی آج کل بہت پیچیدہ بن گئی ہے جس میں مندرجہ ذیل خامیاں بہت نمایاں
م ہوتی ہیں

بر دہ معاشرے میں خامیاں

- جیسا کہ انگریز کے دور میں رواج تھا، ویسا ہی پاکستان بننے کے بعد بھی ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان سکول، کالج یا یونیورسٹی سے فارغ ہو کر صرف سرکاری یا غیر سرکاری نوکریوں کے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں اور تعمیری کاموں میں ایک منٹ بھی صرف نہیں کرتے
- پاکستان بننے کے بعد بھی ہر قومی کام کے لیے حکومت کی طرف دیکھتے ہیں۔ اگر ہمیں ایک چھوٹا سا سکول بنانا ہو تو ہم کہتے ہیں کہ یہ حکومت کیوں نہیں بنا دیتی
- اگرچہ ہر سالانہ میٹنگ میں تاجر چور بازاری اور مہنگائی کو دور کرنے کی تجاویز پیش کرتے ہیں لیکن جب بھی موقع ملتا ہے ان سب کاموں میں پیش پیش ہوتے ہیں۔
- کہتے ہیں کہ دفاتر کا ڈھنگ بھی بدل گیا ہے۔ روز کی میز روز صاف رکھنے کی بجائے صرف وہ کاغذات میز سے ملتے ہیں جن کا معاوضہ مل جاتا ہے۔ کوئی کام کرنا اہلکاروں کے لیے ایک شخصی لحاظ بن کر رہ گیا ہے
- ہمارے رؤسا اور صنعت کاروں نے قومی کاموں میں کم سے کم حصہ لیا ہے حالانکہ ان کے پیش نظر یہ نمونہ پیش کر گئے تھے کہ ہر ایک دکان میں ایک ڈبہ رکھا ہوتا تھا جس میں وہ اپنے قومی کاموں کو پروان چڑھانے کے لیے خود بھی روپیہ ڈالتے تھے اور آنے والے امرا سے بھی درخواست کرتے تھے کہ وہ ڈبے میں کچھ ڈالیں اور خیراتی کاموں میں کچھ حصہ لیں۔ آج کل جب بھی ہمارے

رؤسا کوئی کام کرتے ہیں تو وہ محض حکومت کے افسران کو خوش کرنا ہوتا ہے۔

۷۔ ہمارے عوام میں اس احساس کا فقدان پیدا ہو گیا ہے کہ پاکستان کے لوگوں کو دنیا کی قوموں سے مقابلہ کرنا ہے اور ان کی دنیا میں کامیابی اس بات پر منحصر نہیں کہ انھوں نے اپنے ملک میں کتنی ترقی کی، بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ وہ دنیا کی قوموں کی ترقی کی دوڑ میں کون سے نمبر پر رہتے ہیں۔

الغرض ہمارے معاشرے کا قدار کا نظریہ ہی بدلتا جا رہا ہے اور جو لوگ چور بازاری، سفارش، رشوت اور بدعنوانی کر کے وقتی طور پر امیر بن گئے ہیں۔ ہم ان کی پرستش کرتے ہیں اور وہ اخلاقی اقدار یہ جو تعلیم، اعلیٰ قوموں کے نمونۂ زندگی، اور مذہبی پابندی سے ہم میں پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں۔ معاشرے کی حالت کو سدھارنے کے لیے صحیح تعلیم ہی ملک کی مشکلات کا حل بن سکتی ہے۔

ہماری تعلیم

معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے ہم نے اب تک کبھی تعلیم کو بنیادی حل نہیں سمجھا۔ اور پاکستان بننے کے بعد موجودہ طریقۂ تعلیم نے ہماری قوم میں وہ کردار، عادات اور اہلیتیں نہ پیدا کیں جو ایک آزاد قوم کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔ ہمیں بحیثیت آزاد قوم کے اپنے تعلیمی مسائل بھی خود ہی حل کرنے ہیں ہمیں نصاب تعلیم، طریقۂ تعلیم اور طریقۂ امتحان کو بہت حد تک بدلنا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ۱۵ سے ۲۰ فیصد تک پڑھے لکھے لوگ ملتے ہیں۔ جبکہ مغربی ممالک میں مشکل سے ۱۵ سے ۲۰ فیصد ان پڑھ ہوتے ہیں۔ کیا ہم اتنی پڑھی لکھی قوموں کا نصاب، طریقۂ امتحان اور طریقۂ تعلیم بیک لخت اپنے ملک پر ٹھونس سکتے ہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم پر بھی شل صادق آئے کہ کوا چلا تھا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔

۸ فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خان نے ہماری تعلیم کو ایک عملی رنگ دینے کا بار بار خواہش کی اور تعلیمی رپورٹ اور نصابی رپورٹ تیار کرنے کا حکم دیا۔ ان کی نظروں میں بھی تعلیمی اصلاحات ملک کی مشکلات کا سب سے بڑا حل تعلیں کیونکہ ان کا اثر ہر گھر پر پڑتا تھا۔

لیکن اس نظام تعلیم کو جن بنیادوں پر استوار ہونا تھا انھیں پاکستان کے عوام کا بیشتر حصہ

سمجھنے سے قاصر رہا اور ان کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ لہٰذا اس سے پاکستان کو شش سے ملک کو خاطر خواہ فائدہ نہ پہنچ سکا۔

بہرصورت ملک میں صحیح نظامِ تعلیم جاری کرنے کے لیے درج ذیل تین بڑی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

۱۔ اساتذہ کے نظریہ میں تبدیلی

۲۔ طلبا کے نظریے میں تبدیلی

۳۔ سائنس کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام۔

ہمارے نئے اساتذہ

نئے نظامِ تعلیم کو کامیاب بنانے کے لیے علم دوست، محنتی اور جفاکش اساتذہ کی ضرورت ہے جو سکولوں میں مل جل کر کام کرتے اور اس نظامِ تعلیم کو جو ملک کی بہبود اور ترقی کے لیے بنایا جاتا، کامیاب کرنے کی کوشش کرتے۔ ایسے اساتذہ پبلک سکولوں میں آج کل بھی ملتے ہیں۔ وہ اپنے اپنے کام کو اتنی محنت اور وفاداری سے کرتے ہیں کہ ان کے طلبا دنیا میں جہاں بھی جائیں نہایت موزوں اور کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ اگر ان میں مذہبی خوبو اور پاکستان سے اُنس پیدا ہو جائے تو کون ان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے دہلی میں ایسے مسلمان اساتذہ کی بہت بڑی جماعت بنا دی ہے جو پرائمری سے لے کر کالج کی تعلیم تک اس جذبہ اور شوق سے اپنے طلبا کے ساتھ بیٹھ کر کام کرتے ہیں کہ تمام ہندوستان نے انہی کے نظریات کو اپنا لیا ہے۔ جس پرائمری سکول کی بنیاد ڈاکٹر صاحب نے تقسیم سے پہلے رکھی تھی وہ آج ایک بڑی یونیورسٹی بن گیا ہے۔ جہاں پرائمری جماعت سے یونیورسٹی تک تعلیم دی جاتی ہے امریکہ کے تعلیمی ماہرین جنھوں نے جامعہ دہلی کو دیکھا ہے ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ اگر پاکستان کو علمی دنیا میں ترقی کرنی ہے تو ان کو جامعہ ملیہ دہلی کا نظامِ تعلیم اختیار کرنا چاہیے۔

یہاں کے نمایاں اساتذہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، مولانا عبدالحی جیسی سادہ، نیک نیت اور محنتی ہستیاں شامل ہیں۔ راقم کو بھی ڈاکٹر ذاکر حسین کا مدرسہ دیکھنے کا

موقع ملا۔ مدرسہ کیا، ایک پُر سکون بستی تھی، جہاں ہر استاد اور ہر طالب علم ایسی ایمانداری سے اپنے کام میں معروف تھا کہ ہر طرف ایک تعلیمی ماحول نظر آتا تھا۔

میں نے ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ جناب آپ کے اساتذہ کے اطمینان قلب کا دراصل کیا سبب ہے؟ کہنے لگے۔ ان کے سامنے ایک تعلیمی مقصد ہے۔ اور پھر ہم ان کی سادہ خوراک، سادہ گھر اور سادہ لباس کا خیال بھی رکھتے ہیں اور بعض ان کے بچوں کی تعلیم اور ان کی لگاتار تعلیم بھی تو ہمارا ہی کام ہے۔ مجھے جو نئی کتاب تعلیم پر ملتی ہے میں خرید کر ان تک پہنچا دیتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کی سادہ زندگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ باوجود شیخ جامعہ ہونے کے ان کی تنخواہ سو روپے ماہوار تھی۔ ایک روز ایک بڑے آدمی ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لیے آگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں برابر میں بٹھالیا۔ اور مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر باتیں کرتے رہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب باتیں کرتے کرتے اپنی کالی اچکن کے کالر کے بٹن کی طرف ہاتھ لے جاتے۔

مہمان نے حیران ہو کر پوچھا ڈاکٹر صاحب آپ کے گلے میں کوئی تکلیف ہے۔ کہنے لگے نہیں، کل میرے پاس ایک ہی قمیص تھی کیوں کہ دوسری دھوبی کے گئی ہے۔ بیوی نے کہا قمیص میلی ہو گئی ہے لاؤ اسے دھو دوں قمیص ابھی گیلی تھی کہ جامعہ کا وقت ہو گیا۔ اس لیے میں بنیان پر اچکن ہی پہن کر آگیا ہوں تاکہ طلبا کا وقت ضائع نہ ہو۔

یہ ہے اُن مسلمان مجاہد اساتذہ کی شان جنھوں نے علم کے دریا بہا لے اور قوم کا ہمیشہ سر بلند رکھا۔ ان سادہ لوگوں کے لیے تعلیم ایک مقصد حیات کا حکم رکھتی تھی اور دنیاوی ضروریات کی تکمیل وہ ادارے کرتے تھے جو ان کو چلاتے تھے۔

تقسیم کے پہلے سناتن دھرم سکول اور ڈی اے وی سکول لاہور کے اساتذہ کی بھی یہی روش تھی ڈی اے وی سکول لاہور جس میں آج کل اسلامیہ کالج ہے کچھ ایسی ہی درس گاہ تھا۔ اس کے طالب علم اکثر یونیورسٹی میں اول آتے تھے۔ لیکن اس کے ہیڈ ماسٹر کو صرف سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ ان کا مکان ان کی لائبریری اور ان کے بچوں کی تعلیم جس کی تکمیل یورپ تک ہوئی اُن کی قوم ہی کے ذمے تھا۔

اب یہ دیکھنا ہماری حکومت کا کام ہے کہ ہمارے محکمہ تعلیم نے کبھی ایسی تجاویز پر بھی غور کیا یا نہیں۔ ایک بڑی عمارت تعلیم کا یقین نہیں دلا سکتی۔ لیکن ایک اچھا استاد خواہ وہ درخت کے نیچے بیٹھ کر پڑھائے، علم کے دریا بہا سکتا ہے۔ ایف سی کالج جو ایک مشن کا قائم کردہ کالج ہے۔ ہمیشہ ایسے نظریات پر توجہ دیتا رہا ہے۔

لاہور میں اب بھی ہمارے بہت سے اساتذہ گندے ماحول اور گندے محلوں میں رہتے ہیں لاہور جیسے شہر میں اتنا بڑا امپروومنٹ ٹرسٹ قائم ہے۔ کیا کبھی ٹرسٹ نے کوشش کی کہ ان پریشان حال اساتذہ کے لیے بھی کوئی بستی بنا دی جائے۔

لاہور میں ایک ایجوکیشن ٹاؤن سوسائٹی بنی جس میں لاہور کے بہت سے استادوں، پروفیسروں ڈاکٹروں نے مل کر فیصلہ کیا کہ ایک بستی بنائیں جہاں ایک سکول، ہسپتال اور کمیونٹی سینٹر ہو: تاکہ ایک نئے نمونے کی بستی بنا کر حکومت کے لیے ٹاؤن پلاننگ کی ایک عمدہ مثال پیش کی جا سکے۔ وجہ معلوم نہیں لیکن اس جماعت کے آدمیوں کو کبھی جگہ مل نہ سکی۔ حالاں کہ اے جی آفس، ٹیلیگراف آفس اور سٹیٹ بنک کے کلرکوں تک کے لیے نئی نئی بستیاں بن گئیں۔ اور ان کو زمینیں دی گئیں۔ لیکن جب اساتذہ تعمیری پروگرام لے کر اٹھے تو ان کی حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ اساتذہ کے لیے تعلیمی اداروں کے قریب بستیاں بنا کر ان کو اکٹھا رہنے اور تعلیمی نظریات کو بہتر بنانے کے لیے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔

اچھا استاد۔ تعلیم اور نئے نظامِ تعلیم کو کامیاب کرنے میں سنگِ میل کا کام دے گا۔ ہمارے بچوں کو علم، عمل اور اخلاق سکھانے کے لیے ایک اچھے استاد سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔

ہمارے محنتی اور نیک نیت طالب علم

طالب علم کسی ملک کی قومی دولت ہوتے ہیں۔ موجودہ طلبا جو سیاسی احساسات کا شکار بن گئے ہیں اور دھاچوکڑی اور نعرہ بازی میں ایمان رکھتے ہیں انہیں یہ روش بدل دینی چاہیے۔ ایک طالبہ جو غیر ملک سے یہاں آئی ہوئی ہے ہمارے جوان طلبا کی یہی شکایت کر رہی تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ طلبا میں

اساتذہ کی فرمانبرداری، علم سے دلچسپی، لیبارٹری اور لائبریریوں کا شوق بے انتہا ہوا کرتا ہے مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کے طلبہ ان مقامات پر کم سے کم دیکھنے میں آتے ہیں اور نعرہ بازی میں ان کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے ہیں۔ وہ اپنے اساتذہ کے پاس بھی ہدایت کے لیے کم جاتے ہیں ہم اپنے ملک میں اساتذہ کو باپ کی جگہ سمجھتے ہیں اور ہمیشہ تعلیمی ہدایات اور بعض اوقات اپنے نجی معاملات کی بابت بھی ان سے رائے لیتے ہیں۔

ہمارے طلبا میں کوئی کمی نہیں۔ اگر ان میں علم دوستی کا جذبہ۔ ملک کی محبت اور اعلیٰ اخلاق پیدا ہو جائے تو یہ ملک کا سب سے قیمتی سرمایہ بن سکتے ہیں۔ ہمارے ملک کی ترقیاتی سکیمیں انھیں طلبا کی کارکردگی اور ہمت کا نتیجہ ہوتی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آزاد پاکستان کو دنیا کی بہت بڑی طاقت بنانے میں وہ بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے سکتے ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ چینی لوگ جنھیں ہم دنیا کے مشہور افیمی کہا کرتے تھے ایک جھپٹے میں ہندوستان کی فوجوں پر حاوی ہو گئے۔ یہ سب ان فوجی افسروں اور سپاہیوں کی علمیت، بہادری اور حب الوطنی کا جذبہ تھا جس کو انھوں نے طالب علمی کے وقت اپنایا تھا۔

والدین اور اساتذہ ہمیشہ طلبا اور بچوں کے ہمدرد ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے طلبا میں نظریاتی تبدیلی پیدا ہو جائے تو ان میں یقیناً، بھروسہ۔ اہلیت، شخصی قابلیت، جذبۂ محنت و مشقت۔ ریسرچ کا مادہ۔ کاموں کو تکمیل تک پہنچانے کی ذمہ داری، دوسروں پر اعتماد اور ملک کی خدمت کے جذبات اُبھر آئیں گے۔ ایسے طالب علم اپنے ملک کے بہترین شہری ثابت ہوتے ہیں، اور دن رات ملک اور قوم کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔

سائنسی تعلیم

آج کل قومیں خلاؤں میں پرواز کر رہی ہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب سائنس میں ترقی کی جائے۔ کسی ملک میں بغیر لیبارٹری اور بغیر سائنسی سامان کے سائنس پڑھانا بالکل بے معنی ہے دنیا کے ملکوں کی سائنسی ترقی کا اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس ملک کے انجینئر اپنے ملک

ق۔ زرعی اور ترقیاتی سکیموں میں کتنا حصہ لیتے ہیں۔ کل کی بات ہے کہ چین ایک پسماندہ ملک کہلاتا ۔ آج اس کی ترقی سے اس کی سائنسی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ سب اس لیے ہے چین نے سائنس میں بھرپور ترقی کی ہے۔

ہمارے ملک میں سائنس کا استاد کیا کرے، جب ہمارے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ئنس کا پورا سامان ہی نہ ہو۔ اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔ آئیے اپنے چند پائلٹ۔ یا ماڈل سکولوں وں یا ایک دو یونیورسٹیوں کو سائنس کے سامان سے پوری طرح لیس کریں۔ اور ان میں چند بیرونی اور پروفیسروں کی زیر ہدایت سائنس کی تعلیم کو اپنے اصلی رنگ میں جاری کریں۔ زرعی، یونیورسٹی۔ انجینئرنگ یورسٹی۔ ٹیکنیکل سکول۔ پولی ٹیکنیک۔ انڈسٹریل سکول سب ملک کی ضروریات کے مطابق سائنس کو ب میں ترقی دے سکتے ہیں۔ ہم بیرونی ملک کے ماہرین کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے ایجوکیشن ریسرچ ینٹر۔ ایجوکیشن ایکسٹنشن سینٹر اور اٹامک ریسرچ سینٹر کو قائم کر کے تعلیم اور اٹامک انرجی میں ریسرچ نے کا موقع پیدا کیا۔ ایک امریکی پروفیسر نے بڑی نیک نیتی سے یہ کہا کہ ہم نے پاکستان کے لوگوں سوچنے کا طرز تو سکھا دیا ہے۔ یہ اب ان کا کام ہے کہ وہ اپنے ملک کے مسائل کس طرح حل کرتے ہیں۔

اب ہمیں اپنی لیبارٹریوں اور سائنسی تعلیم کا جائزہ لینا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے اپنے ملک میں کس حد تک سائنسی ترقی کی ہے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ ہماری سائنسی درسگاہیں اس وقت ہی ترقی کریں گی جب ان میں کچھ بیرونی ملکوں کے سائنس دان ملکی سائنس دانوں سے مل کر ہماری سائنسی طرز تعلیم پر جدید رنگ چڑھا دیں گے۔

سائنس کی صحیح تعلیم ہمارے مسئلہ خوراک۔ مسئلہ بیروزگاری۔ مسئلہ آمد و رفت۔ مسئلہ آبادی مسئلہ صحت عامہ وغیرہ کا حل نکال سکتی ہے۔ ہمیں اس کی طرف پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

آئیے ہم سب مل کر دعا کریں کہ آزاد پاکستان میں لوگوں کی زندگی کا معیار بہتر عمدہ اور قابل فخر ہو جائے۔ اور ہر آدمی کو اُس کی اہلیت اور قابلیت کے مطابق ترقی کے مواقع میسر آئیں۔

فروغ تعلیم کیلئے حکومت کی مساعی

ابتدائی تعلیم

صوفی محمد جمال اللہ ہیڈ ماسٹر محبوب عالم اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ

جب سے اس کرۂ ارضی پر انسان نے سلطنت و حکومت کی داغ بیل ڈالی ہے، اسی وقت سے ہر اچھی حکومت اپنی رعایا اور عوام کے حقوق کی نگہداشت اپنا فریضہ تصور کرتی رہی ہے اور عامۃ الناس کا مفاد ہمیشہ اس کے پیش نظر رہا ہے۔ شخصی حکومتوں کے ادوار میں بھی رعایا پرور حکمرانوں نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے امکان بھر کوششیں کی ہیں۔ اس جمہوری عہد میں تو ماشاءاللہ سکہ ہی عوام کا چلتا ہے اس لیے یہ عوام کی منتخب کردہ حکومت عوام کے مفاد کو کبھی پس انداز نہیں کر سکتی۔

حکومت کے فرائض جن کا تعلق عوام کی بہبود سے ہے یوں تو بے شمار ہیں۔ لیکن ان سب سے اہم فریضہ جس پر قوم کی فلاح اور ملک کی اصلاح کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے، وہ تعلیم ہے۔ اس لیے ہر دانش مند حکومت اور حکومتوں کے ارباب اہتمام عامۃ الناس کی تعلیم سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ بلکہ فلاح عامۃ الناس کا یہ پہلو ہمیشہ ان کے مدنظر رہا۔

حکومت خداداد پاکستان نے بھی اپنے دور اقتدار کی اس قلیل مدت میں فروغ تعلیم کے سلسلے میں ایسے قابل ستائش کارنامے سرانجام دیئے ہیں کہ اس معیار تو انائی کی کوئی اور حکومت اتنے قلیل عرصے میں شاید اتنے اہم کاموں سے عہدہ برآ نہ ہو سکتی۔

اگر قیام پاکستان سے قبل کے تعلیمی نقشہ پر نظر ڈالیں تو ہمیں تعلیمی ادارے اتنی تعداد میں نظر نہیں آئیں گے جتنے کہ آج کل ہیں۔ اور اساتذہ کی اتنی بڑی کھیپ بھی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ نیز درس گاہیں بھی اتنی آباد اور بھرپور نہیں تھیں، آخر یہ نتائج مساعی جمیلہ ہی کے

سرہونِ احسان ہیں۔ یہ کامیابیاں از خود وجود میں نہیں آگئیں۔ ان کو منصۂ شہود پر لانے کے لیے بہت سی کوششوں کو معرضِ عمل ہونا پڑا ہے۔ اور بہت سی نسیانہ روز محنتوں نے یہ کامیابی دکھائی ہے سے

بے محنتِ پیہم کوئی جوھر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانہ فرہاد

حکومت پاکستان نے ملک میں تعلیم و تعلم کا معیار بلند کرنے اور افرادِ ملت کو زیادہ سے زیادہ تعلیمی استعداد بہم پہنچانے کے لیے ماضی قریب میں ایک قومی کمیشن مقرر کیا تھا جس نے بڑی تگ و دو اور کافی محنت کے بعد ایک رپورٹ مرتب کی جس پر کئی مراحل طے کرنے کے بعد صدرِ مملکت کی توثیق و تصدیق کی آخری مہر ثبت ہوئی۔ لیکن جب قومی کمیشن کی یہ سفارشات عوام کے سامنے آئیں تو ایک شور سا مچ گیا۔ یارانِ وطن نے کرید کرید کر اور کھرچ کھرچ کر اس سے کیڑے نکالے اور اعتراضات کا کوہ نما انبار لگا دیا۔ اِس کے خلاف جی کھول کر مظاہرے کئے اور اس بہانے سے مدتوں کا جی کا بخار نکال لیا اور پرانی ہندوانہ رسم کے مطابق اِس اختلاف کو ایک باقاعدہ تحریک کی شکل دیدی۔ جذبات کی رو میں بہہ جانے والے کم اندیش نوجوان طالب علموں کو اِس میں شامل کر کے ایک ہنگامۂ رستاخیز کروا دیا۔ حکومت کے اربابِ اہتمام نے طوعًا و کرہًا اِس پر نظرِ ثانی کر کے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے اس میں کچھ اہم تبدیلیاں بھی کر دیں۔ اب اگر اہلِ وطن ٹھنڈے دل سے سوچیں اور متانت سے تفکر و تدبر کریں تو ان سفارشات میں بہت سی مفید، کارآمد اور خوش آیند تجاویز بھی ہیں، جن کے زیرِ عمل آنے سے ملک اور قوم یقینًا فلاح و اصلاح پائے گی۔

محبانِ وطن نے قومی تعلیمی سفارشات کے اسقام و عیوب کو تو خوب نمایاں کیا اور اس میں جہاں کہیں کوئی شوشہ اپنی دانست میں غیر موزوں یا اپنی رائے کے خلاف دیکھا اِس پر قصیدہ ہجویہ کہدیا لیکن ہنر و خوبی کا کوئی لفظ زبان پر نہیں لائے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ع

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

کے پیشِ نظر اِس کے محاسن کو بھی جلوہ گر عام پر لاتے اور اِس کا روشن پہلو بھی لوگوں کو دکھاتے

نیز۔ گذشت آنچہ گذشت

ثانوی تعلیم کے متعلق تو غیرسے دے ہو چکی اور اِس پر کافی قیاس آرائی اور بحث مباحثہ بھی ہو چکا جن کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں۔ پیشِ نظر مقالہ میں صرف ابتدائی تعلیم کے متعلق قومی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کا جائزہ لیا جائے گا اور اس بات پر غور کیا جائے گا کہ حکومت نے ابتدائی تعلیم کی اصلاح اور اِس کے فروغ میں کون کون سی سود مند اور نتیجہ خیز سفارشات کو شرفِ قبولیت بخشا ہے اور ارباب اہتمام تعلیم کے وہ کون کون سے نیک ارادے ہیں جن کو عملی جامہ پہنانے سے ملک و قوم کا تعلیمی معیار بلند ہو سکنے کی توقعات ہیں۔

یہاں حکومت کی مدح سرائی مقصود نہیں اور نہ تعریفوں کے پل باندھنا اور ستائش کے پہاڑ کھڑے کرنا مدعا ہے۔ بلکہ محض حقیقت حال کا اظہار مقصود ہے۔ اور مدعا یہ ہے کہ ہم نہایت سکونِ دل اور اطمینانِ قلب سے ابتدائی تعلیم کی سفارشات کے اچھے پہلوؤں پر بھی ایک نگاہ غلط انداز ڈالیں۔

ابتدائی تعلیم کی سفارشات پر نظر ڈالتے ہی سب سے پہلے جو چیز دکھائی دیتی ہے وہ مرحلہ تعلیم کا تعین ہے۔ حکومت نے اِس برصغیر میں پانچ سالہ لازمی تعلیم کو دس سال کے اندر اور آٹھ سالہ لازمی تعلیم کو پندرہ سال کے اندر اندر نافذ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور ہر بچے کے لیے آٹھ سال کی تعلیم کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ حکومت کا یہ اقدام نہایت دانشمندانہ ہے۔ دنیا کی موجودہ ترقی کے پیشِ نظر پانچ سالہ تعلیمی معیار پست اور کمزور نظر آتا تھا۔ اِس لیے پانچ سال کے بجائے آٹھ سال کی تعلیم کو لازمی اور ضروری قرار دینا ایک نہایت نیک فال اور پُر امید تمہید ہے۔ خدا کرے یہ ارادے بخیر و خوبی عمل پذیر ہوں اور اپنے وطن کا ہر ایک فرزند کم از کم آٹھ سالہ تعلیمی ماحول میں گذارے۔ اتنے عرصے میں وہ یقیناً اتنی استعدادِ نوشت و خواند پیدا کرے گا جس کی عملی زندگی میں ہر شہری کو بالعموم ضرورت ہے۔

سفارشات میں ابتدائی تعلیم کے لیے جن مقاصد کا تعین کیا گیا ہے۔ وہ بذاتہٖ حوصلہ افزا ہیں مثلاً:-

ا۔ بچوں کو پڑھنے لکھنے کے قابل بنا دیا جائے۔

ب۔ ان کی شخصیت کے اخلاقی، جسمانی اور روحانی پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے۔

ج ۔ ان میں بنیادی علوم وفنون کی صلاحیت پیدا کی جائے، جس کی ایک فرد اور اچھے شہری کو ضرورت ہوتی ہے اور انھیں آئندہ تعلیم کے قابل بنایا جائے۔

د ۔ بچوں میں شہری ذمہ داری، حب الوطنی اور ملکی ترقی کا احساس پیدا کیا جائے ۔

ہ ۔ ان میں محنت دیانتداری اور حصول علم کا اشتیاق پیدا کیا جائے اور جسمانی سرگرمیوں (یعنی کھیل کود یا ورزش جسمانی) کا شوق بڑھایا جائے ۔

مقاصد پر سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ محض لکھائی پڑھائی ہی مقصود تعلیم نہیں بلکہ اصلی مدعا بچے کی اخلاقی روحانی اور جسمانی تربیت ہے۔ تاکہ وہ ایک اچھی تربیت سے با اخلاق انسان بن سکے۔ اور قوم کا ایک صحت مند اور صالح جوان بن کر شہری اور تمدنی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کا اہل بن جائے۔ ملک کا ہمدرد ہوا اور وطن کا محب۔ نیز ایک مقصد یہ بھی پیش نظر ہے کہ آئے اچھی معیشت کا بار گراں سنبھالنے کے لیے بھی اسی منزل میں، تیار کرنا شروع کر دیا جائے۔ اس میں بنیادی علوم وفنون کی صلاحیت بیدار کرنا اس بات کی تمہید ہے کہ وہ معاشرے کا ایک کارآمد فرد بنے گا دوسروں پر بوجھ نہیں ہوگا۔ بلکہ ہنر وفن کی ابتدائی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہو کر اسکول سے نکلے گا۔ اور اپنی راہ خود متعین کر کے اُس ہنر وفن کی تکمیل کر سکے گا۔

تعلیم کے یہ پیش نظر مقاصد اگر حاصل ہو جائیں تو ملک وقوم کی نہایت خوش بختی ہے۔ اور اگر مدارس کی ہشت سالہ تعلیم ہمارے طلبا کو اخلاقی روحانی اقدار کی اس سطح پر لے آئے کہ وہ ایک ذمہ دار شہری بن کر حب الوطنی اور ملکی ترقی کے احساس سے متصف ہو جائیں تو سبحان اللہ تعلیم کا بہت بڑا کرشمہ تسلیم کیا جائے گا۔ اور فی الحقیقت اچھی تعلیم میں یہ اثر وقوت تو ضرور ہے کہ اپنے اثرات سے طالب علموں کے جذبات واحساسات اور ان کی فعالیتوں کا دھارا موڑ دے اور لاابالی پن کو ذمہ داری میں بدل دے اور آوارہ مزاج انسانوں کو نہایت فرض شناس بنا دے۔

جہاں تک تعلیمی مقاصد کا تعلق ہے نہایت بلند ہیں اور اِس نوزائیدہ مملکت کے لیے نہایت موزوں۔ اب اس کے اکتساب کے لیے اِس کے نصاب کی جائزہ کیفیت کا جائزہ لینا ضروری ہے ۔

اس منزل پر نصاب اس طرح کا ہونا چاہیے جو

۱۔ بچوں کی ذہنی قابلیت سے ہم آہنگ ہو۔

۲۔ ان کے روزمرہ ماحول کے مطابق ہو۔

۳۔ یہ نصاب بچے میں لکھنے پڑھنے اور حساب دانی کی بنیادی صلاحیت پیدا کر سکے۔

۴۔ نیز اس کے دل میں خود کام کرنے کا شوق پیدا ہو۔

۵۔ جذبۂ حب الوطنی کو ابھارنے والا ہو۔

۶۔ اساتذہ عملی طریقوں سے اور مقامی اشیاء سے اپنی تدریس کو کامیاب اور مفید بنائیں۔

۷۔ ابتدائی حصہ میں مذہبی تعلیم لازمی ہونی چاہیے۔

۸۔ اسکول لگنے سے پہلے بچوں کا اجتماع ہوا کرے۔

۹۔ قومی ترانہ گایا جائے اور مناسب تقاریب پر قومی جھنڈا لہرایا جائے۔

۱۰۔ جذبۂ حب الوطنی اور اصلاح اخلاق کے لیے تقریریں کی جائیں۔

نصاب تعلیم کے یہ بیرونی خطوط تو بظاہر بہت دل کش اور رعنا نظر آتے ہیں۔ لیکن عملی صورت میں جب اس نصاب کے مطابق تیار کی ہوئی کتابیں بازار میں آتی ہیں تو باوجود اس کے کہ ان کتابوں کی پیشانیوں پر بڑے بڑے جید ماہرین تعلیم اور ملک کے سربرآوردہ اہل تصنیف کے اسمائے گرامی کی ایک فہرست ہوتی ہے۔ عوام اور اساتذہ اتنے مطمئن نظر نہیں آتے جتنے کہ آنے چاہئیں، بلکہ شاکی دکھائی دیتے ہیں۔

بعض پرانے استاد اور فرسودہ خیال والدین تو آج تک ورطۂ حیرت میں پڑے ہوئے ہیں کہ جو عرصہ دراز سے بچوں کو مفرد حروف کی آوازیں اور شکلیں سکھانے کے لیے جو طریقہ پہلے تھا وہ اب بالکل الٹا کیوں ہو گیا ہے۔ پہلی جماعت کے پڑھانے والے اساتذہ نئے قاعدے سے مطمئن نہیں اسی طرح دوسری کتابوں پر بھی لے دے ہوتی رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماضی کی یاد کا حسین ہونا کوئی فطری تقاضا ہے کہ عام طور پر لوگ پرانے نصاب کو ـــــــــــــــــ

آج تک پسند کرتے ہیں. حالاں کہ اس جدید دور میں ان کتابوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

اب یا تو ہمارے عوام اور بچوں کی تعلیم میں دل چسپی لینے والے لوگ مصنفین کے ہم خیال ہو جائیں یا مصنفین عوام کی ذہنی اور خیالاتی سطح پر اتر آئیں. لیکن یہ دونوں باتیں محال نظر آتی ہیں. پرانے استادوں اور بوڑھے والدین کو دورِ جدید کے تقاضوں کا احساس کرتے ہوئے اور اپنے بچپن کے زمانے کے نصاب کو فراموش کرتے ہوئے جدید مصنفین کا ہم خیال بن جانا چاہیے "کہ تقویم پارینہ نایدبکار"

ابتدائی تعلیم کے لیے جو سفارشات کی گئی ہیں ان میں اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ پہلی دوسری اور تیسری جماعت کے بچوں کی تعلیم کے لیے استانیاں زیادہ موزوں رہتی ہیں اس لیے استانیاں ملازم رکھنے کے اقدامات کئے جائیں اور اسی بات کے پیش نظر استادوں اور استانیوں کے تربیتی اداروں میں طالب علموں کی تعداد کا کوٹا بڑھا دیا گیا ہے. اور یوں بھی بہت سی جگہوں پر تربیتی جماعتیں جاری کر دی گئی ہیں. اکثر مقامات پر تو گورنمنٹ اسکولوں کے ساتھ ہی ایک جے وی کلاس کھول دی گئی ہے. ان کلاسوں کے لیے کوئی خاص اہتمام الگ نہیں کیا گیا. بلکہ اساتذہ کی تربیت کے لیے سہل اور کم خرچ طریقہ اختیار کر لیا گیا ہے. استادوں اور استانیوں کی تعداد بڑھ جانے سے یقینی طور پر خواندگی کا تناسب بڑھ جائے گا اور مدارس میں طالب علموں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔

سفارشات میں عوام سے یہ توقع ظاہر کی گئی ہے کہ وہ ابتدائی سکولوں کے لیے جگہ. فرنیچر. عمارت تدریسی سامان اور اساتذہ کے لیے اقامتی سہولتیں مہیا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے. ہاں پسماندہ علاقوں میں حکومت ہی ضروری اخراجات کی کفیل ہوگی۔

سفارشات میں ابتدائی تعلیم کے استادوں کے لیے مشاہرہ میں اضافہ کی بھی سفارش کی گئی ہے تاکہ وہ مناسب معیار زندگی اختیار کر سکیں. نیز ان کے لیے صحت، انشورنس اور سبکدوشی کے بعد کی سہولتیں مہیا کرنے پر بھی خاص توجہ دی جائے گی۔

یہ امر واقعی خوش کن اور امید افزا ہے کہ پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کی تنخواہوں کی طرف حکومت

توجہ دے رہی ہے۔ سو روپے سے کم تنخواہ پانے والے اساتذہ کے مشاہرہ میں کچھ اضافہ ہوا ہے اس کے علاوہ تنخواہ کو دس فی صدی بڑھا کر اسے بنیادی تنخواہ قرار دیا گیا ہے۔ حکومت کا یہ اقدام واقعی مستحق صد تحسین ہے۔ یوں تو اس دور میں ہزاروں روپے تنخواہ پانے والے بھی مطمئن نظر نہیں آتے، بلکہ شاکی رہتے ہیں کہ تنخواہ سے کچھ نہیں بنتا اور بنے بھی کیسے، اطمینان قلب پیسے میں تھوڑا ہے۔ وہ تو یادالٰہی میں ملتا ہے۔ اور اس چیز کا آج فقدان ہے۔ ہمارے ابتدائی مدارس کے اساتذہ اس تھوڑی سی اعانت سے بھی خوش ہیں اور بیماری کی صورت میں دواؤں کی امداد بھی یقینی طور پر ایک عمدہ اعانت ہے، بلکہ مدد وہی جو آڑے وقت میں کام آئے۔

اگر حکومت ان اساتذہ کو سبکدوشی کے بعد کی سہولتیں بھی مہیا کر دے جیسا کہ سفارشات میں ذکر کیا گیا ہے تو ابتدائی سکولوں کے اساتذہ یقیناً بہت حد تک مطمئن ہو جائیں گے۔

معاشرے میں استاد کا وقار بلند کرنے کے لیے جو تجویز سفارشات میں مذکور ہے کہ خاص خاص قابلیت کے اساتذہ کو صدر پاکستان یا دیگر گورنروں کی خدمت میں شرف باریابی بخشا جائے اور عوام میں اس کا خوب چرچا کیا جائے، یہ ایک ایسا اقدام ہے کہ جس سے عوام کے دلوں میں استاد کی عظمت پیدا ہو جانے کی پوری امید ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوام میں اپنا وقار پیدا کرنے کا بہتر اور صحیح طریق یہ ہے کہ استاد صالح انسان ہو، اس کے اخلاق بلند ہوں وہ اپنے فرائض کا پابند بچوں کا ہمدرد اور بہی خواہ ہو۔ شیریں زبان ہو، ملنسار ہو۔ اگر استاد میں یہ خوبیاں موجود ہوں تو اس کا وقار ہی وقار ہے۔ گورنروں کی ملاقات کی معرفت حاصل کیا ہوا وقار کب تک ساتھ دے گا۔ وقار وہ جو اپنی ذاتی صلاحیتوں سے حاصل کیا جائے مانگی تانگی چیز کام نہیں آیا کرتی ؎

خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

ابتدائی تعلیم کو اعلیٰ سطح پر لانے زیادہ سے زیادہ درس گاہیں کھولنے۔ ضرورت کے مطابق

اساتذہ کو تربیت دلانے اور اساتذہ کے مشاہیروں میں مزید اضافہ کرنے کے لیے حکومت کے مصارف میں بھی بہت اضافہ ہو جائے گا۔

اور انہیں پورا کرنے کے لیے حکومت اور عوام کو خاص جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اس سلسلے میں حکومت عوام سے یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ نئی درس گاہوں کے لیے زمین، عمارت، سامان اور اساتذہ کے لیے رہائش کا انتظام خود کریں اور اس طرح حکومت سے تعاون کرکے فروغ تعلیم میں اس کا ساتھ دیں اس سلسلے میں مستقبل قریب میں کافی عرصہ تک رضاکاروں کی ضرورت رہے گی۔ اس لیے مغربی پاکستان میں ضلعی سطح پر اور مشرقی پاکستان میں سب ڈویژنل سطح پر خاص ٹیکس کے ذریعے سے پچاس فی صد اور پچاس فیصد صوبائی حکومت کی آمدنی سے ہر ضلع اور ہر سب ڈویژن کو ان کے مسائل کے پیش نظر گرانٹ دی جائے گی۔ غریب و پس ماندہ علاقوں پر خاص توجہ دی جائے گی۔ حکومت کا یہ پروگرام علم کے مستقبل کی تابناکی کا پتہ دیتا ہے۔ اگر تعلیم کو عام کرنے کے لیے اس لائحہ عمل پر پوری صداقت دلی اور دیانتداری سے عمل کیا گیا تو یقیناً تعلیمی دنیا کی حالت بدل جائے گی لیکن اس کا بہت کچھ انحصار اس کام کو سرانجام دینے والے اہل کاروں کی دیانت اور خلوص دل پر منحصر ہے۔

ہمارے ملک کے اساتذہ کی ایک دیرینہ آرزو یہ تھی کہ ابتدائی تعلیم کو حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی بدعنوانیوں سے تعلیمات کو محفوظ کرے۔ یہ مطالبہ کبھی کبھی اتنی شدت اختیار کر لیا کرتا تھا کہ اساتذہ برافروختہ ہو کر ہڑتالوں اور مظاہروں پر اتر آتے تھے۔ لیکن یہ مطالبہ مدت تک تشنۂ اعتبار رہا اور اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ اب حکومت نے اساتذہ کی یہ دیرینہ آرزو بھی پوری کر دی ہے۔ اور ابتدائی تعلیم کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ لوکل باڈیز سے اساتذہ کو نجات دیدی ہے۔ ابتدائی سکولوں کے انتظامات کے لیے مغربی پاکستان میں ضلعی سطح پر اور مشرقی پاکستان میں سب ڈویژنل سطح پر انتظامیہ کمیٹیاں مقرر کی گئی ہیں اور ہر ایسی کمیٹی کا چیئرمین ڈپٹی کمشنر یا سب ڈویژنل آفیسر مقرر کیا گیا ہے۔ غرض تعلیم کو بہتر بنانے معیار زندگی کو بلند کرنے اور اشاعت تعلیم کے لیے درس گاہیں کھولنے۔ ضرورت کے مطابق نئے اساتذہ کو تربیت دلانے اور اساتذہ کے معیار زندگی کو متوازن سطح پر لانے کے لیے حکومت مصروف عمل ہے اور تعلیمی ضروریات سے غافل نہیں۔ حکومت کا تعلیمات کی طرف خصوصی توجہ دینا ہمارے لیے خاص طور پر باعث اطمینان ہے اور ملک و قوم کے لیے بھی فلاح و بہبود کا سبب ⁂

۰

تعلیم صنعت وحرفت

پروفیسر ممتاز احمد سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور

پاکستان کو ابھی ایک صنعتی ملک تو نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ہمارا یہ ملک صنعتی لحاظ سے ایک عبوری دور سے ضرور گذر رہا ہے۔ قومی ترقی و تعمیر کے صنعتی منصوبوں کو کامیاب بنانے کے لیے ہمیں صنعتی کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ ہمیں ایسے شہریوں کی ضرورت ہے جو ہمارے صنعتی منصوبوں کو سمجھ سکیں اور انھیں کامیاب اور کامران بنانے میں بہترین معاون بن سکیں۔ اِس معاشرتی مقصد کے علاوہ صنعتی فنون میں چند ایسی تعلیمی خوبیاں موجود ہیں جو خود بخود شخصیت کا مقام اجاگر اور بلند کرنے اور کام کو نکھارنے میں امداد کر سکتی ہیں۔ نصابی لحاظ سے ان تعلیمی مقاصد کا مقصد جو طلبہ کی نصابی کتب میں مہیا کی جاتی ہیں، یہ ہوتا ہے کہ طلباء کی صلاحیتیں بیدار ہوں۔ اس اصول کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس مضمون کے مفصلہ ذیل مقاصد معین کیے گئے ہیں۔

۱۔ مشینی کام کی مہارت

دستی مشین سے کام سکھائے جائیں۔ مہارتوں پر کافی زور دیا جائے۔ ترقی پسند تعلیم کی تحریک سے وابستہ چند انتہا پسندوں نے مہارت کی اہمیت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور اسی بنا پر صنعتی فنون اور پیشہ ورانہ تعلیم کا وقار مشتبہ ہو گیا ہے۔ بدیں وجہ ہمیں دستی مشینی کام اور آلات کے استعمال پر از نو کافی زور دینا چاہیئے۔ تاکہ بچے کام میں دل چسپی لے کر معاشرہ پر بار نہ بنیں اور اپنے ہاتھ سے خود کمانے قابل بن جائیں۔

۲۔ تجرباتی اور تعمیری غور و فکر

صنعتی طریق ہائے کار اور اقتصادی و پیشہ ورانہ زندگی کی روز افزوں پیچیدگی تجرباتی اور تعمیری غور و فکر کا تقاضا کرتی ہیں۔ اِس کا تعلق بھی زیادہ تر طریقہ ہائے تدریس اور تدریسی مہارت کے ساتھ۔

اس میں ان تمام تعلیمی طریقوں کو دخل ہے جو خود نظمی اور تکمیل پسندی سے متعلق ہیں۔ وہی مخصوص اساتذہ جو بہترین کردار کے مالک ہیں طلبہ میں یہ مہارتیں پیدا کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

۳۔ نیا مواد

صنعتی فنون کا نیا نصاب پیش کرتے وقت نئے مواد کو بالکل نئے اور اچھوتے انداز میں پیش کرنا چاہئے دنیا کے روزمرہ صنعتی امور اور ترقیاتی منصوبوں اور سائنسی علوم کے بارے میں توجہ مبذول کرانے کی بیش از بیش ضرورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وافر مطالعہ کے علاوہ اساتذہ کو نئے صنعتی اور ترقیاتی منصوبوں سے رابطہ پیدا کرنا ہوگا، تاکہ وہ نصاب کو بہترین انداز میں پیش کر سکیں۔

۴۔ آلات کی ترتیب

مدارس کے تکنیکی شعبہ کے نظم و نسق اور آلات دست کاری کو زمانہ حال کی صنعت اور کاریگری کا عین نمائندہ ہونا ضروری ہے۔ تاکہ طلبہ مطالعہ اور مشاہدہ کر کے اپنی ورک شاپ کے طریق ہائے کار۔ آلات اور مشینوں کے استعمال اور زمانہ حال کی فیکٹریوں اور دوسرے صنعتی اداروں کے حالات کے متعلق آگاہ ہو سکیں اور اپنی ورک شاپ کی مناسب ترتیب و تنظیم کر سکیں۔

۵۔ مناسب وقت

صنعتی فنون کو مدرسہ کے نظم الاوقات میں مناسب وقت ملنا ضروری ہے۔ طلبہ آرٹ اینڈ کرافٹ روم میں مناسب وقت صرف کریں، تاکہ تعلّم بالعمل کے طریق پر بہترین نتائج سے لطف اندوز ہو سکیں صنعتی فنون کے نفاذ کے ضمن میں مندرجہ ذیل باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے: تاکہ بے شمار طلبہ و طالبات صنعتی فنون تک رسائی حاصل کر سکیں۔

ا ۔ دیہات کے مدارس میں اس کا نفاذ ضروری ہے

ب ۔ جہاں جہاں بھی اس قسم کا نصاب نافذ ہے اسے وسعت دی جائے۔

ج ۔ صنعتی تعلیم کی تربیت اور پیشہ ورانہ صنعتی تعلیم کو قریب تر کیا جائے۔ یہ عمل صنعتی تعلیم کے دونوں حصوں کے لیے مفید ہوگا۔

د۔ ابتدائی درجوں میں بھی صنعتی فنون کی طرف توجہ دلائی جائے اور ہر بچے کی تعلیم میں صنعتی فنون کو ایک لازمی جزو قرار دیا جائے تاکہ بچہ عملی زندگی میں معاشرہ کے لیے بہتر فرد بن سکے۔

ھ۔ ہونہار اور نوجوان طلبہ کو یہ تربیت ضروری دی جائے تاکہ وہ صنعتی تدریس کو بطور پیشہ اختیار کر سکیں۔ ورک شاپ کے اساتذہ کو چاہیئے کہ وہ مناسب تشویق و تحریک سے کام لیں اور طلبہ کو یہ پیشہ اختیار کرنے پر آمادہ کریں۔ صنعتی فنون کے مستقبل کا انحصار صرف ان لوگوں کے مرتبہ پر ہے جنھوں نے یہ پیشہ اپنا رکھا ہے اور اہل فن کی قیادت کر رہے ہیں۔

و۔ جدید صنعتی فنون کا نصاب رائج کرنے کے لیے ملک کے مختلف علاقوں میں تجدیدی اسباق کا انتظام کیا جائے۔

ز۔ اس نصاب کے کچھ حصہ کو سائنس ٹیچر اور کچھ حصے کو آرٹ ٹیچر کے سپرد کیا جائے۔

ح۔ صرف نصاب کے ان مشاغل کو مدرسہ میں رائج کیا جائے، جن کے متعلق آسانی سے سامان فراہم ہو سکے۔

ط۔ تربیت یافتہ اساتذہ کی عدم موجودگی میں ان مشاغل کو ان اساتذہ کے سپرد کیا جائے جنھیں ان مشاغل سے دلچسپی ہو اور سامان کے متعلق کافی معلومات رکھتے ہوں۔

ی۔ مدرسہ کے پڑوس کے کسی کارخانہ دار اور پیشہ ور دکاندار کے بچوں کو دست کاری کے مشاغل کا مشاہدہ ضرور کرایا جائے۔

ک۔ طلبہ اپنے مشاہدات کو باقاعدہ نوٹ بک میں درج کریں۔

ل۔ بچوں کے مشاہدہ سے متعلق سوالات کر کے بچوں کی معلومات کا اعادہ کرایا جائے۔

م۔ ان مشاہدات کا بچوں کی روزمرہ زندگی سے بھی تعلق پیدا کیا جائے۔

استاد کا کام

۱۔ بچوں میں صنعتی دلچسپی پیدا کرنا۔

۲۔ بچوں کو صنعتی فنون کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔

۳۔ بچوں میں یہ صلاحیت پیدا کرنا کہ وہ مختلف صنعتوں اور اپنی روزمرہ کی مصروفیتوں میں تعلق استوار کر سکیں۔

۴۔ طلبہ کو ضبط و خود نظمی کی عادت ڈالنا۔

۵۔ طلبہ کو امداد باہمی کے اثرات و فوائد سے آگاہ کرنا اور دوسروں کے ساتھ تعاون سے کام کرنے کی رغبت دلانا۔

۶۔ فرصت کے لمحات کے لیے مفید مشاغل اختیار کرنے کی عادت ڈالنا۔

۷۔ بچہ میں انضباطِ کارکردگی اور مستعدی سے کام انجام دینے کی عادت ڈالنا۔

۸۔ مفید مشاغل کے ذریعے سے روزمرہ کی زندگی کے لیے سہولتیں مہیا کرنا ؎

سرکاری جریدہ کے اعلانات

شعبہ سکول ———— صیغہ رجال

۲۲۴۷۳ م۔ جان محمد نسیم بی۔ اے بی۔ ٹی نائب ناظر ضلع رحیم یار خاں کا تبادلہ بجگہ اللہ بخش کی جگہ جن کا تبادلہ
۲۴ نومبر ۱۹۶۲ء ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود نائب ناظر مدارس قسمت بہاولپور مقرر کیا گیا۔

۲۲۶۴۲ حافظ ظہور احمد ایف اے سی۔ ٹی ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ منیر احمد خاں کی
۲۴ نومبر ۱۹۶۲ء جگہ بمشاہرہ ۹۰/- روپے علاوہ الاؤنس عارضی جونیر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ صاحب مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد ظفر ایف ایس سی ایس ٹی ایک امیدوار کو م۔ بشیر احمد عرشی کی جگہ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ ۹۰/- روپے عارضی انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول قصور مقرر کیا گیا۔

۲۲۴۸۶ م۔ منظور احمد معلم گورنمنٹ مڈل سکول مراد پور ریاں ضلع رحیم یار خاں کو ۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء (صبح) سے
۲۴ نومبر ۱۹۶۲ء ان کی بغیر درخواست دانستہ غیر حاضری اور حکام بالا کے احکام سے بے پروائی کی وجہ سے مغربی پاکستان گورنمنٹ سرونٹس رول نمبر ۴ (I) آئی۔ ایف ۱۹۶۰ء کی رو سے برطرف کیا جاتا ہے۔

۲۲۶۳۴ م۔ منظور الحق (۲۲۳۳) ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کمالیہ کو م۔ غلام رسول کی جگہ اپنی تنخواہ پر
۲۴ نومبر ۱۹۶۲ء تاریخ حاضری سے ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی بھٹیاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ غلام رسول ایس وی قائم مقام ورنیکلر ٹیچر پنڈی بھٹیاں کو م۔ منظور الحق کی جگہ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

۲۲۷۸۷ م۔ مصطفےٰ علی زیدی بی اے۔ بی۔ ٹی۔ ایل ایل بی نائب ناظر ضلع سیالکوٹ کو ایک نئی عارضی
۲۷ نومبر ۱۹۶۲ء

آسامی پر ترقی دے کر بر پیمانہ تنخواہ ۲۵۰/- — ۱۵ — ۴۰۰/- تاریخ حاضری سے
عارضی افسر بکار خاص (امتحانات) دفتر ناظم تعلیمات لاہور ریجن لاہور مقرر کیا گیا۔

۲۲۷۸۹ ایس۔ اشتیاق علی زیدی بی اے بی ایڈ ایک امیدوار کو م۔ محمد انور سلیم کی جگہ بشاہرہ ۔/۱۳۰ روپے
۲۶ نومبر ۱۹۶۲ء علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پدمان مقرر
کیا گیا۔

۲۲۷۹۱ م۔ خلیل احمد بی اے۔ بی ایڈ سابق ہیڈ ماسٹر ڈی۔ جی۔ مڈل سکول ملٹری فارم اوکاڑہ کو ایک نئی
۲۶ نومبر ۱۹۶۲ء عارضی آسامی پر یکم جولائی ۱۹۶۲ء سے بشاہرہ ۔/۱۳۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی سینئر
انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

۲۳۱۵۱ م۔ محمد بشیر الدین بی اے بی ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ پائلٹ ہائی سکول رحیم یار خاں کو
۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء م۔ مصطفےٰ علی زیدی کی جگہ بشاہرہ خود تاریخ حاضری سے نائب ناظر پسرور (ضلع سیالکوٹ)
مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبد الرزاق بی اے (آنرز) بی۔ ایڈ ایک امیدوار کو م۔ بشیر الدین کی جگہ بشاہرہ ۔/۱۳۰ روپے
علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ پائلٹ ہائی سکول
رحیم یار خاں مقرر کیا گیا۔

۲۳۳۶۵ م۔ غلام محبوب برلاس بی ایس سی بی ایڈ ایک امیدوار کو م۔ خادم حسین کے حق منصب کے
یکم دسمبر ۱۹۶۲ء تحت بشاہرہ ۔/۱۳۰ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر
گورنمنٹ ہائی سکول فیروز وٹواں مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ مشتاق احمد تابانی بی اے بی ٹی ایک امیدوار کو ایک نئی عارضی آسامی پر تاریخ حاضری
سے چھ ماہ کے لیے بشاہرہ ۔/۱۳۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی
سکول احمد پور شرقیہ مقرر کیا گیا۔

۲۳۳۶۸ م۔ عبد الرحمٰن بی اے ایس ڈی پی ای ایک امیدوار کو م۔ محمد شفیق کی جگہ بشاہرہ ۔/۱۳۰ روپے
یکم دسمبر ۱۹۶۲ء

علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی فزیکل ٹریننگ سپروائزر گورنمنٹ نارمل سکول ملتان مقرر کیا گیا۔

۲۴۴۷۳ م۔ عطاالرحمن بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ کے تقرر اور
۸ دسمبر ۱۹۶۲ء گریڈ کی ایک موجودہ مستقل آسامی پر یکم اپریل ۱۹۶۰ء سے توثیق کی جاتی ہے

۲۴۴۵۳ م۔ محمد یامین قریشی ایس وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈاہراں والا کو م محمد یوسف ظفر کی جگہ
۸ دسمبر ۱۹۶۲ء بمشاہرہ خود تاریخ حاضری سے ایس وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ ادو ضلع مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد یوسف ایس وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ ادو (مظفر گڑھ) کو م محمد یامین قریشی کی جگہ بمشاہرہ خود تاریخ حاضری سے ایس وی ٹیچر گورنمنٹ سکول ڈاہراں والا مقرر کیا گیا۔

۲۴۴۷۵ م۔ محمد یار قریشی بی اے۔ بی ایڈ قائم مقام اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جلالپور پیر والا کو
۸ دسمبر ۱۹۶۲ء ایک موجودہ خالی آسامی پر بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے علاوہ الاؤنس ۱۳ جنوری ۱۹۶۲ء سے قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رنگ پور مقرر کیا گیا۔

۲۴۴۰۰ م۔ محمد نواز۔ ایف۔ ایس سی۔ بی اے۔ بی۔ ایڈ ایک امیدوار کو م۔ احمد سعید اختر کے حق منصب
۱۰ دسمبر ۱۹۶۲ء کے تحت بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رینالہ خورد مقرر کیا گیا۔

۲۵۸۴ م۔ طفیل احمد بی اے بی ایڈ ایک امیدوار کو بی ایڈ کی اُس آسامی پر جو محمد افضل جے اے وی ہیڈ کلرک نے خالی کی ہے
۱۰ دسمبر ۱۹۶۲ء بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چشتیاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ ۔ ۔ ۔ بی اے بی ایڈ ایک امیدوار کو م جاوید حیدر نقوی بی اے۔ بی۔ ایڈ کی جگہ اُس آسامی پر جو ۳۱ مئی ۱۹۶۲ء تک منظور ہوئی تھی بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول قصور مقرر کیا گیا۔

ADMN(1-80/24 م رضا اللہ ایف ایس سی بی ٹی جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول احمد پور شرقی کو (جو بی ٹی کی اسامی پہ کام کر رہے تھے) سلطان علی جے اے وی کی جگہ بہ پیمانہ تنخواہ -/۸۰ - ۵ - ۱۲۰ - ۷ - -/۱۹۰ علاوہ الاؤنس م سلطان علی کی سبکدوشی کی تاریخ سے قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول احمد پور شرقی مقرر کیا گیا۔

۱۷ دسمبر

ایضاً م محمود علی میٹرک جے اے وی جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈوہنگا بونگا کو جو بی ٹی کی اسامی پہ کام کر رہے تھے فقیر محمد ایف ایس سی بی ٹی کی جگہ بمشاہرہ خود م فقیر محمد کے رخصت پر جانے کی تاریخ سے جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈوہنگا بونگا مقرر کیا گیا۔

ایضاً م رحمت علی میٹرک جے اے وی جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رحیم یار خاں کو (جو بی ٹی کی اسامی پہ کام کر رہے تھے) م محمد سلیم ایف اے سی ٹی کی جگہ (جو حاضر نہیں ہوئے تھے) احکام جاری ہونے کی تاریخ سے بمشاہرہ خود جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رحیم یار خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً م محمد افضل میٹرک جے اے وی جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چشتیاں کو (جو بی ٹی کی اسامی پہ کام کر رہے تھے) م خان محمد کی جگہ جو ۱۶ دسمبر کو مستعفی ہو گئے ہیں تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول چک نمبر ۱۵ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م عبدالرحیم ایف اے جے اے وی جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول منڈی صادق گنج کو (جو بی ٹی کی اسامی پہ کام کر رہے تھے) ایک نئی اسامی پہ بمشاہرہ خود جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چک ۳۵ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م نصیر اختر بی اے جے اے وی جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چک ۱۳۲ کو (جو بی ٹی کی اسامی پہ کام کر رہے تھے) م محمد عباس کی جگہ بہ پیمانہ تنخواہ علاوہ الاؤنس -/۸۰ - ۵ - -/۱۲۰ - ۷ - -/۱۹۰ قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ نواز خان مقرر کیا گیا۔

ایضاً م سردار محمد ایف اے سی۔ ٹی جونیئر انگلش ٹیچر، ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بہاولپور کو (جو پی ٹی سی کی آسامی پر کام کر رہے تھے) م سعید احمد کی جگہ بہ پیمانہ تنخواہ -/۸۰ — ۵ — -/۱۲۰ — ۷ — -/۱۹۰ علاوہ الاؤنس قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ عباسیہ ہائی سکول بہاولپور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م گل محمد جے اے وی انسٹرکٹر تنظیم کو ایک موجودہ خالی آسامی پر ۱۲ نومبر ۱۹۴۸ء سے بہ پیمانہ تنخواہ -/۸۰ — ۵ — -/۱۲۰ — ۷ — -/۱۹۰ علاوہ الاؤنس قائم مقام انسٹرکٹر تنظیم بہاولپور مقرر کیا گیا

ایضاً م۔ محمد امین ایف اے سی۔ ٹی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رحیم یار خان کو ایک موجودہ خالی آسامی پر بہ پیمانہ تنخواہ -/۸۰ — ۵ — -/۱۲۰ — ۷ — -/۱۹۰ علاوہ الاؤنس ۲۵ جولائی ۱۹۴۸ء سے قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رحیم یار خان مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبدالستار جے اے وی ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول جھیلاں والی کو ایک موجودہ خالی آسامی پر ۱۶ اگست ۱۹۴۸ء سے بہ پیمانہ تنخواہ -/۸۰ — ۵ — -/۱۲۰ — ۷ — -/۱۹۰ علاوہ الاؤنس قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول جھیلاں والی مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ غلام رسول جے اے وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول بہاولپور کو (جو جے وی کی آسامی پر کام کر رہے تھے) ایک موجودہ آسامی پر م حمید حسین کے تبادلے سے خالی ہوئی بہ پیمانہ تنخواہ -/۸۰ — ۵ — -/۱۲۰ — ۷ — -/۱۹۰ علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول محمد پور دیوان مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ خدا بخش جے اے وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول خان پور کو (جو جے وی کی آسامی پر کام کر رہے تھے) ایک موجودہ آسامی پر جو رئیس فضل حسین کے وفات پانے پر خالی ہوئی بہ پیمانہ تنخواہ -/۸۰ — ۵ — -/۱۲۰ — ۷ — -/۱۹۰ علاوہ الاؤنس قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول امین آباد مقرر کیا گیا۔

ایضاً شہریار علی بیگ جے اے وی ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول خان پور کو (جو جے وی کی آسامی

کام کر رہے تھے) ایک موجودہ آسامی پر (جو م-خوشی محمد کے مستعفی ہونے سے خالی ہوئی)
بہ پیمانہ تنخواہ -/۸۰ — ۵ — -/۱۲۰ — ۷ — -/۱۹۰ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے
قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ مڈل چک نمبر پ/۱۵۶ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م-بشیر احمد جے اے وی ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول صادق گڑھ پیلس کو (جو جے وی کی آسامی
پر کام کر رہے تھے) ایک موجودہ آسامی پر (جو م-محمد ابراہیم کے مستعفی ہونے سے خالی ہوئی)
تاریخ حاضری سے بہ پیمانہ تنخواہ -/۸۰ — ۵ — -/۱۲۰ علاوہ الاؤنس، قائم مقام جونیئر
انگلش ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول کھولاں آریاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً م-محمد انور ایف اے سی ٹی ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول لیاقت پور کو (جو جے وی کی اسامی پر
کام کر رہے تھے) ایک نئی آسامی پر بہ پیمانہ تنخواہ -/۸۰ — ۵ — -/۱۲۰ — ۷ — -/۱۹۰ روپے
علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول گوٹھ عبداللہ
مقرر کیا گیا۔

ایضاً م-محمد صدیق ایف اے سی ٹی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈونگا بونگا (جو جے وی کی آسامی پر
کام کر رہے تھے) ایک نئی آسامی پر بہ پیمانہ تنخواہ -/۸۰ — ۵ — -/۱۲۰ — ۷ — -/۱۹۰ روپے
علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول اکال گڑھ مقرر کیا گیا

ایضاً م-محمد یوسف ایف اے سی ٹی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ سمابہ کو (جو جے وی کی آسامی پر کام
کر رہے تھے) م-محمد نواز کی جگہ جو اسی سکول میں سینئر انگلش ٹیچر مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ بہ پیمانہ
تنخواہ -/۸۰ — ۵ — -/۱۲۰ — ۷ — -/۱۹۰ علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے قائم مقام
جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول بچہ بچی لاہور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م-بشیر احمد جے اے وی ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول مراد پور سیال کو (جو جے وی کی آسامی پر کام کر رہے
تھے) م-محمد اشرف کی جگہ بہ پیمانہ تنخواہ -/۸۰ — ۵ — -/۱۲۰ — ۷ — -/۱۹۰ روپے
علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول شجاع آباد مقرر کیا گیا

ایضاً م۔ صبح صادق جے اے وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ہارون آباد کو (جو ایک جے وی کی آسامی پر کام کر رہے تھے) ایک نئی آسامی پر بہ پیمانہ تنخواہ ۸۰/- — ۵ — ۱۲۰/- — ۷ — ۱۹۰/- علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ سمابا مقرر کیا گیا۔

ADMN-I ۲۴۹۳۳ ۱۷ دسمبر ۶۲ء م۔ ظہیر الدین میٹرک II ایک امیدوار کو م۔ محمد رضی کی جگہ بمشاہرہ ۶۰/- روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول ملتان مقرر کیا گیا۔

ADMN ۲۵۱۶۴ ۱۷ دسمبر ۶۲ء م۔ انور علی خان بی اے۔ بی ٹی۔ سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول دیہوآ کو (جو عارضی ہیڈ ماسٹر کے طور پر کام کر رہے تھے) غلام رسول خان کی جگہ بمشاہرہ خود تاریخ حاضری سے نائب ناظر مدارس ضلع ملتان مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ غلام رسول خان ایف۔ اے۔ ایس وی۔ ایچ۔ پی نائب ناظر مدارس ضلع ملتان کو م۔ غلام رسول کی جگہ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود نائب ناظر مدارس (تنظیم) ضلع بہاول نگر مقرر کیا گیا۔

۲۵۲۹ انور علی خان بی اے بی ٹی کو جنھیں بطور نائب ناظر مدارس ضلع ملتان تبادلہ کا حکم ہوا تھا م۔
۱۵ دسمبر ۶۲ء عبدالرحمن خان کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول دیہوآ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبدالرحمان خان بی اے بی۔ ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول دیہوآ کو م۔ غلام رسول کی جگہ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود نائب ناظر مدارس (تنظیم) ضلع بہاول نگر مقرر کیا گیا۔

ADMN-I ۲۵۹۳۵ ۲۰ دسمبر ۶۲ء م۔ انیس احمد خان ایک امیدوار کو م۔ محمد شفیع شفقت کی جگہ بہ پیمانہ تنخواہ ۶۰/- — ۴ — ۱۰۰/- — ۱۰۵/- — ۷ — ۱۴۰/- روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رینالہ خورد (منٹگمری) مقرر کیا گیا۔

۲۵۸۴۳ A-I ۲۰ دسمبر ۶۲ء م۔ شیر محمد بی اے بی ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چک نمبر ۱۴۷/۶-آر کو بی ایڈ کی اس آسامی پر جو م۔ محمد اصغر نے خالی کی ہے تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود سینئر

انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ہارون آباد مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔محمد سلیم ایم اے بی ایڈ عارضی سینئر انگلش گورنمنٹ ہائی سکول صادق آباد کو م۔شیر محمد کی جگہ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چک ۱۳۱ آر مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔منظور احمد بی۔اے۔بی ایڈ ایک امیدوار کو م۔محمد اسلم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔تاریخ حاضری سے بمشاہرہ ۱۳۰/- روپے علاوہ الاؤنس عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول صادق آباد مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔عبدالستار بی اے بی ایڈ ایک امیدوار کو بی ایڈ کی اُس اسامی پر جو رضا اللہ ایف ایس سی ٹی نے خالی کی ہے بمشاہرہ ۱۳۰/- روپے علاوہ الاؤنس عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول احمد پور شرقی مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔عبدالمجید ایم اے (اردو) بی ایڈ ایک امیدوار کو اس اسامی پر جو م۔محمود علی نے خالی کی ہے۔تاریخ حاضری سے بمشاہرہ ۱۹۰/- روپے علاوہ الاؤنس عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈونگا بونگا مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔محبوب عالم خاں بی اے بی ایڈ ایک امیدوار کو اُس اسامی پر جو م رحمت علی نے خالی کی ہے تاریخ حاضری سے بمشاہرہ ۱۳۰/- علاوہ الاؤنس عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رحیم یار خاں مقرر کیا گیا۔

ایضاً تاج محمد حبیبہ بی اے۔بی ایڈ ایک امیدوار کو اُس اسامی پر جو م۔عبدالرحیم نے خالی کی ہے تاریخ حاضری سے بمشاہرہ ۱۳۰/- روپے علاوہ الاؤنس سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول منڈی صادق گنج مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔نثار احمد خاں بی اے بی ایڈ ایک امیدوار کو بی ایڈ کی اس اسامی پر جو نعیر اختر نے خالی کی ہے تاریخ حاضری سے بمشاہرہ ۱۳۰/- روپے علاوہ الاؤنس سینئر انگلش ٹیچر چک نمبر ۲۳/۶ آر مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔محمد رفیق اسلم بی اے بی ایڈ ایک امیدوار کو بی ایڈ کی اُس اسامی پر جو م سردار محمد نے خالی کی ہے۔ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ ۱۳۰/- روپے علاوہ الاؤنس عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بہاولپور مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔محمد امین بی اے۔ بی ایڈ ایک امیدوار کو م۔غلام جیلانی خاں ایم اے کی جگہ جو ۹ نومبر ۱۹۶۲ء کو مستعفی ہو چکے ہیں بمشاہرہ ۱۳۰/- روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈاہراں والا مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔عبدالرحمن خاں بی ایڈ ایک امیدوار کو م۔سعید احمد بی۔ایس سی کی جگہ جو حاضر نہیں ہوئے بمشاہرہ ۱۳۰/- روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول منڈی صادق گنج مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔فضل حق بی۔ایس سی۔ بی ایڈ ایک امیدوار کو م۔امان اللہ قریشی ایم اے بی ایس سی بی ایڈ کی جگہ جو مستعفی ہو چکے ہیں بمشاہرہ ۱۳۰/- روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔رحمت علی بی ایس سی بی ایڈ ایک امیدوار کو م۔نظام الدین احمد کی جگہ بمشاہرہ ۱۵۰/- روپے بر پیمانہ تنخواہ ۱۵۰/- ــ ۱۰ ــ ۳۵۰/- روپے تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ پائلٹ ہائی سکول ملتان مقرر کیا گیا۔

۵۸۱۹ حافظ بشیر احمد ٹیچر پرائمری سکول کوکارا بیلا سنگھ ضلع بہاول نگر کو ۱۲ اپریل ۱۹۶۱ء سے
۱۳ فروری ۱۹۶۳ء ان کے سوئے کردار کی وجہ سے مطابق اصول نمبر ۴ (۱) (f) حکومت مغربی پاکستان ملازمت سے برطرف کیا جاتا ہے۔

۵۸۸۳ م۔محمد رمضان قائم مقام ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ کو ۷۰/- ــ ۴ ــ ۱۰۰/-
۱۳ فروری ۱۹۶۳ء ــ ۵ ــ ۱۰۵/- ــ ۷ ــ ۱۴۰/- کے پیمانہ تنخواہ سے ۸۰/- ــ ۵ ــ ۱۲۰/- ــ ۷ ــ ۱۹۰/- روپے کے پیمانہ تنخواہ میں ترقی دے کر بمشاہرہ ۹۰/- روپے یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء سے

گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خان میں مقرر کیا گیا۔

۵۵۲۴ ADMN(I) ۱۳ فروری ۶۲ء م۔ انور علی خاں۔ بی اے۔ بی ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول دیپھا کو ۳۱ دسمبر ۶۱ء سے م۔ محمد انور خاں ڈبلیو پی۔ ای ایس کی جگہ اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں بطور ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول دیپھا مقرر کیا گیا۔

۵۵۲۶ ADMN(I) ۱۳ فروری ۶۲ء م۔ بشیر احمد انصاری ایم اے قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول منٹگمری (جو بطور عارضی لیکچرار گورنمنٹ کالج منٹگمری کام کر رہے ہیں) کو م۔ عبدالقیوم بی اے بی ایڈ کی جگہ اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے قائم مقام سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبدالقیوم بی اے۔ بی ایڈ عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری کو م۔ انور علی خاں کی جگہ اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول دیپھا مقرر کیا گیا

ایضاً مرزا عبدالغنی ایم اے بی۔ ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول تنسکر گڑھ (جو فی الحال بطور عارضی لیکچرار گورنمنٹ بہاول کالج بہاول نگر کام کر رہے ہیں) کو م۔ ریاض حسین زیدی کی جگہ اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ظفروال مقرر کیا گیا۔

۵۴۱۵ ADMN(I) ۱۳ فروری ۶۲ء م۔ محمد متقی پی ٹی آئی گورنمنٹ مڈل سکول جیجنی گوٹھ ضلع بہاولپور نے جو استعفیٰ پیش کیا تھا وہ ۳ ستمبر ۶۱ء سے منظور کیا جاتا ہے۔

۶۹۷۴ A (I) ۱۸ فروری ۶۲ء م۔ مظفر الرحمن بی اے ایس اے وی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول لائل پور کو م۔ محبوب شاہ ہاشمی کی جگہ اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے سینئر انگلش ٹیچر سنٹرل ماڈل ہائی سکول لاہور مقرر کیا گیا۔

آموزش

۱۵ شماره نمبر ۱۰ | لاهور | اپریل ۶۳

اس شمارے میں

[illegible] | نذیر احمد شیخ

آموزش

لاہور

اپریل ۱۹۶۳ء

جلد ———— ۱۵

شمارہ ———— ۱۰

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

پبلشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی۔ لاہور

آر۔ ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۱۹۴ انارکلی لاہور سے شائع کیا گیا

اداریہ

ہر قوم کا ایک مخصوص کردار ہوتا ہے جو اُسے دوسری اقوام سے ممتاز کرتا اور اعزاز بخشتا ہے۔ بانیٔ پاکستان نے پاکستانیوں کے قومی کردار کے لیے "ایمان، اتحاد اور انضباط" کا زرّیں اصول پیش کیا اور یہ بھی فرمایا کہ:۔ "اب اِس ملک کی زبان اُردو ہو گی، نہ کہ کوئی اور زبان۔ قومی اتحاد کے لیے زبان کا واحد ہونا ضروری ہے۔"

اگرچہ خود قائدِاعظم کو اُردو میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے دِقّت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن انھوں نے قوم کے اجتماعی مفاد کے پیشِ نظر اُردو ہی کے حق میں فیصلہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اُردو ایک ہمہ گیر زبان ہے، جو اِس برِّصغیر میں لنگوا فرنیکا کا حکم رکھتی ہے اور قدیم وجدید علوم کو اپنے اندر جذب کر سکتی ہے علاوہ ازیں اُردو میں نہ صرف اِس خطّۂ ملک کی اعلیٰ روایات محفوظ ہیں بلکہ اِس میں مغربی ممالک کے غیر صحت مند خیالات کو رد کرنے کا سامان بھی موجود ہے۔

قائدِاعظم کی وفات کے بعد اُن کی فرمائش اور فہمائش بحث وتمحیص کے شور وغل میں دب کر رہ گئی اور تمام تصریحات کے باوجود اُردو نہ سرکاری زبان بنی، نہ اعلیٰ سطح پر ذریعۂ تعلیم قرار دی جا سکی۔

اب اسے، اِس خطّۂ پاک کی خوش قسمتی کہیئے کہ شکوک وشبہات کے بادل چھٹتے جاتے ہیں اور حقیقت کا آفتاب نمودار ہو رہا ہے۔ ملک وملّت کے دردمندوں نے قومی قدروں کے تحفظ کی کوششیں تیز کر دی ہیں اور نظامِ تعلیم کو غیر ملکی اثرات سے پاک کرنے کی ٹھان لی ہے۔ اب اردو کو انگریزی کی جگہ سرکاری زبان قرار دینے اور اُسے ہر سطح پر ذریعۂ تعلیم بنانے کا غُلغلہ بلند ہے۔ کیوں کہ مغربی پاکستان کے ساکنوں نے ملکی سالمیت اور قومی یکجہتی کے پیشِ نظر ایک ہی تہذیب اور ایک ہی زبان کو فروغ دینے کا عزم بالجزم کر لیا ہے۔ چناں چہ مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں اُردو کو سرکاری زبان قرار دینے کے متعلق مسودۂ قانون پیش کیا جا چکا ہے، جس کے منظور ہو جانے پر مغربی پاکستان کے تمام محکموں اور عدالتوں میں اُردو ہی سرکاری زبان متصوّر ہو گی۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم وتدریس کا سرانجام اُردو ہی میں کیا جائے گا۔ اور ملکی قوانین کی تدوین واشاعت کا تمام کام اُردو ہی کے ذریعہ عمل میں آئے گا۔

کراچی یونیورسٹی اکیڈمک کونسل نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سال سے بی اے اور بی ایس سی تک اردو ہی میں تعلیم دی جائے گی اور امتحانات بھی اردو ہی میں ہوں گے۔ پنجاب یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد بھی اردو کو ڈگری کلاسز میں ذریعۂ تعلیم بنانے کے متعلق غور و خوض کر رہے ہیں۔

سائنس اور قومی زبان کی کانفرنس منعقدہ لاہور میں ڈاکٹر مظہر حسین صاحب نے اپنی بنگالی تقریر میں کہا ہے کہ "خود میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ کو ایم ایس سی کی جماعتوں میں طبیعیات، ریاضی اور شماریات کی تعلیم بنگلہ زبان میں دیتا رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ مغربی پاکستان کے اساتذہ بھی ان جماعتوں کو اردو میں سائنس کی تعلیم دینے پر پوری طرح قادر ہیں۔ رجعت پسندانہ ذہنیت ہی وہ واحد رکاوٹ ہے جس کی وجہ سے ہم قومی زبان میں سائنس کی تدریس کے منصوبے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔ قومی زبان کا ذریعۂ تعلیم ہونا ہماری زبان تہذیب اور ہمارے تمدن کی بقا اور نشو و نما کے لیے ضروری ہے۔"

بقول ڈاکٹر نذیر احمد صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور۔ جہاں تک قومی زبان میں سائنس کی تدریس کا تعلق ہے اس وقت پورے پاکستان میں انٹرمیڈیٹ کے درجے تک کوئی امر مانع نہیں رہا۔ ڈھاکہ اور کراچی کی یونیورسٹیاں ڈگری کے درجے تک سائنس اور آرٹ کے تمام مضامین کی تدریس کے لیے قومی زبان کے استعمال کی اجازت دے چکی ہیں۔

ان کوائف سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومی زبانوں کے ہر سطح پر ذریعۂ تعلیم بننے کے امکانات روشن ہیں اور ہم تعلیمی کمیشن کی مقرر کردہ منزل مقصود کی جانب بڑھتے جا رہے ہیں ؛

پاکستان میں پبلک سکول

پروفیسر فرحت اللہ خاں نیو مسلم کالج لاہور

بچہ ایک نرم و نازک پودے کی طرح ہوتا ہے جس کی پرورش ماں کی گود سے شروع ہوتی ہے۔ اس کی پہلی تربیت گاہ اس کا گھر ہے اور دوسری تربیت گاہ تعلیمی ادارہ۔ جیسے ایک نرم و نازک پودے پر تین اہم وقت گزرتے ہیں۔ اسی طرح بچے کی پرورش میں بھی تین دور آتے ہیں۔

(۱) بچپن اور اوائل عمری

(۲) سن بلوغ اور احساس ذمہ داری

(۳) بحیثیت انسان پاؤں پر کھڑے ہونا اور ملک و قوم کے لیے مفید شہری بننا۔

پبلک سکول کی اہمیت

سکول بچے کے لیے ایک اہم ترین تربیت گاہ ہوتی ہے۔ اس کا بچپن پرائمری سکول میں، سن بلوغ سیکنڈری سکول میں۔ اور تعلیم کی تکمیل کالج میں انجام پاتی ہے۔ ہمارے ملک میں پبلک سکول، سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سکولوں کا نعم البدل ہوتا ہے۔ اس میں ۱۱ سال سے ۱۷ سال تک کے طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ عمر کا یہ حصہ بچے کی زندگی میں نہایت پرخطر ہوتا ہے۔ جوانی کے جوش میں ڈوبا ہوا بچہ کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ اگر اس عمر میں تعلیم و تربیت میں کمی واقع ہو جائے تو بچہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ ہمارے ملک کے تقریباً ۵۰ فیصد بچے اس موقع پر تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ پبلک سکول بچے کی ذہنی، جسمانی اور اخلاقی نشوونما پر ایسا اثر ڈالتا ہے کہ عموماً بچہ ایسے سکولوں میں سیدھی راہ سے نہیں بھٹکتا۔

تعلیمی رپورٹ اور موجودہ سیکنڈری سکول

موجودہ دور میں تعلیمی اصلاحات کا سب سے اہم صحیفہ تعلیمی رپورٹ ہے۔ موجودہ سیکنڈری سکولوں کا

ذکر کرتے ہوئے ہمارے ماہرانِ تعلیم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں:۔

"The Secondary Schools of Pakistan have long been the subject of deep concern. Reforms have been suggested time and again but few have been carried out. The tradition of the literary type of Secondary School has been so strong among the public, as well as among the educators that resistance to change has frustrated the intention of nearly all reformers".

پاکستان کے سکنڈری سکولوں کی حالت عرصہ سے پریشان کن ہے۔ گاہے گاہے اصلاحات کی تجاویز ہوتی رہی ہیں۔ لیکن ان میں سے شاید ہی کسی پر عمل کیا جاتا ہو۔

ایسی حالت میں ایک اچھے سکول کی ضرورت ہوا کرتی ہے جو طلباء کو زندگی کے روزمرہ حالات کے مطابق تعلیم و تربیت دے سکے اور دوسرے سکولوں کے لیے نمونہ بن سکے۔ کسی اچھے سکول کی تعلیم کے مقاصد پاکستان میں یہ ہونے چاہئیں:۔

(۱) بچے میں انفرادیت پیدا کرنا۔

(۲) پاکستان کا اعلیٰ شہری بننے میں مدد دینا۔

(۳) اچھا کارندہ بننے میں مدد دینا۔

(۴) حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنا۔

ان مقاصد کے حاصل کرنے میں اب تک ہمارا سیکنڈری سکول ناکام رہا ہے۔ موجودہ سکولوں کی حالت کو سنوارنے کے لیے ماہرین تعلیم نے بعد ازاں سیکنڈری ایجوکیشن کو مفید تر بنانے کی کوشش کی چنانچہ نئے نظریات کے ماتحت نصاب تعلیم معیار امتحانات اساتذہ کی حالت، سکولوں میں نئے طریقے اور املا کی اشیاء

کو پُر اثر بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن کلاسوں میں پرانا سٹرا ہُوا نثریت نئی تبدیلی پیدا نہ کر سکا جس سرعت سے نصاب، امتحانات اور درسی کتب کو بدلا گیا اس سے توقع تھی کہ آنے والے دور میں طلبا، کی زیادہ محنت اور اساتذہ کی ثابت قدمی سے یہ تجاویز بہت مفید ثابت ہوں گی۔

پبلک سکول

تعلیمی پروگرام کو ترقی دینے میں پبلک اور رہائشی سکولوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ایسے سکولوں میں ہم سہ نکاتی پروگرام پر عمل کرتے ہیں۔

(۱) اچھی تعلیمی دسترس (۲) عمدہ اخلاق (۳) اچھی صحت

"A public school offers high class academic, physical and moral education, that aims at developing all round personality.

پبلک سکول ایک اعلیٰ ذہنی، جسمانی اور اخلاقی معیارِ تعلیم سکھاتا ہے۔ تاکہ طلبا، میں بھرپور شخصیت پیدا ہو۔ ایسے سکولوں کے تعلیم یافتہ بچے پاکستان کے بڑے بڑے دفاتر میں اور پاکستان کی بری، بحری اور ہوائی افواج میں افسروں کے فرائض ادا کر رہے ہیں۔

برطانوی نمونے کے پبلک سکول

ہمارے ملک میں جتنے بھی پبلک سکول ہیں وہ انگریزی پبلک سکول کی نقل ہیں۔ یہ نمونہ دراصل انگریزوں ہی نے ہمارے ملک میں جاری کیا تھا۔ ایچیسن کالج لاہور۔ لارنس کالج گھوڑا گلی بھی ہمارے پبلک سکولوں میں شامل ہیں، جو انگریز ہمارے لیے چھوڑ گئے تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ان سکولوں نے ہمارے ملک کے بہت سے کام سنبھال دیئے۔ آج ہمارے ملک میں تیرہ پبلک سکول ہیں۔ ان سکولوں کے قیام میں ہم نے اپنی ضروریات ہی کو مدِنظر رکھا۔ کہیں پہلے بری فوج کے افسروں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کہیں بحری اور ہوائی فوج کے افسروں کی۔ ان سکولوں کے بچوں میں خصوصی طور پر قائدانہ اور افسروں کی صلاحیتیں زیادہ پائی جاتی تھیں۔ اس لیے انھوں نے ہمارے صنعتی، تجارتی اور ترقیاتی

سکولوں کے دفتروں کے لیے بھی اچھے افسر مہیا کیے۔ آج پاکستان میں تین قسم کے پبلک سکول پائے جاتے ہیں

(۱) **رہائشی پبلک سکول** :- یہ وہ سکول ہیں جہاں امراء اور رؤسا کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ مثلاً ایچیسن کالج لاہور۔ لارنس کالج گھوڑا گلی۔ برن ہال سکول اور گورنمنٹ سنٹرل پبلک سکول ایبٹ آباد صادق پبلک سکول بہاول پور اور پبلک سکول حیدر آباد، ڈھاکہ وغیرہ۔

(۲) **ملٹری نمونے کے پبلک سکول** :- یہاں ملٹری افسران اور رؤسا کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً کیڈٹ کالج حسن ابدال۔ پبلک سکول پتقارو۔ پی۔ اے ایف سکول (سرگودھا، پشاور لوئر ٹوپا (مری) ملٹری سکول کوئٹہ۔ سرائے عالمگیر (جہلم) جاٹ گام۔ کوہاٹ)

(۳) **ڈے سکول** :- جن کو انگریزی سکول بھی کہتے ہیں۔ یہاں بچے صرف دن کے وقت پڑھنے آتے ہیں لیکن تعلیم صرف انگریزی میں ہوتی ہے۔ ان میں مشن سکول بھی شامل ہیں، جو بیرونی مشنوں نے چلائے تھے۔ مثلاً کنونٹ سکول (پنڈی۔ پشاور۔ واہ) سینٹ انتھنی (لاہور) سینٹ میری (پنڈی) گرامر سکول (کوئٹہ، کراچی)

پبلک سکول کی خامیاں

ہندو پاکستان کے مشہور ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ پبلک سکول دراصل انگریزی سکولوں کی دین اولاً انگریز اپنا طرزِ تعلیم۔ طرزِ زندگی اور ریاست، پسماندہ اقوام پر ٹھونسنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ ان کے مکمل غلام اور محتاج بن جائیں۔ دوسرے ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ اگر پاکستان اور بھارت آزاد بھی ہو جائیں اپنی آزادی کے بعد بھی اپنی معاشرتی ضروریات اور صنعتی اشیاء ان سے خریدیں۔ ایک ترقی یافتہ قوم حیثیت سے ہمارے ملک سے دائمی ثقافتی تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم رکھیں۔

مندرجہ بالا دو خامیوں کا ردِ عمل یہاں سوچنا ہوگا اور اپنے تعلیمی نظام کو ایسے سانچے میں ڈھالنا ہوگا جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہمارا طالب علم پاکستان کا سچا شہری بنے اور اپنے اندر ایثار، حب الوطنی قربانی اور اسلامی اخلاق کا جذبہ پیدا کر سکے۔

تیسرے برطانوی نمونے کے پبلک سکول کے طالب علموں میں برطانیہ میں بھی چند ایسے عیوب

آئے کہ یورپ کے چند مفکرین تک ان کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ چنانچہ زمانۂ حال کے مشہور ادیب اور فلسفی مسٹر برٹرانڈرسل (BERTRAND RUSSEL) اپنی کتاب تعلیم میں لکھتے ہیں :-

اگر ہمارے امرا اور روسا کو زندہ رہنا ہے تو چند خوبیاں ہمیں پبلک سکول کے طلبا میں پیدا کرنی ہوں گی۔ مثلاً ہر طالب علم کو یہ محسوس کرنا ہوگا کہ اِس دنیا میں اُس کی زندگی کا کوئی مقصد ہے۔ اب تک ان درس گاہوں کے طلبا ذہنی صحتوں کی نشوونما کو اِس لیے قربانی کی بھینٹ چڑھاتے رہے کہ ان میں تجسس اور فکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ہمدردی اور انکساری کو اس لیے خیرباد کہتے رہے کہ ان سے پسماندہ اقوام پر حکومت کرتے وقت رکاوٹ پیدا ہوتی ہے"۔

میجر نیازالدین برطانوی پبلک سکولوں پر بحث کرتے وقت فرماتے ہیں :-

"The high cost, the creation of a privileged class, suppression of intellect and individuality; and adoption of snobbing attitude by the pupils, are some glaring points against the present day public schools".

موجودہ پبلک سکول کا مہنگاپن۔ ایک مخصوص جماعت کی تشکیل، ذہنی نشوونما میں رکاوٹیں، تحکمانہ برتاؤ۔ اِس طرزِ تعلیم کی چند نمایاں کمزوریاں ہیں لیکن باوجود ان کمزوریوں کے پبلک سکول ہمارے سکولوں کے مقابلے میں بہتر ثابت ہوئے۔

پبلک سکول اور سیکنڈری سکول کا مقابلہ

ہمارے سیکنڈری سکول چند سکولوں کے سوا معیاری سکول ثابت نہیں ہوئے کیوں کہ ہمارے سکولوں میں تعلیمی دسترس، جسمانی پرورش اور اخلاقی قدروں کا معیار نیچا رہا۔

پاکستان بننے کے بعد ہمارے ملک میں بہت بڑی صنعتی اور تجارتی ترقی ہوئی اور ملک کو ہر شعبہ میں ترقی یافتہ ملکوں کے دوش بدوش چلنا پڑا۔ ملک میں ترقی یافتہ ملکوں کا معیار

قائم کرنے کے لیے اور ہوائی۔ بری اور بحری افواج کی شہرت کو برقرار رکھنے کے لیے ہمارے طلبہ نے بڑا حصہ لیا۔ صدر مملکت فیلڈ مارشل ایوب خاں بھی ہم سے یہی چاہتے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے :۔

"I want such schools, that will produce potential leaders to hold the post of responsibility in the young".

مجھے ایسے سکولوں کی ضرورت ہے جو ملک میں مخلص رہنما پیدا کریں، جن کو ہم ملک میں ذمہ داری کے منصب سپرد کر سکیں ——— ایسے سکول صرف پبلک سکول ہی ہو سکتے ہیں۔

پبلک سکول کا نصاب

پرانے پبلک سکولوں کا نصاب، عین برطانوی سکولوں کے مطابق ہے۔ ان کا امتحان بھی کیمرج یونیورسٹی لیتی ہے۔ پاس شدہ طلباء کو سینئر سرٹیفکیٹ۔ یا ہائر سینئر سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے۔ ہر مضمون انگریزی زبان میں پڑھایا جاتا ہے۔ پرانے پبلک سکول اب تک اسی ڈگر پر چل رہے ہیں۔

ہمارے ملٹری پبلک سکول مثلاً حسن ابدال پی اے۔ ایف سکول سرگودھا وغیرہ کے نصاب کو پاکستانی سکولوں کے مطابق کرکے طلبا کو بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کا امتحان دلایا جاتا ہے۔ پس ہمارا نصاب ان سکولوں پہ لاگو ہو جاتا ہے اور ہم ان کے نتائج سے بتا سکتے ہیں کہ ان سکولوں کی تعلیمی حالت کیسی ہے۔

کیڈٹ کالج حسن ابدال سالہا سال سے سیکنڈری بورڈ آف ایجوکیشن لاہور کے امتحانات میں اول یا دوم آ رہا۔ ان کی کامیابی نصاب کو نئے تعلیمی طریقوں سے پیش کرنے، اور لکھائی کے ہر کام کو پابندگی سے کرانے اور اُس کی درستی پر مبنی ہے۔

پبلک سکول میں ورزش کی اہمیت

کیڈٹ کالج حسن ابدال میں اگر ہمارے اساتذہ یا طلبا ایک دن گذاریں تو پبلک سکول کی زندگی اور ہمارے سیکنڈری سکولوں کے فرق کا نمایاں طور پر پتہ چل جائے۔ پبلک سکول کے طلبا بڑی پابندی سے روزانہ ورزش کرتے ہیں اور اس کی پابندی سے ان میں ایک ایسی فرمانبرداری پیدا ہو جاتی ہے

جس کا دوسرے سکول کے طلبا میں عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا۔

صبح صبح پبلک سکول کے طلبا وقت کے مطابق پی ٹی کی وردی پہن کر میدان میں نکل آتے ہیں۔ اور پی ٹی انچارج اور پریفیکٹوں کے ماتحت پی۔ ٹی کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھیل کے میدان میں طلبا کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر صبح صبح جسم کے ہر حصے کو حرکت دے رہا ہے تاکہ جسم میں سارے دن کام کرنے کے لیے تروتازگی اور قوتِ ارادی پیدا ہو جائے۔

پبلک سکول میں ورزش کا معیار منظم افواج کے معیار کا مقابلہ کرتا ہے۔

پبلک سکول کا ماسٹر اور اس کی تعلیمی صلاحیت

پبلک سکول کے ماسٹر کی ذمہ داری بھی عجیب و غریب ہوتی ہے۔ لباس سے۔ برتاؤ سے۔ علمی برتری سے اور زبان دانی سے اپنے آپ کو طالب علم کے سامنے نمونہ بن کر دکھانا پڑتا ہے۔ وہ اپنے وقت۔ نصاب اور کلاس کی ترقی کا اتنا پابند ہوتا ہے کہ کہیں کلاس کے کام میں کمی ہوئی اور اس کی پریشانی شروع ہوئی۔ سکول کا ہیڈ اور خود طلبا بھی اس کی ترقی کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اگر وہ معیار سے گر جائے تو طلبا خود کلاس میں کھڑے ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ معیار کے مطابق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پبلک سکول کا کوئی ماسٹر ایم اے اور بی ایڈ سے کم نہیں ہوتا۔

راقم الحروف کو بھی ڈون پبلک سکول ڈیرہ دون میں بحیثیت سینئر جغرافیہ ماسٹر تین سال کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ جغرافیہ پڑھاتے وقت مجھے اس اسکول نے جتنا معروف، ذمہ دار اور حساس رکھا۔ شاید ہی کسی کالج یا سکول نے رکھا ہو۔ اس سکول میں ایک جغرافیہ کا کمرہ تھا۔ جو بذاتِ خود ایک تعلیم گاہ تھی۔ اس میں ایک طرف نقشے۔ دوسری طرف تصاویر اور گلوب۔ ایک بڑی الماری میں جغرافیہ کی لائبریری۔ دوسری طرف جغرافیائی میگزین اور رسالے۔ ایک طرف ماڈل دوسری طرف نقشہ سازی کا سامان۔ ایک طرف فلمیں اور فلم سٹرپ اور دوسری طرف پروجیکٹر اور موسمیات کے مطالعہ کا سامان ایک طرف نقشے اور ماڈل بنانے کا سامان اور دوسری طرف ڈیرہ دون کی وادی کے ماڈل تھے اس سکول کے ماسٹر کو ان تمام چیزوں کے استعمال اور ان کے بنانے پر حاوی ہونے کی ضرورت تھی۔

اس کے علاوہ محکمۂ جنگلات۔ محکمۂ رسل ورسائل۔ محکمۂ زراعت۔ محکمۂ تجارت۔ محکمۂ صنعت وحرفت اور محکمۂ تعلقات عامہ کا نشر واشاعت کا تمام لٹریچر موجود تھا۔ تاکہ طلباء ملک کے جدید ترین حالات سے باخبر رہیں۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میری ٹریننگ کالج کی پروفیسری کے دوران چند سال گذرے ہمارے کالج کے طلباء اکثر یہ سوال کیا کرتے تھے "پروفیسر صاحب آپ کی ٹریننگ سرآنکھوں پر لیکن سکول میں جاکر یہ طریقے ہمارے کام نہیں آئیں گے۔ وہاں ایک ہی طریقہ کامیاب نظر آتا ہے کہ طلباء کو رٹواؤ اور پاس کراؤ اور کام نہ کریں تو خوب ڈنڈے لگاؤ" حالانکہ کیسا ہی سکول ہو وہ رٹوانے یا ڈنڈے لگانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

یہ ہے بنیادی فرق پبلک سکول میں اور سیکنڈری سکول میں۔ پبلک سکول میں ہر طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ آنے والے دور کا وہ ایک اہم جزو ہے۔ اس لیے اسے تمام وہ باتیں معلوم ہونی چاہئیں۔ جو حالات وقوع میں آرہے ہیں۔ چنانچہ پبلک سکول میں ہر میز پر ایک چھوٹا سا گلوب ہوتا ہے۔ یا ضرورت کے وقت اٹلس۔ استاد ہر سبق کے لیے نقشے تصاویر۔ فلم سٹریپ اور دیگر امدادی اشیا استعمال کرتا ہے جن سے ملکی حالات ایک دلچسپ اور خوش کن مضمون بن جاتے ہیں۔ طلبا نقشہ جات اور تصاویر کی مدد سے ملکوں کے حالات خود قلم بند کرتے ہیں۔ آکسفورڈ نوٹ بک پر کرنے اور موجودہ جغرافیائی میگزین کا مطالعہ کرنے کے لیے بھی دن مقرر ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی طلبا قریب کی فیکٹریوں میں یا محکمۂ سردے یا محکمۂ جنگلات میں جاکر ملکی صنعتوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کبھی ماسٹر صاحب کے زیر ہدایت طلبا جغرافیائی پراجیکٹ مثلاً ہمارا سکول۔ فیکٹری۔ مارکٹ وغیرہ تیار کرتے ہیں۔

الغرض پبلک سکول میں ریحنیل میتھڈ۔ پراجیکٹ میتھڈ۔ لیبارٹری میتھڈ۔ سفری طریقہ۔ طریقہ مشاہدہ یا طریقہ وحدت، موقع اور محل کے مطابق استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے ڈیڑھ دن جانے کے بعد پہلے سال میں ۳۴ طلبا نے امتحان دیا۔ جس میں ۱۴ فرسٹ ڈویژن اور ۲۰ سیکنڈ ڈویژن حاصل کرکے پاس ہوئے۔ ایسے نتائج بالعموم پبلک سکولوں ہی میں دیکھنے میں آتے ہیں۔

پبلک سکول میں اخلاقی تعلیم

پبلک سکول کا ہر ماسٹر اپنی وردی اور گاؤن پہن کر طلبا کو سبق دیتا ہے جس سے اس کے کام میں اعتماد اور تمکنت پیدا ہو جاتی ہے۔ پبلک سکول کا ہر طالب علم اپنے ماسٹر کی بڑی عزت کرتا ہے جب وہ گذر رہا ہو تو فوراً راستے سے ہٹ کر مؤدبانہ سلام کرتا ہے۔ استاد اور طالب علم ہر کام کو محنت و مشقت، پابندیٔ وقت اور ایمانداری سے کرتے ہیں۔ صبح کا ناشتہ دوپہر کا کھانا اکٹھے کھاتے ہیں۔ ماسٹر عموماً میز کے سرے پر بیٹھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ طلبا کھانے کے آداب اچھی طرح ادا کرتے ہیں یا نہیں۔ ماسٹر ہر کام کو ایسی ذمہ داری اور سلیقہ شعاری سے انجام دیتا ہے کہ طلبا کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ وہ تعلیم اور مطالعہ کے وقت ان کا کام بھی دیکھنے جاتا ہے۔ اور کمزور طلباء کی مدد بھی کرتا ہے۔ کھیل کے میدان میں نظم اور استقلال سکھاتا ہے۔ تب ہی تو ڈیوک آف ولنگٹن نے کہا تھا کہ میں نے واٹرلو کی لڑائی ایٹن اور ہیرو سکول کے میدان میں جیتی تھی:۔

"I had won the battle of Waterloo in the playground of Eton and Harrow".

پاکستان میں پبلک سکول کے طالب علموں کی خامیاں

برطانوی سکولوں کی طرح پاکستان میں بھی اول تو پبلک سکول کا نظامِ تعلیم صرف رؤسا کے بچوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ دوسرے یہ طرزِ تعلیم ایک نئی جماعت کی تشکیل کر رہا ہے جس کے بنا پر بچوں میں غربا سے نفرت اور اپنوں سے بے اعتنائی موجود ہے۔ تیسرے ان میں غیر ضروری تکبر و نخوت کے جذبات بہت بڑھ رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں اب اس بات کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے سکول جو طلبا میں ملک اور قوم سے ہمدردی پیدا کریں کس قسم کے ہونے چاہئیں۔

تعلیمی رپورٹ میں سیکنڈری سکولوں کے مندرجہ ذیل مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) طلبا کو یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے تیار کرنا۔

(۲) ان کی طبیعت کے مطابق پیشوں کے لیے تیار کرنا

(۳) طلبا میں ذہنی، جسمانی اور اخلاقی صلاحیتیں پیدا کرنا جو اعلیٰ شہری بننے میں مدد دیں۔

کیا ہم ان مقاصد کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں؟ آپ کہیں گے نہیں۔ کیونکہ ہمارے سکولوں میں مواد کے رٹوانے پر زور ہے جس کا اثر محض سکول کے کمرے تک محدود رہتا ہے۔ ہمیں نظامِ تعلیم میں یکسر تبدیلی کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے پبلک سکول کی روایات کو مروج کرنا چاہیئے کیونکہ اب تک پبلک سکول ہی اعلیٰ پیمانہ پہ ہماری اعلیٰ تعلیمی جدوجہد میں ہمارے مددگار ہیں۔ یہ دو طرح ہو سکتا ہے۔

اولاً یہ نظامِ تعلیم عوام کی جیبوں کے مطابق کم خرچ ہو اور سکول رہائشی سکول۔

دوم۔ اس نظام میں انگریزی زبان کی بجائے ہماری مادری زبان اردو کو جگہ دی جائے۔ اور آئندہ اردو ہی ہمارا ذریعہ تعلیم ہو۔

سکول کی نوعیت

پاکستان میں دو قسم کے سکول ہیں۔

(۱) شہری سکول (۲) دیہاتی سکول۔ ان کے سکولوں کے نصاب شہری اور دیہاتی حالات کے مطابق علیحدہ علیحدہ ہونے چاہئیں۔ اور شہری طلبا میں ٹائپ، ٹکنالوجی اور سائنس کی تعلیم کو زیادہ اہمیت دی جائے اور دیہاتوں میں عملی طور سے زراعت سکھائی جائے۔ ہمارے شہری سکول صنعت، تجارت، دفتر، یونیورسٹی، اور پروفیشنل کالجوں کے لیے طلبا اور کارکن مہیا کرتے ہیں اور گاؤں کے بچے اگر عمدہ کاشت کار بن جائیں تو ملک کے بہت سے مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ٹریننگ کالج کے انگریز پرنسپل ٹریننگ کالج کے طلبا کو زراعت کا عملی شوق دلایا کرتے تھے۔ آج بھی پاکستان میں ۸۰ فیصد لوگ گاؤں میں آباد ہیں۔ اس لیے ہماری تعلیم میں زراعت کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

رہائشی سکول کا ایک بہتر نمونہ

ڈاکٹر گرائمر، جو تعلیمات کے بہت بڑے ماہر ہیں، اور جنھوں نے بیشتر وقت کراچی اور دہلی میں گذارا ہے

ان سے ایک دفعہ یہ سوال کیا گیا کہ پاکستان کے لیے کونسا تعلیمی تجربہ کامیاب ہوگا تو انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان کا جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تجربہ پاکستان کے لیے بھی ایک بنیادی حل پیش کرتا ہے۔ اس طرزِ تعلیم میں ملک کے حالات کے مطابق نظامِ تعلیم سستا اور عمدہ بن سکتا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مجھے بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ۱۹۴۳ء میں چند روز کے لیے ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ اُس زمانہ میں ایک رہائشی سکول تھا۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خان شیخ جامعہ تھے۔ اُن دنوں میں ہندوستان کے سب سے مشہور پبلک سکول ڈون سکول ڈیرہ دون میں بحیثیت سینئر جغرافیہ ماسٹر کام کرتا تھا۔ مسٹر فٹ اس سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ مسٹر فٹ ایک خاص شخصیت کے مالک تھے وہ دل سے چاہتے تھے کہ کسی طرح ہندوستان کا نظامِ تعلیم بہتر ہو جائے۔ اس لیے اپنے اساتذہ کو ملکی حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے (چھٹیوں میں) مختلف سکولوں میں بھیجتے تھے۔ ایک روز چھٹیوں کے شروع ہونے سے پہلے میں نے مسٹر فٹ سے پوچھا کہ میں یہ چند روز کس سکول میں گذاروں۔ انہوں نے جواب دیا، ڈاکٹر ذاکر حسین خان کا جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندوستان کا سب سے بہتر سکول ہے۔ آپ وہاں جاکر اس تعلیمی تجربے کا مطالعہ کریں۔ جب میں جامعہ میں گیا۔ تو ڈاکٹر ذاکر حسین ایک مسند پر بیٹھے ہوئے بڑے لڑکوں کو پڑھا رہے تھے۔ گھنٹہ بجنے پر مجھے بلایا۔ ڈاکٹر صاحب بہت نیک اور منکسر المزاج استاد ہیں۔ فوراً اسکول سے ایک بچے کو بلایا اور کہا حامد! خان صاحب ایک بڑے پبلک سکول کے ماسٹر ہیں۔ یہ اب تمہارے مہمان ہیں اور تمہارے ساتھ ہی رہیں گے۔ ننھے حامد نے مجھے سلام کیا اور بڑی ہمت سے میرا مختصر سا سامان لے کر بورڈنگ کی طرف چل پڑے۔ ایک کمرے میں چارپائی اور چھوٹی سی میز پڑی تھی، اس پر میرا بستر بچھا کر کہنے لگے جناب یہ آپ کا کمرہ ہے۔ تھوڑی دیر میں عتیق احمد صاحب آئے۔ یہ علیگڑھ میں میرے ساتھ آفتاب ہال میں رہتے تھے۔ کہنے لگے میں آجکل سکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں، مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ہم گوشہ نشینوں کو نوازا۔ میں نے ڈون سکول اور مسٹر فٹ کی باتیں سنائیں۔ فرمانے لگے ہم اور ہمارے طلبا تو غریب اور سادہ ماحول میں رہتے ہیں۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔ یہاں تو شیخ جامعہ کے

جذبات متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک جرمن لیڈی آپا جان ہیں جو بیسوں برس سے بچوں کی تعلیم و تربیت میں دن رات مصروف رہتی ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں۔ اور مل جل کر اپنے کام صحیح رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جغرافیہ کی تعلیم ہی کو لیجئے۔ ہم دریائے جمنا کے کنارے کئی دفعہ اپنے طلبا کو لے جاتے ہیں اور ریت مٹی، اور دریا کے طاس کا جغرافیہ پڑھاتے ہیں۔ دہلی شہر اور سڑکوں کا اندازہ ہمارے طلبا نے پیدل جا کر کیا ہے۔ ہم نے دہلی جا کر ایک نقشہ اور سڑکیں پیمانے کے مطابق بنائی ہیں۔ ملک کے اناج، ملک کی صنعتوں اور ملک کی ترقیاتی سکیموں پر ہم اپنے سکول میں خوب غور کرتے ہیں۔ ہمارے بہت سے ماڈل اور کھلونے مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ سادہ نقشے۔ سادہ تصاویر۔ سادہ کتابیں اور سادہ طرز تعلیم ہماری زندگی کا مقصد ہے۔ میں نے بتایا کہ دنیا کے لوگ ترقی کرتے کرتے آسمانوں پر پہنچ گئے کیا آپ کے مدرسے میں ایسے ترقیاتی نظریات ہیں؟ کہنے لگے ترقی رجحان، اہلیت اور جذبے کے ماتحت ہوتی ہے۔ اگر ہم جذبات اور اہلیتیں طلبا میں پیدا کر سکے تو ملک میں سائنسی نظریات کو ترقی دینا مشکل کام نہ ہوگا۔

اب سکول کی چھٹی کا گھنٹہ بج چکا تھا۔ ننھے حامد آئے اور کہنے لگے جناب کھانا تیار ہے۔ ہم ایک بڑے کمرے کی طرف چلے۔ بہت سے لڑکے قطاروں میں دسترخوان کے دونوں طرف بیٹھے تھے۔ میرے اندر جانے پر کھڑے ہو گئے۔ میں نے السلام علیکم کہا اور انھوں نے وعلیکم السلام۔ اس کے بعد ہم سب بیٹھ گئے۔ ہر قطار میں اب ایک لڑکا پیالے رکھ رہا تھا۔ نوکر اس میں گرم سالن ڈالتا جا رہا تھا اور دوسرا لڑکا روٹی رکھ رہا تھا۔ چند منٹ میں یہ کام ہو گیا۔ پھر سب نے بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کر دیا۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھو کر بچے اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

کچھ دیر کے لیے پھر ۵ بجے کے قریب گھنٹی بجی اور طلبا کھیلوں میں حصہ لینے کے لیے باہر نکل آئے اس سکول میں بچے ہلکے پھلکے اور کم خرچ کھیل کھیلتے ہیں۔ والی وال نٹ بال۔ کیرم۔ گتکا۔ کشتی۔ کبڈی اُن کے پسندیدہ کھیل مانے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے گاہے گاہے میری ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اکثر کہا کرتے تھے ہمارا ملک غریب ہے۔ ان بچوں کی ذہنی، جسمانی اور اخلاقی نشوونما ضروری ہے۔ مجھے جامعہ کے طلباء میں بے حد سادگی، علمی ذوق اور حب الوطنی کا جذبہ نظر آیا۔ ہندوستان کی آزادی میں ان بچوں نے نمایاں حصہ لیا ہے کیوں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں بھی ملک کی آزادی کے بڑے حامی تھے۔ جناب ذاکر حسین خاں آج مملکتِ ہندوستان کے نائب صدر ہیں۔ اور ہمارے پڑوسی ملک کی خدمت میں مصروف ہیں۔ جامعہ کے طلباء کا لباس کھدر سے بنا تھا۔ ان کا خرچ ۲۰ روپے ماہوار تھا۔ یہ سادہ لباس، سادہ خوراک، اور اونچے خیالات کے قائل تھے۔ سادہ زندگی اور بلند خیالات ان کا نظریۂ حیات تھا۔ تب ہی تو مسٹر فٹ (جو ہیڈ ماسٹروں کی دنیا میں بلند پایہ ہیڈ ماسٹر مانے جاتے تھے) اور ڈاکٹر گرائمز، جو کراچی میں آئی سی اے کے چیف تھے، اس طرزِ تعلیم کو ہمیشہ سراہتے تھے۔ مسٹر فٹ نے ۱۹۲۷ء میں انگلستان جاکر عوام کا پبلک سکول کھولا۔ لندن کے گرد و نواح میں آج بھی وہ عوام کی تعلیمی خدمت میں مشغول ہیں۔ لیکن اُن کو اس راہ پر لگانے والا سرچشمہ آج بھی مسلمانوں کے ہاتھوں پروان چڑھ رہا ہے اور ایک معمولی سکول سے بڑھ کر یونیورسٹی بن گیا ہے۔

اس جامعہ کے طلباء آج بھی ہندوستان کے نہایت وفادار شہری ہیں۔ ان کی زندگی میں ہنر، عمل اور اخلاق کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ ایسے رہائشی سکول پاکستان کو بھی آزادی کے ایک بلند مقام پر لاکر کھڑا کر سکتے ہیں۔ ہماری تعلیمی رپورٹ میں بھی رہائشی سکولوں کو بلند مرتبہ دیا گیا ہے ٭

موجودہ امریکی نظامِ تعلیم پر ایک طائرانہ نظر

پروفیسر نذیر احمد شیخ سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اٹھانوے فی صد بالغ افراد خواندہ ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ ناخواندگی کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے۔ ملک بھر میں کوئی کونہ ایسا نہیں جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے یکساں تعلیمی مواقع بہم پہنچانے کے لیے پبلک سکول موجود نہ ہوں۔ سب بچوں کے لیے تعلیم لازمی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں میں ثقافتی تربیت کے لیے چنداں فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ بعض ریاستوں میں سولہ سال کی عمر تک اور بعض میں اٹھارہ سال کی عمر تک لازمی تعلیم مروج ہے۔ اسی فی صد سے زائد بچے سترہ سال کی عمر تک سکولوں میں زیر تعلیم رہتے ہیں۔ ایک معمولی کسان کا لڑکا ڈاکٹر بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں جوہر ذاتی موجود ہو۔ وہ اپنی فطری ذہانت اور ذاتی کاوش سے اعلیٰ مراتب اور بلند مدارج حاصل کر سکتا ہے اس کے لیے کوئی شے سدِ راہ نہیں بن سکتی۔ سفارش اور خاندانی اثر و رسوخ اِس ضمن میں بہت زیادہ ممدو معاون نہیں ہو سکتے کیونکہ اولین شرط اہلیت اور قابلیت ہے۔ اگر دو امیدوار ہر لحاظ سے مساوی ہوں تو پھر خاندانی وجاہت مددگار ہو سکتی ہے۔ ایک مزدور باپ کی بیٹی ایک اعلیٰ سائنسداں بن سکتی ہے بشرطیکہ اس میں قابلیت ہو۔ مالی مشکلات دور کرنے کے لیے بہت سے ذرائع موجود ہیں۔ کوئی شخص زیورِ تعلیم سے محروم نہیں ہونے پاتا اگر توفیقِ ایزدی نے اسے قابلیت کا جوہر ودیعت کیا ہو۔ اگرچہ بلند مقاصد میں کامرانی آسان نہیں کیونکہ ہر قدم پر مقابلہ سخت ہے۔ لیکن پھر بھی کوئی شخص ناانصافی یا حق تلفی کا گلہ نظر نہیں آتا۔ ایک امتحان میں مختلف زاویوں سے ہر فرد کی شخصیت کو خوب پرکھا جاتا ہے۔ جوہرِ قابلیت کو رائگاں نہیں جانے دیا جاتا۔

پچاس مختلف ریاستوں میں پچاس مختلف اقسام کا طریقِ تعلیم رائج ہے۔ امریکی تعلیمی زندگی میں

وہی تنوع پایا جاتا ہے جو سماجی زندگی میں دیکھنے میں آتا ہے۔ ملک بھر میں ایک کمرے والے پرائمری سکول تقریباً ختم ہو رہے ہیں۔ ان کی جگہ بڑے سکول کھولے جا رہے ہیں۔ چھوٹے سکول جہاں بہت سے مضامین پڑھانے کا اہتمام اقتصادی لحاظ سے غیر منفعت بخش ہے ختم کیے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر کونینٹ کی رپورٹ بھی جو موجودہ سکولوں کے متعلق ہے چھوٹے سکولوں کے خلاف ہے۔ اس رپورٹ میں اس امر پر خاص زور دیا گیا ہے کہ چھوٹے سکول جن میں مالی خسارے کی وجہ سے فنی مضامین پڑھانے کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ قومی لحاظ سے مفید نہیں ہیں۔ کیونکہ ان بچوں کو مختلف النوع مضامین سے مستفید ہونے کا موقع نہیں مل سکتا۔ بڑے سکولوں میں تعداد طلبا پانچ ہزار تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ اور سب قسم کے مضامین پڑھانے کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ ہر مضمون کے لیے کافی تعداد میں طلبا دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اس لیے مالی لحاظ سے بڑے سکول بہت مفید ہیں۔

اگرچہ سب ریاستیں اپنے اپنے نظامِ تعلیم کے لحاظ سے سب قسم کی قید و بند سے آزاد ہیں اور مرکزی حکومت ان پر کوئی پابندیاں عائد نہیں کرتی۔ لیکن بنیادی مضامین میں سب ریاستوں میں باہم یگانگت ضرور موجود ہے۔ ریاستی حکومت اور پبلک اپنے بچوں کے لیے تعلیمی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ قومی مرکزی حکومت مضامین کے انتخاب میں چنداں دخل نہیں دیتی۔ ریاستی حکومتیں اپنی ضرورتوں کے پیش نظر جو مضامین چاہیں جاری کر سکتی ہیں۔ ہر ریاست کے افسرانِ تعلیم خود فیصلہ کرتے ہیں کہ سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فلاں فلاں مضامین پڑھائے جائیں اور ہر کورس میں فلاں فلاں اُمور پر زیادہ توجہ دی جائے۔ پڑھانے کے لیے اساتذہ کی رہنمائی کے لیے طریقِ تعلیم کے اشارات بھی اجمالی طور پر بتا دیے جاتے ہیں۔ اس کلی آزادی یا کلی تقسیم کا مقصد یہ نہیں کہ مرکزی حکومت قوم کی اس بنیادی ضرورت کی جانب سے اغماض برتتی ہے۔ ایسا خیال کرنا ہرگز درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ مرکزی حکومت ہر سال دو ہزار ملین ڈالر سے زائد رقم تعلیمی پروگراموں کے لیے مختص کرتی ہے اور ہنگامی حالات کے پیش نظر ریاستوں کی معاونت کے لیے فوری قدم اٹھاتی ہے۔ جب مقامی ذرائع متکفل نہیں ہو سکتے۔ فیڈرل حکومت مدد کی پیش کش کرتی ہے۔

امریکی نظامِ تعلیم کے دو بنیادی اصول ہیں۔ اول یہ کہ ہر شہری حصولِ تعلیم کے لیے بلا لحاظ مذہب و ملت اور بلا تفریق رنگ و نسل مساوی حقوق رکھتا ہے۔ ہر شعبہ کے لیے شخصی قابلیت بنیادی چیز ہے۔ دوم جمہوریت کے قرار و بقا بنی نوعِ آدم کی فلاح و بہبود اور شخصی آزادی کے تحفظ کے لیے تعلیم لازم ہے۔

پرائمری تعلیم:۔ اضلاع متحدہ امریکہ میں تقریباً ایک لاکھ آٹھ ہزار پانچ سو پرائمری سکول قائم ہیں۔ ان میں تین کروڑ کے لگ بھگ طلبا، زیرِ تربیت ہیں۔ ان بچوں میں سے ۸۷ فی صد بچے ایسے سکولوں میں پڑھتے ہیں جنھیں مقامی ذرائع کی مدد سے چلایا جاتا ہے۔ امریکی بچے طفولیت کے آغاز سے تعلیمی سرگرمیاں شروع کرتے ہیں۔ بعض تین سال کی عمر میں اور اکثر چار سال کی عمر میں نرسری سکولوں میں جانا شروع کر دیتے ہیں۔ معلّم کی زیرِ نگرانی بچے کی باقاعدہ دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ پانچ سال کی عمر میں بچے کنڈرگارٹن سکولوں میں چلے جاتے ہیں، جہاں بچے کی منظم نشو و نما کا کام باقاعدہ جاری رہتا ہے۔ ان بچوں کی دماغی جسمانی اور سماجی بہبود کی نگرانی کی جاتی ہے۔ اکثر کنڈرگارٹن سکول گورنمنٹ کے زیرِ اہتمام ہیں۔ لیکن مقامی آبادی بھی ہر لحاظ سے مدد کرتی ہے۔ موجودہ پرائمری سکول کی عمارت ایک یا دو منزلہ ہوتی ہے۔ جن میں چھ سے بارہ سال کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جماعتوں کے کمرے کشادہ اور ہوادار ہوتے ہیں۔ کرسیاں اور میزیں ایک جگہ نصب نہیں ہوتیں۔ قدرتی اور مصنوعی روشنی کا مناسب امتزاج کیا جاتا ہے۔ دیواروں کے رنگ ہلکے اور چمکیلے ہوتے ہیں۔ بچوں کے نوٹس بورڈوں پر بچوں کے آرٹ کے کام کی نمائش کی جاتی ہے۔ ہر کمرۂ جماعت میں بچوں کے پڑھنے کے لیے دلچسپ کتب کا ذخیرہ فراہم کیا جاتا ہے۔ سائنسی سامان کافی مقدار میں مہیا کیا جاتا ہے۔ بچوں کے مشاہدے کے لیے پھول اور پالتو پرندے فراہم کیے جاتے ہیں۔ جہاں آب و ہوا اجازت دیتی ہے بچوں کو کھلی ہوا میں بٹھایا جاتا ہے۔ تاکہ وہ سورج کی روشنی اور تازہ ہوا سے استفادہ کر سکیں۔

ابتداء سے پڑھنا لکھنا اور حساب کے بنیادی قواعد سکھلائے جاتے ہیں۔ تاریخ اور جغرافیہ کے مبادیات سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ چھوٹی جماعتوں میں ہی وہ سائنسی تجربات شروع کر دیتے ہیں اور انھیں روزمرہ زندگی کے مشاہدات اور واقعاتِ عالم سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ بچوں کی قوتِ مشاہدہ کے

نشو و نما کے لئے اہتمام کیا جاتا ہے۔ انہیں روزانہ زندگی کے واقعات کا جائزہ لینے اور ان کے متعلق بحث کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ تاکہ وہ اپنے خیالات اور جذبات و احساسات دوسروں کے سامنے موثر انداز میں پیش کرنا سیکھ جائیں۔ پرائمری سکول میں لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ مجالست کی بدولت موانست پیدا کرتے ہیں۔ انھیں یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ سکول ان کی دنیا کا ایک اہم جزو ہے وہ ان مواقع سے جو معاشرہ ان کے لیے مہیا کرتا ہے مستفید ہونا سیکھتے ہیں۔ اپنی ذمہ داریوں سے باحسن الوجوہ عہدہ برا ہونے کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقی قوت کو اجاگر کرنے کے لیے ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ زندگی کے گوناگوں مشاغل سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں اور اپنے گرد و پیش کے احباب کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔

سب لوگوں کو یکساں تعلیمی مواقع مہیا کرنے کے لیے پوری کوشش کی جاتی ہے۔ دیہات کے لوگوں کو زیور علم سے آراستہ کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا جاتا۔ اگرچہ دیہات میں شہروں کے مقابلہ میں تعلیمی مواقع کم ہیں، لیکن بڑی سرعت کے ساتھ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ آسانیاں پیدا کی جا رہی ہیں۔ ایک کمرہ والے دیہاتی سکول ختم ہو رہے ہیں۔ ان کی جگہ بڑے سکول قائم کئے جا رہے ہیں۔ بہت سے پرائمری سکولوں کے مقابلہ میں مرکزی مقام پر ایک بڑا سکول زیادہ مفید سمجھا جاتا ہے وہاں نسبتاً اچھے کمرے، بہتر سائنسی تربیت گاہ اور بہتر تفریحی سامان مہیا کیا جاتا ہے۔ گرد و نواح کے بچوں کو سکول کی بسیں گھر سے لے آتی ہیں۔ اور واپس پہنچا دیتی ہیں۔ بالعموم پرائمری سکولوں کے نصاب کا خاکہ کم و بیش مندرجہ ذیل خطوط پر تیار کیا جاتا ہے۔

(۱) حساب
(۲) صنعت و حرفت
(۳) صنفی فنون
(۴) صحت جسمانی
(۵) گھریلو کام کاج
(۶) موسیقی
(۷) جسمانی ورزش
(۸) زبان دانی
(۹) سائنس
(۱۰) معاشرتی علوم (تاریخ - جغرافیہ - شہریت)

[redacted]

ذہین بچوں کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے۔ ان کے ساتھ خصوصی سلوک روا رکھا جاتا ہے ان کی تعلیم کے لیے علیحدہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ عام بچوں کے نصاب میں اضافہ کرکے ان کے تعلیمی پروگرام میں توسیع کی جاتی ہے۔ عام بچوں کے مقابلہ میں انھیں زیادہ کورس پڑھائے جاتے ہیں۔ معذور بچوں کے لیے بھی سپیشل یا خاص سکول کھولے گئے ہیں۔ ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ بچوں کو علمی اور مفید تعلیم دی جائے ان کی درسی تعلیم کو عملی زندگی کے ساتھ مربوط کیا جائے۔ معاشرہ کی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور ان کی دلچسپیوں اور رجحانات کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ درسی کتب کے ساتھ فلمیں، فوٹو، ریڈیو، پروگرام، اخبارات، اور بچوں کے رسائل استعمال کئے جاتے ہیں۔ جن سے بچے کی واقفیت عامہ کے وسیع کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ تعلیمی سرگرمیوں میں کتب خانے۔ عجائب گھر اور تجارتی مرکز بہت اہم تصور کیے جاتے ہیں۔ بچوں کو اکثر ان مقامات کی سیر کے لیے لے جایا جاتا ہے۔ جب بھی ممکن ہو ماہرین تعلیم اور کہنہ مشق اساتذہ کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے وسیع تجربات سے بچوں کو مستفید کریں وہ بچوں کو دلچسپ اور مفید باتیں بتاتے ہیں جن کا زندگی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔

حال ہی میں سائنسی تعلیم کے لیے ٹیلی ویژن کا استعمال شروع کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ سے ایک عمدہ تیار کیا ہوا سبق قوم کے سب بچوں کو بیک وقت پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہی معلم سینکڑوں معلمین کا کام کر جاتا ہے۔ چوں کہ وہ سبق پوری تیاری کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ ایک مثالی سبق ہوتا ہے جو دیگر اساتذہ کی راہ نمائی بھی کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ مثالی سبق عام اسباق سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ معلم کی اہمیت کمرۂ جماعت میں مسلّم ہے۔ طلبا کی رہ نمائی کے لیے کمرۂ جماعت میں اس کی موجودگی اشد ضروری ہے۔ معلم اور متعلّم کے باہم رابطہ سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں، ٹیلی ویژن کے سبق سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

تیسری جماعت سے غیر ملکی زبانیں پڑھانے کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ عرصہ سے پرائمری سکولوں کے تعلیمی پروگرام میں فضائیہ کی تعلیم بھی شامل ہے۔ بہت سے سکولوں میں نئے سائنسی زاویے نئے انداز میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ اور فضائیہ کے متعلق بہت سی نئی چیزیں پڑھائی جا رہی ہیں۔ بیرونی دنیا

متعلق بنیادی حقائق سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ انھیں شہریوں کے حقوق اور قومی و ملکی فرائض کے متعلق مبادیات سکھائے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ ہوشیار اور چست و چالاک شہری بننے کے قابل ہو سکیں۔

ہائی سکول:۔ ریاست ہائے متحدہ میں سیکنڈری سکولوں کی تعداد اٹھائیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ ان میں ۸۰ فی صد پبلک سکول ہیں۔ جونیئر اور سینئر ہائی سکولوں میں تقریباً ایک کروڑ پندرہ لاکھ طلبا، سالانہ داخلہ لیتے ہیں۔ ہائی سکول کی تعلیم قوم کے سب لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے لازمی ہے۔ ۱۹۱۰ء میں صرف پندرہ فی صد بچے ہائی سکولوں میں جاتے تھے۔ آج چودہ سے سترہ سال کی عمر تک نوّے فی صد بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے باسٹھ فی صد کے قریب ہائی سکول سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہیں۔ پرائمری سکول میں عام طور پر آٹھ سال کی تعلیم کا اہتمام ہے۔ اس کے بعد چار سال ہائی سکول میں گذارنے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ ہائی سکولوں کی تعداد چوبیس ہزار ہے۔ گذشتہ چند سال میں بہت سی ریاستوں میں جونیئر ہائی سکول قائم کیے گئے ہیں۔ بیالیس فی صد سکینڈری سکولوں میں دونوں جونیئر اور سینئر ہائی جماعتوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سالہ ہائی سکول زیادہ مقبول ہو رہے ہیں اور ان کی تعداد خاصی سُرعت سے بڑھتی جا رہی ہے۔

گورنمنٹ اور پبلک ہائی سکولوں کے علاوہ چار ہزار کے قریب مذہبی اداروں کے تحت ہائی سکول کام کر رہے ہیں جن میں تقریباً پانچ لاکھ کے قریب طلبا زیرِ تعلیم ہیں۔ ان سکولوں میں تعلیم کا معیار وہی ہے جو عام پبلک سکولوں میں ہے۔ تقریباً بیس پچیس سال قبل ایک ہی قسم کے ہائی سکول قائم تھے۔ جو قوم کے سب بچوں کو کالج اور یونیورسٹی تعلیم کے لیے تیار کرتے تھے۔ تنوع کا نام نہ تھا۔ لیکن آج حالات بالکل برعکس ہیں۔ قوم کے نونہالوں کو مختلف النوع شعبہ جات زندگی کے لیے تیار کرنے کی خاطر ان کی ضرورتوں کے مطابق مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ انفرادی رجحانات اور دلچسپیوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں سکول انھیں قدیم راہوں پر گامزن ہیں جن پر انھیں تقریباً پچاس سال قبل لگایا گیا تھا۔ سب بچوں کو ایک ہی قسم کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ اور سارے

دست کاری کے کورس ہائی سکولوں میں شروع کئے گئے ہیں. ممکن ہے تھوڑے عرصے میں ہم بھی ترقی یافتہ ممالک سے سبق سیکھ کر تعلیمی اداروں میں بنیادی تبدیلیاں کرنے کے لیے قدم اٹھائیں. ریاست ہائے متحدہ کی درس گاہیں ہمارے لیے مثالی ہیں. انھی خطوط پر ہمیں اپنے ہائی سکولوں کو ڈھالنا چاہیئے. ابتدا تو ہو چکی ہے. لیکن اس شعبہ میں بڑی سرعت سے ترقی کی ضرورت ہے.

پرائمری سکولوں میں بنیادی تعلیم تقریباً سب بچوں کے لیے یکساں ہے. مادری زبان، ریاضی اور معاشرتی علوم کے مبادیات سے بچوں کو روشناس کرایا جاتا ہے. جونیئر ہائی کے اواخر میں اور سینئر ہائی کے اوائل میں انھیں مضامین کے انتخاب کا موقع دیا جاتا ہے. تاکہ وہ اپنے میلانِ طبع کے مطابق ان مضامین کا انتخاب کریں جو آئندہ زندگی میں عملی طور پر مفید ثابت ہوں گے. ہائی سکول کے ابتدائی سالوں میں بچوں کو انگریزی، سوشل سائنس، ریاضی، عملی سائنس اور صحت جسمانی جیسے لازمی مضامین پڑھائے جاتے ہیں. اس کے علاوہ طالب علم فنی تربیت بھی حاصل کر سکتا ہے اور غیر ملکی زبانیں بھی سیکھ سکتا ہے. ہائی سکول کے آخری دو سال میں انتخاب کا بہت موقع دیا جاتا ہے. لڑکوں کو سائنس اور ریاضی کے اضافی مضامین پڑھنے کی اجازت ہوتی ہے. وہ ابتدائی زراعت، ابتدائی طب، آہن گری اور ٹیلی وژن وغیرہ مضامین لے سکتا ہے. لڑکیاں موسیقی، نرسنگ، مصوری، ٹائپ رائٹنگ، فیشن ڈیزائن اور دیگر گھریلو صنعتوں میں خاص مہارت حاصل کرتی ہیں.

سکول کے کام کے علاوہ ہر طالب علم کو عملی زندگی کے مشاغل کے لیے تیار کیا جاتا ہے. جو بچے کھیلوں میں دلچسپی رکھتے ہیں، انھیں فٹ بال، ہاکی، تیراکی، ٹینس، باسکٹ بال اور بیس بال وغیرہ میں تربیت دی جاتی ہے. انھیں ڈراموں اور موسیقی کے پروگراموں میں شرکت کی اجازت ہوتی ہے. اکثر سکولوں میں ان مشاغل کی تربیت کے لیے سکول کے اوقات کے بعد اہتمام کیا جاتا ہے. لیکن بسا اوقات انہیں سکول کے وقت میں ہی ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے. یہ احساس شدت سے بڑھتا جا رہا ہے کہ بچوں کو سماجی زندگی کے لیے مؤثر طور پر تربیت دی جائے. اور ذہنی تربیت کے ساتھ جسمانی قوی کی تربیت کا بھی پہلو بہ پہلو اہتمام کیا جائے. بڑے ہائی سکولوں میں جمہوری نظامِ حیات کے لیے خصوصی تربیت کا انتظام کیا جاتا ہے.

طلباء خود ایک سکول کونسل کے اراکین کا انتخاب کرتے ہیں جو سکول پالیسی اور نظم و ضبط کے بہت سے اہم معاملوں کا خود فیصلہ کرتے ہیں پرنسپل اور دیگر اساتذہ محض نگران کی حیثیت سے اُن مجالس میں شریک ہوتے ہیں۔ طلباء کو ووٹ کا صحیح استعمال سکھایا جاتا ہے۔ طلباء سکول کے ڈسپلن بورڈ کے ممبروں کا خود انتخاب کرتے ہیں بعض اوقات اِن مناصب کے لیے طلباء میں سنجیدہ قسم کا مقابلہ ہوتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم :۔ ریاست ہائے متحدہ کے دو ہزار اعلیٰ تعلیمی اداروں میں چھتیس لاکھ طلباء زیرِ تعلیم ہیں۔ پندرہ سو اداروں میں مخلوط طریقۂ تعلیم مروج ہے جونیئر کالجوں کی تعداد پانچ سو بارہ ہے۔ یہ ادارے اپنی نوعیت کے نئی ڈھب کے ادارے ہیں۔ ان میں صنعتی، تکنیکی اور لسانیاتی وغیرہ مختلف اقسام کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں حقیقت میں انھیں بالغوں کے تعلیمی مراکز کہنا چاہیئے۔ ہر شخص اپنے مخصوص شعبۂ زندگی میں ان اداروں سے تعلیمی استفادہ کر سکتا ہے۔ ان میں لائبریری کی سہولتیں نہایت اعلیٰ پیمانہ پر فراہم کی گئی ہیں۔

لبرل آرٹ کالجوں کی تعداد ۷۵۶ ہے۔ اعلیٰ تعلیم صرف چند خوش قسمت لوگوں کے لیے مخصوص نہیں، ہر ہائی سکول کا گریجوایٹ اعلیٰ تعلیم کے مواقع سے مستفید ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ اپنے انتخاب کردہ شعبہ میں قابلیت رکھتا ہو۔ آج تقریباً چالیس فی صد کے قریب ہائی سکولوں کے فارغ التحصیل افراد سارے وقت کے لیے اعلیٰ تعلیم کی غرض سے کالجوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ صرف ۹ فیصد جز وقتی طور پر داخل ہوتے ہیں اور باقی وقت میں مختلف کام کرتے ہیں، تاکہ خود کفیل ہو سکیں۔ ریاستوں کے گورنمنٹ کالجوں میں ریاستی باشندوں سے کم فیس لی جاتی ہے، جبکہ دوسری ریاستوں کے طلباء کو زیادہ فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ حاجت مند طلباء کو مالی امداد فراہم کرنے کے لیے بہت سے ادارے قائم ہیں۔ بعض حالتوں میں طلباء کو وظائف دیئے جاتے ہیں۔ لیکن جو طالب علم اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اترتے ان کے لیے قرض حسنہ کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے ۱۹۵۸ء میں تحفظِ تعلیم کا قانون پاس کیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی صاحبِ استعداد امریکی باشندہ مالی مشکلات کی وجہ سے زیورِ تعلیم سے محروم نہ رہنے پائے۔ ریاضی سائنس اور غیر ملکی زبانوں کی ترویج کی طرف خاص توجہ دی جائے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں

طلبا پانچ ہزار ڈالر کے قریب قرضہ لے سکتے ہیں جو انھیں دس سال میں ادا کرنے ہوتے ہیں۔ یہ رقم تعلیم سے فارغ ہونے کے ایک سال بعد واجب الادا ہوتی ہے ۱۹۵۹ء میں جب کہ اس ایکٹ کو پاس ہوئے صرف ایک سال ہی ہوا تھا۔ ۱۳۷۰ کالجوں اور یونیورسٹیوں نے اس پروگرام میں حصہ لیا۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے کئی قسم کے ادارے قائم ہیں۔ مثلاً آرٹس کالج۔ جونیئر کالج انجینئرنگ اور ٹیکنیکل سکول، ٹیچرز ٹریننگ کالج اور متفرق فنی ادارے۔ آرٹس کالج امریکی یونیورسٹی تعلیم کا مرکزی نقطہ ہے، جہاں سائنس یا آرٹس میں چار سال تعلیم دی جاتی ہے۔ جس کے بعد انھیں ایم۔ ایس یا ایم اے کی ڈگری دی جاتی ہے۔ بہت سے طالب علم آرٹس کالجوں میں ہی تعلیم مکمل کر لیتے ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر خصوصی اعلیٰ تربیت کے لیے سپیشل اداروں میں خاص تربیت حاصل کرتے ہیں۔ انجینئر کے لیے پانچ سالہ تربیتی کورس لازم ہے جس کے بعد سول۔ مکینیکل۔ الیکٹریکل۔ فضائیہ وغیرہ کی ڈگری دی جاتی ہے۔ ہوائی جہاز یا بحری جہاز بنانا۔ خلاپیمائی۔ اسلحہ سازی۔ الیکٹرانک یا نیوکلیر کے متعلق خاص تربیتی کورسوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ وہ نوجوان مرد یا عورتیں جو طب کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، آرٹس کالجوں میں تین چار سال ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اس کے بعد چار سال تک میڈیکل سکولوں میں زیرتعلیم رہتے ہیں۔ ایک سال ہسپتال میں شاگردی کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ باقاعدہ تربیت یافتہ ڈاکٹر تسلیم کر لیے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طلبا اپنے وقت کا کچھ حصہ کام میں صرف کر کے خاصی رقم کما لیتے ہیں جو فیسوں وغیرہ کی ادائے گی کے لیے کافی ہوتی ہے وہ گرمی کی چھٹیوں میں کام کر کے کافی رقم جمع کر لیتے ہیں جو دوران سال میں خرچ کرتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کی طرح والدین کی خون پسینہ ایک کر کے کمائی ہوئی رقم ضائع نہیں کرتے۔ اپنی کمائی ہوئی دولت خرچ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ باغبانی برتن صاف کرنا اور متفرق قسم کے معمولی کام کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ کالجوں میں اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کے لیے طلبا کو خاصی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ کالج کی تعلیم سے کماحقہ مستفید ہونے کے لیے بہت سے کھیلوں اور دیگر مشاغل میں شریک ہونا پڑتا ہے۔

ہائی سکولوں کے اعلیٰ درجے میں کامیاب ہونے والے طلبا کو بہت سے وظائف دیئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۴۱۵ یونیورسٹی جو ملک کی بڑی دانش گاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ حاجت مند طلبا کے لیے

ہزاروں وظائف کا سالانہ اہتمام کرتی ہے ۵ ؛ ۷ ۵ ریاست کے باشندوں سے فیس وصول نہیں کی جاتی لیک
طلبا کے لیے لازم ہے کہ لیبارٹری اور دیگر متفرق اخراجات کے لیے خود کفیل ہوں ۵ ۱ ۷ ۵ یونیورسٹی و
مغرب کے زرعی علاقہ کی ایک عمدہ یونیورسٹی ہے جو اُنیس کالجوں پر مشتمل ہے جن میں آرٹس، سائنس،
قانون، طب، زراعت، تجارت، دندان سازی، تربیتِ معلمی، ویٹرنری سائنس، فنِ تعمیر، صحافت، گھریلو
دستکاریاں، فنونِ لطیفہ، عملی فنون، امراضِ چشم کی خصوصی تربیت، موسیقی، اور نرسنگ وغیرہ شامل ہیں
یونیورسٹی (۲۵۵۵) ایکڑ رقبہ میں واقع ہے ۴۱۷ ایکڑ زمین پر یونیورسٹی عمارات اور ۱۵۰۰ ایکڑ پر تج
فارم واقع ہیں۔ یونیورسٹی لائبریری میں ½ ۱۱ لاکھ کتب ہیں۔ یہاں بہت سے طلبا اور معلمین ریسرچ کر
کرتے ہیں۔ ڈگری حاصل کرنے کے لیے چند لازمی مضامین لینا ضروری ہیں۔ لیکن طالب علم ایسے مضا
انتخاب کرنے کے لیے مختارِ مطلق ہے۔ جو اس کے مستقبل کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہوں۔ اس کے ا
کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سینکڑوں مضامین میں سے ہر طالب علم اپنی ضرورت اور دلچسپی کے م
چند مضامین چن لیتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں بھی جمہوری طرزِ زندگی کی (ہائی سکولوں سے بہت زیاد
تربیت دی جاتی ہے۔ طلبا بالعموم آزاد ہیں اور انھیں ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا اُ
ذاتی ذمہ داری ہے۔

ریاست ہائے متحدہ میں اعلیٰ تعلیمی ادارے ۶۰-۱۹۵۹

(۱) یونیورسٹیاں	(تعداد)	۱۴۱	تعداد طلبا	۴۴ر۸۶۰
(۲) آرٹس کالج	"	۷۵۶	"	۵ر۷۴۰
(۳) ٹریننگ کالج	"	۱۹۸	"	۱۱ر۷۴۰
(۴) فنی ادارے (ڈگری دینے والے)		۵۱	"	ر۴۲۹۰
(۵) مذہبی تعلیم کے ادارے		۱۷۳	"	۱۷۲۲
(۶) مصوری		۴۶	"	۵۳۷۷
(۷) متفرق پیشہ ورانہ سکول		۷۵۰	"	۱۰۷۳
(۸) جونیئر کالج		۵۱۲	"	۲۹۵

خصوصی تربیت :- آرٹس کالج اور یونیورسٹیوں کے فنی ادارے اعلیٰ تعلیم کے خاص مراکز کی حیثیت رکھ ہیں۔ اگرچہ اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کے سب لوگ قائل ہیں۔ لیکن بہت سے لڑکے اور لڑکیاں ہائی سکو سے فراغت کے فوراً بعد فنی تربیتی اداروں میں داخلہ لے لیتے ہیں جو متعدد مرکزی مقامات پر واقع ہیں طب اور قانون وغیرہ کے اعلیٰ پیشوں کے لیے آرٹس کالجوں کی تعلیم لازمی ہے۔ لڑکیاں ہائی سکول ر فراغت کے بعد یا تو آرٹس کالجوں میں داخلہ لیتی ہیں یا معلمی کی تربیت کا آغاز کرتی ہیں اور ٹریننگ کالج میں داخل ہو جاتی ہیں۔ یہی حال موسیقی، صحافت، زراعت تجارت وغیرہ کے شعبہ جات کا ہے۔ اگ ان اداروں میں زیادہ زور عملی تربیت پر ہے تاہم سوشل سائنس اور عملی سائنس کو نظر انداز نہیں کیا مثال کے طور پر ایک M I T کے طالب علم کے لیے انگریزی ادب۔ فنونِ لطیفہ یا غیر ملکی زبانوں میں۔ ایک کا سیکھنا اشد ضروری ہے۔ ڈاکٹر کارل کامٹن نے اِس ادارہ کے ہال پر یہ لکھوایا ہے۔ "یہ ادا زندگی اور رفو ندگی کے مشاغل کے لیے تربیت گاہ ہے۔ اس کا خصوصی مطمع نظر طلبا میں اعلیٰ کردار ذہنیت اور تیز فہمی پیدا کرنا ہے۔"

اِس وقت ملک بھر میں پانچ ہزار سے زائد ادارے مردوں اور عورتوں کو اکاؤنٹ کیپنگ اور کلرکی وغیرہ کی تربیت دیتے ہیں تاکہ کاروبار زندگی کے لیے مؤثر طور پر تیار ہو سکیں۔ ز لائبریریوں میں کام کرنے والوں، سوشل کارکنوں، ریڈیو کے ماہروں اور درجنوں دیگر پیشہ و کے لیے اعلیٰ تعلیم کے لامحدود مواقع موجود ہیں۔

تعلیم بالغاں :- یہ عقیدہ کہ سلسلہ تعلیم زندگی بھر جاری وساری رہنا چاہیئے، امریکہ میں مقبول ع ہے۔ اور سرسری اندازہ کے مطابق ۳۰ سے ۳۵ ملین بالغ شہری ہر سال مزید تعلیم کے لیے داخل ہیں۔ ان میں سے تین چوتھائی سے زائد داخلہ لینے والے بیس سے لے کر ساٹھ سال کی عمر تک ہوتے ہیں۔ اکثریت کی عمر ۳۰ سے ۴۵ سال ہوتی ہے۔ مرد و زن تقریباً برابر تعداد میں شریک ہو روایت یہ ہے کہ ان پروگراموں میں حصّہ لینے والوں میں اچھے خاصے تعلیمیافتہ لوگوں کی تعداد لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے۔ اعلیٰ پیشوں کے لیے صاحب قابلیت اور اہل صلاحیت ا

تعداد مزدوروں اور کسانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جن پروگراموں میں لوگ کثرت سے شریک ہوتے ہیں وہ عام تعلیمی پروگرام۔ امور خانہ داری۔ تجارت وصنعت اور دیگر پیشہ ورانہ پروگرام ہیں۔ پبلک اور پرائیویٹ ادارے تبلیغی کلاسوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بذریعہ خط وکتابت بھی ہزاروں خواہش مند حضرات کو پیشہ ورانہ زندگی کے لیے اعلیٰ معلومات مہیا کی جاتی ہیں۔ تاکہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائیں۔ عام تعلیم اور تکنیکی معلومات، صنعتی اداروں میں کام یا اہتمام کرنے والوں کے لیے مہیا کی جاتی ہیں۔ امریکی پبلک سکول میں اس علاقہ یا بستی کے سبھی رہنے والے برابر کے حق دار سمجھے جاتے ہیں۔ ملک کے نووارد آباد کاروں کے لیے بڑے شہروں میں خاص انتظامات کئے جاتے ہیں۔ تاکہ انگریزی زبان سیکھ کر جلد ہی وہ شہری ذمہ داریوں سے باحسن الوجوہ عہدہ برا ہو سکیں۔ سابقہ چند برسوں میں عوام کی دلچسپی تعلیم بالغاں کے سلسلہ میں بہت بڑھ گئی ہے۔

تعلیمی اخراجات اور کنٹرول: ۔ ۱۹۵۹ء-۵۸ء میں ملک میں پبلک اور پرائیویٹ اداروں کا کل خرچ تقریباً ۲۲ ہزار ملین ڈالر تھا۔ ان میں سے ۱۴ ہزار ۴ سو ملین ڈالر پرائمری اور سیکنڈری تعلیم پر صرف ہوئے اس میں اساتذہ کی تنخواہیں۔ سکولوں میں روزمرہ استعمال کے سامان کی لاگت، عمارات کی تعمیر و مرمت اور سود کی ادائے گی جو سکولوں کی عمارات کی تعمیر کے لیے رقم ادھار لینے کی وجہ سے دینا پڑتا ہے شامل ہیں یہ خرچ اوسطاً ۴۵۷ ڈالر فی طالب علم ہے۔ مالی امداد کے تین ذرائع ہیں: -

۱ - مرکزی حکومت ۲ - ریاستی حکومت اور ۳ - پبلک۔ ان کے حصوں میں ۴ : ۴۰ : ۵۶ کی نسبت ہوتی ہے۔ پبلک سکول چلانے کے لیے چالیس ہزار کے قریب سکول ڈسٹرکٹ قائم ہیں۔ وہ ایک خاص تعلیمی ٹیکس لگاتے ہیں۔ جو عوام خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں اس کے علاوہ تعلیمی پروگراموں کو مناسب انتظام کرنے کے لیے ریاستی حکومتیں بھی تعلیمی ٹیکس وصول کرتی ہیں ۔ مرکزی حکومت کو ریاستوں کے تعلیمی معاملات میں چنداں دخل نہیں۔ پھر بھی مرکزی حکومت، ریاستی تعلیمی پروگراموں کے لیے زرکثیر صرف کرتی ہے۔ پچاس ریاستوں کو مرکزی گرانٹ ملتی ہے۔ مرکزی حکومت کالجوں کو زمین کے عطیہ کی صورت میں مدد دیتی ہے۔ زراعتی تجرباتی فارموں کے لیے فنی تعلیم کا اہتمام کرتی ہے سکولوں کو

عمارات کی تعمیر و توسیع کے سلسلہ میں معاونت کرتی ہے اور مرکزی زیر اثر علاقہ کے اداروں کے اخراجات یا فوجی سپاہیوں کے بچوں کے متفرق اخراجات بھی مرکزی حکومت ہی برداشت کرتی ہے۔

مرکزی تعلیمی محکمہ : عوام کو تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے مرکزی تعلیمی محکمہ قائم ہے۔ مرکزی حکومت کی جانب سے سب شعبوں کے لیے ماہرین کا تقرر عمل میں آتا ہے۔ جو اپنے متعلقہ شعبوں میں بوقت ضرورت رہنمائی کرتے ہیں۔ سب ریاستیں اپنے تعلیمی معاملات میں مکمل طور پر خود مختار ہیں۔ سب اختیارات سکول کو تفویض کر دیئے جاتے ہیں۔ جو اپنے حلقہ کی پرائمری اور سکینڈری تعلیم میں سیاہ وسفید کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ پرائیویٹ اداروں کے اندرونی معاملات میں حکومت بالعموم دخل اندازی نہیں کرتی۔ سکولز اور کالجوں کے پروگرام میں مرکزی یا ریاستی حکومت کے دباؤ کے تحت یگانگت عمل میں نہیں آتی۔ بلکہ یہ ادارے از خود ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ تمام کی تمام ۵۰ ریاستوں میں پرائیویٹ اداروں کے لیے لازم ہے کہ وہ صحت و صفائی اور تعلیمی لحاظ سے ایک معقول معیار پر پورے اتریں۔ وہ اساتذہ کے تقرر اور مضامین کے انتخاب میں پورا اختیار رکھتے ہیں بارہ ریاستیں مذہبی پرائیویٹ اداروں کی مالی امداد بھی کرتی ہیں۔ لیکن اڑتیس (۳۸) ریاستیں اس امداد کے سخت خلاف ہیں۔ ان اداروں کی آمدنی پر کوئی ٹیکس عائد نہیں ہوتا۔ ماسوا اُن اداروں کے جو محض جلب منفعت کے لیے کھل گئے ہیں۔

امریکہ کے شہری اور امریکی مدرسے : ایک عام امریکی شہری اپنے آپ کو اپنے حلقہ کے سکول کے بہت قریب سمجھتا ہے۔ اسے سکول کی ضروریات اور مسائل سے گہری دلچسپی ہوتی ہے۔ پبلک سکولوں کا نظام بالعموم جمہوری خطوط پر ہوتا ہے۔ سکول ڈسٹرکٹ کے ممبروں کا انتخاب اس علاقہ کے لوگ خود کرتے ہیں۔ جو عوام کے سامنے سکول کے معیار تعلیم کو بلند رکھنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جب کبھی سکول کی نئی عمارت بنانے کے لیے نیا ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ مقامی آبادی کا استصواب رائے ہوتا ہے۔ اگر اکثریت نئے ٹیکس کے حق میں ووٹ دے تو وہ ٹیکس عائد کر دیا جاتا ہے۔ حال ہی میں امریکی تعلیمی دنیا میں ایک نئی بات پیدا ہوئی ہے جو روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ وہ اساتذہ اور والدین کی باہمی ایسوسی ایشن ہے جو سکول کے افسران کے ساتھ مل کر سکول کے تعلیمی معیار کی بلندی اور زیر تربیت بچوں کے تفریحی مشاغل کا بندوبست کرتی ہے

والدین اور اساتذہ کے اس باہمی ارتباط سے بچوں کے والدین سکول سے وابستہ رہتے ہیں اور اساتذہ کے ساتھ اپنے بچوں کی تعلیمی حالت کے سلسلہ میں تبادلۂ خیالات کرتے رہتے ہیں۔

نسلی امتیاز کا استیصال: مئی ۱۹۵۴ء میں ۷ ریاستوں کے علاوہ کولمبیا کے سکول ڈسٹرکٹ کے سکولوں میں بھی نسلی امتیاز روا رکھا جاتا تھا۔ لیکن ان آٹھ سال میں دنیا بدل گئی ہے۔ تقریباً تمام ریاستوں میں نسلی امتیاز کا قلع قمع کرنے کے لیے موثر اقدام کئے جا چکے ہیں۔ امید واثق ہے کہ بہت جلد اس کلنک کے ٹیکے کو دھو دیا جائے گا۔

امریکی تعلیم میں نئے زاویے: (۱) امریکہ کا نظام تعلیم اس بدلے ہوئے ماحول کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ جو ابھی چند سال گذرے ایک خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ ہوائی سروس تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ دنیا کے ممالک اس نئی دنیا کے بہت قریب آ گئے ہیں۔ لہٰذا امریکی عوام میں دوسرے ممالک کی زبانیں سیکھنے کا شوق بڑھتا جا رہا ہے۔

۲۔ ٹیلی ویژن، فلم اور تفریحی سفر کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی طرف عوام کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

۳۔ سیاسی، ثقافتی اور تکنیکی ارتقاء کے پیش نظر نصاب تعلیم میں تغیر و تبدل بسرعت جاری ہے۔ ریاضی سائنس اور غیر ملکی زبانوں کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔

۴۔ بہتر تعلیمی سامان فراہم کرنے اور بہتر تدریسی طریقوں کی ترویج کے لیے کوشش کی جا رہی ہے۔

۵۔ طلباء کو زندگی کی مناسب راہوں پر لگانے کے لیے رہنمائی کے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔

۶۔ ذہین طلباء کی تعلیم کے لیے ذرائع بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ تاکہ عام بچوں کے ساتھ مل کر ان کی اعلیٰ صلاحیتیں ختم نہ ہونے پائیں۔

۷۔ ہر شعبہ میں بچوں کی تخلیقی قوتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔

۸۔ امریکی بچوں کو بیرونی دنیا کے لوگوں کی تہذیب و ثقافت سے روشناس کرانے کی کوششیں روبعمل ہیں۔

۹۔ سکول اور عوام میں گہرا رشتہ قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

۱۰۔ سکول کی ترقی اور کامیابی پر متعلقہ علاقے کے لوگ فخر محسوس کرتے ہیں ×

تعلیمی دست کاری
کا
مدرسے کے مضامین سے تعلق

ممتاز احمد پروفیسر سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور

تعلیمی دستکاری مدرسے کے دوسرے مضامین سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ دوسرے مضامین کا بہت حد تک دستکاری پر انحصار ہے۔ ہر سبق میں کسی لفظ، جملہ یا عنوان کی تشریح و توضیح کرنے کے لیے خواہ آپ کتنے ہی تشریحی جملے تحریر کریں مگر ان سے جامع طور پر ترجمانی نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ اس کی تصویر کشی نہ کی جائے۔ بجائے ایک طویل بحث کے چند آڑی ترچھی لکیروں سے زیادہ وضاحت ہو سکتی ہے۔ ایڈگرڈیل (EDGARDALE) نے لکھا ہے کہ تحریری علامات کے مقابلہ میں تصویر کشی کہیں زیادہ تعلیمی افادیت کی حامل ہے تصویر کشی، ماڈل اور نمونہ جات انسان کے خیالات اور جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں۔ سائنس اور جغرافیہ کا بہت حد تک چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مثلاً ایک ہی سبق میں کہر، برف، بادل، جغرافیہ کے مضمون میں پڑھایا جاتا ہے اور یہی عنوانات سائنس کے مضمون میں بھی شامل ہیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سائنس اور جغرافیہ کا آپس میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ سائنس اور حساب کا بھی آپس میں قریبی تعلق ہے۔ کیوں کہ سائنس میں اوزان کا استعمال ہوتا ہے جس کا حساب سے بہت زیادہ تعلق ہے۔ سائنس پڑھانے کے لیے مختلف تجربات کرنے اور چارٹ اور نقشہ جات بنانے پڑتے ہیں۔ تختہ سیاہ پر مختلف اشکال کھینچنا پڑتی ہیں تاکہ طلباء کو وضاحت سے ذہن نشین کرایا جا سکے۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تصویر کشی کا دوسرے مضامین سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ علم الابدان اور علم الصحت کے لیے دل کا چارٹ یا دل کا ماڈل، دورانِ خون کا نظام۔ آنکھ، کان، ناک، ہاتھ، پاؤں کے ماڈل مٹی سے تیار کئے جاتے ہیں۔ تاکہ بچوں کو اصل چیز کے متعلق وضاحت سے سمجھایا جا سکے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو اساتذہ پڑھاتے وقت ماڈل یا چارٹ کو استعمال

میں لاتے ہیں۔ ان کی جماعتوں کے طلبا سبق کو آسانی سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس جو اساتذہ صرف زبانی تدریس پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ ان کے شاگرد ٹھوٹا کر۔ وہ ہی رہتے ہیں کیوں کہ طلبا وہ سبق اچھی طرح ذہن نشین نہیں کر سکتے۔ اور کئی ایک خامیاں رہ جانے کی وجہ سے طلبا کی صحیح ذہنی نشو و نما نہیں ہو پاتی۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ استاد پوری تیاری اور ضروری سامان کے ساتھ سبق پڑھائے اور اس کے لیے تعلیمی دست کاری کی اشد ضرورت ہے۔ جن اساتذہ کو تعلیمی دست کاری سے ذرا بھی دلچسپی ہو وہ اپنے سبق کو بہت حد تک دل چسپ بنا سکتے ہیں اور اسی دل چسپی کے سبب وہ مدرس کامیاب کہلا سکتے ہیں۔ تختہ سیاہ پر چند آڑی ترچھی لکیروں کا بچوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ صنعت وحرفت کا مدرسے کے دوسرے مضامین سے گہرا تعلق ہے۔

جغرافیہ کے مضمون کو لیجیے کہ اس میں قدم قدم پر نقشہ جات، تصاویر اور ماڈل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مثلاً پنجاب کی نہریں۔ لکڑی کے تختہ پر کھود کر نقشہ تیار کرنا۔ ٹین کو موڑ کر نہروں کا سلسلہ دکھانا اور نہروں سے مختلف مقامات کی آبپاشی دکھانا۔ آبپاشی کے دیگر وسائل دکھانے کے لیے مختلف ماڈل تیار کرنا، اس طرح سبق نہایت دل چسپ بنایا جا سکتا ہے۔

تدریس تاریخ کے سلسلے میں یہ کہنا درست ہوگا کہ پرانے زمانے کے سکّے، لباس، برتنوں کے نمونے قطب مینار، روضۂ تاج محل اور شاہان سلف کی تصاویر تیار کر کے دکھانا اور ان کے ذریعے سے سبق پڑھانا، بچوں کے دلوں پر خاطر خواہ اثر مرتب کرتا ہے۔ بعض اساتذہ تاریخ پڑھانے کے لیے مختلف سامان جمع کر کے تاریخ پڑھانے کے کمرے کو نہایت محنت سے سجاتے ہیں اور پرانے زمانے کے سامان کو سینت سینت کر رکھتے ہیں اور مختلف تصاویر کے ذریعے سبق کو دل چسپ بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ اور جغرافیے کی مؤثر تدریس میں ماڈل اور پرانے زمانے کے سامان کو بہت حد تک دخل حاصل ہے۔

حساب کو اگرچہ ایک خشک مضمون سمجھا جاتا ہے۔ مگر دست کاری کی مدد نے یہ خیال بھی غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ کیوں کہ حساب، الجبرا اور جیومیٹری کے مختلف مسائل ماڈل اور اشکال کے ذریعے

بآسانی ذہن نشین کرائے جا سکتے ہیں۔ تختۂ سیاہ پر جیومیٹری کی مختلف اشکال کاٹ کر لگانے سے جس قدر آسانی سے سمجھایا جا سکتا ہے وہ زبانی پڑھانے سے ناممکن ہے۔ اس سے تعلیمی دست کاری کی افادیت کا افادی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً ہر تکون کے تینوں زاویوں کا مجموعہ دو قائمہ زاویوں کے برابر ہے اس حقیقت کی تفہیم کے لیے ایک تختے پر لکڑی کی ایک تکون کاٹ کر لگا دی جائے تو وضاحت سے تکون اور تکون کے زاویوں کے مجموعے کا حل بتایا جا سکتا ہے۔ اردو اور انگریزی کے اشعار اور مختلف عنوانات کی تشریح میں بھی تصاویر اور ماڈل بہت مدد دیتے ہیں۔ بالخصوص ابتدائی جماعتوں میں تو بچوں کے ذہنوں پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ جو اساتذہ نظم پڑھاتے وقت اشعار کی تشریح بذریعہ تصاویر کرتے ہیں وہ اپنے سبق کو یقیناً نہایت کامیاب بنا لیتے ہیں۔ کیوں کہ کوئی مفہوم لفظوں کے بجائے تصاویر کے ذریعے سے بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ غالب کے اشعار کی بذریعہ تصاویر زیادہ وضاحت سے تشریح ہو سکتی ہے۔ زبان و بیان سے بھی صنعت و حرفت کا کچھ کم تعلق نہیں ہے۔

دراصل ہر مضمون کا صنعت و حرفت سے گہرا رابطہ ہے۔ اس لیے ہر مضمون کے معلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے مضمون سے متعلق درس دیتے وقت ابتدائی مدارج میں طلباء کے لیے ایسی تنقیص تجویز کرے جن کے لیے تعلیمی دست کاری کے ذریعہ ماڈل وغیرہ تیار ہو سکیں۔ یعنی ان ماڈلوں کا سبق سے تعلق ہو۔ سبق پڑھا چکنے کے بعد بچوں کے وقت نامہ میں ایک ایسا گھنٹہ ہونا چاہیے جس میں بچے آموختہ سے متعلق کوئی ماڈل نقشہ یا چارٹ تیار کریں۔

اس لحاظ سے صنعت و حرفت کے استاد کے ساتھ دوسرے مضامین کے اساتذہ خود بھی اس میں دل چسپی رکھتے ہیں اور وہ خود بھی بچوں کی مدد سے ماڈل اور چارٹ وغیرہ تیار کرتے رہتے ہیں۔ یہ ایک نہایت ہی ہمت افزا عمل ہے۔

مختلف قسم کے پراجیکٹ کی تیاری کے لیے ہر جماعت کو چند گروپوں میں اس طرح تقسیم کر دینا چاہیے کہ ہر گروپ کے سپرد ایک پروجیکٹ کر دیا جائے۔ اور استاد کا فرض ہے کہ وہ اس پروجیکٹ کی پوری اسکیم طلباء سے تیار کرائے۔ استاد بطور نگراں کام کرے۔ جہاں کہیں طلبا غلطی کریں وہاں ان کی مدد کرے اور

ان کی اصلاح کرتا جائے۔

اگر ہم بنظر غائر دیکھیں تو تاریخ۔ جغرافیہ۔ حساب۔ سائنس اور زبان دانی غرضیکہ مدرسہ کے ہر مضمون کا تعلق تعلیمی دستکاری سے ضرور وابستہ ہے۔

اگر استاد ان ہدایات پر عمل کرے تو وہ اپنے مضمون کو طلبہ کے لیے کافی دلچسپ اور عملی بنا سکتا ہے اور ان کے لیے ایک نہایت خوشگوار ماحول پیدا کر سکتا ہے۔ شروع شروع میں اسے ضرور دقت ہو گی مگر بعد ازاں یہ طریقہ ایک بہترین ذریعۂ تدریس ثابت ہو گا۔ نیز اس میں بڑے زبردست نفسیاتی راز بھی مضمر ہیں۔ جن سے مختلف بچوں کی ذہانت اور ان کے مختلف النوع رجحانات کا پتہ چل سکتا ہے اور ہم بتا سکتے ہیں کہ کونسا بچہ آئندہ زندگی میں کون سے شعبے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ تاکہ اس بچے کو اس مخصوص شعبے میں دلچسپی لینے کے ذرائع بہم پہنچائے جائیں۔ لبا اوقات بچوں کی صحیح راہ نمائی نہ ہونے کی وجہ سے بچے غلط پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر بچوں کو ان کے ذوق اور طبعی میلان کے مطابق تعلیم دی جائے تو وہ یقیناً اپنی آئندہ زندگی میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکیں گے اور یہ کام دست کاری کے ذریعہ سے نہایت آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔

صنعت و حرفت کے ذریعے سے معمولی قسم سے لے کر اعلیٰ قسم کے ماڈل تیار کئے جا سکتے ہیں۔ اور اس تشریحی طریقے سے بچوں کو نہایت آسانی سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتابوں میں بھی تصاویر دی جاتی ہیں جو چھوٹے بچوں کے لیے بالخصوص نہایت ہی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ مگر ایک سبق کی دلچسپی کا دارو مدار زیادہ تر استاد پر ہی ہوتا ہے۔ اگر استاد اپنی ذمہ داری محسوس کرے تو وہ یقیناً ہر سبق کو دلچسپ بنا لے گا۔ یاد رہے کہ اگر ایک استاد کسی سبق یا مضمون میں دلچسپی نہیں لیتا تو وہ اپنے شاگردوں میں بھی اس مضمون کے متعلق دلچسپی پیدا نہیں کر سکتا۔

تعلیمی دست کاری سے بچوں کے جسم کی بھی خاصی تربیت ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بچوں کو ٹیکنیکل تعلیم دی جائے۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ بچوں کو صنعت و حرفت کے ذریعے تعلیم دی جائے جن مضامین کو بچے بخوبی نہ سمجھ سکیں، ان مضامین کو تعلیمی دست کاری کے ذریعہ سمجھایا جائے۔

تصاویر سے بچوں کو فطری طور پر لگاؤ ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تصاویر کے ذریعہ بچوں کے اسباق میں کافی دلچسپی پیدا کی جاسکتی ہے۔ اور اس طریقہ سے بچے کی آنکھ ہاتھ اور قوت حافظہ کی بڑی کامیاب تربیت ہوسکتی ہے۔

الغرض استاد کو ایسی مشقیں تجویز کرنی چاہئیں جو بچوں کی عمر اور استعداد کے مطابق ہوں۔ نیز اس کے ساتھ ہی استاد کو ان کے ماحول کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے۔ اور اس معاملہ میں استاد کو بڑی ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ یعنی اسے اپنے اسباق کی تدریس میں اس قسم کا سامان استعمال کرنا چاہیئے جو اسے اپنے قرب وجوار میں آسانی سے مل سکے اور اس سامان کو حاصل کرنے کے لیے زیادہ صرف بھی نہ کرنا پڑے۔ اس لیے اس معاملہ میں استاد کو کافی احتیاط کی ضرورت ہے۔

کہانی پڑھانا

استاد کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو پڑھاتے وقت خود تختہ سیاہ پر رنگدار چاک سے خاکہ بنائے اور خاکہ کی تکمیل کے دوران میں سوال وجواب کے ذریعے اس کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتا جائے۔ ابتدائی جماعتوں میں صرف ضروری باتیں اور بڑی جماعتوں میں تفصیل بتانی چاہیئے۔ اعلان سبق کے لیے اچھی خاصی گنجائش پیدا ہو جائے گی۔ اس سے اگلا قدم یہ ہوگا کہ کچھ مجسمے تیار کئے جائیں جن سے نمونہ کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے۔ بچوں کو جھاڑیوں اور درختوں کے ماڈل تیار کرنے کے لیے کہا جائے۔ اس کے لیے گتے کے دو ٹکڑے لے کر انھیں اس طریقہ سے کھڑا کریں کہ زاویہ قائمہ بن جائے۔ پھر انھیں گوند وغیرہ سے وہیں چپکا دیں۔

گھاس تیار کرنے کے لیے کریپ پیپر یا پینٹنگ کا گہرا سبز رنگ کا کاغذ کاٹ کر گوند سے چپکا دیا جائے۔ اسکیمو کی کہانی کے لیے ایک تختہ پر روئی بچھا کر اس پر لکڑی یا گتے سے او نذار بنا کر سفید رنگ کر دیا جائے یا مٹی سے بنا کر ان پر سفید چاک لگا دیا جائے۔ سلیج اور دیگر سامان اسی طرح سے تیار ہوسکتا ہے۔ ایک الٹا پیالہ رکھ کر اس پر روئی چپکا دی جائے۔ اس سے اسکیمو کا گھر تیار ہو جائے گا چمڑے سے اسکیمو کا خیمہ تیار کر لینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے مختلف حصوں میں بسنے والوں کی

زندگی پرسبق پڑھانے کے لیے ان کے ماحول کے مطابق ماڈل تیار کیے جائیں۔ مدد دوں۔ جاپانیوں۔ ریڈانڈین اور حبشیوں وغیرہ کی کہانیاں چھوٹے بچوں کو پڑھاتے وقت ، بچوں کی مدد سے ماڈل تیار کرانے چاہئیں۔ یہ ایک قسم کے چھوٹے پیمانے پر منصوبہ بندی ہوگی۔ یہ منصوبہ بندی چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے لیے بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

کھیل اور دست کاری

ہم نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ کھیل اور کھلونا کیا چیز ہیں۔ ہمیشہ یاد رکھئے کہ ایسے ماڈل تیار کرنا جن میں کھیل کا عنصر نمایاں ہو، استاد اور شاگرد دونوں کے لیے دل چسپی کا باعث ہوتے ہیں تعلیمی ادارے میں کھیل اور ان کا ردو بدل طلبہ پر بہت اچھا اثر ڈالتے ہیں۔ تعلیمی دست کاری کے سلسلہ میں بچوں کی دل چسپی اور فطری لگاؤ کھیل کے ذریعہ بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچے آری سے لکڑی کے ٹکڑے کرنے کو بہت پسند کریں گے۔ اور بڑے بچے ان ٹکڑوں کو یکجا کرکے کوئی خاص شکل دینے میں بڑی خوشی محسوس کریں گے۔

جماعت کے اندر کپڑے کے ٹکڑوں یا دھاگوں سے گیند وغیرہ تیار کرنا اور لکڑی کے معمولی اور بے کار ٹکڑوں سے چھوٹی چھوٹی تختیاں، اور میزیں اور دوسری چیزیں بنانا بڑی دل چسپی کا موجب بنیں گے بچے عموماً ایسا ماڈل تیار کرنا پسند کرتے ہیں جو کھڑا ہو سکے۔ اور وہ ان سے مختلف قسم کے کھیل کھیل سکیں چھوٹے بچے فوجی سپاہیوں اور جانوروں کے ماڈل تیار کرنے میں زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

کنڈرگارٹن کے درجوں میں دست کاری کے مشاغل کا تعلق محض کھیل تک ہی محدود نہ ہو بلکہ مقصد بھی پیش نظر ہو۔ ابتدائی درجوں میں اسباق سادہ اور ترقی پذیر ہوں۔

تاریخ کے متعلق ماڈل

پہلے سبقوں میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ جغرافیہ اور دست کاری کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اب تاریخ اور دست کاری کے باہمی ربط و تعلق پر غور کریں۔ بچوں سے زمانہ قدیم کے کھیلوں کے متعلق معلومات فراہم کرائی جائیں۔ یہ معلومات تاریخ کی عام درسی کتب، اخبارات اور رسائل کی تصاویر سے بآسانی مل جائیں گی۔ نیا

عجائب گھر میں بچے ایسی چیز دیکھ سکیں گے اور خود بھی نمائش پیش کریں گے جو انھوں نے مختلف ذرائع سے حاصل کئے ہوں گے۔ انھیں اپنے کمرہ یا ایسے کمرہ میں جو اس کام کے لیے مخصوص ہو سنبھال کر رکھا جائے۔ شروع میں الفاظ کی بجائے تحقیق کی ایسی مشقوں سے ہی ابتدا کی جائے جو اکتسابی تعلیم کا بہترین ذریعہ ہوگا۔ پرانے زمانے کے بگتے ہتھیار، اوزار، مٹی، گتے اور لکڑی سے تیار کرائے جائیں۔ پرانے زمانے اور موجودہ زمانے کے ملبوسات تیار کرائے جائیں۔ یہ کام لڑکیوں کے لیے بڑی دل چسپی کا باعث ہوگا۔ اگر ڈرامہ کرنا ہو تو تمام سامان بچوں سے تیار کرایا جائے۔ متوسط اور اعلیٰ درجے کے بچوں کے لیے زیادہ مشکل کام ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ان کی تاریخی معلومات زیادہ وسیع ہوں گی۔

گھریلو کام کاج

مدرسے میں مختلف دست کاریوں کے سیکھنے کے بعد بچے گھر پر بھی اپنے بھائی بہنوں کو مختلف سامان بنانے میں مدد دے کر گھریلو کام کاج سے ربط و تعلق پیدا کر سکتے ہیں۔ گھریلو سامان یعنی ٹوٹی پھوٹی برساتی کے ٹکڑے پرانے کمبل اور دریوں سے تھیلے تیار کئے جا سکتے ہیں۔ لڑکیاں پرانے کپڑوں سے گڑیاں اور کھلونے تیار کر سکتی ہیں ٭

جمہوریت کی ابتدائی تربیت گاہیں

منظور احمد ٹیالوی متعلم بی ایڈ کلاس

انسان جس ہوش ربا سرعت کے ساتھ ترقی کے منازل طے کر رہا ہے جس پھرتی اور چابک دستی سے ستاروں پر ہی نہیں بلکہ سیاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے اور زمانۂ سلف کے خوابوں کو جس صورت سے دنیائے حقیقت میں لا رہا ہے۔ اس سے انسان کی ذہنی بیداری اور قوتِ تسخیر کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ وہ آج اپنا محاسبہ کرنے کے لیے آمادہ اور اپنے معاملات آپ سلجھانے کے لیے تیار نظر آ رہا ہے۔

"جان جائے مگر آن نہ جائے" کے مقولے کو جزو ایمان بنا کر انسان اپنے مطالبات و حقوق کے حصول و تحفظ کے لیے ہمہ تن کوشاں ہے۔ آزادی کو انسان کا پیدائشی حق منوانے کے لیے آمریت، موروثیت اور شہنشاہیت کے بتوں کو ریزہ ریزہ کیا جا رہا ہے۔ غلامی کے طوق اور محکومی کی زنجیریں ایک ایک کر کے کاٹی جا رہی ہیں۔

گذشتہ نصف صدی میں آزادی اور حریت کے لیے اسی انسانی تگ و دو کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں اور فضائے آزادی میں امیدوں سے بڑھ کر وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ غلام قومیں آزادی کی فضا میں جینے کا پورا پورا اختیار حاصل کر چکی ہیں۔ آمریت سسک رہی ہے..... شہنشاہیت تڑپ رہی ہے۔ سامراجیت بھٹک رہی ہے۔ اور موروثیت تو بالکل ہی دم توڑ چکی ہے جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ مساوات، اخوت اور رواداری و مروت کے پاکیزہ جذبات نشو و نما پا رہے ہیں۔

دنیا کے بیشتر ممالک میں جمہوری طرزِ حکومت کا تجربہ نہایت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اور ان ممالک کی تقلید میں ہر جگہ جمہوری طرزِ حکومت کے لیے راہ ہموار کی جا رہی ہے۔ غیر ترقی یافتہ قومیں بھی

جمہوریت کو اپنے لیے فلاح وبہبود کا منبع ووسیلہ سمجھ رہی ہیں۔ اگرچہ پسماندہ اقوام کی جہالت اور بے شعوری ان کی راہ میں رکاوٹ اور ان کے مفاد پرست راہنما ان کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے ہیں۔ ایسے ممالک میں جمہوریت غلط ہاتھوں میں مقید ہے جنھوں نے کبھی آمریت وشہنشاہیت کے روپ میں عوام کے خون سے ہاتھوں کی حنابندی کی تھی۔ جمہوریت کی شہ رگ آج انھی بدطینت لوگوں کی گرفت میں ہے جنھوں نے عوام کی سسکتی ہوئی نعشوں پر اپنے عشرت کدے تعمیر کئے تھے۔ جمہوریت کے نام پر مفاد پرستی، خودغرضی اور اقربا نوازی وکنبہ پروری کے جو افسوسناک مظاہرے دیکھنے میں آرہے ہیں، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ دور کیوں جائیے پاکستان کی گذشتہ دس سالہ تاریخ کا مطالعہ ہم کو بتاتا ہے کہ جمہوریت کے نام پر کیاکیا گل کھلائے گئے اور جمہوریت کو رسوا کرنے کے لیے کیسی کیسی شرمناک کوششیں کی گئیں۔ لیکن اس سے جمہوری طرزِ حکومت کی ناکامی ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ جمہوریت کے ان نام نہاد علمبرداروں اور ٹھیکیداروں کی نالائقی اور بدنیتی ظاہر ہوتی ہے۔ جو محض ہوس کے پتلے اور غرض کے بندے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر یہ بھی عرض کردوں تو نامناسب نہ ہوگا کہ اس کی ذمہ داری کافی حد تک عوام پر بھی عائد ہوتی ہے جو دراصل جمہوریت کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہیں۔ ضرورت اس چیز کی ہے کہ جس ملک میں بھی جمہوری طرزِ حکومت رائج کیا جائے۔ وہاں کے عوام کو جمہوریت کے مفہوم سے آگاہ کیا جائے۔ ان کو اپنے فرائض واختیارات سے روشناس کرادیا جائے۔ نیز ان کی حقیقی قدروقیمت کا بھی ان میں احساس پیدا کیا جائے۔ تب جاکر جمہوری طرزِ حکومت کی کامیابی کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ ورنہ یہی کامیابی ناکامی میں بھی تبدیل ہوسکتی ہے اور یہی فتح شکست کا روپ دھار سکتی ہے۔

عوام کی صحیح تربیت ہی کسی ملک کی ترقی وخوش حالی کا باعث بنتی ہے اور صحیح تربیت کے لیے انسانی زندگی کا بہترین اور موزوں ترین دور وہی ہے جبکہ وہ فطری طور پر اپنی ذہنی نشوونما کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور اس کا ذہن اس سفید کاغذ کی مانند ہوتا ہے، جس پر جو کچھ لکھ دیا جائے وہ انمٹ ثابت ہو اور جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ابتدائی دور انسان درسگاہوں میں گذارتا ہے فصحائے عرب نے کیا خوب کہا ہے کہ العلم فی الصغر کالنقش فی الحجر۔

جمہوری طرز حکومت اپنی جگہ بہترین طرز حکومت ہے۔ ہم اس کے گرانقدر ثمرات سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کو صحیح بنیادوں پر قائم کیا جائے اور مخلص قومی کارکنوں کی مساعیٔ جمیلہ اس میں کار فرما ہوں۔

ایک ایسی نمائندہ حکومت جو عوام کی منتخب کردہ ہو۔ جو عوام میں سے ہو اور عوام کے لیے کام کرتی ہو دراصل جمہوری طرز حکومت کہلاتی ہے۔ حکمران طبقہ کے انتخاب کا دارومدار عوام کی پسند کے تابع ہوتا ہے گویا جس ملک میں جمہوری طرز حکومت ہو۔ اس ملک کے عوام ہی حقیقتاً اس کی ترقی و تنزل، خوش حالی و بدحالی بہتری و ابتری اور بلندی و پستی کے مکمل طور پر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ بہت ہی ضروری ہے کہ عوام کو جمہوریت کے مفہوم سے اچھی طرح باخبر کیا جائے۔

میں سمجھتا ہوں، جمہوریت کی ابتدائی تربیت گاہیں ہمارے سکول اور کالج ہیں۔ جہاں تعلیم حاصل کرنے والے قوم کے نونہال بڑی آسانی سے درس جمہوریت عملی طور پر حاصل کر سکتے ہیں وہ کس طرح؟ آئیے اس پر غور کریں۔

جمہوری طرز حکومت میں سب سے اہم چیز جس کا عوام اور خواص میں مشترک ہونا ضروری ہے اپنے فرائض و اختیارات اور ذمہ داریوں کو نہ صرف سمجھنا بلکہ ان کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے سرانجام دینا ہے۔ یہ چیز بعینہٖ اسکولوں اور کالجوں میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ کیوں کہ ابتدا ہی سے اساتذہ کرام کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے اور طلبا کو اپنے فرائض کا۔

اساتذہ کو بھی درس دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں اور اپنی ذمہ داریوں سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہوں۔ ورنہ اس کے نتائج بہت خطرناک نکلیں گے طلباء کی کامیابی و ناکامی کا انحصار کافی حد تک اساتذہ کی محنت اور بہتر کارکردگی پر ہوتا ہے۔

اگر اساتذہ اپنے فرائض کو بطریق احسن انجام دیں اور اپنی ذمہ داریوں کو دیانت دارانہ طریق سے ادا کریں، تو طلباء کی ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ درس گاہ کی چار دیواری میں اساتذہ کی بالکل وہی حیثیت ہوتی ہے جو ملک کی حدود میں حکمران طبقہ کی .... ایک آزاد ملک کے برسر اقتدار طبقہ کو جتنے تفکرات درپیش ہوتے ہیں، اگرچہ ان کی نوعیت اور دائرہ عمل مختلف ہوتا ہے، لیکن نصب العین ایک ہی

ہوتا ہے۔ ادھر حکمران طبقہ کو ملک کے عوام کی فلاح و بہبود کا خیال دامن گیر رہتا ہے تو ادھر اساتذہ کو ہر وقت اپنے طلباء کی بھلائی و ترقی اور کامیابی و کامرانی کا خیال ان کے دل پر مسلط

کسی ملک کا حکمران طبقہ اگر اپنے فرائض و اختیارات اور ذمہ داریوں سے بے پروائی اور کوتاہی برتتا ہے تو ملک کی بدحالی و بربادی کی ذمہ داری تمام تر اسی پر عائد ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر اساتذہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں تغافل اور سستی سے کام لیں تو طلبہ کی ناکامی اور درس گاہ کی بدنامی کا سبب انہی کو سمجھا جائے گا۔ اس لحاظ سے اگر ہم درس گاہ کے طلباء اور جمہوری ملک کے عوام کا موازنہ کریں تو کچھ زیادہ فرق نہیں ملے گا۔ طلباء کو جس طرح اپنے اساتذہ کی عزت کرنا ان کے نیک مشوروں پر عمل کرنا، ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر کاربند رہنا، امتحانات کے موقع پر سخت محنت کرنا اور ہر جگہ اپنے اساتذہ اور اپنی درس گاہ کے نام کو روشن کرنا ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح کسی بھی ملک کے عوام کو اپنے انتخاب کئے ہوئے نمائندوں کی عزت کرنا اور ان کی پالیسیوں پر عمل کرنا ان کے بتائے ہوئے طریق پر ملک کی ترقی و خوشحالی میں اپنا کردار ادا کرنا ان کے بنائے ہوئے پروگرام کو عملی جامہ پہنانا، اور اپنے ملک کا نام روشن رکھنا بے حد ضروری ہے۔ آپ اندازہ کر رہے ہوں گے کہ نصب العین میں فرق ہو تو ہو لیکن طریق کار اور لائحہ عمل مشترک ہی ہے۔

جمہوری طرز حکومت میں دوسری سب سے زیادہ اہم شق حکمران طبقہ اور عوام کے گہرے رابطہ اور باہمی تعاون سے تعلق رکھتی ہے۔ کیوں کہ جس ملک کے عوام حکمران طبقہ کے ساتھ اور حکمران طبقہ عوام کے ساتھ تعاون کرے گا۔ اسی ملک میں کامرانی و کامیابی اور ترقی و خوشحالی کا دور دورہ رہے گا۔ اور اس ملک کا تابناک مستقبل دیگر ممالک کے لیے باعث رشک ہوگا۔ اسی طرح طلباء کی کامیابی و کامرانی کا کوئی پروگرام خواہ وہ کتنا ہی کارآمد اور نفع بخش کیوں نہ ہو طلبہ کے تعاون کے بغیر رو بعمل نہیں آ سکتا۔

جمہوری طرز حکومت میں تیسری اور سب سے زیادہ ضروری چیز رائے عامہ کا احترام ہے درس گاہوں میں معلمین کو بھی اپنے طلبہ کی رائے کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔

تقریباً ہر درس گاہ میں مختلف کلب اور سوسائٹیاں طلبہ کے ذہن و فکر کی تربیت کے لیے

بنائی جاتی ہیں۔ جن کے انتخابات بالکل اسی طریق پر ہوتے ہیں جس طریق پر کسی جمہوری ملک کے نمائندوں کا چناؤ کیا جاتا ہے اور عہدیداراں کے اختیارات و فرائض اور حدودِ کار کی تعیین بھی اسی طرح عمل میں آتی ہے۔ جس طرح کسی ملک کی پارلیمنٹ کا اجلاس سپیکر کی صدارت میں منعقد ہوتا ہے اور ممبران کسی اہم مسئلہ کے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح درس گاہ کی یونین کا اجلاس صدرِ یونین کی صدارت میں منعقد ہوتا ہے اور طلبا سٹیج پر آکر اپنے مافی الضمیر کا بڑی بے باکی سے اظہار کرتے ہیں علیٰ ہٰذا القیاس اگر ہم درس گاہ اور جمہوری طرزِ حکومت کا ذرا قریب سے مطالعہ کریں تو ہمیں ان دونوں میں کافی حد تک مشابہت نظر آئے گی اس لیے ہمارا یہ دعویٰ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ جمہوریت کی ابتدائی تربیت گاہیں دراصل ہمارے اسکول اور کالج ہی ہیں جن میں ہمارے نونہال اپنی زندگی کے قیمتی اور اہم لمحات بسر کرتے ہیں۔ لیکن یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہم اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جمہوری طرزِ حکومت کا بول بالا ہو اور ہمارے ملک کی بنیادیں جمہوری طریق پر استوار ہوں تو ہمیں چند تجاویز پر عمل کرنا ہوگا۔

اول یہ کہ ملک میں تعلیم عام کی جائے اور چونکہ ہمارے ملک میں غربت و افلاس زیادہ ہے اس لیے کم از کم میٹرک تک تعلیم مفت رکھی جائے۔

دوم:۔ تعلیمی اخراجات کو کم سے کم کر دیا جائے۔ تاکہ غریب سے غریب بھی علم کے زیور سے آراستہ ہو کر اپنے ملک کی ترقی و خوشحالی میں اپنا کردار بخوبی ادا کر سکے۔

تعلیم کی کمی صرف جمہوریت کے لیے ہی نقصان دہ نہیں بلکہ ہر لحاظ سے ہماری ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ تعلیم عام کرنے کے بعد سب سے پہلے ایسا کورس مقرر ہونا چاہیئے۔ جو عملی زندگی میں طلبہ کے لیے ممد و معاون ثابت ہو۔ شہریت کے مضمون کو لازمی قرار دیا جائے۔ اس کے بعد ہمارا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ درس گاہ کے ماحول کو مکمل طور پر جمہوری بنا دیں اور طلبہ کو احساس دلائیں کہ آگے چل کر ملک کی فلاح بہبود کی ذمہ داری انہی کے کندھوں پر ہوگی۔

ہماری درس گاہیں جو قوم کے معمار پیدا کرتی ہیں، دراصل جمہوریت کی ابتدائی تربیت گاہیں ہیں، لیکن بدقسمتی سے اس پہلو پر ہماری نظر بہت کم پڑتی ہے۔ درس گاہوں کو ہم محض حصولِ سند کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اور یہی وہ خامی ہے جو ہمارے کردار میں کوئی امتیاز پیدا نہیں ہونے دیتی اور جب ہم فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں تو ہماری حیثیت یہی ہوتی ہے کہ "چار پائے بروکتاب چند" ہمارے سامنے برصغیر کی دو عظیم درس گاہوں کی مثالیں موجود ہیں جن میں تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کے کردار کو بھی سنوارا جاتا ہے، لیکن ہم پھر بھی درس گاہ جیسے عظیم اور مفید ادارے کو محض پڑھنے پڑھانے، سننے سنانے اور نشستند و گفتند و برخاستند کی جگہ سمجھتے ہیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ملک کی دو عظیم درس گاہوں سے میری مراد علیگڑھ کالج اور جامع علیہ ہے جہاں کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ افراد آج ہند و پاک کی عظیم شخصیتوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان کی زندگیاں علم و عمل کا ایک ایسا حسین امتزاج ہیں جن پر قوم کو پورا پورا اعتماد ہے۔ دنیا کے دیگر ترقی یافتہ ممالک میں جمہوری طرزِ حکومت کی کامیابی کی وجہ یہی ہے کہ وہاں کے عوام کا تعلیمی معیار بلند ہے۔ وہاں کی درس گاہیں ایک ایسا ادارہ ہیں، جہاں سے فارغ ہونے والے طلباء تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ ہو کر عملی دنیا میں قدم رکھتے ہیں اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہوتے ہیں، اور اجتماعی مفاد کے پیشِ نظر انفرادی مفاد کی ذرہ بھر پروا نہ کرنا اُن کا شیوہ ہے۔

ضرورت ہے کہ آج ہم بھی اپنی درس گاہوں کے معیار کو بلند سے بلند تر کریں اور طلباء کے لیے ایک ایسا جامع اور موثر کورس تجویز ہو جو ان کو حب الوطنی قوم پرستی، خلوص اور نیک نیتی کے سانچے میں ڈھال دے۔

— ⁘ —

تعلیم کے اولین مقاصد اور اصول

بشیراں بی بی اختر گورنمنٹ گرلز ہائی سکول منٹگمری

دنیا میں ہر جاندار خواہ انسان ہو یا حیوان جو بھی کام کرتا ہے کسی نہ کسی مقصد کے تحت کرتا ہے ایک بَیا اس لیے گھونسلا بناتا ہے کہ اپنی اور اپنے بچوں کی حفاظت کرے اور انھیں سردی، گرمی اور بارش سے بچائے۔ مداری بندر کو اُس کے کرتب دکھانے کے لیے نقال بناتا ہے۔ کوچوان گھوڑے کو اس لیے سدھاتا ہے کہ وہ دوڑ بھاگ اور سواری میں اچھا نکلے۔ غرض ہر کام اور ہر بات کا کچھ مقصد ہوتا ہے۔ اسی طرح تعلیم کے بھی کچھ مقاصد ہیں۔ ابتدائی مقاصد درج ذیل ہیں۔

۱۔ اس ننھی پود یا پنیری (بچہ) کو ایک سرسبز اور لہلہاتا ہوا پودا (شہری) بنانا ہے جس سے اس کی پوری شخصیت ایک بند کلی سے شگفتہ پھول میں منتقل ہو جائے

۲۔ ابتدائی تعلیم کا ایک یہ بھی مقصد ہے کہ بچہ اپنے ماحول میں وہ کر اتنی سوجھ بوجھ حاصل کرلے کہ وہ کسی کام یا مسئلے میں اپنی رائے پیش کر سکے۔

۳۔ بچے کو لکھنا پڑھنا سکھانا تاکہ وہ خط لکھ سکے۔ منی آرڈر فارم پُر کر سکے وغیرہ وغیرہ یعنی اخذ و اظہارِ خیالات کی معاشرتی ضرورت پوری کر سکے۔

۴۔ ابتدائی تعلیم سے ذریعہ معاش بنانا تاکہ اپنی زندگی کو ایک بوجھ اور بار بنا کر کسی کا سکون و راحت نہ چھین سکے۔ اپنے پاؤں آپ کھڑا ہو سکے۔

۵۔ ابتدائی تعلیم کا مقصد بچہ کی، جسمانی، ذہنی، سماجی اور روحانی تربیت کرنا ہے۔

ا۔ جسمانی تربیت : جس طرح ریل کے انجن یا کسی مشین کو پائدار بنانے کے لیے اس کی

مشینری کا بہترین ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح جب تک "بچہ" کی جسمانی تربیت نہ کی جائے اس کی شخصیت کی پوری تعمیر ناممکن ہے۔ اس لیے اس کے پھولنے کے لیے اچھی اور خوشگوا فضا اور خوراک درکار ہے۔ صاف ستھرا لباس یعنی جسمانی صفائی کے ساتھ ساتھ کھیلوں کا مناسب انتظام ہونا چاہیئے۔ بچوں کو کھیل کے میدان میں آزادانہ کھیل کود کا موقع دینا چاہیئے۔ مدرس کو اُن کے ساتھ کھیل کود میں شامل ہونا چاہیئے بہت چھوٹے بچوں کو متحرک کہانیاں اور تمثیلی حرکات کے ذریعہ ورزش کرا سکتے ہیں اور اُن سے بڑے بچوں کے لیے حکمیہ ورزش یعنی 'RDER EXERCISE کرانی چاہیئے، تاکہ بچوں کے قوائے جسمانی مناسب تربیت پا سکیں۔ اعضائے جسمانی میں کوئی خلل یا خرابی پیدا نہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ بچوں کی جسمانی تربیت کے لیے مکانِ مدرسہ مناسب ہو۔ لباس مناسب اور موسم کے مطابق ہو۔ زیادہ تنگ یا کھلا نہیں ہونا چاہیئے کیوں کہ عمدہ توانا صحت ہی میں اعلیٰ دماغ کی امید ہو سکتی ہے۔

ب ۔ ذہنی تربیت : جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ بچوں کی ذہنی تربیت بھی کرنی ہے۔ مدرس کو کمرۂ جماعت میں ایسی فضا پیدا کرنی چاہیئے۔ ایسے طریقِ تدریس استعمال کرنے چاہئیں جن سے بچے کے دماغ کے کل پُرزے حرکت میں آئیں اور سوچنے سمجھنے کے مواقع میسّر ہوں۔ اس کے لیے مدرس کو دورانِ سبق میں مناسب توضیحات تدریس استعمال کرنی چاہئیں۔ تاکہ بچہ اُسے دیکھ کر اس کے متعلق سوچ سکے۔ مضامین کہانیاں، نقلیں۔ لطائف۔ پہیلیاں لکھوائی اور پڑھائی جائیں۔ تک بندی اور بیت بازی کرائی جائے۔ تاکہ ذہنی محرکات ظہور میں آئیں ۔

ج ۔ اخلاقی یا روحانی تربیت : تعلیم کا ایک اہم مقصد بچے کے اخلاق کو سنوارنا اور روحانی تربیت کرنا ہے، تاکہ وہ احکام خداوندی اور سنت نبویؐ کو بجا لا سکے۔ ارکان

جس کی بنیاد ایک مینارے کی طرح پانچ لوگوں پہ ہے :-
(۱) کلمہ (۲) نماز (۳) روزہ (۴) زکوٰۃ (۵) حج کو عملی طور پہ جان کر ان کو عملی زندگی میں اختیار کر سکے۔
بچے کی روحانی تربیت کے لیے استاد اور ماں باپ بہترین مثال ہیں۔ کیونکہ بچہ ان تینوں کی حرکات و سکنات کو ایک نمونہ بنا لیتا ہے اور ویسا ہی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
ایک ننھی بچی جب اپنی ماں کو نماز ادا کرتے دیکھتی ہے تو اس کے دل میں بھی شوق پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ منہ ہاتھ دھو کر اپنے سجدے سجدے گذار کر نماز میں ماں کی نقل کرتی ہے۔ اس لیے کہ بچے نقال ہوتے ہیں۔
اسی طرح اگر کوئی بات بچوں کو استاد سمجھا دے اور اس پہ کوئی دوسرا آدمی نکتہ چینی کرے تو بچہ کسی دوسرے کی بات کبھی نہ مانے گا، بلکہ اس کا یہی جواب ہوگا کہ یہ بات میرے استاد نے مجھے بتائی ہے۔ اور یہی ٹھیک ہے۔
اس لیے ضروری ہے کہ والدین گھر پہ اور اساتذہ سکول میں بچے کی اخلاقی اور روحانی تربیت کرتے رہیں۔ سکول میں مدرس کو دینی احکامات کے متعلق مناسب وقت دینا چاہیئے اور دینی تعلیم سکول میں رائج کر کے خود اس کا نمونہ بننا چاہیئے۔ اور والدین بھی گھر پہ اعلیٰ اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کرتے رہیں۔

د - سماجی تربیت: بچے کو عمدہ اور مفید شہری بنانے کے لیے سماجی تعلیم کو بھی ابتدائی تعلیم میں خاص حصہ دیا گیا ہے۔ گھر اور سکول بچے کے لیے ایک چھوٹی سی سماج اور ایک معاشرہ ہے جس میں رہ کر بچہ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، بات چیت کرنے کے آداب سیکھتا ہے۔ وہ بڑوں کو جس طرح کرتے دیکھتا ہے اسی طرح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے مدرس کو سکول کی زندگی میں مناسب ماحول پیدا کرنا چاہیئے۔ سماج اور

معاشرے میں بچہ دوسروں سے اپنی عزت کرانا اور ان کی عزت کرنا سیکھتا ہے۔ اپنے حقوق ادا کرتا ہے۔ دوسروں کے حقوق ادا کرواتا ہے اور اپنی شخصیت اور فرائض کو سمجھتا ہے۔ اچھا شہری بننے کے لیے شہریت کے اصول سکھائے جاتے ہیں۔ بچے کے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے اور وہ جو کچھ سیکھتا ہے اور سکھاتا ہے۔ یہ سب سماجی اور معاشرتی تربیت کہلاتی ہے ؛

تعلیمی خبریں

اقوامِ متحدہ کا تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارہ

اقوامِ متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارہ نے بڑھتے ہوئے تعلیمی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ۱۹۶۲ء میں وسیع پیمانے پر منصوبہ بندی کی جس کے مطابق اس نے چار بڑے علاقائی مرکز قائم کیے اور ۹ مدرسوں کے تربیتی اور تکنیکی ادارے کھولے۔

۱۹۶۲ء میں یونیسکو نے جائزہ لیا تو ثانوی مدرسوں میں معلوم ہوا کہ ایک طوفان امنڈ آیا ہے۔ دو سو ملکوں اور علاقوں میں تقریباً ۰۰۰۰۰۰ ۱۷ بچے پڑھ رہے تھے۔ ریاستہائے متحدہ میں حالیہ عرصہ میں ۱۵ سال سے ۱۹ سال تک کے بچوں کی تعداد اسکولوں میں ۵۰ سے ۷۵ فی صد تک بڑھ گئی۔ لنکا میں ۱۱ سے ۴۴ فی صد تک۔ نیدرلینڈز میں ۳۵ سے ۷۸ فیصد تک اضافہ ہوا۔ فرانس میں ۱۲ سے ۲۲ فی صد تک اور چائل میں ۱۲ سے ۲۷ فی صد تک۔ مراقش میں ۱۴٫۵ سے ۳۶٫۵ فی صد تک اور موزمبیق میں ۰ء۸ سے ۲ء۱ فی صد تک۔ بہر حال جائزہ سے ظاہر ہوا کہ ضرورت کے مقابلے میں ترقی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ مدرسوں کی کمی اور اسکولوں کے لیے عمارتوں کی ضرورت بھی شدید تھی خصوصاً ترقی کرنے والے علاقوں میں فرانس کے رینی ماہیو، جنھیں ایجنسی کی بارھویں جنرل کانفرنس میں یونیسکو کا ڈائرکٹر جنرل چنا گیا تھا، انھوں نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:-

"دنیا میں جتنے بچے ہیں ان میں ۴۵ فیصد اب بھی سکول نہیں جاتے۔ جب یہ بلوغ کو پہنچتے ہیں تو بے علموں کی تعداد میں سالانہ دو کروڑ سے ڈھائی کروڑ تک کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ آج اسی کروڑ بالغ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے۔ اس کیفیت میں ذہانت کے ذریعوں کی حیرت ناک تباہی ہوتی ہے۔"

باقاعدہ تعلیمی ترقی کے لیے حکومت کی امداد کی غرض سے یونیسکو نے ۱۹۶۲ء میں منصوبے منظور کیے ہیں کہ ۱۹۶۳ء میں پیرس میں ایک بین الاقوامی تعلیمی منصوبہ بندی کا ادارہ کھولا جائے۔ یونیسکو نے ایشیائی

قوموں میں کام کرنے کے لیے نئی دہلی میں ایک علاقائی مرکز کھولا تھا تاکہ تعلیمی منصوبہ بندوں، ناظموں اور ناظروں کو اس میں تربیت دی جائے۔ اور ایک ایسا ہی مرکز عرب ریاستوں کی خدمت کے لیے بیروت. لبنان میں بھی کھولا تھا۔

ان کے علاوہ ایک ایشیائی علاقائی ادارہ اسکولوں کی تعمیر کی تحقیق کے لیے بینڈونگ، انڈونیشیا میں کھولا تھا، اور مدرسین کے معلمین کی تربیت کے لیے فلپینز میں ایک مرکز قائم کیا تھا. یونیسکو نے اس طرح منصوبہ بندی اور تعمیری اداروں کا ایک جال افریقہ اور ایشیا میں پھیلا دیا۔ انہی دونوں علاقوں میں ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

اقتصادی اور معاشرتی ترقی کی تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے یونیسکو نے کارکردگی کی سرگرمیوں پر اپنے ۱۹۶۲ء کے ۴،۴۸۴،۰۹۷،۱۶۱ ڈالر کے بجٹ کا ۱۰ فی صد حصّہ صرف کر دیا۔ ایجنسی کے اتنے ہی ماہر میدانِ کار میں تھے جتنے افسر صدر دفتر میں تھے۔

۱۹۶۲ء میں تین بڑی کانفرنسوں نے تعلیم کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔

ڈیڑھ سو سے زیادہ لاطینی امریکی تعلیمی ماہر یونیسکو کی سرپرستی میں سانتیاگو چائل میں اکٹھے ہوئے تاکہ برِ عظیم میں بے علمی کو دور کرنے کے لیے منصوبے بنائیں۔ ۱۹۶۲ء میں بے علمی ۴۳ فی صد تھی. کانفرنس نے سانتیاگو کا منشور منظور کیا جس میں لاطینی امریکی ملکوں سے کہا گیا تھا کہ وہ تعلیمی منصوبہ بندی کو اپنی کل معاشرتی اور اقتصادی منصوبہ بندی میں شامل کر لیں اور ۱۹۶۵ء تک اپنی کل قومی آمدنی کا ۴ فیصد اس کے لیے مخصوص کر دیں۔

ایسی ہی ایک سفارش افریقی ملکوں کے ایک گروہ نے کی تھی، انھوں نے عدیس ابابا منصوبہ میں تعلیمی ترقی کے لیے جو تجویزیں پیش کی گئی تھیں ان کا مطالعہ کیا تھا. یہ کانفرنس پیرس میں ہوئی تھی اور اس نے سفارش کی تھی کہ تعلیمی منصوبہ بندی کے نظام کو بہتر بنایا جائے اور مدرسوں کی تربیت کو سبقت دی جائے۔

تیسری کانفرنس ٹوکیو میں ہوئی جس میں ایشیا کے وزرائے تعلیم نے شرکت کی انھوں نے فیصلہ کیا کہ صنعتی و فنی تعلیم کو بڑھتی ہوئی سبقت دی جائے۔

تیسری کانفرنس ٹوکیو میں ہوئی جس میں ایشیا کے وزرائے تعلیم نے شرکت کی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ صنعتی و فنی تعلیم کو بڑھتی ہوئی سبقت دی جائے اور تعلیم کے تمام شعبوں کو قومی منصوبہ بندی کے تحت ہونا چاہیئے۔

سنہ ۱۹۶۲ء میں یونیسکو نے تعلیمی منصوبہ بندوں کی ایک ٹیم بھی بھیجی تھی اور کئی ادارے بھی کھولے جن کی مالی امداد اقوام متحدہ کے خاص فنڈ سے کی گئی۔ لاؤس میں ایک تکنیکی تربیتی ادارہ ارجنٹینا میں ایک پٹرول کا ادارہ بھارت میں ایک مرکزی سائنسی آلات کا ادارہ۔ نائجیریا میں ایک مدرسوں کا تربیتی کالج، ایکواڈور میں ایک پالی ٹکنیک اسکول اور سوڈان، کونگو (برازاویل) اور سینیگال میں ثانوی مدرسوں کا تربیتی ادارہ۔

اعلیٰ تعلیم کی طرف زیادہ توجہ :- اعلیٰ تعلیم کی طرف خصوصاً افریقہ میں یونیسکو زیادہ توجہ دے رہی ہے۔ افریقہ میں اعلیٰ تعلیم کی توسیع کے طریقوں پر غور کرنے کے لیے تاناناریو۔ مڈغاسکر میں ایک کانفرنس ہوئی جس کا اہتمام یونیسکو نے کیا۔ اس کانفرنس نے رائے دی کہ ۳۳ افریقی یونیورسٹیوں کو تقویت و ترقی دی جائے اور توقع ظاہر کی کہ ۳۱ استوائی افریقی ملکوں میں سنہ ۱۹۸۰ء تک اعلیٰ تعلیم میں نوگنا اضافہ ہو سکے گا

سنہ ۱۹۶۲ء کے شروع میں یونیسکو کے ۱۰۲ ممبر تھے اور سال کے اختتام پر ۱۱۳ ممبر۔ اس سال میں سات افریقی ریاستوں نے شمولیت کی۔ الجزائر، برونڈی، موریتانیہ، روانڈا۔ سیرالیون۔ ٹانگانیکا اور یوگنڈا اور ان کے ساتھ جمیکا۔ منگولی عوام کی جمہوریہ۔ ٹرینی ڈاڈ اور ٹوباگو اور یمن۔ یونیسکو کے پیرس کے صدر دفتر میں گنجائش بڑھانے کے لیے جنرل کانفرنس نے ایک سہ منزلہ دفتر موجودہ عمارت کے سامنے پیالا میں زیر زمین بنانے کی منظوری دی۔

تعلیم میں تفریق کرنے کے خلاف کنونیشن کا نفاذ مئی سنہ ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ اس کنونیشن کا اہتمام یونیسکو نے کیا تھا۔ اس کنونیشن میں جس پر نو قوموں کے دستخط ہو چکے ہیں تفریق کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی بنیاد نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب سیاسی یا کسی اور طرح کی رائے پر، قومی، یا معاشرتی آغاز کی معاشی کیفیت یا پیدائش پر ہو۔ اس منشور کی خلاف ورزی کرنے سے جو اختلافات پیدا ہوں، انھیں طے کرنے کے لیے جنرل کانفرنس نے ضروری کارکن مقرر کر دیئے ہیں۔

دو سائنسی مرکزوں کا قیام: سائنس کے میدان میں ۱۹۶۲ء میں یونیسکو نے دو اہم مرکز قائم کیے۔ یونیسکو کی سرپرستی میں ایک بین الاقوامی تخمینہ کا مرکز روم میں کھولا گیا تاکہ تخمینہ کرنے والوں کی مختلف زبانوں میں یگانگت پیدا کرنے کے مسئلہ پر تحقیق کرے اور اطلاعات مہیا کرنے کے عام مسائل کی جانچ کرے اور ممبر ریاستوں کے لیے ماہروں کو تربیت دے۔

خاص فنڈ کے زیر سرپرستی یونیسکو نے ٹوکیو میں زلزلیات اور بھونچال کی انجینئرنگ کا ایک خاص ادارہ کھولا۔ اقوام متحدہ کی معاشی و سماجی کونسل کے لیے ایک نئی رپورٹ میں یونیسکو نے ایسی احتیاطی تدابیر بتائی ہیں جن سے زلزلوں سے جان اور مال کے نقصان کو گھٹایا جا سکتا ہے۔ رپورٹ نے پوری دنیا میں زلزلوں سے آگاہی دینے والے نظام کے قیام کی سفارش کی ہے۔ ایران میں زلزلہ آنے کے بعد یونیسکو نے ایک سائنسی اور انجینئرنگ کی ٹیم بھیجی تاکہ اُس ملک کے تعلیمی نظام کی دوبارہ تعمیر میں امداد دے۔

بین الحکومتی بحریاتی کمیشن کی سرپرستی میں بین الاقوامی بحر ہند کی مہم ۱۹۶۲ء میں جاری رہی۔ اور اوّل الذکر بجائے خود یونیسکو کی سرپرستی میں قائم ہے۔

بیس سے زیادہ ملکوں کے ۴۰ جہاز اس جائزے میں حصہ لے رہے ہیں۔ اس کے ذریعہ سمندری دوروں، طبقات الارض کی کیفیات اور مچھلیوں کی نقل مکانی کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ استوائی اطلانتک سمندر کے پانیوں کی تحقیق کے لیے ایک بین الاقوامی جائزہ کی بھی سفارش کی تاکہ اس سال میں ان پانیوں کے ماہی ذرائع کا پتہ چلایا جا سکے۔

لاطینی امریکہ کے لیے اقوام متحدہ کے اقتصادی کمیشن کی شرکت میں یونیسکو نے ۱۹۶۲ء میں وسطی امریکہ میکسیکو اور کیریبئین علاقہ دیہی زندگی کے مسائل پر سماجی تحقیق کی غرض سے ایک مذاکرہ کیا۔

برطانوی یونیورسٹیوں میں غیر ملکی طلباء کا داخلہ

برطانیہ کی یونیورسٹیوں، کالجوں اور اعلیٰ تعلیمی مرکزوں میں جب بھی نیا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے تو زیادہ سے زیادہ تعداد میں نوجوان طلباء داخلے کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

اس سے پہلے اعلیٰ تعلیم کے لیے کبھی بھی اتنی زیادہ تنگ و دو نہیں ہوتی تھی۔ تاہم ہم ان کالجوں اور

یونیورسٹیوں میں غیر ممالک کے طلبا کو کسی نہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ داخلے دیئے جاتے ہیں۔

برطانیہ میں یونیورسٹیوں میں داخلہ حاصل کرنے والے طلبا کی کثیر تعداد دوسری عالمگیر جنگ کے دوران اور اس کے فوراً بعد بچوں کی پیدائش میں کئی گنا اضافہ ہو جانے کا براہ راست نتیجہ ہیں۔

اٹھارہ سال سے بیس سال کی عمر کی موجودہ آبادی ان نوجوانوں کی ہے جو سنہ ۱۹۴۲ء اور سنہ ۱۹۴۴ء کے درمیانی عرصہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس امر کا امکان ہے کہ اس عمر کے نوجوانوں کی تعداد سنہ ۱۹۶۵ء کے فوراً ہی بعد اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جائے گی اور ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تعلیمی نظام کو وسیع کرنے اور اسے از سر نو تشکیل دینے کے لیے پہلے ہی سے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔

اگرچہ خود برطانیہ کے طلبا کی کثیر تعداد کی وجہ سے تعلیمی اداروں پر بہت زور پڑ رہا ہے۔ پھر بھی اعلیٰ تعلیمی مرکزوں میں سمندر پار ملکوں کے طلبا کو جو زیادہ سے زیادہ تعداد میں برطانیہ پہنچ رہے ہیں برابر داخلے دیئے جا رہے ہیں۔

برطانیہ میں یونیورسٹیوں نے کئی سال سے سمندر پار ملکوں کے طلبا کے لیے نشستوں کی اچھی خاصی تعداد مقرر کر دی ہے۔ سنہ ۶۲-۱۹۶۱ء کے اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ طالب علموں کی تعداد پہلے کی نسبت بڑھ گئی ہے۔ برطانیہ اور آئرلینڈ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے کل ایک لاکھ ۲۲ ہزار طلبا میں سے ۱۳ ہزار تین سو پچاس طلبہ سمندر پار ممالک کے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دس میں سے ایک طالب علم غیر ملکی ہے۔ ان میں ایشیا کے ۵۰۲۱، افریقہ کے ۳۸۶۵، امریکہ کے ۲۵۷۱ یورپ کے ۱۰۱۲۶۴ اور نیوزی لینڈ کے ۵۶۳ طلبا برطانیہ گئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک طالب علم کسی ملک سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔

ان طلبا نے جن مضامین کا مطالعہ کیا تھا وہ ترجیح کے لحاظ سے یہ ہیں:-

فنون لطیفہ، ٹیکنالوجی، عمرانیات، طب، سائنس، جنگلات، دندان سازی اور جانوروں سے متعلق علم۔ ان کے علاوہ ۵،۷۱۶ طلبا ریسرچ میں مصروف تھے۔ دونوں گروپوں میں ہندوستان اور امریکہ کے طلبہ کی اکثریت تھی۔

علاوہ ازیں غیر ممالک کے تقریباً دو ہزار طلبا، برطانیہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں فاضل وقت کے کورس کر رہے تھے۔ ان میں سے تقریباً آدھے طلبا ریسرچ کر رہے تھے جو اپنے ملک واپس جاکر ذمہ داری کے عہدے سنبھال لیں گے۔

برطانیہ میں نئی یونیورسٹیاں کھلنے والی ہیں۔ ان میں سسکس کی وہ یونی ورسٹی بھی شامل ہے جس کا دوسرا سال شروع ہے، ۱۴ ہزار درخواست دہندوں میں سے جو ۴۶۳ طلبا منتخب کئے گئے تھے۔ ان میں پانچ انڈرگریجوایٹ طلبا، غیر ممالک کے بھی ہیں۔ برطانیہ میں اس وقت ۲۵ یونیورسٹیاں ہیں۔ دو یونیورسٹیاں ۱۹۶۳ء میں قائم ہو جائیں گی اور چار مزید یونیورسٹیاں کھولنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

برطانیہ میں در اصل یونیورسٹی محض ایک عمارت نہیں ہے۔ بلکہ ڈگری دینے کا ایک ادارہ ہے جو لندن یونیورسٹی کی طرح مختلف کالجوں پر مشتمل ایک وفاقی ادارہ بھی ہو سکتا ہے یا ویلز یونیورسٹی کی طرح ایک ایسا ادارہ ہو سکتا ہے جس کے چار یا پانچ کالج مختلف شہروں میں واقع ہوں۔ یونیورسٹی کی تنظیم کے سلسلہ میں جو ممکنہ تبدیلیاں زیر بحث ہیں ان میں عام سطح اور اعلیٰ سطح پر یونیورسٹی کی تعلیم شامل ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایسی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں گی جہاں طلبہ صرف پہلی ڈگری کے لیے تعلیم حاصل کریں گے اور ان میں سے بعض محض ریسرچ کے لیے مخصوص ہوں گی۔

ان یونیورسٹیوں کے علاوہ برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم و تربیت کے اور بھی ادارے ہیں جن میں اعلیٰ فنی تعلیم کے کالج خاص طور پر قابل ذکر ہیں جہاں سائنس، انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کے خاص خاص مضامین کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کالجوں میں ۸ فیصد طلبا، سمندر پار ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ قانون پڑھانے کے اسکول، نرسوں اور اساتذہ کے تربیتی کالج اور ہر قسم کے پیشے کاروبار اور تجارت سکھانے کے کالج اور تربیتی ادارے ہیں۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں ان اداروں میں تعلیم پانے والے سمندر پار ملکی طلباء کی کل تعداد ساٹھ ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ جبکہ دس سال پہلے صرف تیرہ ہزار پانچسو تھی۔ ہر قسم کے اعلیٰ تعلیمی مرکزوں اور یونیورسٹیوں میں پورے وقت تعلیم پانے والے طلبا، کی سب سے زیادہ تعداد نائیجیریا کی ۶۳۸۷، ہندوستان کی ۴۴۹۷ اور گھانا کی ۸۴۳ تھی۔

برطانیہ کی قدیم یونیورسٹیاں خاص طور پر آکسفورڈ اور کیمبرج، اپنے طلبہ کو رسمی تعلیم کے علاوہ بہت کچھ سکھاتی ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ رہائشی یونیورسٹیاں ہیں اور ان کی اجتماعی زندگی میں سماجی، ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں کے مواقع خوب حاصل ہوتے ہیں جو اور دوسری یونیورسٹیوں میں اتنی آسانی سے نہیں حاصل ہو سکتے۔

بہر حال یہ تو ایک خاص ماحول کی زندگی ہے۔ لیکن سمندر پار ملکی طالب علم کو جو واقعی برطانوی طرز زندگی کا تجربہ کرنا چاہتا ہے۔ غیر رہائشی یونیورسٹی میں بہتر مواقع حاصل ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ ان بہت سی سہولتوں سے زیادہ استفادہ کرے جو برطانیہ میں اس کے قیام کے دوران اس کے لیے موجود ہیں۔

ان سہولتوں کو حاصل کرنے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ اگر وہ لندن میں ہو تو برٹش کونسل کے مرکزی دفتر سے رجوع کرے اور اگر کسی دوسرے شہر میں ہو تو وہاں کے برٹش کونسل کے دفتر جا کر ان سے رجوع کرے۔ طالب علم کو معلوم ہو گا کہ ان کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے تمام چیزیں مہیا کر دی گئی ہیں۔ مثلاً رہن سہن، کھانے، پینے اور پہننے اوڑھنے کے طریقے، سفر، تفریح گاہوں، کلبوں اور ہر قسم کے اجتماعوں سے لے کر رہائشی مکان حاصل کرنے اور برطانوی خاندانوں سے تعارف تک تمام معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ طالب علم لندن میں اپنے کمرہ میں ہو یا اور کسی بڑے شہر میں ہو یقیناً کبھی بھی تنہائی محسوس نہیں کرے گا۔

جو طلبا کسی عطیہ یا وظیفہ پر نہیں جاتے بلکہ اپنے خرچ سے پڑھتے ہیں۔ ان کو پانچسو پونڈ تک سالانہ خرچ کرنے پڑتے ہیں۔

تارکین وطن کے لیے انگریزی کی تعلیم

برطانیہ میں بے روزگار پاکستانیوں کے لیے انگریزی کی پہلی کلاسیں حال ہی میں برمنگھم کے نزدیک اسمتھ وک میں شروع کی گئی ہیں۔

دس ہفتے کے اس کورس کا انتظام مقامی تعلیمی محکمہ نے قومی امدادی بورڈ کی درخواست پر کیا ہے اور اگر یہ کامیاب ثابت ہوا تو اس کا انعقاد برطانیہ کے دوسرے حصوں میں بھی کیا جا سکتا ہے پہلے دن

اسمتھ وک کے جانسن ٹیکنیکل کالج کی کلاسوں میں تین پاکستانیوں نے شرکت کی۔

این۔اے۔بی کے ایک ترجمان نے کہا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ بہت سے تارکین وطن کے لیے اسوقت تک ملازمت حاصل کرنے کے بہت کم مواقع ہیں۔ جب تک کہ وہ انگریزی زبان کی بنیادی معلومات حاصل نہ کرلیں۔

کورس کے دوران صرف انگریزی سے کام لیا جائے گا۔ لیکن حرکات اور اشارات اور تختہ سیاہ پہ خاکوں کا بھی استعمال کیا جائے گا۔ تاکہ انگریزی الفاظ کے معنی سمجھانے میں مدد مل سکے۔ اس طریقے سے طلبا، نہ صرف انگریزی میں بات کرنے لگتے ہیں، بلکہ شروع سے ہی انگریزی میں سوچنے لگتے ہیں۔

برطانیہ کے تعطیلاتی کورسوں میں غیر ملکی طلباء کی شرکت

تمام برصغیر کے طلباء ان اداروں درخواست دہندوں میں شامل ہیں جنھوں نے سینتیس ازاں تعطیلاتی کورسوں میں شرکت کے لیے درخواست کی ہے۔ برٹش کونسل نے اس سال ایسٹر کے موقع پر سمندر پار ملکی طلباء کے لیے ان کورسوں کا انتظام کیا ہے۔

ان کے علاوہ تین کورس اور ہیں جو برطانیہ کے قابل دید مقامات کے دوروں سے متعلق ہیں۔ امید ہے کہ اس سال ہمیشہ سے زیادہ لوگ ان کورسوں میں شرکت کریں گے۔

مس ایلین میکاناچی نے جو لندن کے سمندر پار ملکی طلباء کے شعبہ میں کورسوں کی منتظمہ ہیں۔ لندن پریس سروس کے ایک نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے پاس کورسوں کی تعداد زیادہ ہے اور ہم پہلے کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ طلباء کو داخلہ دے سکتے ہیں۔

ان کورسوں کی مدت چند دن سے لے کر ایک ہفتہ تک ہے اور ان کا مقصد طلباء کو برطانیہ کے دوسرے حصوں کے طلباء اور عوام سے متعارف کرانا ہے۔

طلبا کی ایک دلچسپی یہ بھی ہوگی کہ وہ ایک ہفتہ شکسپیئر کے دریائے ایوان میں جہازرانی میں گذاریں گے۔ ان سے جہاز کے چلانے اور کسی قدر کھانا پکانے میں مدد لی جائے گی ٭

سرکاری جریدے کے اعلانات

صیغۂ رجسٹرال ——— شعبۂ سکول

ت۔ ۸۰۔ ۵۸۱۰ م۔ صفدر بیگ مرزا بی اے بی ایڈ سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول قصور کو ایک موجودہ خالی
۱۵ فروری ۱۹۶۳ء آسامی پر تاریخ حاضری سے ۱۳۰/- — ۱۰ — ۲۰۰/ — ۱۰ — ۱۲۵/ روپے کے
گریڈ میں بمشاہرہ -/۱۳۰ روپے علاوہ الاؤنس عارضی لائبریرین گورنمنٹ پائلٹ ہائی سکول
سیالکوٹ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد سرور ایم اے بی ایڈ عارضی لکچرار گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ کو صفدر بیگ مرزا کی جگہ جن کا
تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے ۳۰۰/۱۲۰ روپے کے گریڈ میں قائم مقام سینئر انگلش
ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول قصور مقرر کیا گیا۔

ع ۔ ۲۰۷۷ م۔ محمد افضال ایچ پی۔ او ٹی۔ قائم مقام ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رنگ پور کو اپنی تنخواہ پر م۔ عبدالکریم
۱۱ مارچ ۱۹۶۳ء طارق کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے قائم مقام اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ
ہائی سکول لیہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبدالکریم طارق ایچ۔ پی۔ او ٹی قائم مقام اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول لیہ کو تاریخ
حاضری سے محمد افضل ایچ پی، او ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے
گریڈ میں قائم مقام اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رنگ پور مقرر کیا گیا۔

ع۔ ۱۴۵۳۲ م۔ محمد دین شاکر پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول کھاریاں کو تاریخ حاضری سے م فضل حق کی
۲۵ مارچ ۱۹۶۳ء جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول فتح جنگ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ فضل حق پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول فتح جنگ کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد دین کی جگہ
جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول کھاریاں مقرر کیا گیا۔

E-۲۷۲۷ ۲۵ مارچ ۶۳ء — م بشیر احمد شمیم بی اے ،سی ،ٹی جونیر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کہروڑ پکا کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد منیر الیف اے ،سی۔ ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ پر جونیر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول لیہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ محمد منیر الیف اے سی۔ ٹی قائم مقام جونیر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول لیہ کو م بشیر احمد شمیم بی اے سی۔ ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر قائم مقام جونیر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کہروڑ پکا مقرر کیا گیا۔

۱۰۱۳۳ ADMN(I) ۲۵ مارچ ۶۳ء — م۔ مرتضےٰ خاں ایس وی میٹرک ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جلالپور پیروالا کو م۔ محفوظ علی خاں کی جگہ بمشاہرہ خود تاریخ حاضری سے ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملتان مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ محمد ایوب صابر میٹرک ایک امیدوار کو مرتضےٰ خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے بمشاہرہ ۷۲/- روپے علاوہ الاؤنس عارضی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جلال پور پیروالا (ضلع ملتان) مقرر کیا گیا۔

۱۰۸۱۰ ADMN(I) ۲۹ مارچ ۶۳ء — م۔ عبدالحمید بی اے بی ایڈ ایک امیدوار کو م۔ عبداللہ دار سینیر انگلش ٹیچر کی جگہ جو بسلسلہ رخصت ۱۴ مارچ ۶۳ء سے تین ماہ کی رخصت پر ہیں بمشاہرہ ۱۳۰/- روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی سینیر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول اکال گڑھ مقرر کیا گیا۔

E-۱۶۱۳۱ دفتر نظارت قسمت راولپنڈی — م۔ محمد اقبال بی اے بی ایڈ۔ انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چکوال کو اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں م۔ محمد منظور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول لیہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ محمد منظور بی اے۔ بی ایڈ انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول لیہ کو م۔ محمد اقبال کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چکوال مقرر کیا گیا۔

۱۱۰۹۴ ADMN(I) یکم اپریل ۶۳ء — م۔ محمد اسحاق عارضی اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول پسرور کا استعفےٰ ۹ نومبر ۶۲ء کی صبح سے منظور کیا جاتا ہے۔

(۱۱۲۳۳A(I) م۔ محمد حسین مولوی فضل اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ کو ایک خالی اسامی پر
۲ اپریل ۱۹۶۳ء تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چنیوٹ مقرر کیا گیا۔

۱۱۲۲۴ ADMN(I) م۔ عبدالرحمٰن ایس وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول خیرپور کو م۔ سلطان محمد نون کی جگہ (جو ملازمت
۲ اپریل ۱۹۶۳ء پر حاضر نہیں ہوئے) تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں عارضی ورنیکلر ٹیچر
گورنمنٹ ہائی سکول ملٹری فارم اوکاڑہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد رفیق ارشد میٹرک ایف ٹے ایس وی (ایک امیدوار) کو م۔ عبدالرحمٰن ایس وی ٹیچر
کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ ۸۰/- روپے عارضی ورنیکلر ٹیچر
گورنمنٹ ہائی سکول خیرپور ٹامیوالی مقرر کیا گیا۔

(۱۱۲۷۸A(I م۔ محمد نصر اللہ خاں ایس۔ وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول وحدت کالونی لاہور کو م۔ عبدالغفور کی
۳ اپریل ۱۹۶۳ء جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول
منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبدالغفور قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری کو م۔ محمد نصر اللہ خاں کی
جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے قائم مقام
ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول وحدت کالونی لاہور مقرر کیا گیا۔

۱۱۷۶۰ ADMN(I) م۔ محمد صفدر ایم اے۔ بی۔ ٹی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پسرور کو (جو فی الحال بطور
۶ اپریل ۱۹۶۳ء عارضی لیکچرار اردو گورنمنٹ۔ بہاول کالج بہاول نگر میں ۱۵ اپریل ۱۹۶۳ء تک مامور رہیں گے)
م۔ فتح محمد بی اے آنرز بی۔ ٹی کی جگہ تاریخ حاضری سے ۳۰۰/۱۲۰ روپے کے گریڈ میں سینئر
انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ریناله خورد مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ ریاض حسین زیدی۔ بی اے۔ بی ایڈ عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ظفروال کو
م۔ عبدالمجید ایم اے بی ایڈ کی جگہ جو ۲۸ جنوری ۱۹۶۳ء سے مستعفی ہو چکے ہیں اپنے
گریڈ میں عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈوونگا ونگا مقرر کیا گیا۔

۱۱۷۹۰—ADMN(I) ۶ اپریل ۶۳ء — م۔ عبدالمجید ایم اے بی ایڈ عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈوڈہ لگابونگا کا استعفیٰ (۲۸ جنوری ۶۳ء سے) منظور کیا جاتا ہے۔

۱۲۰۴۸—ADMN(I) ۸ اپریل ۶۳ء — م۔ جاوید احمد بی اے۔ بی ایڈ کا تقرر بطور عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ تین ماہ کے لیے عمل میں آیا تھا اب ایک نئی آسامی پر ۳۱ مئی ۶۳ء تک اس کی توسیع کی جاتی ہے۔

۱۱۹۸۳—ADMN(I) ۸ اپریل ۶۳ء — م۔ محمد منیر بی اے بی ایڈ ایک امیدوار کو م۔ رستم رحمن کی جگہ جو مستعفی ہو چکے ہیں بمشاہرہ ۱۳۰/- روپے علاوہ الاؤنس ۲ اپریل ۶۳ء سے عارضی لائبریرین گورنمنٹ پائلیٹ ہائی سکول ملتان مقرر کیا گیا۔

۱۲۲۹۴ ۹ اپریل ۶۳ء — م۔ غلام شبیر شاہ کو (جو ڈی سی۔ ہائی سکول حمروٹا دفتی ضلع رحیم یار خاں میں بطور پی ٹی آئی کام کر رہے ہیں) عبدالحمید کی جگہ (جو ملازمت پر حاضر نہیں ہوئے) تاریخ حاضری سے تاریخ حاضری سے ۶۰/- — ۴ — ۱۰۰/- — ۱۰۵/- — ۵ — ۱۴۰/- روپے کے گریڈ میں پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول ہارون آباد مقرر کیا گیا۔

۵۸۴۱—E(I) ۱۰ اپریل ۶۳ء دفتر نظارت بہاولپور — م۔ محمد اسمٰعیل میٹرک جے اے وی ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول صادق گڑھ پیلس کو م۔ محمد قاسم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول خان پور مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ محمد قاسم ایف اے جے اے وی معلم گورنمنٹ ہائی سکول خانپور کو م۔ محمد اسمٰعیل کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول صادق گڑھ پیلس مقرر کیا گیا۔

۱۲۴۵۰—ADMN-(I) ۱۱ اپریل ۶۳ء — م۔ محمد ابراہیم نیازی میٹرک (صرف انگریزی) فاضل فارسی اورینٹل ٹیچر (ایک امیدوار) کو م۔ عبدالواحد کی آسامی پر جو گورنمنٹ ہائی سکول فیروزہ بھیج دیئے گئے ہیں، تاریخ حاضری سے بمشاہرہ ۱۰۰/- روپے علاوہ الاؤنس عارضی اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ

ہائی سکول صادق آباد (رحیم یار خان) مقرر کیا گیا۔

۱۲۹۱۹ — ADMM(I) ۱۲ اپریل ۶۳ء حافظ عطا محمد فاضل عربی اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول کمالیہ کو م۔ محمد حسین کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی سکول چنیوٹ بھیج دیئے گئے ہیں تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پہ اور اپنے گریڈ میں قائم مقام اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ عبداللطیف راؤ ایس وی۔ قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد خورشید عالم ایس وی۔ قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کسووال کو راؤ عبداللطیف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پہ اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے قائم مقام ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

۱۳۲۱۸-A(2) ۱۸ اپریل ۶۳ء م۔ محمد سعید ولد م غلام نبی ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ننکر گڑھ ضلع سیالکوٹ کو یکم جون ۶۲ء (قبل دوپہر) سے قاعدہ نمبر ۴ (۱) (الف) متعلق ملازمین مغربی پاکستان (لیاقت اور نظم و ضبط) کے تحت بوجہ دانستہ غیر حاضری ملازمت سے برطرف کیا جاتا ہے۔

صیغۂ رجال ——— شعبۂ دفتر

E-۱۱۳۵۳ ۳۰ اپریل ۶۳ء م۔ محمد اصغر قائم مقام سینئر کلرک دفتر ناظر مدارس ضلع گوجرانوالہ کو م۔ محمد حنیف خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے قائم مقام سینئر کلرک گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول گوجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد حنیف خاں سینئر کلرک گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول گوجرانوالہ کو م۔ محمد اصغر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے سینئر کلرک دفتر ناظر مدارس ضلع گوجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

E-۱۰۵۹۵ ۲۸ مارچ ۶۳ء م۔ محمد رفیق احمد خاں جونیئر کلرک لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور کو م۔ اعجاز محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول

گلبرگ لاہور مقرر کیا گیا ہے۔

ایضاً — م۔ نیاز محمد جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول لاہور کو م۔ رفیق احمد خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے جونیئر کلرک لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور مقرر کیا گیا۔

نظارت مدارس قسمت راولپنڈی E-۹۲۶۰ ۱۴ فروری ۶۳ء — م۔ محمد یعقوب میٹرک (II) ایک امیدوار کو ایک عارضی آسامی پر جو پانچ ماہ کے لیے منظور ہوئی ہے بمشاہرہ -/۶۰ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی جونیئر کلرک گورنمنٹ ہائی سکول بھالیہ مقرر کیا گیا۔

ن۔م۔ق۔ ملتان G-۱۴۷۶ ۱۸ فروری ۱۹۶۳ء — م۔ محمد اکرم ولد اللہ دتا میٹرک (II) ایک امیدوار کو م۔ اعجاز محمد بھٹی قائم مقام جونیئر کلرک کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے بمشاہرہ -/۶۰ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے قائم مقام جونیئر کلرک دفتر ناظر مدارس قسمت ملتان مقرر کیا گیا۔

ن۔م۔ق۔ راولپنڈی EST-۱۰۴۷۵ ۱۶ فروری ۱۹۶۳ء — م۔ محمد نواز خاں جونیئر کلرک دفتر ناظر مدارس قسمت راولپنڈی کو ایک نئی عارضی آسامی پر یکم جنوری ۱۹۶۳ء سے ۳۰ مئی ۱۹۶۳ء تک -/۷۵ — ۶ — -/۱۰۵ — ۷ — -/۱۷۵ روپے کے پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام سینئر کلرک دفتر ناظر مدارس قسمت راولپنڈی مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ بشیر احمد بھٹی میٹرک (II) ایک امیدوار کو م۔ محمد نواز خاں کی جگہ جنھیں ترقی دیکر سینئر کلرک بنا دیا گیا ہے بمشاہرہ -/۶۰ روپے علاوہ الاؤنس تاریخ حاضری سے عارضی جونیئر کلرک دفتر ناظر مدارس قسمت راولپنڈی مقرر کیا گیا۔

صیغۂ رجال ———— شعبۂ سکول

ن۔م۔ق۔ بہاولپور E-۲۷۹۴ ۴ فروری ۱۹۶۳ء — مہر محمد حسین بی اے۔ بی۔ ٹی انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول خیرپور کو م۔ عبدالمجید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈونگا بونگا مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ عبدالمجید ایم اے۔ بی۔ ٹی۔ انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈونگا بونگا کو محمد حسین کی جگہ تاریخ حاضری سے بشاہرہ خود انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول خیرپور مقرر کیا گیا۔

ن م۔ ق بہاولپور، ۳۶۲۲۰-E، ۱۲ فروری ۱۹۶۳ء — م۔ غلام سرور میٹرک جے۔ اے۔ وی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ مڈل سکول سمہ سٹہ کو م۔ عبدالحق کی جگہ بشاہرہ خود تاریخ حاضری سے انسپکٹر تنظیم بہاولپور مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ عبدالحق میٹرک جے اے وی انسپکٹر تنظیم بہاولپور کو م۔ غلام سرور کی جگہ بشاہرہ خود ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ مڈل سکول سمہ سٹہ مقرر کیا گیا۔

ن م۔ ق۔ بہاولپور، ۳۶۴۶-E، ۱۲ فروری ۱۹۶۳ء — م۔ غلام محمد بی اے۔ بی اے۔ بی ایڈ ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول دھورکوٹ کو م۔ عبدالرحمٰن کی جگہ (جن کا حق منصب گورنمنٹ مڈل سکول دھورکوٹ کو منتقل کیا جا رہا ہے۔) بشاہرہ خود تاریخ حاضری سے سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول اُوچ شریف مقرر کیا گیا۔

۳۶۲۲۶-E، ۱۲ فروری ۱۹۶۳ء — حافظ محمد امین نائب ناظر مدارس ضلع رحیم یار خاں کو اپنی تنخواہ پر عبدالرحیم کی جگہ انسپکٹر تنظیم بہاولپور مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ عبدالرحیم انسپکٹر تنظیم بہاولپور کو ایک موجودہ خالی اسامی پر بشاہرہ خود تاریخ حاضری سے اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول مقرر کیا گیا۔

ن م۔ ق۔ بہاولپور، ۳۵۹۰-E، ۱۲ فروری ۱۹۶۳ء — م۔ رحمت علی۔ ایس۔ وی۔ ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈونگا بونگا کو م۔ نیاز احمد کی جگہ اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے ایس۔ وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول احمد پور شرقی مقرر کیا گیا۔

ایضاً — م۔ نیاز احمد ایس وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول احمد پور شرقی کو م۔ محمد یوسف کی جگہ اپنی تنخواہ پر اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے ایس وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈاہرانوالہ مقرر کیا گیا۔ ۲

سرکاری چٹھی

بنام ہیڈماسٹر صاحبان
ہائی سکولز، لاہور ڈویژن

چٹھی نمبر ۱۳۶۲۰/م مورخہ ۱۹/دسمبر ۱۹۶۲ء

موضوع:- لائبریری فنڈ سے "آموزش" اور "پنجاب ایجوکیشنل جرنل" کی خریداری۔

آپ کی آگاہی کے لیے تحریر ہے کہ پرنسپل صاحب سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے زیر نگرانی آئیڈیل بک ہاؤس ۱۹۴ انار کلی لاہور سے دو تعلیمی رسالے بعنوان "آموزش" (اردو) اور پنجاب ایجوکیشنل جرنل (انگریزی) ہر مہینے شائع ہوتے ہیں، ان رسالوں کا چندہ علی الترتیب چھ اور آٹھ روپے ہے۔

ہر دو رسالے نہایت مفید ہیں اور نظری و عملی تعلیم کے جدید ترین رجحانات سے متعلق معلومات افزا مواد پیش کرتے ہیں جو معلمین کے بہت کام کی چیز ہے علاوہ ازیں یہ دونوں رسالے محکمے سے منظور شدہ ہیں۔ آپ سے درخواست ہے، کہ براہِ مہربانی محولۂ بالا دونوں رسالے جاری کرا لیجیے۔

(پناہ علی انسپکٹر آف سکولز لاہور ڈویژن)

آموزش

جلد نمبر ۱۵ شمارہ نمبر ۱۱ لاہور مئی ۶۳

اس شمارے میں

معاونین | نذیر احمد شیخ

آموزش لاہور

مئی سنہ ۱۹۶۳ء
جلد ——— ۱۵
شمارہ ——— ۱۱

سالانہ چندہ
پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

پبلشر
یونی ورسٹی بک ایجنسی۔ لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی
۱۹۴ ، انارکلی لاہور سے شائع کیا

اداریہ

آج کل جدید تعلیم کا بہت چرچا ہے۔ اگرچہ جدید تعلیم کسی ایسے اندازِ تعلیم کا نام نہیں جسے عہدِ حاضر کے معلمین کی اُپج یا جدت طرازی کا نتیجہ کہا جائے۔ جدید تعلیم کی تحریک و تلقین اُن حقائق و نظریات پر مبنی ہے جو فطرتِ انسانی کے لیے اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا کے ہر بڑے معلم کا دماغ اِن حقائق سے ہم آہنگ تھا اور اُس کے دل کی دھڑکن اِن نظریات سے پوری طرح مطابقت رکھتی تھی۔ سن عیسوی کے آغاز سے تقریباً نصف صدی قبل جب سقراط لوگوں کو سمجھداری اور بے باکی سے سوچنے کی تلقین کرتا تھا تو وہ ایک جدید معلم ہی تھا۔ جہاں تک یہ تحریک دنیا کے سچے معلمین کی اِس خواہش اور کد و کاوش کا ماحصل ہے کہ اپنے کام کے بہتر و خوش تر تصور کو اپنایا جائے۔ اسے کوئی نئی چیز نہیں کہا جا سکتا، بلکہ وہ معلم بھی جو خواہ اِس تحریک کے سربرآوردہ مبلغین کے خیالات سے باخبر نہ ہو۔ بلکہ جبلی طور پر اپنے تلامذہ کے لیے آزادیٔ قلب و نظر کی سعی کرے، جدید معلم کہلائے گا۔ جدید تعلیم کچھ ایسی ناقابلِ رد قدروں پر مشتمل ہے جنہیں مذہب، فلسفہ اور علم الاخلاق نے ہمیشہ سراہا بلکہ اپنی تبلیغ کا لائحہ عمل بنایا۔ اس میں شک نہیں کہ انھیں اپنے مشن میں ہر بار کامیابی حاصل نہ ہو سکی کیوں کہ اُس وقت تک کوئی ایسا آلۂ کار تیار نہیں ہوا تھا جو اُن قدروں کو فرد یا جماعت کے کردار میں مؤثر بنا سکتا۔ تعلیم جسے اِس کام میں مدد و معاون ہونا چاہیے تھا، اس پر اکثر و بیشتر مختلف قدر شکن و متبذل خیالات کا غلبہ تھا۔

جدید تعلیم کو محولۂ بالا قدروں کے بروئے کار لانے اور نظریات کو عملی جامہ پہنانے کا ایک امید افزا اور قابلِ استعمال آلۂ کار سمجھنا چاہیے۔ لیکن جہاں تک جدید تعلیم کے اس پہلو کا تعلق ہے کہ یہ مشینی قسم کی بے روح تعلیم کے خلاف احتجاج کرتی ہے اور تعلیم کے روایتی تصور کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ نئی تعلیم یقیناً نئی ہے۔ کسی زمانے میں تعلیم ان تمام عوامل پر توجہ مبذول کرتی تھی جو کسی طرح بھی حصولِ تعلیم سے

تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً نصاب، طریقۂ تدریس، تنظیم، امتحان، معائنہ وغیرہ۔ لیکن بچہ، اس کی نفسیات، اس کے تخلیقی تقاضے اور اس کی دھڑکتی ہوئی زندگی پر کوئی توجہ نہ دی جاتی تھی۔ جدید تعلیم نے بچے کو مرکزی حیثیت دے کر انقلاب برپا کر دیا۔ اب تعلیم میں بچے کے علاوہ جملہ امور ثانوی درجہ رکھتے ہیں۔

جدید تعلیم میں مرکزی یا بنیادی چیز یہ ہے کہ وہ بچپن اور اس کی صلاحیتوں کا خاص لحاظ رکھتی ہے۔ وہ معلم جو اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا جدید تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔

جدید تعلیم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ بچے کی انفرادیت کا احترام سکھاتی ہے۔ اور اس حقیقت پر یقین رکھتی ہے کہ ہر بچہ کچھ یگانہ صلاحیتوں کا حامل ہے جو کسی دوسرے بچے میں اس طرح نہیں پائی جاتیں۔ چنانچہ جدید نفسیات اور نفسیاتی تحلیل نے بچوں کے انفرادی اختلافات پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ جدید تعلیم کا ماہر بچوں کی ظاہری مشابہت و مماثلت پر نہیں جاتا۔ بلکہ ان کی منفرد صلاحیتوں کا پتہ لگاتا ہے۔ وہ اس پیشہ یا استادہ طریقِ تدریس کو ٹھکرا دیتا ہے جس میں طلبہ سے حسبِ حال انفرادی سلوک کی گنجائش نہ ہو۔ وہ کسی طریقۂ تدریس کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ بلکہ بچے کی ضرورت کو دیکھتا ہے وہ بچے کی خودی کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ لیکن اسرارِ خودی کے ساتھ رموزِ بے خودی کو بھی ملحوظ رکھتا ہے اور بچے کی انفرادیت کا اس طرح نشو و نما چاہتا ہے کہ معاشرے کے لیے مفید مطلب ثابت ہو وہ جانتا ہے کہ بچوں میں سماجی احساس کو تقویت پہنچانا نہایت ضروری ہے۔ کیوں کہ یہی چیز معاشرتی تنظیم اور رواداری کی بنیاد ہے، اسے جدید تعلیم کی تیسری خصوصیت کہا جا سکتا ہے۔

جدید تعلیم میں جبر و اکراہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ سیرت کی تشکیل اور ذہن کی نشو و نما کے لیے آزادی کو ایک ضروری شرط قرار دیتی ہے۔ تاکہ بچے نفسیاتی الجھنوں کا شکار نہ ہونے پائیں۔ آزاد ماحول میں بچوں کو خود فعالی، تعلیم بالعمل، سوچ بچار اور اپنی غلطی کی معرفت سے با خبر ہو کر آپ اپنی اصلاح کے مواقع بہم پہنچتے ہیں۔ جدید تعلیم کی یہ چوتھی خصوصیت بچوں میں خود انضباطی کی تخلیق کرتی ہے، جو ایک ذمہ دار اور کامگار زندگی کے لیے ضروری ہے۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ جدید تعلیم میں (باقی صفحہ ۱۶۷ پر ملاحظہ فرمائیے)

معاشرتی ارتقا میں معلم کا کام اور مقام

اے جی بٹ پرنسپل سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور

سرکارِ رسالت کا ایک پُرمغز مقولہ مشہور ہے کہ "معلم یا متعلم بنو، اور بس، ورنہ تباہ ہو جاؤ گے"۔ تعلیم کسی قوم کی ثقافت کے تحفظ و ترقی کا، صرف ایک وسیلہ ہے۔ ممکن ہے ہم تعلیم کے مقصد و معنے کی تعبیر کرنے بیٹھیں۔ لیکن انجام کار، معلم ہی ہوگا، جو تعلیم کے حقیقی مقصد و معنے کی تعیّن کرے گا۔ قوم کی تقدیر کے بنانے میں، معلم کا فرضِ منصبی اس قدر اہم ہے کہ صحیح معنوں میں انسانی تہذیب کے مستقبل کو معلمین ہی کے نظائر و عقائد کا ثمرہ کہا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہ سچ ہے کہ ہر تغیر، خواہ وہ بہتری لائے خواہ بدتری، اوّل اوّل انسانوں کے ذہنوں ہی میں جڑ پکڑتا ہے تو یہ بھی اتنا ہی سچ ہے کہ معلم ہی وہ ہستی ہے جو اوّلاً انسانی خیالات میں اور پھر نتیجتہً انسانی کردار میں، انقلاب پیدا کرتا ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں "موجود" و "مطلوب" کے درمیان کوئی رخنہ پڑ جاتا ہے اور اسے دُور کرنے کی جستجو ہوتی ہے تو پھر یہ کام معلم اور صرف معلم ہی کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔

قومی تعلیم کے کمیشن کی رپورٹ اس بیان میں حق بجانب ہے کہ ہائی سکول کی تعلیم میں معلم ہی سب سے زیادہ ذی اثر عامل ہے۔ نصاب، نظم و نسق اور ساز و سامان وغیرہ سے متعلق اصلاحات اگرچہ اہم ہیں۔ لیکن صرف اس صورت میں جبکہ معلم کی زندہ جاوید شخصیت خود ان چیزوں میں زندگی کی روح پھونکے۔

ہر نظامِ تعلیم میں، معلم کی اہمیت کو عالمگیر حُسنِ قبول حاصل رہا ہے۔ چناں چہ امریکی تعلیم کے ایک رہنما نے لکھا تھا کہ کسی ادارے کا تدریسی عملہ، اُس کے ساز و سامان کی سب سے زیادہ ضروری مد ہے۔ امریکی ہائی سکولوں کے لیے موزُوں اساتذہ فراہم کرنا ایک ایسا کارِ عظیم ہے کہ اس مطالبے سے عُہدہ برآ ہونے کی جد و جُہد نے ہماری تہذیب کو بدحواس کر دیا ہے۔ عالمگیر تعلیم کے امریکی تجربے کی کامیابی و ناکامی کا انحصار اب اس بات پر ہے کہ ہم

تابل معلموں کے فراہم کرنے کی اہمیت رکھتے ہیں یا نہیں (ڈاکٹر سی. ایچ. جڈ)

فلاحِ انسانی میں ترقی کی تحریک، محض صحیح قسم کی تدریس ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ معیارِ تدریس کے مطابق ہی تہذیب ترقی کرتی ہے، اور معلم کا اثر بہت سی نسلوں تک باقی رہ سکتا ہے۔ معلمین عظام کی خدماتِ عالیہ جغرافیائی اور قومی سرحدوں کو توڑ کر ساری دنیا میں پھیل جاتی ہیں۔ اس ضمن میں ذرا حضرت محمد مصطفےٰ صلعم یسوع مسیح اور سقراط کے تعلیمی اثرات پر نظر ڈالیے۔

تعلیم کی ثانوی منزل میں، طالب علم، زندگی کے بڑے تشکیلی دور سے گذرتا ہے۔ اور جدید تعلیم نے یہ نکتہ پہلے کی نسبت زیادہ واضح طور پر جان لیا ہے کہ سکول کے کام میں معلم کا ذاتی اثر، اس کے مضمونِ تدریس سے زیادہ معنی خیز ہوا کرتا ہے۔ امتحان میں کامیاب ہو جانے کے مقابلے میں مدرسی کام کے متعلق اندازِ فکر کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ معلم کی جانب، متعلم کا ذاتی ردِّ عمل، اس اندازِ فکر کی تخلیق میں بہت کچھ اعانت کرتا ہے۔ ہم میں سے اکثر اس اثر سے پوری طرح باخبر ہوں گے جو کسی منفرد معلم نے کبھی ہماری زندگی پر مرتب کیا تھا۔ اگر کوئی ایسا محرک نہ ملتا تو ہم میں سے اکثر کی زندگی بالکل مختلف ہوتی۔

اس کام کی وسعت و عظمت

گذشتہ پندرہ سال نے پاکستانی ہائی سکولوں کے فرائض منصبی میں ایک تغیر کا مشاہدہ کیا ہے، ابتداءً ایک ایسا سکول جو طلبہ کو کالج کے لیے تیار کرتا اور گیارہ سے پندرہ سال تک کے بچوں کی، ایک مختصر فیصدی کی تعلیمی خدمات انجام دیتا تھا، اب اسی عمر کے بچوں کی روز افزوں تعداد کے لیے کافی سمجھا جا رہا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں صرف ۱۵۰۲۱ امیدواروں نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دیا جبکہ ۱۹۶۳ء میں ۸۲۳۰۷ کی کثیر تعداد امتحان کی خواستگار ہوئی اور ۷۹۹۸۷ امیدواروں نے امتحان دیا۔ درمیانی سال کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:۔

۱۹۴۹	۱۹۵۲۲
۱۹۵۰	۲۲۵۰۶
۱۹۵۱	۲۸۴۰۲

۳۱۵۸۵	۱۹۵۲
۲۶۵۰۸	۱۹۵۳
نامعلوم	۱۹۵۴
نامعلوم	۱۹۵۵
۵۵۲۰۳	۱۹۵۶
۵۹۹۱۷	۱۹۵۷
۶۴۰۵۸	۱۹۵۸
۶۹۷۶۹	۱۹۵۹
۷۰۵۰۶	۱۹۶۰
۶۹۷۶۹	۱۹۶۱

اس کا مطلب اتنا واضح ہے کہ نظر انداز ہونے کا احتمال پیدا نہیں ہوتا۔ اب ہمارا ہائی سکول اپنے آپ کو چند منتخب طلبہ کا سکول نہیں سمجھ سکتا۔ یہ بڑھتے بڑھتے، تمام نئی اُمت کا سکول بنتا جا رہا ہے۔ اب اِس میں یہ استطاعت نہیں کہ طلبہ کو محض کالج کے لیے تیار کر دیا کرے۔ اِس کے برعکس اب اس پر یہ لازم آتا ہے کہ طلبہ کو شہریت اور بہت سے پیشوں کی اہلیت کے لیے تیار کرنے کی مخصوص ذمہ داریاں سنبھال لے۔

ہائی سکول کے مفوّضہ کام میں تغیّر ہو جانے کے باعث لاینحل قسم کے بہت سے تعلیمی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ مثلاً سکولوں میں طلبہ کا سخت ہجوم، مناسب عمارات و سامان کی کمی، مطلوبہ صفات سے متصف اساتذہ کا فقدان، ہمہ اقسام کے نام نہاد پرائیویٹ سکولوں کی ارزاں بعلت پیداوار، کسی مرکزی تنظیمِ معلمین کی غیر موجودگی اور اُس کے نتیجے کے طور پر کسی پیشہ ورانہ قانونِ اُخلاق کا نہ ہونا۔ معلمین کے مشاہروں کی کمی اور پرائیویٹ ٹیوشنوں کی گرم بازاری ــــ آخری تجزیہ میں یہ تمام مسائل کسی دوسرے تعلیمی مسئلے کی طرح معاشرتی مسائل ہیں۔ لیکن ان کا حل سکول ہی کے ذریعے سے تلاش کرنا ہے کیوں کہ اِس ذمہ داری کو اٹھانے اور اس

خلیج کو مٹانے کے لیے جو "موجود" و "مطلوب" کے درمیان حائل ہے، کوئی دوسرا ذریعہ موجود نہیں۔

یہ ہے وہ سیاق و سباق جس کے پیشِ نظر ہمیں پاکستانی معلّم کے کام کا از سرِ نو جائزہ لینا ہے۔ تاریخ نے اُسے ایک نادر موقع دیا ہے کہ وہ اپنی قوم کو قرونِ وسطیٰ کی صبر آزما کفایت شعاری سے نکال کر بیسویں صدی کی صنعتی دنیا میں، ایک مقامِ فخر و ناز تک پہنچا دے۔ اِس ہونی شُدنی امر کو ظہور میں لانا، بیک وقت ایک استثنائی حق بھی ہے اور ایک تقاضا بھی، جس سے ہم عہدہ برآ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہم (معلمین) صورتِ حال کی واقعیت سے آنکھیں نہ چرائیں۔ لیکن اِس خواب کو سچ کر دکھانے کا کام ایک ایسے معلّم کا منتظر ہے جو کم از کم موجودہ معلّم سے اصلاً کوئی مماثلت نہیں رکھتا۔ آج کل ایک عام معلّم اپنے ہی مسائل میں ایسا غلطاں و پیچاں رہتا ہے کہ نہ نظر اٹھا سکتا ہے نہ اُس کام کو دیکھ سکتا ہے جو اُسی کے کرنے کا ہے۔ اسے مشکل ہی سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ مسائل جو اُسے تنگ کر رہے ہیں صرف قومی سطح پر حل ہو سکتے ہیں اگر معلّم کو ایک بہتر زندگی کا حظ اٹھانا ہے تو پوری قوم کو سوچنے اور زندگی بسر کرنے کی ایک نئی سطح سے متعارف کرنا ہوگا۔

المختصر، ہمارے اساتذہ کے لیے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ وہ قوم کی تعمیرِ نو کے کارِ عظیم سے شناسائی حاصل کریں بلکہ جراءت و دُور بینی کے ساتھ اس کارِ عظیم کو قبول بھی کر لیں۔ اسلامی تہذیب میں تدریس ہمیشہ ایک زبردست قوت کا سرچشمہ رہی ہے۔

—— "میری بعثت صرف معلّم کی حیثیت سے ہوئی ہے" —— یہ ہے ارشاد نبی اکرمؐ کا۔ اور انھوں نے انسانی خیالات کی تاریخ میں عظیم ترین انقلاب برپا کر کے اپنی معلّمانہ حیثیت کے ساتھ پورا پورا انصاف بھی کر دکھایا۔ ان کے متقدین میں سے اعاظم معلّمین کی ایک چیدہ جماعت نے اپنی قابلیتوں کو اسی کام کے لیے وقف کر دیا کہ اقتصادی، سماجی، سیاسی، اور دینی حیات و خیالات میں نوعِ انسان کو ترقی کی راہ دکھائیں۔

آج پاکستان کو کسی دوسری چیز سے زیادہ ایسے معلّمین کی ضرورت ہے جو جہانِ امروز کے حقائق سے آگاہ کر سکیں اور ایک طرف جدید سائنس و ٹکنالوجی اور دوسری طرف اسلام کی اَبدی

قدروں میں صحیح آگہی کا سبب بنیں۔ ایسے معلمین کا تیار کرنا ٹریننگ کالجوں اور ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ مناسب تعداد میں اچھے معلمین تیار کرنا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی میں پرائمری اسکولوں سے لے کر یونیورسٹی تک تمام اداروں کو اپنی کوششیں صرف کر دینی چاہئیں۔ یہ کام مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں ہے۔ ہمارے درمیان ایسی مایوس کن آوازوں کی کمی نہیں جو چاروں طرف بربادی کے سوا کچھ نہیں دیکھتیں۔ حضرت ویاس کے پیغمبر ہر دور میں جلد نازل ہونے والی تباہی کی پیش گوئی کرتے رہے ہیں۔ لیکن تاریخ یہی سبق دیتی ہے کہ تعلیم کے دشوار و سست رفتار عمل کے دوران خوفناک آفت کو بہتر مستقبل میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم پر ایسا ہی محکم ایمان رکھتے ہوئے، آئیے اس بات پر غور کریں کہ ہمیں معلم سے کون کون سے ذاتی ساز و سامان رکھنے کی خواہش ہو سکتی ہے۔

معلم کی تعلیم

ثانوی اسکول کے معلم کا کام پیچیدہ، سخت اور نشاط انگیز ہے۔ اس کا فریضہ صرف یہ نہیں کہ وہ اپنا مضمون اچھی طرح جانتا ہو بلکہ وہ لوگوں کو بھی جانتا ہو۔ دوسروں سے تعلقات پیدا کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو اُسے اتنی سمجھ ہو کہ تعلم کس طرح واقع ہوتا ہے۔ اور تعمیری اندازِ فکر اور متوازن جذبات کیوں کر نشو و نما پاتے ہیں۔ اُسے قوم کا ثقافتی ترکہ ہی اگلی نسلوں کو منتقل نہیں کرنا ہے۔ بلکہ نو عمر ذہنوں کو تعلم کے مختلف میدانوں میں مزید ذہنی جستجو پر بھی آمادہ کرنا ہے۔

مختصر یہ کہ ثانوی مدرسے کے معلم کا کام روزانہ چالیس چالیس منٹ کے چھ پیریڈ پڑھانے تک محدود نہیں ہے۔ اس میں طلبا کے ساتھ ہم نصابی کام، قومی سرگرمیاں، وافر مطالعہ اور تیاری بھی ضرور شامل ہونی چاہیئے۔ حیرت ناک تغیر کے اس پُرآشوب زمانے میں ثانوی مدرسہ عبوری دور سے گذر رہا ہے، اس لیے معلمین کو چاہیے کہ اپنے پروگرام کا مسلسل جائزہ لیتے رہیں۔ اور ایسے ذرائع تلاش کرتے رہیں کہ یہ زیادہ مؤثر طور پر طلبہ کی ضروریات سے مطابقت پیدا کرے۔

ان امور کی مؤثر بجا آوری کے لیے معلم کو ایک معقول فلسفۂ حیات کی ضرورت ہے۔ وہ زندگی کی گہری اور وسیع سوجھ بوجھ رکھتا ہو۔ خواہ وہ تاریخ کا استاد ہو، خواہ ریاضی کا استاد وہ تاریخی دنوں اور

الجبرائی فارمولوں کے ماوری دیکھ سکنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور اپنی تدریس کو زندگی کی دیرپا قدروں سے مربوط کر سکے۔ صرف اسی طریق سے وہ قریب و بعید کی ہر دو قدروں کے محسوس کرنے میں نوجوانوں کی مدد کر سکتا ہے۔ اس کے بغیر وہ پورے طور پر ایک اہل استاد نہیں بن سکتا۔ خواہ وہ اپنے مضمون پر کتنا ہی حاوی کیوں نہ ہو۔ اور خواہ مختلف طریقہ ہائے تدریس و تکنیک پر کتنا ہی عبور کامل رکھتا ہو۔

تعلیم کا انتہائی مقصد یہ ہے کہ نوجوان اپنے تعلّم اور اپنی بصیرت کو بروئے کار لانے کے قابل ہو جائیں ذہنی علم اور مفید مہارتیں، اگرچہ ان کی اہمیت میں کلام نہیں۔ بذاتِ خود صحیح قسم کے نمونۂ کردار کی ضامن نہیں ہو سکتیں۔ حالاں کہ تعلیم کو صرف اسی بات سے دلچسپی ہے۔ اگر ان نمونہ ہائے کردار کو جو سکول میں سکھائے گئے ہیں مادی شکل میں آنا ہے تو معلّم کو چاہیے کہ وہ، دوسری باتوں سے قطع نظر، ایک بھرپور شخصیت کا جلوہ دکھائے۔ شخصیت کی ایک عام تعریف یوں بیان کی گئی ہے "کسی فرد کے تاثراتی رجحانات کا مجموعہ"۔ یہ تعریف معلّم کے بنیادی عقائد اور توقعات کی اہمیت پر خط کھینچتی (اور انھیں نمایاں کرتی) ہے معلّم اپنے طلبہ کی رہ نمائی کرنے اور ان میں رُوح پھونکنے کی قوت حاصل کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ان قدروں کا جن کی تلقین کرتا رہتا ہے سرگرم معتقد ہو۔ اس لیے ہونے والے معلّم کو لازم ہے کہ اپنے فلسفۂ حیات کی موزونیت پر سنجیدگی سے غور کرے۔ اگر وہ اخلاقی و روحانی قدروں کے غیر فانی ہونے پر پُرسوز ایمان رکھتا ہے تو اس سے اس کے ذوق و شوق میں بھی اور مسائلِ تدریس میں بھی، زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جائے گا۔

جیسا ہمارا معاشرہ ہے ایسے نظریاتی معاشرے میں یہ مسئلہ اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے معلمین سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ نظریۂ پاکستان کے لیے معینہ خیالات و تاثرات کا رجحان وضع کریں، جو اصل کے اعتبار سے خود اسلام ہی کا نظریہ ہے۔ اگر طلبہ میں مثبت اور بھرپور طرزِ فکر کی نشوونما کرنی ہے تو معلمین پہلے اپنے کردار کو اسلام کے نمونۂ کردار کے مطابق بنائیں۔

ملازمت سے پہلے کردار کی ضرورت

تعلیم کے ذہنی میدان میں ثانوی مدرسے کے معلّم کا یہ کام ہے کہ مختلف زمانوں کی ثقافت کا ترجمان ہے

تاکہ اُس کے تلامذہ کو یہ جاننے کا شوق پیدا ہو جائے کہ دوسری قومیں کس طرح رہتی، سوچتی اور کام کرتی تھیں۔ معلّم اسی طرح اپنی چھوٹی سی دنیا کے ماورائی جہان بین کرنے میں طلبہ کی رہنمائی کرسکتا ہے اور صرف اسی طرح اِس حکمت کا پتہ لگا سکتا ہے جو ماضی کی ثقافت میں حال کے لیے موجود ہے۔ زندگی کی پیچیدگی و یکتائی کو پانے کے لیے اور اس کارگذاری کا سراغ لگانے کے لیے جو مختلف تہذیبیں تکمیلِ حیات کی خاطر انجام دیتی ہیں یہی ایک یقینی طریقہ ہے۔ لیکن ہائی سکول کا نوجوان اس ذہنی سرگرمی کے لیے صرف اُن اساتذہ کے فیضِ صحبت سے آمادہ ہو سکتا ہے جو وسیع النظر ہوتے ہوئے علومِ انسانی کے بیشتر میدانوں سے واقفیت رکھتے ہوں۔ اِس لیے ہائی سکول کے معلّم کے لیے ایک وسیع اور عام تعلیم، بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ طبیعیات، تاریخ، سیاسیات، عمرانیات، اقتصادیات اور ادبیات میں درک رکھتا ہو۔ اِس وسیع تعلیم کے علاوہ ایک یا دو ایسے مضامین پر حاوی ہو جو ہائی سکول کے نصابِ تعلیم میں مشترک ہوں۔

اِس قسم کی علمی اور نظری تیاری نہ صرف یہ یقین دلائے گی کہ معلّم جو کچھ پڑھاتا ہے اس سے خود بھی پوری طرح واقف ہے بلکہ معلّم کو بھی اِس قابل بنا دے گی کہ ہر سال، ہر ماہ، بلکہ ہر ہفتے، اپنے مضمون کے متعلق مزید معلومات حاصل کر لیا کرے۔

ہمارے ہائی سکولوں کے اساتذہ اس علمی اور نظری معیار سے نہایت درجہ فروتر ہیں۔ اگر وہ سائنس کے فارغ التحصیل ہیں تو اُن کی معلومات میں معاشرتی سائنس کا کوئی دخل نہیں۔ آرٹس کے فارغ التحصیل نوجوانوں کا معاملہ ان سے بھی بدتر ہے۔ وہ اکثر و بیشتر فارسی، عربی، اسلامیات اور اُردو جیسے مضامین لے کر بی اے پاس کر لیتے ہیں اور طبیعی یا معاشرتی سائنس سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے۔ ان کے علاوہ معدودے چند ایسے ہیں جو صرف انگریزی کے فارغ التحصیل ہیں۔ ان میں سے بعض کبھی کسی کالج میں نہیں جاتے اور کالج کے باقاعدہ متعلمین سے ہم صحبت یا ہم خیال ہونے کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے۔ مختصر یہ ہے کہ ہمارے معلمین اکثر و بیشتر اُس وسیع اور عام تربیت سے عاری ہوتے ہیں جو ایک عام طبعی زندگی کی موزوں تصویر پیش کرتی ہے، اور نتیجہ کے طور پر یہ سمجھنے میں ناکام رہے ہیں کہ علم کے تمام شعبوں کو زندگی اور اس کے مسائل کی تفہیم و تفسیر میں مناسب حصہ لینا چاہیئے۔

مہارتِ خصوصی کی جانب نظر ڈالی جائے تو وہ بھی کوئی بہتر نقشہ پیش نہیں کرتی۔ ملک کے ٹریننگ کالج مضامین کے طریقہ ہائے تدریس سکھانے کا اہتمام کرتے ہیں معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ معلم بننے والا جو کسی مضمون کے تدریسی کورس میں اختصاص حاصل کرنا چاہتا ہے، اُس مضمون میں فارغ التحصیل ہو۔ لیکن اس شرط پر پورا اترنے والوں کی تعداد اتنی مایوس کُن ہوتی ہے کہ یہ شرط معرضِ التوا میں ڈالنی پڑ جاتی ہے۔ کیوں کہ بصورتِ دیگر محض مٹھی بھر طلبہ تاریخ، جغرافیہ، اور ریاضی وغیرہ کی تدریس میں اختصاص حاصل کرنے کے اہل ٹھہرتے ہیں۔

ان امیدواروں میں جو ٹریننگ کالجوں میں اکٹھے ہو جاتے ہیں زیادہ تعداد ان کی ہوتی ہے، جو فارسی، اسلامیات، یا اُردو، جیسے مضامین میں فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ یہ مضامین مدرسی مضامین بھی ہیں لیکن مدرسوں میں ان مضامین کے لیے تربیت یافتہ فارغ التحصیل ملازم نہیں رکھے جاتے۔ کاش ہونے والے معلم کالج میں داخل ہوتے وقت اپنی آئندہ روش کے متعلق فیصلہ کر لیا کریں اور اگر مضامین لینے کے سلسلے میں ان کی رہنمائی ہو سکے تو بہت سی محنت کا ضیاع رک جائے اور نقصان و محرومی کا ازالہ ہو جائے۔ فی الحال کالج میں داخل ہونے والے اکثر نوجوانوں کے سامنے رہنمائی کا محض یہ اُصول ہوتا ہے کہ کون کون سے مضامین لے کر آسانی سے امتحان پاس کیا جا سکتا ہے۔ اس اصول کے پیشِ نظر فارسی، اسلامیات اور اُردو جیسے مضامین غیر معمولی کشش رکھتے ہیں۔ پھر ضرورت کے تحت ٹریننگ کالج حاصل کردہ نمبروں کی تعداد ہی کو داخلے کا معیار قرار دے دیتا ہے اور مضامین کی نوعیت کا پاس و لحاظ کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔

اگر معلمی کے معیار کو بلند کرنا ہے تو اس افسوس ناک صورتِ حال کا مداوا ضرور ہونا چاہیئے۔ وہ لوگ جنھیں تربیتِ معلمین کی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے اِس مسئلے سے بخوبی واقف ہیں، اور انھوں نے اِس معاملے میں فوری اصلاح کے لیے اربابِ اختیار کو توجہ دلائی ہے

پیشہ ورانہ تیاری

اس سے پہلے کہ یونیورسٹی کسی معلم کو ثانوی مدارس میں پڑھانے کا سرٹیفکیٹ عطا کرے، معلم کو یونیورسٹی کے کسی ٹریننگ کالج میں یکسالہ ٹریننگ کورس کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں تعلیمی نفسیات، اُصولِ تعلیم، انصرام مدرسہ، تاریخ تعلیم، طریقہ ہائے تدریس، اور تدریس زیرِ نگرانی کے کورس ہی بالعموم مطلوبہ کورس ہوتے ہیں۔ مدت سے یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ

وہ معلم جو تدریس کو ایک پیشہ سمجھتا ہے، نہ کہ کسی دوسرے کام کا ذریعہ، اسے زیادہ مکمل تربیت کی ضرورت ہے [illegible] کی جو آجکل مہیا کیا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں معلمین کی تربیت پر بہت زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے اور تربیت فلسفۂ تعلیم، علم توالد و تناسل، نفسیاتِ شباب اور تعلیمی آزمائشوں اور پیمائشوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ آج کل اس حقیقت کا احساس بڑھتا جاتا ہے کہ اپنے وجود کے کائناتی پہلو سے انسان کی ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی، (اُس عملی ہم آہنگی کے مقابلے میں جو عمرانی و اقتصادی ماحول سے فی الفور ہو جاتی ہے) زیادہ بنیادی ہے۔ اس طرح معلمین کی پیشہ ورانہ تربیت میں وسیع مطالعہ اور رنگارنگ تجربہ اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔

کچھ ایسے ہی مقاصد کو حاصل کرنے کی غرض سے قومی تعلیم کے کمیشن نے معلمین کی تربیت کے لیے دو سالہ کورس کی سفارش کی تھی۔ لیکن فی الحال وہ سفارش معرضِ التوا میں پڑ گئی ہے۔ اور ہمیں اس محدود وقت کو جو ہمارے اختیار میں دیا گیا ہے بہترین طور پر صرف کرنا ہے۔

ملازمت کے دوران معلمین کی بالیدگی

ملازمت سے قبل، کسی معلم کی تعلیم، خواہ کافی و وافی کیوں نہ ہو، اُسے ملازمت کے دوران مسلسل بالیدگی و افزائش کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ جب کوئی معلم مبتدی کی حیثیت سے جماعت کے رُو برو آتا ہے تو اُس کے دل میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے اور تمام پیشوں پر صادق آتی ہے۔ پیشہ وروں، تاجروں، اور صنعت کاروں کے متعلق یہ بات جامع الکلم کی حیثیت رکھتی ہے کہ جو بھی ان پیشوں کو اختیار کرے وہ اپنا مطالعہ اور اپنی بالیدگی جاری رکھے۔ وہ ڈاکٹر جو اپنا مطالعہ جاری نہیں رکھتا، اپنے میدان میں جلدی کہنگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ بھلا آدمی جو فورڈ کے ٹی ماڈل کا ایکسپرٹ تھا اگر اس نے جدید ترقیات کا مطالعہ جاری نہ رکھا ہو تو وہ آج جدید موٹر کی کیا درستی کرے گا۔ یہ بات معلم کے متعلق بھی بہت کچھ درست ہے۔

ایک معلم جو تعلیمِ دورانِ ملازمت کی خواہش یا اُس کے مواقع سے محروم ہے وہ اکثر و بیشتر ماضی کی چیز بن کر رہ جاتا ہے۔ معلم کی وُسعتِ نظری اور ژرف فہمی کا نفع براہِ راست اس کے تلامذہ تک پہنچتا ہے۔ جہاں سکول کا سٹاف ذہنی طور پر جامد ہو جاتا ہے وہاں معیارِ تدریس تیزی سے رو بہ زوال آتا ہے

اور مدرسے کے طلبہ کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل معلمین کی دورانِ ملازمت بالیدگی پر بہت زور دیا جارہا ہے۔

دورانِ ملازمت کی بالیدگی و ترقی اگوناگوں صورتیں اختیار کرسکتی ہے۔ معلمین تجدیدی کورس اور تعلیمی کارگاہ میں شرکت کریں یا کانفرنسوں اور قومی پروگراموں میں حصہ لیں۔ کچھ دنوں سے ہمارے ملک میں ان چیزوں کا نسبتاً زیادہ رواج ہوگیا ہے۔ وہاں کی افادیت جو یقیناً خارج از بحث ہے۔ تلک محدود ضرور ہوجاتی ہے۔ کیوں کہ یہ سرگرمیاں ہمیشہ سرکاری کفالت کی رہینِ منت ہوتی ہیں۔ اور اُس انفرادی مُہم جوئی سے خالی رہتی ہیں جو فطری جوش اور ذوق و شوق کی آئینہ دار ہوا کرتی ہے۔ یہ چیزیں اور زیادہ موثر ہوسکتی ہیں۔ اگر تنخواہ کے اضافوں اور ترقیوں کو دورانِ ملازمت کی بالیدگی سے مربوط کردیا جائے۔ بہرطور یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ کوئی ایسا خارجی معیار جو لیاقت کی پیمائش کرسکے اور خود معلمین کے لیے قابلِ قبول ہو تقریباً ناممکن ہے۔

ہمارے معلمین کے لیے دورانِ ملازمت بالیدگی کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ وہ پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے امتحانات دے کر اپنی اسنادِ قابلیت میں اضافہ کرلیں۔ یہ طریقہ بہت کچھ قابلِ توصیف ہے کیوں کہ یہ عام طور پر ذاتی اُپج کے اظہار اور قابلیت کے خارجی اقرار کو یکجا کرکے بعنوانِ ترقی بہتر تنخواہ اور برتر منصب پر منتج ہوتا ہے۔ اگرچہ اِس کی کچھ کم مثالیں نہیں ہیں کہ مزید اسنادِ لیاقت فوری انعامات کے حصول میں کام نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے ہیڈ ماسٹروں کا خیال ہے کہ معلم کو ہوس کے امتحان کی تیاری مدرسے کے کام سے باز رکھتی ہے۔ لیکن ان مسائل کا تسلی بخش حل معلوم کیا جاسکتا ہے اور ہمارے معلمین کو بالیدگی کے مواقع مہیا کرنے کے لیے پرائیویٹ امتحانات جاری رہ سکتے ہیں۔ ان امتحانوں کی وسعت اور افادیت کئی گنا بڑھ سکتی ہے۔ اگر یونیورسٹی کو یہ ترغیب دی جاسکے کہ بڑے بڑے قصبوں میں شام کے وقت توسیعی جماعتوں کا اہتمام کیا جائے۔

مُعلّم کے اِنعامات

معلم کی تعلیم کا یہ مختصر جائزہ، معلم کے ذاتی ساز و سامان کے متعلق تھا۔ یا اُس کی ان ذمہ داریوں کے

متعلق جن کا پورا کرنا اُس پر لازم ہے، مناسب ہو گا۔ اگر یہاں اُن انعامات کا ذکر بھی ہو جائے جو
معلّم کی محنت کے منتظر رہتے ہیں۔

آغاز ہی میں کہنے دیجیے کہ یہ انعامات مادی آسائشوں کی بجائے دِل کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ تقریباً سارے جہان میں
معلمی ایک کم اُجرت پیشہ ہے۔ معلّم ایک مزدور کی طرح نہ پہن اوڑھ سکتا ہے نہ مزدور کی طرح زندگی
کر سکتا ہے، پھر بھی اُسے بعض اوقات اتنی کم اُجرت ملتی ہے جتنی کسی بے سلیقہ مزدور کو ملے۔ چناں چہ
ہر ملک کا اوسط معلّم مجبور ہے کہ اپنی زندگی ایک ٹھاٹھ دار غربت کی نذر کر دے۔

معلّم کے تین عظیم ترین انعامات میں سے ایک انعام "فرصت" ہے۔ عملی طور پر کوئی معلّم ایسا نہیں ہے
جو تاجروں اور پیشہ ور لوگوں کی طرح سال میں پچاس ہفتے ڈیوٹی پر رہے۔ اور بہت کم معلم ایسے ہیں
جو ہفتے میں چھ دن نو سے پانچ تک پڑھاتے رہتے ہوں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اوقاتِ
تدریس کے علاوہ بھی کرنے کے لیے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ مثلاً اسباق کی تیاری اور تحریری کام کی اصلاح
وغیرہ۔ لیکن اِس میں سے بہت سا کام کوئی شخص خود اپنے مناسب وقت پر اپنے گھر بھی کر سکتا ہے لیکن
فرصت ایک ایسا استحقاق ہے جس کو اکثر معلم غلط استعمال کرتے ہیں۔ جو معلم یہ جانتا ہے
کہ اپنے وقتِ فرصت کو کیوں کر اچھی طرح استعمال کرے۔ اسے عزت و وقار کی صورت میں کافی
معاوضہ مل کر رہے گا۔

معلّم کا دوسرا انعام یہ ہے کہ وہ ایک قدر و قیمت والے مضمون پر اپنے دماغ کو استعمال میں
لا رہا ہے۔ دوسرے آدمی ان کاموں میں معروف رہتے ہیں جن میں سارے دن دماغ کو سوئے
رہنا پڑتا ہے یا ایسی سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں جو اکتا دینے والی اور فضول ہوتی ہیں۔ ایک
تاجر پر غور کیجیے، جو اپنی نشست گاہ سے بندھا اور اس ٹیلیفون کی زنجیر سے جکڑا بیٹھا رہتا ہے
جس کی گھنٹی صبح ہی بجنے لگتی ہے اور غروبِ آفتاب کے بہت بعد تک ٹنن ٹنن کرتی رہتی ہے۔ صرف
روپے کی ریل پیل ہی اس صورتِ حال کو قابلِ برداشت بناتی ہے۔ لیکن اگر معلّم کوئی اہم اور دل چسپ
مضمون مثلاً جسمِ انسانی کی ساخت یا دو عالم گیر جنگوں کی تاریخ اچھی طرح سمجھے ہوئے ہے

تو دوسروں کے سامنے، ان کی شرح کرنا اور سکھانے کے دوران خود سیکھنا، ایک حقیقی مسرت کی حیثیت رکھتا ہے۔

تدریس کا تیسرا انعام دوسرے انعام سے بہت زیادہ وابستہ ہے۔ یہ وہ مسرت ہے جو کسی شے کی تخلیق سے حاصل ہوتی ہے۔ جب معلّم کے پاس کوئی طالب علم آتا ہے تو اُس وقت طالب علم کے دماغ کی صرف ادھوری تشکیل ہوئی ہوتی ہے گویا اُس کا دماغ دھندلے خیالات اور خالی مقامات سے پُر ہوتا ہے اب یہ معلّم کا استثنائی کام ہے کہ اِس دماغ کو ایک محکم اور واضح شکل دے۔ معلّم کو اِس کام سے ایک عجیب و بے مثال مسرت حاصل ہوتی ہے ——— تخلیق انسانی میں قدرت کا ہاتھ بٹانا۔ ایک جاننے والے بچے کو صدق و کذب کا فرق سمجھانا۔ اسے حُبِ وطن کے معانی سو چنے میں لگا دینا۔ اُس سے تاریخ کے حقائق و دلائل کا سننا، جن کا پتہ لگانے میں ابھی اس کی مدد کی تھی اور جنھیں اس نے خود درست کیا اور مقصد کے موافق بنایا ہے اِس سے کچھ ایسا ہی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کسی فن کار کو اُس وقت محسوس ہوا کرتا ہے جب وہ سادہ کینوس اور کیمیاوی رنگ آمیزی کے ذریعے کوئی تصویر بنائے۔

اگر کوئی معلّم ان انعامات کو حاصل کرلے جو اُس کا پیشہ بڑی فیاضی سے پیش کرتا ہے تو اُسے کبھی غربت کا دُکھ محسوس نہ ہوگا۔ ایسا معلّم تادمِ زیست فی الحقیقت ایک عمدہ آدمی رہے گا۔ جسے سالہا سال کی پریشانی اور تنگدستی ایک غُرانے والا بدمزاج، نفرت زدہ شخص نہ بنا سکے گی ؎

(بقیہ اداریہ صفحہ ۲ سے آگے) بچوں کی تخلیقی قوت کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جاتی ہے تعلیم میں آزادی کا مطالبہ اخلاقی و تعلیمی دونوں قسم کا جواز رکھتا ہے۔ آزادی کے بغیر تخلیقی قوتوں کا اظہار نہیں ہوسکتا۔ دراصل حقیقی مسرت اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے کہ بطیبِ خاطر کوئی کام کریں۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ جدید معلّم بچوں کی تمام فعالیتوں کو اِس طرح ترتیب دیتا ہے کہ بچوں کا کام ان کے لیے ہر قدم پر مسرت کا باعث ہو۔ امید ہے کہ جدید تعلیم کی بدولت ہمارے بچوں کی خداداد ذہانت و صلاحیت ضائع ہونے سے بچ جائے گی اور وہ اپنی خودی کی بطریقِ احسن نشوونما کرسکیں گے۔ انفرادی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ زیادہ آمادۂ تعاون نظر آئیں گے، اور دوسروں کے مفاد کا لحاظ رکھیں گے ؎

مصر اور اُس کی تعلیمی ترقی

پروفیسر فضل احمد، پروفیسر محمد اسحاق اور پروفیسر محمد چوہدری سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور

نیل کی سرزمین

دریائے نیل نہ صرف دنیا کے سب سے بڑے دریاؤں میں سے ہے بلکہ اس دریا کے ساتھ بہت سی رومانی روایات اور تاریخ عالم کی بے شمار عبرت بھری کہانیاں وابستہ ہیں۔ زمانہ حال تک دنیا اس دریا کے منبع سے بے خبر تھی۔ ہزاروں برس تک اس دریا کی وادی میں بسنے والے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ اس کا زندگی بخشنے والا پانی کسی طاقتور دیوتا کے فیض کا نتیجہ ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ جولائی اگست کے مہینوں میں یہ دریا ایک دم بھر کر کناروں سے اچھل آتا ہے اور اس کا پانی نہ صرف ان کی کھیتیوں کو سیراب کر جاتا ہے بلکہ زرخیز مٹی کی ایک قیمتی تہ بھی بچھا جاتا ہے۔ ماضی کے دھندلکے سے یہ کہ اسی طرح ہوتا آیا تھا۔ نیل کی اس سالانہ فیاضی نے جھلسے ہوئے صحرا کے حاشیے پر زندگی کی دل زیب بہار پیدا کر رکھی تھی۔ قدیم زمانے کا انسان قدرتی طور پر یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ یہ کرشمہ کسی طاقتور دیوتا ہی کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے۔ اس کے اس یقین کو اس بات سے اور بھی سہارا ملتا تھا کہ وادی کے جنوبی حصے میں بلند و سنگلاخ پہاڑوں اور طوفانی آبشاروں نے ایسی دیوار کھڑی کر رکھی تھی جسے پار کرنا انسانی طاقت سے بالکل باہر تھا۔

ارد گرد کے ریگستانی بیابانوں میں مصر یقیناً ایک اعجوبے کا درجہ رکھتا تھا۔ جو شخص صحرائے اعظم یا صحرائے سینائی میں سے ہوتا ہوا مصر پہنچتا اس کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ ان لق و دق ریگ زاروں کے کنارے ایک ایسی سرسبز اور شاداب سرزمین بھی واقع ہو سکتی ہے۔ اسی تاثر نے مشہور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ مصر فی الحقیقت دریائے نیل کا تحفہ ہے۔

قدیم مصری اپنے اِس زندگی بخش دریا کا بڑا احترام کرتے تھے۔ وہ اِس طاقت ور دیوتا کو خوش رکھنا چاہتے تھے جو ان کے خیال میں اِس دریا میں پانی بھیجتا تھا۔ دوسرے چڑھاووں کے علاوہ وہ ہر سال ایک خوب صورت کنواری لڑکی بھی اِس دیوتا کی نذر کیا کرتے تھے۔ برسات کے موسم سے کچھ پہلے ایک خوب صورت لڑکی چنی جاتی اسے اچھے سے اچھے کپڑے اور قیمتی زیور پہنائے جاتے پھر اسے دریا میں پھینک دیا جاتا۔ دریا کے تھپیڑے اسے ہڑپ کر جاتے۔ عام یقین یہ تھا کہ اگر یہ انسانی قربانی نہ دی جائے تو دیوتا ناراض ہو جائے گا اور پانی بند کر دے گا۔

یہ وحشیانہ رسم اسلام کے آنے تک باقی تھی۔ فاتح مصر حضرت عمروؓ ابن العاص نے جب اس قدیم سرزمین کا انتظام سنبھالا تو یہ انسانیت سوز رسم حکماً بند کر دی گئی۔ خدا کا کرنا دیکھو کہ اِس سال دریا میں طغیانی نہ آئی بس پھر کیا تھا لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ قربانی نہ دینے سے دیوتا ناراض ہو گیا ہے۔ اب وہ طغیانی کا پانی ہمیشہ کے لیے بند کر دے گا۔ ان باتوں سے کسانوں میں ایسا ہراس پیدا ہوا کہ وہ ملک چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

حضرت عمروؓ ابن العاص نے سارا ماجرا فاروق اعظمؓ کو لکھا۔ انھوں نے جواب میں اپنا وہ تاریخی خط بھیجا جو دریائے نیل کے نام تھا اور جس کے متعلق ہدایت تھی کہ اگلے سال انسانی قربانی کے موقع پر یہ خط دریا میں ڈال دیا جائے۔ خط میں لکھا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اللہ کے بندے عمرؓ امیر المومنین کی طرف سے مصر کے دریائے نیل کے نام
اے نیل اگر تو اپنی مرضی سے بہتا ہے تو بے شک مت بہہ۔ لیکن تیرا بہنا اگر اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے تو ہم اِس کے حضور میں التماس کرتے ہیں کہ تجھے بہتا رکھے"۔

خط دریا میں پھینک دیا گیا۔ اِس سال اتنے زور کی طغیانی آئی کہ برسوں سے ایسی طغیانی نہ آئی تھی۔

اِنسانی تہذیب کا گہوارہ: اِس بات کے متعلق ابھی کوئی قطعی شہادت نہیں ملی کہ تہذیب نے

سب سے پہلے جو دنیا کے کس حصے میں جنم لیا۔ تاہم یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ مصر ان ملکوں میں سے ہے جہاں انسانی تہذیب نے سب سے پہلے ترقی کی۔ اس ملک میں مہذب زندگی کے آثار حضرت مسیح سے کوئی پانچ چھ ہزار سال پہلے ملتے ہیں۔ قدیم مصری تہذیب کے آثار اب تک نیل کی وادی میں جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ یہ آثار بیسویں صدی کے انسان کو بھی حیرت میں ڈال دیتے ہیں ان میں سے سب سے زیادہ مشہور شہرہ آفاق اہرام ہیں جو قاہرہ سے کچھ دور اپنے ابدی سر اٹھائے کھڑے ہیں۔

تہذیب کا قدیم گہوارہ ہونے کے علاوہ مصر کو ایک اور خصوصیت بھی حاصل ہے یہ تین اہم بر اعظموں یعنی ایشیا، افریقہ اور یورپ کے درمیان ایک پل کا درجہ رکھتا ہے۔ ایشیا سے اسے صرف صحرائے سینائی الگ کر رکھا ہے۔ اس صحرا کے مغرب میں بحیرۂ روم موجیں مارتا ہے جس کے اس پار یورپ کا براعظم ہے اس اہم جغرافیائی محل وقوع نے مصر کو پرانے وقتوں سے قوموں اور تہذیبوں کی لڑائی کا اکھاڑہ بنا رکھا ہے۔ فاتحین کے جو ریلے مغرب سے مشرق کو یا مشرق سے مغرب کو بڑھتے رہے وہ مصر کو روندکر جاتے رہے ہے۔ مصر پر قبضہ جمائے بغیر ہر فاتح اپنی فتوحات کو نامکمل سمجھتا رہا نتیجہ یہ نکلا کہ مصر کی تاریخ عبرت کا ایک بے مثال واقعہ بن کر رہ گئی۔ اس سرزمین میں نہ صرف انسانی تہذیب نے پرورش پائی بلکہ یہاں بیسیوں حکمرانوں نے سلطنت اور جاہ و حشمت کی داغ بیل ڈالی اور اپنا اپنا نقارہ بجاکر چلتے بنے۔ یہاں تاریخ کے نامور فاتحین نے اپنی عظمت کا جھنڈا گاڑا، اور چکاچوند پیدا کرنے والی چمک دکھاکر رخصت ہو گئے۔

آج قدیم مصری تہذیب کے صرف آثار اور اس کے شہرہ آفاق فاتحین کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں۔ تاہم انسانی تہذیب مصر کی وادی کی مستقل طور پر احسان مند ہے۔ جب کرۂ ارض تقریباً سارے کا سارا وحشت کے اندھیرے میں ڈوبا پڑا تھا، اس زمانے میں انسانی تہذیب اس وادی میں ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی۔ یہاں بسنے والے لوگ اجتماعی زندگی کے ایسے تجربے کر رہے تھے جو آگے چل کر انسانی ترقی میں کام دینے والے تھے۔

اسلام کی آمد

مصر کا اسلامی جھنڈے تلے آنا دنیا کی فوجی تاریخ کا ایک بہت بڑا اعجوبہ ہے۔ حضرت عمروؓ ابن العاص اسلام لانے سے پہلے مصر ہو آئے تھے وہ اس ملک کی خوش حالی اور اس کی معاشی ترقی سے بہت متاثر تھے۔ مسلمان جب جزیرۃ العرب سے نکل کر نواحی ملکوں سے دو دو ہاتھ کرنے لگے تو حضرت عمروؓ کے دل میں مصر کی فتح کا خیال رہ رہ کر جھلکیاں لینے لگا۔ مگر مسلمان ایرانی اور بازنطینی شہنشاہیتوں کے ساتھ بیک وقت نبرد آزما تھے دنیا کی ان سب سے بڑی سلطنتوں کے ساتھ ایک ہی وقت میں ٹکر لینا عربوں جیسی بے سروسامان قوم کے بس کی بات نہیں تھی۔ مگر اس قوم کے بازوؤں میں ایک غیبی طاقت کام کر رہی تھی جس کے بل بوتے پر اس نے ناممکن کو ممکن بنا کر رکھ دیا۔ تاہم ان حالات میں حضرت عمرو ——— مصر کا نام زبان پر نہ لا سکتے تھے۔ انھوں نے یہ بات دل ہی میں رکھی۔ مگر اس کے متعلق لگاتار سوچتے رہے۔

بازنطینی مہم میں فلسطین کا علاقہ حضرت عمرو رضؓ ابن العاص کے ذمے تھا۔ جب شام اور فلسطین بازنطینی اثر سے پوری طرح صاف ہو گئے تو حضرت عمرو رضؓ کو مصر کا خیال پھر ستانے لگا۔ سنہ۱۸ھ میں فاروق اعظمؓ شام کے دورے پر آئے تو انھوں نے مصر پر چڑھائی کرنے کی اجازت مانگی۔ ساتھ ہی مسلمانوں کے لیے مصر کی فوجی اہمیت بھی واضح کی۔ یہ ملک بازنطینی قبضے میں تھا اور دشمن اس کے ساحلوں سے شام پر سمندری حملہ کر سکتا تھا۔

فاروق اعظمؓ سلطنت کی حدود وسیع کرنے کے شائق نہ تھے۔ ہر چیز سے بڑھ کر انھیں مسلمانوں کی جانیں عزیز تھیں۔ وہ کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے جس سے مسلمانوں کو بلا وجہ تکلیف ہو۔ حضرت عمروؓ کی باتیں سن کر آپ نے فرمایا کہ شام اور فلسطین ابھی نئے نئے فتح ہوئے ہیں۔ یہاں سے فوجیں نکال کر مصر لے جانا مناسب نہیں ہے۔ حضرت عمروؓ نے عرض کی کہ مجھے صرف چار ہزار سپاہی درکار ہیں۔ اتنی فوج نکالنے سے شام اور فلسطین کا دفاع کمزور نہیں ہو جائے گا۔ ان کے اصرار پر آخر انھیں اجازت مل گئی۔

مصر میں بازنطینی لشکر کی تعداد لاکھ سے اوپر تھی۔ پھر یہ لوگ صدیوں سے وہاں قدم جمائے بیٹھے تھے۔ ان کے پاس مضبوط قلعے اور اسلحہ کے ڈھیر تھے۔ دوسری طرف حضرت عمروؓ ابن العاص صرف چار ہزار بہادروں کو لیے ایک اجنبی ملک میں قدم رکھ رہے تھے۔ جہاں کا ذرہ ذرہ ان کی مخالفت کر سکتا تھا۔ لیکن حضرت عمروؓ جس قدر بہادر تھے اسی قدر باتدبیر بھی تھے۔ انھوں نے ایسی بیدار مغزی سے کام لیا کہ بازنطینی لشکر کی ساری قوت دھری کی دھری رہ گئی ۲۳ھ تک حضرت عمروؓ نے مصر سے لے کر طرابلس تک کا سارا علاقہ فتح کر لیا۔

اسلام کا معجزہ

مسلمانوں سے پہلے کئی دوسرے فاتحین نے مصر میں قدم جمالیے تھے۔ انھوں نے یہاں اپنی حکومتیں قائم کیں، اپنا دین پھیلایا۔ مگر مصری قوم کا اپنا مخصوص رنگ اسی طرح باقی رہا۔ مگر نیل کی قدیم وادی میں اسلامی جھنڈا ایک انوکھی شان سے داخل ہوا۔ اس جھنڈے کے آتے ہی قبطی قوم کو ہر طرح کے ظلم سے نجات مل گئی لمبی صدیوں کے بعد سے پہلی بار انسانی سطح پر زندگی گذارنے کا موقع ملا۔ اس چیز نے قبطیوں کے دلوں کو فتح کر لیا۔ پہلے فاتح انھیں جسمانی طور پر بے بس بنا کر ان پر حکومت کرتے تھے۔ اسلام نے ان کے دلوں کو موہ لیا۔ اس نے انھیں ضمیر کی آزادی اور زندگی کی آسودگی بخشی نتیجہ یہ نکلا کہ قبطی اپنے ہم مذہب بازنطینیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا ساتھ دینے لگے۔

فتح مصر کے بعد بہت سے عرب قبیلے اس ملک میں آکر آ گئے۔ انھوں نے مقامی آبادی کے ساتھ مکمل برابری کی سطح پر میل جول قائم کیا۔ نتیجہ تاریخ کے ایک لاجواب عجوبے کی شکل میں نکلا۔ مصری قوم عربیت کے رنگ میں اس طرح رنگ گئی کہ وہ عرب دنیا کا ایک حصہ بن گئی زبان، لباس، رہن سہن اور دوسرے ہر لحاظ سے قبطیوں اور عربوں میں کچھ فرق نہ رہا۔ مصر کی زبان عربی اور اس کی تہذیب بھی عربی بن گئی۔ سارے شمالی افریقہ کے ساتھ یہی ماجرا گذرا۔ قبطی اور بربری قومیں جو ہزاروں برس سے اپنا جداگانہ رنگ قائم رکھے ہوئے تھیں، عربی اسلامی ثقافت میں اس طرح کھو گئیں کہ ان کا الگ وجود ختم ہو گیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عرب قوم کا حصہ اور عربی تہذیب کی علمبردار بن گئیں۔ تاریخ میں دوسری کوئی

مثال موجود نہیں، جہاں تعلیم نے قوموں کی اس طرح کا یا پلٹ کر رکھ دی ہو۔ تاریخ کا یہ معجزہ اسلامی تعلیم ہی کا کرشمہ ہے۔

جدید مصر

جدید مصر کا آغاز محمد علی پاشا سے ہوتا ہے۔ یہ شخص البانوی تھا۔ اور سلطان ترکی کے ماتحت مصر کا وائسرائے مقرر تھا۔ مگر اپنی قابلیت اور ترکی سلطنت کی بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر اس نے مصر میں ایک حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کا آخری حکمران شاہ فاروق تھا جسے ۲۶ جولائی ۱۹۵۲ء کے انقلاب نے تخت خالی کر دینے پر مجبور کر دیا۔

اس انقلاب کے پیچھے اصل ہاتھ جمال عبدالناصر کا تھا۔ چنانچہ ملک کی باگ ڈور بہت جلد اس جیرت انگیز شخص کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ناصر متوسط گھرانے کا ایک فرد ہے۔ اس کا باپ صرف ایک پوسٹ ماسٹر تھا۔ اور ناصر اس کے سات بیٹوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ غیر معمولی فطری جوہروں کے ساتھ قدرت نے ناصر کو ایک حساس دل دے رکھا ہے۔ وہ اپنے ملک اور عرب قوم کی تباہ حالی پہ بہت کڑھتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مصر چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ انھی دنوں کسی پرانے دوست سے ملاقات ہو گئی۔ اُس نے کہا باہر کیا کرنے جاتے ہو؟ ملک میں کرنے کا تھوڑا کام موجود ہے!

ناصر نے یہ بات پلّے باندھ لی اور فوراً اصلاح حال کی تدبیریں سوچنے لگا ـــــ اس کی فوجی تربیت نے اسے ایک عملی آدمی بنا دیا تھا۔ وہ نظریاتی تحریک چلانے کی بجائے عملی قدم اٹھانے میں یقین رکھتا تھا۔ آخر اس نے یہ قدم اٹھا یا، تقدیر نے اس کا ساتھ دیا اور اس کا منصوبہ بڑی خوش اسلوبی سے پروان چڑھا ـــ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر ملک کو بادشاہت سے نجات مل گئی۔ ناصر کو یہ موقع مل گیا کہ مصری قوم اور عرب کی تعمیر نو کرے۔ اس سے پہلے عرب قوم اپنی تاریخ کا سب سے تاریک دن دیکھ چکی تھی۔ وہ قوم جس کے فاتحانہ ریلے کے سامنے دنیا کی کوئی طاقت نہ ٹھہر سکی تھی۔ اب اس پستی تک پہنچ گئی تھی کہ فلسطین کے عربوں کو ان کے آبائی گھروں سے نکال باہر کیا گیا اور عرب ملک دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ انھوں نے مل کر نئی یہودی ریاست پر حملہ کیا۔ مگر منہ کی کھائی۔ عرب ملکوں کی متحدہ فوجی طاقت

ننھی سی اسرائیلی ریاست کے ہاتھوں پٹ گئی۔ اس ذلّت نے عرب قوم کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ اس پر عرب دنیا اندر ہی اندر کراہ رہی تھی۔ مگر روشنی کی ایک ہلکی سی کرن نظر نہ آتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پستی پر ہمیشہ کے لیے مہر لگ گئی ہے۔ مایوسی کے اس اندھیرے میں ناصر نے روشنی کی شمع روشن کی

حقیقت پسندی

صدر ناصر کی سب سے بڑی خوبی ان کی حقیقت پسندی ہے۔ اس نے عرب قوم کے شاندار ماضی میں کھو کر موجودہ دور کے ٹھوس حقائق کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ جہاں اس نے عرب قوم کا بہتر مستقبل تعمیر کرنے کے لیے ایک معقول منصوبہ سوچا۔ وہاں ساتھ ہی اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ منصوبہ سائنس اور ٹکنالوجی کی قوت کے بغیر کبھی پروان نہیں چڑھے گا۔ قوم کی تعمیر نو کے لیے پہلے گھر کی صفائی ضروری تھی۔ اس کے بعد جدید علوم کی مدد سے ایک طاقتور عرب قوم کی تعمیر کا مرحلہ تھا۔ پہلے مرحلے کے لیے ناصر نے ذیل کا چھ نکاتی منصوبہ تیار کیا۔

(۱) نہر سویز کو انگریزی استعمار کے ہاتھ سے چھیننا اور مصریوں کو اس قابل بنانا کہ اس نہر کو سنبھال رکھ سکیں۔

(۲) بڑی بڑی جاگیروں کو ختم کر کے کسانوں کو عزت کی زندگی عطا کرنا تاکہ وہ قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کام دے سکیں۔

(۳) ذخیرہ اندوزی، چوربازاریوں اور دوسرے سماج دشمن دولت پرستوں سے نجات حاصل کرنا تاکہ غیر ملکی استعمار کے ساتھ اس کے مصری ساتھیوں کا خاتمہ بھی ہو جائے۔

(۴) ملک میں معاشرتی انصاف قائم کرنا تاکہ ہر شخص کو اس کا جائز حق ملے اور کوئی شخص اپنی محنت کے پھل سے محروم نہ رہے۔

(۵) ایک طاقتور قومی فوج منظم کرنا تاکہ ضرورت کے وقت ملک کا دفاع ہو سکے۔

(۶) نام نہاد سیاست دانوں کی دھڑے بندیاں ختم کر کے سچی جمہوریت کی بنیاد رکھنا۔

جب یہ چھ نکاتی لائحہ عمل پہلے پہل لوگوں کے سامنے آیا تو بہت سے لوگ اس کا مذاق اڑانے لگے

ایک بہت عام فقرہ یہ تھا کہ ناصر کسانوں کے معیارِ زندگی کو آغا خان کے برابر کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھلا کس طرح ممکن ہے؟ مذاق اڑانے والے آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ بڑی بڑی جاگیریں اب ایک پرانی کہانی ہے اور وہ فلاحین جنھیں شاید سال میں دو ایک مرتبہ گوشت کھانا نصیب ہوتا تھا، اب ہفتے میں ایک بار ضرور گوشت کھاتے ہیں۔

کم و بیش اسی کامیابی کے ساتھ منصوبے کے دوسرے حصے بھی پورے ہوئے ہیں۔ مصری انجینئر اور مصری فنی ماہر نہر سویز کو بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ موجودہ سائنسی دور میں یہ بہت بڑی بات نہ سہی مگر عرب قوم اس کارنامے پر بھی فخر کے ساتھ سر بلند کر سکتی ہے۔ ان کارناموں کا ایک نہایت قیمتی اثر یہ ہوا ہے کہ مصری عوام جو ناصر کے اقتدار سے پہلے بد دلی کا شکار تھے اور عالمی معاملوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے، آج بیدار اور چوکس ہیں اور گرد و پیش کی دنیا میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ ملک بھر میں بیداری اور زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ کسانوں کی طرح صنعتی مزدوروں کی بھی سنی گئی ہے۔ ملکی صنعتیں تیزی سے ترقی کر رہی ہیں۔ سرمایہ داروں کو اس بات کی اجازت نہیں، کہ مزدوروں کے خون پسینے کی کمائی کو ہڑپ کر جائیں۔ بنک اور بیمہ کمپنیاں سرکاری ملکیت بن چکی ہیں جن ٹھیکہ داروں کی آمدنی ۴۹ ہزار پونڈ سالانہ یا اس سے زیادہ تھی ان کے کاروبار قومی ملکیت قرار دیئے جا چکے ہیں۔ ان تمام باتوں نے ایک ہمہ گیر معاشرتی انقلاب پیدا کر دیا ہے جس کے اثرات مصر کی حدود سے نکل کر باقی عرب ملکوں میں بھی محسوس کئے جا رہے ہیں۔

تعلیم سے عملی خدمت

عہدِ ناصر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تعلیم کو تعمیرِ نو کے عملی کام پر لگا دیا ہے۔ اس نے پہلے دن سے یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے موجودہ دور میں کوئی قوم اس وقت تک آگے نہیں بڑھ سکتی جب تک وہ جدید سائنس سے بھرپور خدمت نہ لے اور اس کے لیے نظری تعلیم کی بجائے عملی کام زیادہ اہم ہے۔ مصر مدتوں سے یورپ کے ساتھ رابطہ قائم کئے ہوئے تھا۔ ملک میں مغربی تعلیم کے مرکز بھی موجود تھے، مگر مصر کی صنعتی باگ ڈور غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھی۔ تمام

رت اور صنعت پر مغربی کمپنیاں چھائی ہوئی تھیں۔ ناصر نے یہ سارا کاروبار مصریوں کے ہاتھوں میں دیا۔ نتیجہ ناگزیر تھا۔ مصری حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ہر قسم کے فنی کام سیکھ گئے۔ مغربی قوموں کا یہ نعرہ ان کے بغیر مصر کی معیشت تباہ ہو کر رہ جائے گی بالکل غلط ثابت ہوا۔ تعلیم بالعمل کا اصول بالکل درست ثابت ہوا۔ مصری قوم نے بہت جلد ہر قسم کے فنی میدان میں اپنی قابلیت کا عمدہ ثبوت دیا۔

تعمیر نو کے لیے بھاری خرچ کی ضرورت تھی۔ ناصر نے تعلیم اور تعمیر نو کے میدانوں میں کسی خرچ سے دریغ نہیں کیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد مصر کے پاس کوئی دس لاکھ کروڑ ڈالر زرمبادلہ موجود تھا۔ نہر سویز کے قومی قبضے میں آجانے سے معقول زرمبادلہ کا ایک اور راستہ کھل گیا۔ پھر کپاس کی غیر معمولی فصل نے بڑی آمدنی پیدا کی۔ یہ تمام روپیہ جی کھول کر تعلیمی ترقی اور تعمیر نو پر خرچ کیا گیا۔ تاہم تعمیر نو کا کام اتنا لمبا چوڑا تھا کہ اکیلے ملکی وسائل کافی نہیں تھے۔ غیر ملکی امداد کا سہارا ناگزیر تھا۔ یہاں پھر ناصر نے غیر معمولی ہوشمندی کا ثبوت دیا۔ اس نے امریکہ اور روس دونوں سے بھاری مالی امداد حاصل کی ہے۔ وہ غیر جانبداری کی حکمت عملی پر عامل ہے اور دونوں طرف سے مدد لینے میں یقین رکھتا ہے۔ اسوان کے مقام پر دریائے نیل کے بند کو بہت اونچا کیا جا رہا ہے۔ یہ منصوبہ ۱۹۷۲ء تک پورا ہوگا۔ اس کا سارا خرچ روس برداشت کر رہا ہے۔ اس کے مکمل ہو جانے پر مصر کا زیر کاشت رقبہ ساٹھ لاکھ ایکڑ سے بڑھ کر اسی لاکھ ایکڑ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اس سے سولاکھ کروڑ کلوواٹ بجلی پیدا ہوگی۔

ناصر نے امریکہ کے ساتھ بھی بہت اچھے تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ اپنی غذائی ضرورتوں کے لیے مصر امریکہ سے مدد لیتا ہے۔ صدر کینیڈی کے ساتھ ناصر کے تعلقات بڑے دوستانہ ہیں۔ دونوں کے درمیان نہایت آزادانہ خط و کتابت جاری رہتی ہے۔

صدر ناصر کی حکومت نے تعلیم اور صحت کے میدانوں میں بڑی نمایاں ترقی کی ہے۔ خواندگی عام کرنے کے لیے ابتدائی مدرسوں کا جال پھیلایا گیا ہے۔ ہر تین دن کے اندر دو نئے ابتدائی مدرسے کھلتے اور کام جاری کرتے رہے ہیں۔ تعلیم بالکل مفت ہے۔ یونیورسٹیوں میں طلبہ کی بے پناہ بھیڑ ہے۔ کوئی سوا لاکھ طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

سب سے زیادہ توجہ سائنسی علوم کو مل رہی ہے۔ عوام کا پڑھنا لکھنا اپنی جگہ ضروری ہے مگر زندگی کے مختلف میدانوں کی رہنمائی فنی ماہروں ہی کو سونپی جا سکتی ہے۔ یہ غرض حاصل کرنے کے لیے سائنس کی پہلی عرب اکادمی قائم کی گئی ہے۔ سائنسی تحقیق کرنے والوں کی خصوصی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ حد یہ ہے کہ جامعہ ازہر میں بھی دستکاری اور عملی کام کے شعبے قائم کیے جا رہے ہیں۔ دنیا کی اس سب سے پرانی یونیورسٹی میں حال ہی تک صرف دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ اب اس میں جدید سائنس اور عملی فنون کی تعلیم بھی ملے گی سائنس کی عملی تعلیم کو عام کرنے کے لیے دیہی علاقوں میں چار ہزار کتب خانے قائم کیے جا رہے ہیں یہ کتب خانے علمی مرکز ہونے کے علاوہ ہر قسم کی معلومات بھی بہم پہنچائیں گے۔

اس تعلیمی ترقی کی اصل منزل مصر کو طاقتور بنانا اور عرب اتحاد کو قریب تر لانا ہے۔ اب تک یہ دونوں مقصد بہت اچھی طرح پورے ہوئے ہیں۔ اسرائیل کا وجود عرب دنیا کے سینے میں خنجر کے برابر ہے۔ اس چھوٹی سی ریاست نے اپنے آپ کو جوہری ہتھیاروں سے لیس کر رکھا ہے۔ عرب ملکوں کے سامنے سب سے پہلا سوال یہودی خطرے کا مقابلہ ہے۔ اس کے لیے جدید اسلحہ سے لیس فوجی قوت کی ضرورت ہے۔ ناصر نے یہ مسئلہ کامیابی سے حل کیا ہے۔ جرمن سائنس دانوں کی رہنمائی میں مصری سائنس دان راکٹ بنانے کے قابل ہو گئے ہیں۔ حلوان کے مقام پر فولاد کا ایک کارخانہ قائم ہے۔ اس جگہ آواز سے تیز طیاروں کے انجن تیار ہونے لگے ہیں۔

ان کارناموں نے نہ صرف مصر کو صنعتی دنیا میں ایک عزت کا مقام دیا ہے۔ بلکہ اس ملک کو عرب دنیا کا رہنما بھی بنا دیا ہے۔ دوسرے عرب ملکوں کے عوام جہاں اور جب بھی معاشرتی انصاف یا سیاسی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ مدد اور رہنمائی کے لیے ان کی نگاہیں فوراً قاہرہ کی طرف اٹھتی ہیں قاہرہ عرب دنیا کی بیداری کا مسلمہ مرکز بن چکا ہے۔ اس بات کو وہ عرب رہنما بھی تسلیم کرتے ہیں جو صدر ناصر اور اس کی حکومت کے دوست نہیں ہیں۔

اس قابل رشک معاشرتی ترقی کے پیچھے جمال عبدالناصر کی حیرت انگیز شخصیت کام کر رہی ہے ۴۸ سال کی عمر میں بھی یہ شخص اسی طرح انتھک ہے جس طرح جوانی میں تھا۔ وہ اٹھارہ گھنٹے تک روزانہ

کام کرتا ہے۔ قومی کام کے لیے وہ ہر وقت حاضر ہے۔ آدھی رات ہو یا آرام کا کوئی دوسرا وقت ناصر کے ساتھ ہر وقت ملاقات ہو سکتی ہے۔

عرب دنیا میں آج سب سے قوی جذبہ اتحاد کا ہے۔ عرب عوام ہر قیمت پر اتحاد چاہتے ہیں۔ وہ یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ ان کی ساری مصیبتوں کا سبب ان کی آپس کی پھوٹ ہے۔ تاہم عرب دنیا سیاسی طور پر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی پڑی ہے۔ ایسے افراد اور جماعتیں موجود ہیں جن کا مفاد اسی میں ہے کہ یہ سیاسی اکائیاں اسی طرح باقی رہیں۔ مگر یمن عراق اور شام کے حالیہ انقلابوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اتحاد کی تحریک اب روکی نہیں جا سکتی۔ اس تحریک کے پیدا کرنے میں سب سے بڑا کردار صدر ناصر نے ادا کیا ہے۔ وہ آج عرب دنیا کا سب سے بڑا ہیرو ہے۔ اس کا نام ہر عرب کی زبان پر ہے اس کی تصویر ہر عرب جھونپڑی میں موجود ہے۔ حد یہ ہے کہ یمن کے حالیہ انقلاب میں جو لوگ عبداللہ السلال اور مصری فوجوں کے خلاف لڑ رہے تھے، انھوں نے بھی صدر ناصر کی تصویریں اٹھا رکھی تھیں۔

یقیناً یہ بہت بڑا ذہنی انقلاب ہے۔ اسے پیدا کرنے کے لیے ناصر نے ہر قسم کے تعلیمی حربوں سے کام لیا ہے۔ ان حربوں میں قاہرہ ریڈیو بھی شامل ہے، جس کی نشریات دنیا بھر میں سنی جا سکتی ہیں ناصر نے یہ نکتہ خوب سمجھا ہے کہ نشر و اشاعت کے موجودہ دور میں ریڈیو سے کس طرح خدمت لینی چاہیے۔ قاہرہ ریڈیو کے رنگا رنگ پروگرام اور اس کی بھانت بھانت کی بولیاں لاکھوں انسانوں کے ذہنوں کو متاثر کرتی ہیں۔ مگر اس سے زیادہ موثر خدمت رسمی تعلیم سے لی گئی ہے۔ ملک کی اندرونی ترقی بہر حال اس کی تعلیمی ترقی ہی کی پیداوار ہے۔ ذیل میں اس تعلیمی ترقی کا اجمالی خاکہ دیا جا رہا ہے۔

— ۲ —

سترھویں، اٹھارویں صدی کے دوران مصر میں علم کی قدیم شمع مدھم ہونے لگی تھی۔ جلد ہی صنعتی انقلاب واقع ہوا، جس کے زیر اثر علمی دنیا میں بھی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ اشاعتِ علم کی کوششیں ہونے لگیں مصر کے طول و عرض میں مدارس کھلنے لگے۔ ۱۹۲۵ء میں قاہرہ یونیورسٹی وجود میں آئی۔ ۱۹۴۲ء میں اسکندریہ یونیورسٹی اور ۱۹۵۰ء میں عین شمس یونیورسٹی قائم ہوئی۔

۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو مصر میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ انقلابی حکومت نے عنانِ اقتدار ہاتھ میں لیتے ہی قومی اور ملکی ترقی کے منصوبے مرتب کئے، جن میں تعلیمی اصلاحات کو اولین حیثیت دی گئی کیونکہ جدید حکومت اس راز سے واقف تھی کہ صحیح اور مفید تعلیم ہی قومی ترقی کی سنگِ بنیاد بن سکتی ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر معیارِ تعلیم بلند کیا گیا۔ عوام میں تعلیم کا شوق ابھارنے کے لیے نامور سائنس دانوں کو انعامات تقسیم کئے گئے۔

غرض مصرِ جدید کی تعلیمی پالیسی میں خوش گوار تبدیلی آچکی ہے۔ ان جدید اصلاحی رجحانات کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:-

تعلیم کو مفید بنانے کا منصوبہ

گذشتہ چند سالوں میں افراد اور معاشرے کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے اور تعلیم سے عملی فوائد حاصل کرنے کے لیے نظامِ تعلیم کی تجدید کی گئی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے لازم تھا کہ صاحبِ ثروت اور اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے دلوں میں دستی کام کے لیے احترام کا جذبہ پیدا کیا جائے اور ان کے لیے وسیع میدان مہیا کیا جائے۔

اسی مقصد کے پیشِ نظر ہر درجہ میں پیشہ ورانہ تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کی وسیع اشاعت، نصاب اور ضروری وسائل کی توسیع۔ اساتذہ کی تربیت کا اہتمام۔ اس تعلیم کے گوناگوں مسائل کا مطالعہ اور ان کے حل کرنے کے طریقے اور فارغ التحصیل طلبہ کے مستقبل کا تحفظ بالخصوص ملحوظ رکھا گیا ہے کارخانہ داروں اور ماہرینِ معاشیات سے اس تعلیم کی خامیوں کے متعلق مشورہ لیا جاتا ہے، تاکہ اصلاحی اقدامات کئے جاسکیں اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے والے مختلف اقتصادی شعبوں کی ضروریات پوری کرنے کے اہل ہوسکیں۔ پیشہ ورانہ تعلیم کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ترقی دینے کے لیے مختلف درجوں پر مشاورتی مجلسیں قائم کی گئی ہیں۔

پیشہ ورانہ تعلیم محض اپنے مخصوص مدارس اور کالجوں تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ مختلف کمپنیوں اور بڑے بڑے منصوبوں میں کام کرنے والوں کے لیے تبیینِ تعلیم کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ یہ نصاب اس طرح

، کیا گیا ہے کہ شبینہ جماعتوں میں پڑھنے والے اسی قدر تجربہ اور قابلیت حاصل کر سکیں جس قدر عدہ جماعتوں کے طلبہ۔

پیشہ ورانہ کارآموزی (VOCATIONAL APPRENTICESHIP) کا انتظام جاری کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے مختلف جگہوں پر مراکز قائم کئے گئے۔ ان میں سے اکثر مراکز فنی مدارس سے ملحق ہیں۔ بڑی بڑی تجارتی فرموں نے شبینہ تعلیم کی عملی افادیت کو محسوس کر لیا اور اپنے کاریگروں کے لیے ایسے ہی کورس جاری کئے۔ یہاں تک کہ بعض فرموں کے زیر اہتمام شبینہ جماعتوں نے باقاعدہ فنی مدرسہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ وزارت تعلیم ایسے مدارس کو ہر قسم کی امداد دیتی ہے اور تربیت یافتہ اساتذہ اور نصابی کتب مہیا کرتی ہے۔

علاوہ ازیں وزارت تعلیم نے حال ہی میں عمومی تعلیم کے ثانوی مدارس میں پیشہ ورانہ مضامین پڑھانے کا تجربہ شروع کیا ہے۔ یہ اقدام نہ صرف پیشہ ورانہ اقدام ہی میں بلکہ بالعموم ثقافتی نظریات میں جدید رجحان کا آئینہ دار ہے۔ اس جدید رجحان کے مطابق تعلیم یافتہ اور مہذب شہری سے مراد وہ فرد نہیں جو صرف نظری علوم سے آشنا ہو بلکہ حقیقی تعلیم یافتہ وہ شخص ہے جو نظری علم کے ساتھ ساتھ عملی فنون سے بھی بہرہ ور ہو۔

تعلیمی درجہ بندی

گزشتہ چند سال میں ۱۹۵۶ء کی مجوزہ تعلیمی درجہ بندی کو آخری شکل دی گئی ہے۔ پرائمری کے لیے چھ سال کا عرصہ مقرر کیا گیا اور کوئی طالب علم تمہیدی (PREPARATORY) درجہ میں داخل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ پرائمری کے امتحانات پاس نہ کر لے۔

ثانوی تعلیم میں کوشش کی جا رہی ہے کہ درسی مضامین، نصاب، تخصیص کی ہر دو شاخوں یعنی سائنس اور ادب میں ایسا تناسب ہو کہ اعلیٰ تعلیم اور یونیورسٹی کی تعلیمی ضروریات بطریق احسن پوری ہو سکیں۔

اعلیٰ تعلیم کی کمیٹیاں جنہیں اپنے متعلقہ شعبوں کی ترقی تفویض کی گئی ہے ایسے وسائل و ذرائع کا

جائزہ لے رہی ہیں جن سے سائنسی اور علمی تقاضے پورے ہو سکیں۔

نصاب تعلیم پر نہایت تعمق کے ساتھ نظر ثانی کی گئی ہے اور مختلف تعلیمی اداروں مثلاً پرائیویٹ طلبا کے لیے نئے ضابطے نافذ کئے گئے ہیں۔ اسی طرح درسی کتب کا جائزہ لیا گیا اور قابل مصنفین سے مقابلہ کی صورت میں نئی کتب لکھوائی گئیں۔ لڑکیوں کی فنی تعلیم پر خاصی توجہ کی گئی اور اسے ہر اعتبار سے لڑکوں کی فنی تعلیم کے معیار پر لایا گیا۔

تعلیمی پالیسی

مذکورہ بالا تفصیل سے موجودہ تعلیمی پالیسی واضح ہو جاتی ہے جس کے اہم نکات یہ ہیں:-

(۱) لازمی درجہ تک عمومی تعلیم

(۲) تعلیم کے تمام مدارج پر سب کے لیے یکساں سہولتیں مہیا کرنا۔

(۳) پرائمری کے بعد کی تعلیم کو ملکی ضروریات اور وسائل کے مطابق ڈھالنا۔

(۴) تعلیم نسواں کی ترویج و توسیع۔

(۵) پیشہ ورانہ تعلیم کی توسیع اور ملک کے تمام حصوں میں مناسب تقسیم۔

(۶) اعلیٰ تعلیم کی نشوونما خصوصاً یونیورسٹیوں، سائنسی کالجوں اور اعلیٰ علوم کی توسیع۔

(۷) سائنسی تحقیقات کی سرپرستی تاکہ عصر حاضر کی سائنسی ترقی کا ساتھ دیا جائے۔

(۸) تعلیمی و ثقافتی میدان میں دوست ممالک سے تعاون۔

نظامِ تعلیم
متحدہ عرب جمہوریہ

۱- عمومی تعلیم

:- اس میں تین درجے ہیں:-

(ا) پرائمری

(ب) تمہیدی

(ج) ثانوی

۱۔ فنی تعلیم :۔ اس کے چار شعبے ہیں :۔

(ا) صنعتی

(ب) زراعتی

(ج) تجارتی

(د) فنی تعلیم برائے طالبات

۳۔ پرائیویٹ تعلیم :۔

۴۔ تربیت معلمین :

۵۔ اعلیٰ تعلیم :۔ اعلیٰ تعلیم کے ادارے دو طرح کے ہیں :۔

(ا) متحدہ عرب جمہوریہ (مصر) کی یونیورسٹیاں

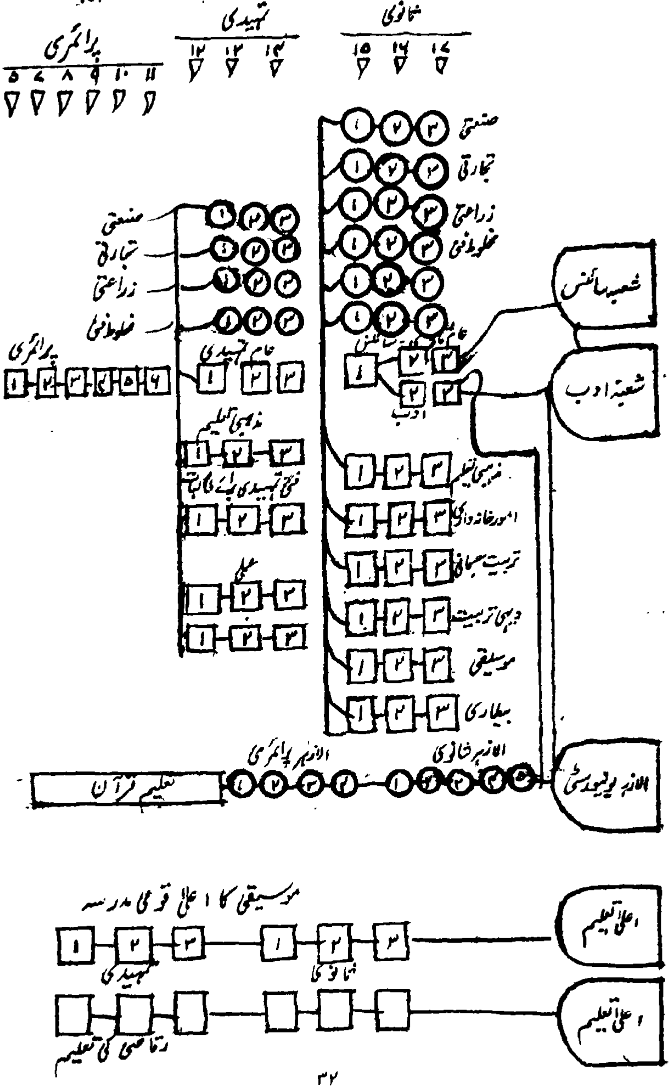
(ب) کالج اور مجالسِ تعلیم جو محکمہ تعلیم کے ماتحت ہیں۔

۶۔ عام تعلیمی خدمات۔

نظامِ تعلیم کا نقشہ

صفحہ نمبر ۳۲ پر ملاحظہ کیجیے۔

آٹھ نقش



پرائمری
۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۱۱
تمہیدی
۱۲ ۱۳ ۱۴
ثانوی
۱۵ ۱۶ ۱۷
صنعتی
تجارتی
زراعتی
شعبہ سائنس
شعبہ ادب
عام تمہیدی
ادب
مذہبی تعلیم
امور خانہ داری
تربیت جسمانی
دیہی تربیت
موسیقی
بیطاری
عملی
الازہر پرائمری
الازہر ثانوی
الازہر یونیورسٹی
تعلیم قرآن
موسیقی کا اعلیٰ قومی مدرسہ
تمہیدی
ثانوی
اعلیٰ تعلیم
رقاصی کی تعلیم
اعلیٰ تعلیم

عمومی تعلیم

درجہ پرائمری

بچہ چھ سال کی عمر میں پرائمری میں داخل ہوتا ہے۔ بعض بچے اِس سے قبل نرسری میں تین سال گذارتے ہیں۔ بچہ ۱۲ سال کی عمر تک اِس درجہ میں تعلیم پاتا ہے۔ پہلی جماعت سے چوتھی جماعت تک کوئی امتحان نہیں ہوتا اور دوران سال بچے کے روزانہ کام کے حاصل کردہ نمبروں کی بنا پر اُسے اگلی جماعت میں ترقی دی جاتی ہے۔ البتہ پانچویں اور چھٹی جماعت کے طلبہ محکمہ تعلیم کے امتحان میں شامل ہوتے ہیں اور کامیاب طلبہ کو پرائمری کی سند دی جاتی ہے جو انھیں فنی یا عمومی تمہیدی درجہ میں داخلہ لینے میں مدد ہوتی ہے۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے شماریات کے مطابق مصر میں ۷۲۰۸ پرائمری سکول تھے۔ جن میں کل ۵۰،۲۹ جماعتیں تھیں۔ پہلی جماعت میں داخل ہونے والے بچوں اور بچیوں کی تعداد ۴۹۷،۵۸۰ تھی۔ اور تمام پرائمری سکولوں میں ۲،۶۰۹،۴۷۲ طلبہ زیرِ تعلیم تھے، جن میں ۱،۶۳۲،۲۰۶ لڑکے تھے اور ۹۷۷،۲۶۶ لڑکیاں۔

اس درجہ میں مندرجہ ذیل مضامین پڑھائے جاتے ہیں :-

مذہبی تعلیم۔ عربی زبان۔ موسیقی۔ حساب۔ روزمرہ سائنس اور صحت کے بنیادی اُصول۔ تاریخ۔ قومی اور سماجی تعلیم۔ جغرافیہ۔ جسمانی تعلیم۔ ڈرائنگ۔ دست کاری۔ زراعت۔ اور کشیدہ کاری۔

ہر سبق کے لیے چالیس منٹ وقت ہوتا ہے۔

پہلی اور دوسری جماعت میں حساب پڑھانے کے لیے درسی کتب نہیں ہوتیں۔ بلکہ عملی حساب اور کارڈوں کی مدد سے حساب کے اصول ذہن نشین کرائے جاتے ہیں۔ پرائمری تک تعلیم لازمی ہے اور عوامی علم و تہذیب کی بنیاد ہے۔ اسی لیے وزارت تعلیم کے بجٹ میں ۲۰،۲۶۴،۰۰۰ (مصری پونڈ) پرائمری تعلیم کے لیے وقف کیے گئے تھے۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں یہ رقم ۲۲،۲۲۴،۰۰۰ پونڈ ہو گئی۔

مشترکہ یونٹ میں پرائمری تعلیم

دیہاتی علاقوں میں تعلیمی، معاشی، سماجی اور حفظ صحت کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے مرتبہ

یونٹ" کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس یونٹ میں ایک شعبہ صحت ہے تعلق رکھتا ہے جس میں ۱۲ مریضوں کے لیے داخلہ کا انتظام ہے اور بیرونی مریضوں کے لیے ایک ہسپتال۔ ایک اپریشن کا کمرہ۔ مرکز بہبود زچہ بچہ ایک دواخانہ اور دو انتظار گاہیں (جن میں ایک عورتوں کے لیے ہے) شامل ہیں۔

تعلیمی شعبہ دس جماعتوں کے ایک مدرسہ، ایک لائبریری۔ عجائب گھر، اساتذہ کے رہائشی مکانات نرسری، اور ایک سماجی مرکز پر مشتمل ہے۔ مشترکہ یونٹ کے پرائمری مدرسہ میں دس جماعتیں ہیں جن میں تقریباً پانچ سو لڑکے اور لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔

تعلیمی نصاب اور طریقہ ہائے تدریس میں ایسی تبدیلیاں کی گئی ہیں جن کی مدد سے ایک ایسا دیہاتی طبقہ پیدا کیا جا سکے جو باہمی تعاون سے دیہی زندگی کی تمام ذمہ داریوں کو بطریق احسن سنبھال سکے مشترکہ یونٹ میں جدید زراعتی طریقوں، دیہاتی صنعتوں اور زرعی دستکاریوں کی طرف خصوصی توجہ کی جاتی ہے۔ اس طرح شعبۂ تعلیم دیہاتی صنعتوں اور زراعت کی ترقی میں سرگرمی سے حصہ لیتا ہے طلبہ کو شعبۂ صحت کی طرف سے فرسٹ ایڈ کی عملی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

عام تمہیدی درجہ
General Preparatory Stage

تعلیمی مدارج میں یہ درجہ ۵۴ - ۱۹۵۳ء میں متعارف ہوا۔ اس کا مقصد طلبہ کو ثانوی تعلیم کے لیے تیار کرنا اور صحیح انتخاب میں رہنمائی کرنا ہے۔ عرصۂ تعلیم تین سال ہے۔

اعلیٰ جماعت میں داخلہ کے لیے طالب علم کو تحریری امتحان میں مجموعی نمبروں کا پچاس فی صد لینا ہوتا ہے۔ عربی زبان چونکہ قومی زبان ہے، اس لیے اس میں کامیابی کا معیار پچاس فیصد نمبر حاصل کرنا ہے۔ غیر ملکی زبان میں چالیس فی صد۔

سن ۶۲ - ۱۹۶۱ء میں ایسے مدارس کی تعداد ۸۰۷ تھی جن میں کل ۶۶۰۸ جماعتیں تھیں اور طلبہ کی مجموعی تعداد ۲۴۹۱۲۹ تھی۔

بعض تمہیدی مدارس میں جرمنی زبان پڑھائی جانے لگی ہے اور اس مقصد کے لیے تعلیمی اُمور کے

مطابق درسی کتب تیار کرائی گئی ہیں۔

گذشتہ چند سال سے وزارتِ تعلیم موسیقی کی تعلیم میں خاص دلچسپی لے رہی ہے ——— موسیقی کی خصوصی صلاحیت رکھنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے تمہیدی مدارس جاری کیے گئے ہیں۔ ان مدارس کے طلبہ عام تمہیدی مدارس کے نصابی مضامین کے علاوہ موسیقی اور رقص کی عملی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ موسیقی اور رقص کے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔

تمہیدی درجہ میں کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ البتہ جسمانی تربیت لائبریری اور فنی تعلیم کے لیے ایک پونڈ اور تحفظ صحت کے لیے ۱۵ (MHS) وصول کیے جاتے ہیں۔ تاہم نادار طلبہ اور پچھلے امتحان میں ۷۵ فی صد نمبر لینے والوں سے یہ برائے نام رقم بھی واپس نہیں لی جاتی۔

عام ثانوی تعلیم

تمہیدی مدارس کا امتحان پاس کرنے والے طلبہ ثانوی مدرسہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ طلبہ کے یومیہ کام پر خاص زور دیا جاتا ہے اور ہر طالب علم کو ہر مضمون میں ۲۵ فی صد نمبر یومیہ کام کی بنا پر دیئے جاتے ہیں اور بقایا ۷۵ فی صد تحریری امتحان کے لیے وقف ہیں۔

پہلے سال عام نصابی مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ دوسرے سال سے سائنس اور ادب کے شعبے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ وزارتِ تعلیم سائنسی مضامین کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ان کی ترویج و توسیع میں بے حد دلچسپی لیتی ہے۔ مدارس کے لیے لیبارٹری۔ لائبریری، نگار خانے، تاریخی و جغرافیائی عجائب خانے مہیا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔

سنہ ۱۹۶۰ء میں ایک نیا تجربہ کیا گیا۔ اس غرض کے لیے پانچ ثانوی مدارس (چار طلباء کے اور ایک طالبات کا مدرسہ) مخصوص کیے گئے۔ ان تجرباتی مدارس کے نصاب میں یہ خصوصیت تھی کہ عام تعلیمی مضامین کے ساتھ ساتھ طلبہ کو پیشہ ورانہ مضامین بھی پڑھائے جائیں، تاکہ فنی اور ثقافتی پس منظر لیے ہوئے متوازن قسم کے شہری پیدا ہوں۔

جدید تعلیمی رجحانات میں طلبہ کی انجمنوں اور کونسلوں کی تشکیل نہایت اہم ہے۔ ان انجمنوں کا مقصد

طلبہ کو تعاون اور جمہوریت کی تربیت دینا ہے اور ان کی مدد سے طلبہ کے مسائل اور ان کی دلچسپی کے امور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ انجمنیں اور کونسلیں اساتذہ کی رہنمائی اور طلبہ کے والدین کی نمائندگی میں عوامی ترقیاتی منصوبوں میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ یہ کونسلیں جماعت، درجہ اور مدرسہ کی سطح پر تنظیم پاتی ہیں۔ مدرسہ سے باہر تعلیمی حلقہ کی کونسل ہوتی ہے اور اعلیٰ کونسل پوری جمہوریہ کی سطح پر بنتی ہے جس میں طلبہ اساتذہ اور محکمہ تعلیم کے نمائندے شامل ہوتے ہیں۔ یہ تمام انجمنیں اور کونسلیں اپنے اپنے دائرۂ کار میں پوری تندہی سے مصروف عمل ہیں۔ مدرسہ کے اندر اور باہر یہ انجمنیں بے شمار مفید خدمات انجام دے رہی ہیں۔ نیز یہ انجمنیں نیشنل یونین کمیٹی، مدرسہ اور علیحدگی اداروں میں رابطہ قائم کرنے میں ممد و معاون ہیں۔

۷۰-۱۹۶۹ء کے دوران عام ثانوی مدارس میں پڑھنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد ۲۰۸۱۶ تھی۔ کل جماعتیں ۳۸۹۳ اور اساتذہ کی تعداد ۸۲۸۲ تھی۔

اس درجہ پر بھی طلبہ سے کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی۔ البتہ فنی تعلیم، تربیت جسمانی، لائبریری اور تحفظ صحت کے لیے ½ پونڈ لیا جاتا ہے۔ نادار طلبہ اور پہلے امتحان میں ۷۵ فی صد نمبر والے طلبہ اس رقم کی ادائیگی سے بھی مستثنیٰ قرار دئے جاتے ہیں۔

فنی تعلیم
Technical Educations

۱۔ صنعتی تعلیم

موجودہ دور کے صنعتی تقاضوں کے پیش نظر اس تعلیم کو ہر درجہ پر خاص اہمیت حاصل ہے۔ سن ۱۹۶۰ء میں ۴۲ ابتدائی فنی مدارس کھولے گئے۔ ان مدارس میں ۱۸۱۳۱ طلبہ زیر تعلیم تھے۔

گذشتہ تین سال میں ثانوی صنعتی مدارس کی تعلیم کو جامع بنانے کے لیے ۲۵ متعلقہ صنعتی صیغوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ایسے مدارس میں ۲۳۰۶۸ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ محکمہ تعلیم صنعت مدارس کے انتظام اور فنی نگرانی کو بہتر بنانے کے لیے تعلیم کے مختلف شعبوں سے ماہر اور تجربہ کار اساتذہ کی خدمات حاصل کرتا ہے۔ ۱۰۰۰۰ از یہ سال کے دوران مختلف تربیتی کورس جاری رہتے ہیں۔ اور اساتذہ کا معیار بہتر بنانے کے لیے

خصوصی کورسوں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔

صنعتی پیشوں میں لڑکیوں کی دلچسپی اور کامیابی کے پیش نظر وزارت تعلیم نے ۱۹۶۱ء میں ایک ثانوی مواصلاتی مدرسہ (Secondary Telecommunication) قائم کیا جس میں طالبات کو وصول و ترسیل پیغامات، مشینوں اور نشرگاہوں کی دیکھ بھال اور ان کے استعمال کی تربیت دی جاتی ہے۔

اس مدرسہ میں داخلہ کے لیے ضروری ہے کہ طالبہ عام تمہیدی امتحان پاس کر چکی ہو۔ اور جسمانی صحت کے لحاظ سے موزوں ہو۔ تمہیدی امتحان میں حاصل کردہ نمبروں کی بنا پر داخلہ میں ترجیحی طریق اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کا نصاب تین سالہ ہے جس کے اختتام پر طالبہ کو سیکنڈری ٹریڈ سکول ڈپلوما دیا جاتا ہے۔

لڑکیوں کے تمہیدی صنعتی مدرسہ میں یہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں:-

امور خانہ داری۔ سلائی۔ مہارت فروخت۔ معاون معمل۔ قالین بافی۔ مشینی بنائی۔ اور ہلکی مشینوں کی دیکھ بھال۔

جو طلبہ عام ثانوی امتحان پاس کر لیں۔ مگر یونیورسٹی کی تعلیم جاری نہ رکھ سکتے ہوں۔ ان کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع بہم پہنچانے کے لیے پیشہ ورانہ تربیتی مراکز قائم کئے گئے ہیں۔ ان مراکز سے تربیت پا کر تجرباتی فارموں اور کمپنیوں میں فورمین بھرتی ہو سکتے ہیں۔

۲۔ زراعتی تعلیم

اس تعلیم کے دو مدارج ہیں۔ تمہیدی اور ثانوی۔

تمہیدی مدارس کا مقصد زرعی امور کو بہتر طریق سے انجام دینے کے لیے تربیت یافتہ کارندے تیار کرنا ہے۔ ثانوی تعلیم ماہرین زراعت پیدا کرتی ہے جو کھیتوں کے انتظام سنبھالنے۔ زرعی منصوبوں کی تکمیل کرنے۔ زراعتی تعلیم کے مختلف شعبوں میں خدمات انجام دینے اور زراعتی مضامین پڑھانے کے فرائض پورے کرتے ہیں۔

اب تمہیدی زراعتی مدارس کی تعداد ۳۰ تک جا پہنچی ہے۔ جن میں ۱۲۱۳ جماعتیں ہیں اور ۸۸۲۳۳

زیر تعلیم ہیں۔ ثانوی مدارس ۱۲ ہیں جن میں ۲۳۷ جماعتیں اور ۱۰۵۲۳۲ طلبہ ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں ۵۰۴۰۰ ایکڑ زمین ان مدارس کے زیر استعمال تھی اور اب تقریباً ۲۱۷،۰۸۰ ایکڑ رقبہ ان مدارس کے تجرباتی اور تربیتی فارموں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

دو صوبوں میں وزارت تعلیم نے ۴۰ ورک کیمپ قائم کئے ہیں اور زرعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زرعی پروگرام سارا سال جاری رہتے ہیں۔

اساتذہ کی تربیت اور تربیت یافتہ ان کی کارگذاری میں وزارت تعلیم پوری پوری دلچسپی لیتی ہے تربیت یافتہ اساتذہ کا مکمل ریکارڈ رکھنے کے لیے وزارت زراعت نے محکمہ تعلیم کے تعاون سے کارڈ انڈیکس سسٹم جاری کیا ہے ۱۹۶۱ء میں زراعتی مدارس کے لئے ایک شماریاتی کارڈ شروع کیا گیا جس سے ان مدارس کے مسائل سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

۴۔ تجارتی تعلیم

تجارتی تمہیدی مدارس :۔ اس کی پہلی جماعت میں داخل ہونے کے لیے پرائمری امتحان پاس کرنا ضروری ہے۔ نیز لڑکے یا لڑکی کی عمر یکم اکتوبر کو سترہ سال سے کم ہونی چاہیے۔ اس مدرسہ کا نصاب تین سال کا ہے، جس کے اختتام پر طالب علم کو تجارتی تمہیدی سند دی جاتی ہے۔ کامیاب ہونے والے طلبہ ثانوی مدارس میں داخلہ لے سکتے ہیں۔

تجارتی ثانوی مدارس : پہلی جماعت میں داخلے کے لیے عام تمہیدی امتحان پاس کرنا شرط ہے اور امیدوار کی عمر یکم اکتوبر کو ۱۹ سال سے کم ہونی چاہیے۔ اس درجہ کا نصاب ۳ سالہ ہے جس کے خاتمے پر ثانوی تجارتی تعلیم کا ڈپلوما دیا جاتا ہے۔ اس درجہ کا تعلیمی نصاب یہ ہے :۔

(۱) ثقافتی مضامین جو عمومی تعلیم میں ہیں

(۲) فنی مضامین :۔ کھاتہ نویسی۔ مالیاتی حساب۔ تجارتی تربیت عربی میں۔ تجارتی تربیت فرانسیسی یا انگریزی میں۔ اصول معاشیات۔ عربی ٹائپ۔ فرانسیسی یا انگریزی ٹائپ۔

۱۹۶۰ - ۱۹۶۱ء میں تجارتی ثانوی مدارس کی تعداد ۷۶ تھی جن میں ۱۲۱۳ جماعتیں تھیں اور زیر تعلیم

طلبہ کی تعداد ۳۶۲۲۲۷۶ تھی۔

تہمیدی مدارس ۱۴ تھے جن میں ۲۰۴ جماعتیں تھیں اور طلبہ ۵۵۹۴ تھے۔ جن میں ۱۷ لڑکے اور ۵۵۳۲۲ لڑکیاں تھیں۔

محکمۂ تعلیم اساتذہ کے لئے تربیتی کورسوں کا اہتمام کرتا ہے اور تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی پوری کرنے کے لیے اعلیٰ تجارتی ادارہ برائے معلمین کا اجراء عمل میں لایا گیا ہے جون ۱۹۶۱ء میں اس ادارے نے اساتذہ کی پہلی جماعت تیار کی۔ شعبۂ تعلیم میں تربیتی کورس جاری کئے اور ماہرین کی خدمات مستعار لی گئیں۔ مزید براں اساتذہ کو ہر سال چار ماہ کے لیے مختلف بنکوں اور کمپنیوں میں عملی تجربہ حاصل کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

پیشہ ورانہ تجارتی مطالعہ: ثانوی امتحان پاس کرنے کے بعد جو طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکتے ہیں ان کے لیے ۱۹۵۶ء سے تجارتی مطالعے کے مراکز قائم کئے گئے ہیں۔ ان مراکز میں طلبہ تجارت فروخت۔ بیمہ۔ اور سکرٹری کا عہدہ سنبھالنے کے لیے عملی تربیت حاصل کرتے ہیں۔

پرائیویٹ تعلیم: یہ نظام تعلیم جمہوریہ عرب میں ۱۹۵۸ء کے قانون نمبر ۱۶۰ کے تحت نافذ العمل ہے۔ وزارتِ تعلیم پرائیویٹ مدارس پر کڑی نگرانی رکھتی ہے۔ اور محکمہ تعلیم کے افسران مدارس کا گاہ بگاہ معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ تمام پرائیویٹ اور غیر ملکی ادارے مندرجہ ذیل مضامین کی تعلیم دینے پر مجبور ہیں۔

عربی زبان — مذہبی تعلیم — تاریخ — جغرافیہ

قومی تعلیم: اس ضابطہ کے تحت تمام ملک کے اداروں میں تعلیمی سرگرمیوں کی ترویج کے لیے حکومت مناسب رہنمائی کرتی ہے۔

پرائیویٹ اداروں کی ضروریات کے مطابق وزارتِ تعلیم ان کی فنی اور مالی امداد کرتی ہے۔ فنی امداد میں معلمین و معلمات مہیا کرنا بھی شامل ہے۔

امسال پرائیویٹ اداروں کی فیس میں پچاس فی صد کمی کرنے اور اساتذہ کی تنخواہوں میں

اضافہ کرنے کے لیے ایک نیا قانون جاری کیا گیا ہے۔ اس طرح سرکاری اور نجی اداروں کا تعلیمی معیار اور اساتذہ کی تنخواہیں یکساں درجہ پر آگئی ہیں۔

تربیت معلمین

مصر میں مندرجہ ذیل ادارے مختلف قسم کے اساتذہ کی تربیت کے ذمہ دار ہیں۔

۱۔ عمومی ادارہ برائے تربیت معلمین و معلمات :۔ ان اداروں میں پرائمری اور تمہیدی مدارس کے لیے اساتذہ تیار کئے جاتے ہیں۔

۲۔ مدرسہ تربیت معلمین برائے دیہات :۔ ایسے مدارس میں پرائمری اور تمہیدی مدارس کے لیے اساتذہ کو تربیت دی جاتی ہے۔

۳۔ ٹیچرز ٹریننگ کالج (ثانوی مدارس کے اساتذہ کے لیے)

۴۔ اعلیٰ صنعتی ادارہ برائے معلمین (صنعتی مدارس کے معلمین کے لیے)

۵۔ اعلیٰ تجارتی ادارہ برائے معلمین (تجارتی مدارس کے معلمین کے لیے)

۶۔ اعلیٰ زراعتی ادارہ برائے معلمین (زراعتی مدارس کے معلمین کے لیے)

تربیتی پروگرام کے مقاصد درج ذیل ہیں :۔

۱۔ تعلیمی حلقوں میں نافذالعمل پروگراموں کی تکمیل کرنا۔

۲۔ تعلیم کے مختلف مدارج پر طریقہ ہائے تدریس و تعلیم کے نئے رجحانات کی ترویج۔

۳۔ اعلیٰ سائنسی پروگراموں کو ترقی دینا اور طلبہ کو سائنسی علوم کی تفہیم۔ جدید رجحانات سے شناسائی بہم پہنچانے میں رہنمائی کرنا

۴۔ زرعی۔ تجارتی اور صنعتی تعلیم میں تربیت پر خصوصی توجہ مبذول کرنا۔

۵۔ اساتذہ کو نظری تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی تربیت بہم پہنچانا۔

اعلیٰ تعلیم

ملک کی موجودہ اور مستقبل کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر اعلیٰ تعلیم کی پالیسی وضع کی گئی ہے۔ ۱۹۵۲ء سے

مقامی ضروریات کے مطابق تعلیمی ادارے بکثرت کھولے گئے۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے، فنی مدارس (صنعتی تجارتی زراعتی) کے لیے اساتذہ مہیا کرتے ہیں اور جدید آلات اور مشینوں کے استعمال اور دیکھ بھال کے لیے ماہرین تیار کرتے ہیں۔ ماہرین کی کمی جو فنی ترقی کی راہ میں حائل تھی، فنی اداروں کے قیام سے دور ہو چکی ہے۔ یہ ادارے وزارتِ تعلیم کے ماتحت ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ معلمین کے اعلیٰ ادارے ———— سات

۲۔ معلمات کے اعلیٰ ادارے ———— آٹھ

۳۔ سرکاری اعلیٰ فنی ادارے ———— انیس

۴۔ غیر سرکاری فنی ادارے ———— تین

پہلے سال میں داخلہ لینے والے طلبہ کے لیے لازم ہے کہ انھوں نے عام ثانوی امتحان پاس کر لیا ہو۔ عرصۂ تعلیم صنعتی اداروں میں پانچ سال اور باقی مذکورہ بالا اداروں میں چار سال ہے۔

سال ء میں حکومت جمہوریہ نے ایک افریقا ایشیائی فنی ادارہ قائم کیا جس میں تین سو طلبہ ہوں گے۔ دو سو طلبا افریقی ایشیائی ممالک سے لئے جائیں گے اور ایک سو ملکی طلبہ داخل ہوں گے یہ ادارہ اقامتی ہوگا۔ تاکہ تمام طلبہ سماجی و ثقافتی سرگرمیوں میں شمولیت کر سکیں۔ نصاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ درجہ اول ۲½ سال کا ہے، جس کے اختتام پر طالب علم کو فنی سند دی جاتی ہے کامیاب ہونے والے طلبہ درجہ دوم میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ درجہ دوم دو سال کا ہے۔ جس کے خاتمے پر انھیں انجینیرنگ، زراعت، اور کامرس میں ایم۔ ایس سی کی ڈگری دی جاتی ہے۔

طالب علم کو اپنے خصوصی مضمون میں عملی تجربہ حاصل کرنے کے لیے پہلے سولہ ماہ کالج سے باہر کام کرنا پڑتا ہے۔ غیر ملکی طلبہ کی سہولت کے لیے عربی کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی میں بھی تمام مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ طلبہ مندرجہ ذیل مضامین پڑھتے ہیں۔

(ا) عام سائنس جس میں سوشل سائنس شامل ہے۔

(ز) بین الاقوامی معاشی روابط

(iii) معاشیاتی جغرافیہ و تاریخ ۔ نیز

(iv) فنی مضامین جن کی تقسیم درج ذیل ہے

(ا) تجارتی شعبہ :۔ معاشیات ۔ قانون ۔ انتظامیہ ۔ حسابات ۔ ٹائپ اور مختصر نویسی وغیرہ۔

(ب) زراعتی شعبہ :۔ زراعت کے بنیادی مضامین، مثلاً بیج بونا، کھیتوں کی نگہداشت ۔ علم نباتات ۔ زراعتی صنعتیں ۔ دودھ دوہنا ۔ دیہاتی زندگی ۔ معاشیات ۔ زرعی شماریات ۔ نسل کشی حیوانات ۔ مطالعہ حشرات ۔ پودوں کی حفاظت کی مشینوں کی نگہداشت اور استعمال اور جنگلات ۔

(ج) صنعتی شعبہ :۔ انجینیرنگ کالج کے تمام مضامین مثلاً :۔ علم الآثار ۔ سول انجینیرنگ ۔ مکینیکل انجینیرنگ ۔ الیکٹریکل انجینیرنگ ۔

یونیورسٹی کی تعلیم

علمی دنیا میں حیات نو پیدا کرنے اور ذہنی انقلاب برپا کرنے میں یونیورسٹیاں قائدانہ حیثیت رکھتی ہیں ۔ اسی لیے سائنس داں اساتذہ ۔ ماہرین فنی مصنفین اور منتظمین پیدا کرنے کا کام یونیورسٹیوں کو تفویض کیا گیا ہے

متحدہ عرب جمہوریہ میں پانچ یونیورسٹیاں ہیں :۔

۱ ۔ قاہرہ یونیورسٹی ۱۹۲۵ء میں قائم ہوئی ۔ اس میں دس علمی شعبے ہیں ۔ اس کی ایک شاخ خرطوم (سوڈان) میں کھولی گئی ہے جس میں آرٹ ۔ قانون اور کامرس کے شعبے ہیں ۔

۲ ۔ اسکندریہ یونیورسٹی ۱۹۴۲ء میں قائم ہوئی ۔ اس میں نو علمی شعبے سرگرم کار ہیں ۔

۳ ۔ عین شمس یونیورسٹی ۱۹۵۰ء میں قائم ہوئی اس میں نو علمی شعبے ہیں اور دو تعلیمی ادارے ۔

۴ ۔ اسیوط یونیورسٹی کا اجرا ۱۹۵۷ء میں ہوا ۔ اس میں زراعت ۔ انجینیرنگ اور سائنس کے علمی شعبے ہیں ۔

۵ ۔ ازہر یونیورسٹی :۔ ازہر یونیورسٹی کے سوا باقی یونیورسٹیوں کے سال اول میں داخل ہونیوالوں کی تعداد ۱۴۷۹۱ تھی جن میں ۸۵۵۴ طلباء نے ادبی شعبے میں داخلہ لیا ۔

عام ثانوی امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہونے والے طلبہ یونیورسٹیوں میں داخلہ لے سکتے ہیں۔

سنہ ۱۹۵۹ء میں یونیورسٹیوں کی اصلاحات کا قانون نافذ کیا گیا۔ نظری تعلیم میں نئے اختصاصی نصاب جاری کیے گئے، مثلاً صحافت۔ لائبریری۔ سائنس۔ ترتیب و تحفظ دستاویزات۔ تعلقات عامہ۔ انتظامیہ سیاسیات اور معاشیات کا نیا شعبہ سال ۱۹۶۱ء میں کھولا گیا۔

صنعتی اور زرعی منصوبوں کی تکمیل کے لیے فنی ماہرین پیدا کرنے کے لیے یونیورسٹیوں میں عملی تربیت کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔

طلبہ کا بنک

بعض نادار طلبہ جو یونیورسٹی کی تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کی مدد کے لیے سنہ ۱۹۶۱ء میں ایک بنک جاری کیا گیا۔ اس بنک سے قابل اور نادار طلبہ کو قرضے دیئے جاتے ہیں۔ قرضہ دینے میں طلبہ کو پہلے امتحان میں حاصل کردہ نمبروں اور تعلیمی شعبہ کی مناسبت سے ایک دوسرے پر ترجیح دی جاتی ہے۔

ازہر یونیورسٹی

یہ دنیا کی بزرگ ترین اور قدیم ترین اسلامی درس گاہ ہے۔ اس نے اسلامی تاریخ پر گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔ اسلامی روایات اور عربی زبان کے تحفظ میں اس درس گاہ نے بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ تاہم اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی قدامت اور استحکام کے باوجود یہ ادارہ عصر کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہو چلا تھا کیوں کہ آج کی زندگی کی اقدار ہمارے اسلاف کی اقدار سے قطعی مختلف ہیں۔

جو لوگ اس عظیم ادارے کی انفرادیت قائم رکھنے کے متمنی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ایک طرف ایسے علمائے دین پیدا ہوں جو دنیوی حقائق کا بھی سامنا کر سکتے ہوں اور دوسری طرف دنیوی علوم کے ایسے ماہرین ہوں جو دین و مذہب کی روح سے آشنا ہوں یہی واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے دین اور دنیاوی زندگی کی خلیج کو پر کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے مددومعاون ہوں گے۔

ازہر یونیورسٹی کے فارغ التحصیل دین و دنیا کے علوم کا حسین امتزاج پیش کریں گے۔

ازہر یونیورسٹی کی ترقی کے نئے رجحانات

(۱) ازہر یونیورسٹی کو ایسا جامع ادارہ بنانا کہ وہ مشرق و مغرب میں جدت و قدامت اور یگانگی کی افزلوی روایات کی حامل ہو۔

(۲) یہ ادارہ اپنی ہزار سالہ روایت کے مطابق اسلام کا محافظ رہے۔ جہاں اسلام کی تعلیم اپنی حقیقی صورت میں پیش کی جاتی ہے۔

(۳) ازہر اور دوسری یونیورسٹیوں کے درمیان کوئی بُعد نہ رہے۔ ازہر اور دوسری یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے۔ حصول تعلیم اور پیشہ میں سب کو یکساں مواقع حاصل ہوں

(۴) جمہوریہ کی تمام یونیورسٹیوں کی علمی سندات کا یکساں مقام تسلیم کیا جائے۔

ازہر یونیورسٹی کی تنظیم نو کا قانون انہی اصولوں کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے اور اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس ادارے کی انفرادی خصوصیات اور تعلیمی معیار میں کوئی کمی واقع نہ ہو۔

ازہر یونیورسٹی کے تعلیمی شعبے

۱۔ ازہر کی اعلیٰ مجالس

۲۔ ادارۂ تحقیقات علوم اسلامیہ

۳۔ شعبۂ وفود اسلامیہ و ثقافیہ

۴۔ ازہر کے تعلیمی ادارے۔

۵۔ ازہر یونیورسٹی۔

یونیورسٹی ضابطہ کے تحت اس کے تعلیمی شعبے مندرجہ ذیل ہیں:۔

تعلیمات اسلامیہ۔ عربی۔ انتظامیہ۔ انجینئرنگ۔ دستکاری۔ زراعت۔ علم الادویہ۔

ان شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اسلام کے گہرے مطالعہ کے علاوہ ان مضامین کو بھی

بہرہ ور ہوتے ہیں جو اسی شعبہ کے طلبہ دوسری یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں۔

قابل طلبہ کے لیے درجۂ اختصاص (Specialization) میں اعلیٰ اسلامی علوم اور عربی زبان و ادب کے مطالعہ کی سہولتیں موجود ہیں۔ یہ طریق کار ازہر اور دوسری اسلامی یونیورسٹیوں کے لیے نیا نہیں ہے۔ ماضی کے بڑے بڑے ماہرین علوم ادویہ، کیمیا اور ریاضیات کے فاضل علوم دینیہ کے بھی متبحر عالم تھے مثلاً ابن سینا، الفارابی، ابن الہیثم، جابر بن حیان وغیرہم۔

عام ثانوی مدارس کے طلبا ازہر یونیورسٹی میں داخلے لے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ انھوں نے قرآن، حدیث، اعتقادات، اسلامی معاشرت، اسلامی قانون، اصول فقہ اور عربی مضمون نویسی میں کامیابی حاصل کر لی ہو۔ ازہر یونیورسٹی کے پرائمری اور ثانوی مدارس کے طلبا مذہبی تعلیمات کے علاوہ مندرجہ ذیل مضامین بھی پڑھیں گے۔

(۱) سائنسی ثانوی تعلیم یا
ادبی ثانوی تعلیم
(۲) فنی تعلیم۔ زراعتی، صنعتی یا تجارتی۔

اس کے بعد یا وہ ازہر یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم جاری رکھیں گے یا حسب خواہش کسی اور یونیورسٹی میں داخلہ لے سکے۔

جامعہ ازہر کے لیے جدید لائحہ عمل

حال ہی میں ازہر یونیورسٹی کے لیے نیا لائحہ عمل نافذ کیا گیا ہے، جس کے مطابق معاشیات، عام نظم و نسق تجارت، اور حساب میں جو لوگ کالج معاملات اسلامیہ سے عالمیت کی سند حاصل کریں گے وہ ڈاکٹریٹ کے برابر ہو گی۔ اسی طرح جامعہ ازہر کے طبیہ کالج کی سند دوسری یونیورسٹیوں کی سند ایم۔ بی بی ایس کے برابر ہو گی۔ اور عالمیت کے ساتھ طب کی کسی شاخ میں تخصیص حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کے مساوی سند ملے گی۔ عملی اداروں یعنی طب، انجینئرنگ اور زراعتی کالجوں میں تعلیم مفت ہو گی۔ ازہر کے جدید میزانیہ میں تین لاکھ پونڈ کا مزید اضافہ کیا گیا ہے۔ تاکہ نئے کالجوں اور ڈگری مرکزوں کے تدریسی شعبوں اور انتظامی شعبوں کو ترقی دی جا سکے۔

نئے میزانیہ میں ڈیڑھ ملین پونڈ کی رقم اسلامی تحقیقات کا ایک مرکز کھولنے کے لیے مختص کی گئی ہے جو عالم اسلام کے چیدہ چیدہ علما پر مشتمل ہوگا۔ علما کی بیوگان اور پس ماندگان کی مالی امداد، حفظ قرآن کے مدارس کی اعانت اور غیر ملکی طلبہ کو وظائف دینے کی بھی نئے میزانیہ میں گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس طرح غزہ کے دینی مرکز کے لیے چار ہزار پونڈ اور کالجوں کی عمارات کی مرمت کے لیے بیس ہزار پونڈ مختص کئے گئے ہیں۔

آئندہ تین سال میں جامعہ ازہر سے ایک ہزار سے زیادہ وفود کو بیرونی ممالک میں بھیجنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ دینی مراکز کے ان مدرسین کا امتحان لیا جائے جن کے پاس جامعہ ازہر یا دوسری یونیورسٹیوں کی اعلیٰ اسناد ہیں اور انھیں جامعہ ازہر میں معید مقرر کیا جائے۔ جامعہ ازہر کے تمام ملحقہ کالجوں کے طلبہ کے فارغ التحصیل ہونے کے لیے حفظ قرآن لازمی شرط ہوگی۔

جامعہ ازہر کے ممتاز طلبہ کو مالی امداد دینے کے لیے یونیورسٹی نے قواعد مرتب کر لیے ہیں۔ ان قواعد کی رو سے ممتاز طلبہ کو ۵ پاؤنڈ ماہوار امداد ملے گی۔ ان میں وہ طلبہ شامل ہیں جو قدیم نظام کے مطابق مسلم مبلغ کی تربیت حاصل کر رہے ہیں یا وہ طلبہ جو عرب جمہوریہ کے باشندے ہیں اور جامعہ ازہر کے ثانوی امتحان میں مجموعی طور پر اسی فی صد نمبر حاصل کر چکے ہیں اور تکمیلی سال میں قابل تعریف کام کیا ہے۔

عام تعلیمی خدمات اور سماجی تعاون

۱۔ تعلیمی اعانات
۲۔ تفریحی و سماجی تعلیم
۳۔ تحریک ترجمہ و تالیف
۴۔ کتب خانے
۵۔ اساتذہ کی خدمات مستعار دینا۔
۶۔ مشرقی طلبہ
۷۔ وفود
۸۔ بین الاقوامی تنظیموں کے ساتھ تعلیمی میدان میں تعاون۔

تعلیمی اعانات

وزارتِ تعلیم نے اس مقصد کے لیے ایک خصوصی محکمہ قائم کیا ہے۔ تعلیمی اعانات کے تربیتی کورس مختلف تعلیمی حلقوں میں منعقد کئے جاتے ہیں، اعانات کی نمائش کی جاتی ہے۔ مختلف حلقوں کو ترغیب دلائی جاتی ہے کہ وہ اعانات تیار کرنے والے ورک شاپ جاری کریں جس کے لیے مالی اور فنی امداد دی جاتی ہے۔

تفریحی وسماجی تعلیم

محکمۂ بہبودِ نوجوانان۔ مدارس میں لڑکوں اور لڑکیوں کے تفریحی وسماجی مسائل کا جائزہ لیتا ہے اور تعلیمی حلقوں کے تعاون سے تفریحی وسماجی مشاغل کی ترویج وتوسیع میں دلچسپی لیتا ہے۔ مختلف حلقوں کے مابین تفریحی مقابلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے اور محکمہ کی طرف تفریحات کا سامان اور ضروری سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ تفریحی وسماجی تعلیم کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے متعلقہ عملے کی تربیت کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔

تعلیمی حلقوں اور مدارس کی تفریحی وسماجی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی مدد کی جاتی ہے۔ ان ضروریات میں سکول تھیٹر۔ کلب ہیلے۔ عوامی تھیٹر۔ تیرنے کے تالاب اور تفریح گاہیں شامل ہیں۔

تحریک ترجمہ وتالیف

یہ تحریک ۱۹۳۹ء میں وزارتِ تعلیم نے شروع کی اور ۱۹۵۲ء تک صرف ۳۴ کتابیں مرتب ہوئیں گزشتہ آٹھ سال میں ۱۱۷ کتب مرتب ہو چکی ہیں۔ پانچ سال قبل وزارتِ تعلیم نے ایک ہزار کتب کی تالیف وترجمہ کا منصوبہ تیار کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا بھر کے تہذیب وتمدن سے متعلق کتب کے تراجم عربی میں کئے جائیں اور ایک لائبریری قائم کی جائے۔

اگست ۱۹۵۵ء سے اب تک وزارت نے اس منصوبے کے تحت ۲۹۸ کتب شائع کی ہیں۔ اس منصوبے کی تکمیل میں اعلیٰ سائنسی کونسل اور اعلیٰ ادبی کونسل وزارت کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔

لائبریریاں اور کتب خانے

۱۹۵۷ء میں تعلیمی دستاویزات کا مرکز قائم کیا گیا۔ تاکہ تعلیمی تحقیقات میں حوالے حاصل کرنے میں مدد۔

ملیں جمہوریہ عرب کی تعلیمی ترقی اور دنیا کے دوسرے ممالک کی تعلیمی ترقی سے متعلق اہم دستاویزات
یب میں رکھی جاتی ہیں۔ بین الاقوامی اداروں کی طرف موصول ہونے والے سوالناموں کے جواب بھی
ہوتا ہے۔

محکمہ اطلاعات نے ریف (دیہی علاقہ) کے گاؤں میں ایک ہزار قومی لائبریریاں قائم کرنے کا کام
دیا ہے۔ ہر لائبریری میں ثقافت و اطلاعات کا مرکز بھی ہوگا۔ جمہوریہ کے تمام دیہات میں اطلاعی خدمات
رسانی چار ہزار سے زائد قومی لائبریریاں قائم کرنے کا منصوبہ بھی زیر عمل ہے۔ ایسی قومی لائبریریوں کا
ہل وطن کو کتابیں مستعار دینے کے علاوہ دیگر لائبریریوں سے کتابیں مستعار لے کر دی جاتی ہیں کو مہیا
ہے۔ قومی لائبریری میں ٹیلی ویژن، روزانہ اخبار اور مختلف نشریات کے علاوہ ثقافتی مراکز تھیٹر اور سنیما
روغ کی ثقافتی سرگرمیوں کی نمائش بھی ہوگی۔

اجی تعاون

۱۔ اساتذہ کی خدمات پیش کرنا :۔ ثقافتی تبادلے کے طور پر وزارت تعلیم، دوست ممالک اور عرب
ریاستوں کو ماہر اساتذہ کی خدمات پیش کرتی ہے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں ۲۴۵۸، اساتذہ تیرہ ممالک میں کام
کر رہے تھے۔ جبکہ سنہ ۱۹۶۷ء میں ان کی تعداد ۳۰۹۱ تک جا پہنچی جو ۲۱ ملکوں میں تعلیمی خدمات انجام
دے رہے ہیں۔

۲۔ غیر ملکی طلبہ :۔ مصر کی یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے عرب ریاستوں، افریقی ایشیائی ممالک
اور دوست ممالک کے طلبہ کا خیر مقدم کرتے ہیں سنہ ۱۹۵۲ء میں مختلف ممالک کے ۳۵۲۲ طلبہ جمہوریہ
عرب کی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم تھے۔ سنہ ۱۹۶۶ء میں ان کی تعداد ۱۴۳۴۹ ہو گئی۔ وزارت تعلیم کالج
اور مدارس سے باہر بھی ان طلبہ کو ہر ممکن سہولت دیتی ہے۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں قاہرہ میں ان طلبہ کے لیے
ایک کلب قائم کیا گیا، جس میں سماجی سرگرمیوں کے لیے تمام سہولتیں موجود ہیں۔ یہ کلب غیر ملکی طلبہ
کے لیے اجتماعی مرکز کا کام دیتا ہے۔ کچھ طلبہ کو ہر سال تعلیمی وظائف دیئے جاتے ہیں۔

وظائف اور امداد :۔ تعلیمی وظائف سے متعلق اعلیٰ تعلیم کے متعلق پالیسی وضع کرتے وقت مندرجہ ذیل

رجحانات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

(۱)۔ وفود ملکی ضروریات کی تکمیل کو ملحوظ رکھ کر بھیجے جاتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لیے سائنسی انداز سے منصوبہ مرتب کیا گیا ہے۔

(۲) انجینئرنگ، صنعت وحرفت اور کیمیکل سائنس کے وفود پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے تاکہ ملک کی روز افزوں صنعتی ضروریات پوری ہو سکیں۔

(۳) وفود دنیا کے ان ممالک میں بھیجے جاتے ہیں۔ جو ان صنعتوں میں ترقی یافتہ ہیں۔ جن میں مصر ترقی کا خواہاں ہے۔

(۴) صنعتی اور زرعی کالجوں کے سینکڑوں طلبا ہر سال فیکٹریوں اور فارموں کی معیاری تربیت حاصل کرنے کے لیے دوسرے ممالک میں بھیجے جاتے ہیں۔ تاکہ اپنے ملک کو دیگر ممالک کے معیار ترقی تک پہنچا سکیں۔

تعلیمی دنیا میں بین الاقوامی تنظیموں سے رابطہ

مرکز دستاویزات تعلیمی متحدہ عرب جمہوریہ بین الاقوامی تنظیموں مثلاً یونیسکو، عالمی تعلیمی مراکز اور انٹرنیشنل لیبر آفس سے پورا پورا تعاون کرتا ہے۔ اس میں تعلیمی کتب، تحقیقات اور دیگر تعلیمی اطلاعات کا تبادلہ شامل ہے۔

دیگر ثقافتی سرگرمیاں

(۱) سکول لائبریریاں

۱۹۵۵ء پرانی لائبریریوں کے علاوہ ۵۰۰ نئی لائبریریاں قائم کی گئی ہیں۔ ان کا انتظام تربیت یافتہ لائبریرین کے ہاتھوں میں ہے۔ ۱۹۵۶ء میں ہر تعلیمی حلقے کے مرکزی شہر میں ایک ایک نمونے کی لائبریری قائم کی گئی۔ طلبہ کے علاوہ دوسرے دلچسپی رکھنے والے لوگ بھی ان لائبریریوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

(۲) سکول میگزین

ثانوی اور تمہیدی مدارس کے طلبہ میں صحافتی شعور پیدا کرنے کے لیے سکول کے رسالوں کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے۔ ان رسالوں کی مدد سے طلبہ حالاتِ حاضرہ سے واقف ہو سکتے ہیں۔

وزارتِ تعلیم سالانہ مقابلے منعقد کرتی ہے اور مدارس کو انعامات دیتی ہے۔ مقابلے میں شامل ہونیوالے رسالوں اور انھیں مرتب کرنیوالے طلبہ کو بھی انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔

(۳) سائنس کے ماہرین اور علم و ادب کے مشاہیر کو حکومت کی طرف سے ان کی علمی خدمت کے صلے میں انعامات دیئے جاتے ہیں۔

(۴) جہالت کا استیصال:۔ وزارتِ ثقافت نے ملک سے جہالت کو ختم کرنے کے لیے ہر ضلع میں مراکز قائم کئے ہیں۔ ان مراکز میں کام کرنے والے اساتذہ سرکاری مدارس میں بھی کام کرتے ہیں۔ ان پڑھوں کو تعلیم دینے کے لیے ایک آسان نصاب مرتب کیا گیا ہے جس میں پڑھنا، املا نویسی اور حساب شامل ہیں۔ مصروف اور ملازم لوگوں کی خاطر شبینہ جماعتوں کا اجرا بھی ہوا ہے۔

———— ❖ ————

سائنسی اندازِ فکر

پروفیسر انیس الدین انصاری سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور

سائنس نے انسانی زندگی پر جو حیرت انگیز اثرات مرتب کئے ہیں وہ ہر شخص محسوس کر رہا ہے۔ لیکن ان اثرات کے تحت مقصدِ تعلیم، طریقۂ تعلیم اور نصابِ تعلیم میں جو اصلاحات ضروری ہیں ان پر عمل کی رفتار بہت سست ہے۔

۱۴۷۶ء میں ولیم کیکسٹن (WILLIAM CAXTON) نے چھاپے کی مشین کے ذریعہ کتابیں چھاپ کر تاریخِ تعلیم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اب تک یہ کتابیں ایسی مشینوں سے چھپتی تھیں جو ہاتھ سے چلائی جاتی تھیں۔ لیکن ۱۸۱۰ء میں فریڈرک کوئنگ (FREDRICK KOEING) نے بھاپ کے انجن کے ذریعہ چھاپہ کی مشین چلائی۔ اس ایجاد سے کتابوں کے حصول میں اس قدر آسانی ہو گئی کہ تعلیم کو ہر شخص کے لیے لازمی کرنے کی تحریک جاری ہوئی۔ سٹیم انجن کی ایجاد، بجلی کی ایجاد اور ان ہر دو ایجادات کے نتیجہ میں ریل، تار، ٹیلیفون، موٹر کار اور صدہا نئی سائنسی چیزوں کی ایجاد نے انسان کی تہذیب و تمدن میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ چناں چہ نظامِ تعلیم میں سائنس کی تعلیم بھی روز بروز اہمیت اختیار کرتی رہی۔ ہربرٹ سپنسر (سنہ ۱۸ء) نے اپنی تصنیف "تعلیم" میں نہایت خوبی سے وضاحت کی کہ ہر شخص کے لیے سائنس کی تعلیم ضروری ہے۔ حکومت کا سول ملازم ہو یا فوجی کا، کارخانہ کا مزدور ہو یا عام کاشت کار، بڑا تاجر ہو یا معمولی دکاندار، مذہبی مبلغ ہو یا سیاسی لیڈر، مصور ہو یا شاعر، مرد ہو یا عورت، ہر ایک کو سائنس کی تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیے۔ غالباً ہربرٹ سپنسر کی اسی تصنیف ہی کا نتیجہ ہے کہ یورپ و امریکہ میں سائنس کی حیرت انگیز ترقی ہو رہی ہے۔ ہربرٹ سپنسر کی یہ کتاب لاکھوں کی تعداد میں یورپ کی ہر زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئی اور یورپ کا

تاہم تعلیم بھی اس سے بہت متاثر ہوا۔

یورپ میں سائنس کی تعلیم کا آغاز فرانسس بیکن (۱۵۶۱ء سے ۱۶۲۶ء) سے ہوا۔ پھر ابتدائی دور میں کمینیس (۱۵۹۲ء سے ۱۶۷۰ء) روسو (۱۷۱۲ء سے ۱۷۷۸ء) میں ڈور (۱۷۴۷ء سے ۱۸۴۹ء) پسٹالوزی (۱۷۴۶ء سے ۱۸۲۷ء) فروبل (۱۷۸۲ء سے ۱۸۵۲ء) سائنس کی تعلیم کے ممتاز رہنما ہوئے۔

موجودہ دور میں یعنی بیسویں صدی میں یورپ اور امریکہ میں سائنس کی اہمیت کا احساس بڑھتا رہا اور اب تو مدارس میں سائنس کی تعلیم کو لازمی قرار دیدیا گیا ہے۔

سائنس کی اس اہمیت کے احساس کے ساتھ ساتھ اس مسئلہ پر بھی کافی غور ہوتا رہا کہ سائنس کی تعلیم کا مقصد کیا ہے۔ مدارس میں سائنس کی تعلیم کا مقصد یہ سمجھا جاتا تھا کہ طلبہ سائنس کی معلومات حاصل کرکے آئندہ اچھے موجد بن سکیں۔ علاوہ ازیں مدرسوں میں سائنس پڑھ کر آئندہ ایسی تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں جس میں سائنس کی معلومات ضروری ہوتی ہے۔ مثلاً انجینئرنگ یا ڈاکٹری۔ لیکن جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ سائنس کی تعلیم کا اہم مقصد نو عمروں میں وہ طرز فکر پیدا کرنا ہے جس سے وہ زندگی کے کسی مسئلہ کو اس طرح حل کر سکیں کہ اس کے نتیجے قطعاً صحیح حاصل ہوں اور اس طرح انسان میں جو قدرتی طور پر قوت فکر موجود ہے اس کا صحیح استعمال ہو سکے۔ اگر انسانی غور و فکر کی صحیح ترقی ہو تو انسانی ارتقا صحیح ہوگا۔ اور انسان ترقی کرکے انسان کامل بننے کے قریب ہوتا جائے گا۔

ہر انسان میں قدرت نے قوت غور و فکر پیدا کی ہے۔ تاریخ سائنس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب انسان کے مشاہدے میں عجیب و غریب اشیا آئیں تو اسے ان اشیا کے خواص معلوم کرنے کی جستجو ہوئی۔ اشیا کے خواص کا علم حاصل کرنے کے لیے اس کی طرز فکر ایک خاص قسم کی ہو جاتی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔ مثلاً اس کو لوہے کا پتھر ملا۔ اب وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ کیا چیز ہے اور اس چیز کے خواص کیا ہیں۔ وہ لوہے کے پتھر کو آگ میں ڈال دیتا ہے۔ دیر تک پڑا رہنے کے بعد ٹھنڈا ہونے پر پھر مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے علم میں آتا ہے کہ اس پتھر سے ایک ایسی

یہ حاصل ہوتی ہے جس کی نوکدار چیز میں بنائی جاسکتی ہیں اور یہ نوکدار چیز جنگلی جانوروں کو مارنے میں اچھی طرح استعمال ہوسکتی ہیں۔ اس طرح انسان تیر کی ایجاد کرتا ہے۔ غرضیکہ سائنس کی ایجاد میں انسان کی طرز فکر جبلت اور جستجو پر منحصر ہے۔ جبلت جستجو یا جبلت تجسس کے اظہار پر اس کے لیے ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ مسئلہ سے متعلق وہ مزید مشاہدات کرتا ہے۔ مشاہدات کی بنا پر کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے اور اس نتیجے کی مزید تحقیقات کرتا ہے۔ مزید تحقیقات سے یا تو وہ نتیجہ جو اس نے حاصل کیا تھا غلط ثابت ہوجاتا ہے۔ یا اس نتیجہ کی پورے طور پر تصدیق ہوجاتی ہے۔ یہ آخری نتیجہ سائنسی اصول یا سائنسی معلومات، یا سائنسی حقیقت کہا جاتا ہے۔

سائنسی طرز فکر کو ذیل کی ترتیب سے بیان کیا جاسکتا ہے :۔

۱۔ مسئلہ

۲۔ مسئلے سے متعلق مشاہدات و تجربات۔

۳۔ نظریہ۔

۴۔ نظریئے سے متعلق مزید مشاہدات یا تجربات۔

۵۔ صداقت یا حقیقت۔

سائنسی صداقت کا قطعی ہونا ضروری نہیں۔ انسان کی مزید تحقیقات سے سائنسی صداقت کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ انسان کا علم روبہ ترقی ہے۔ ایک زمانہ میں ایک سائنسی اصول صحیح سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بعد کی تحقیقات نے اس اصول کی غلطیاں ظاہر کیں اور پھر اس سائنسی اصول میں اصلاح ہوئی۔ مثلاً اب سے پچاس ساٹھ سال قبل یہ یقین کیا جاتا تھا کہ ایٹم قابل تقسیم نہیں ہے۔ اس یقین پر ایٹم کے متعلق کئی اصول قائم کیے گئے تھے اور ان کو قطعی طور پر صحیح سمجھا جاتا تھا۔ مزید تجربات اور مشاہدات نے ثابت کیا کہ ایٹم کے بھی کئی حصے ہیں جن کو الیکٹرون۔ پروٹان۔ نیوٹران۔ پازیٹران میزان نام دیا گیا ہے۔ اسی طرح کئی اشیاء ہیں جن کو عنصر سمجھا جاتا تھا۔ بعد کی تحقیقات سے وہ مرکب ثابت ہوئیں۔ عنصر کو کسی دوسرے عنصر میں تبدیل کرنا نا ممکن سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ کچھ عنصر ایسے ہیں کہ ان کو دوسرے

عنصر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ غرضیکہ انسانی علم ترقی پذیر حالت میں ہے، سائنس کی بہت بڑی تعلیم یہ ہے کہ انسان یہ یقین رکھے کہ اُس کا علم محدود ہے۔ وہ محدود علم کی بنا پر چند اصولوں پر یقین رکھتا ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ مزید مشاہدات اور تجربات کی بنا پر وہ علم غلط ثابت ہوں۔

کسی بات کے متعلق تحقیقات کرنا، اور مزید معلومات حاصل کرنا۔ اور مزید معلومات اور تجربات سے کسی نئے نتیجہ پر پہنچنا سائنسی طرزِ فکر ہے۔ سائنسی طرزِ فکر کو ہر انسان، دانستہ یا نادانستہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرتا ہے۔ زندگی کے روزمرہ کے مسائل، خاندان کے اہم مسائل قومی مسائل، اہم بین الاقوامی مسائل۔ غرضیکہ کوئی چھوٹا مسئلہ ہو یا بڑا، دو طریقوں سے طے ہو سکتا ہے۔ ایک تو عقلی طریقوں سے دوسرے اِس کے برعکس یعنی غیر معقول انداز سے عقلی طریقہ فکر یہ ہے کہ مسئلہ کے متعلق معلومات حاصل کی جائے۔ پھر اُس معلومات کی بنا پر ایک عارضی نتیجہ حاصل کیا جائے جس کو نظریہ (HYPOTHESIS) کہتے ہیں۔ اس نظریہ کو مزید معلومات کی بنا پر غلط یا صحیح ثابت کیا جائے۔ مثلاً کیا کراچی اور لاہور کے روزانہ کم سے کم ٹمپریچر اور زیادہ سے زیادہ ٹمپریچر کے فرق سے کوئی خاص اصولِ موسمیات ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک مسئلہ ہے۔ اِس مسئلے کے متعلق سال بھر کے اخبارات سے مشاہدات جمع کیے جائیں اور ان مشاہدات کی بنا پر کوئی نتیجہ اخذ کیا جائے۔ نتیجہ یہ حاصل ہوگا کہ کراچی میں روزانہ کم سے کم ٹمپریچر اور زیادہ سے زیادہ ٹمپریچر کا فرق کم ہوتا ہے اور لاہور میں یہ فرق زیادہ ہوتا ہے۔ اور اس نتیجہ سے پھر یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے کہ ساحل پر روزانہ کم سے کم ٹمپریچر اور زیادہ سے زیادہ ٹمپریچر کا فرق کم ہوتا ہے اور اندرون ملک یہ فرق زیادہ ہوتا ہے۔ یہ نتیجہ مفروضہ (HYPOTHESIS) ہے۔ پھر اس نظریہ یا مفروضہ پر چٹاگانگ اور ڈھاکہ کے ٹمپریچروں کا مقابلہ اسی طرح کیا جائے اور بالآخر موسمیات کے اس اصول کی تصدیق کی جائے۔

سائنسی طرزِ فکر پیدا کرنے کے لیے طلبہ کے طریقہ تدریس میں اِس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اگر مدرس طلبہ میں سائنسی طرزِ فکر پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے گا تو سائنس کی تعلیم کے فائدے پورے طور پر

ظاہر نہیں ہوں گے۔ گذشتہ چالیس پچاس برس سے اصلاح پسند مدرسین سائنس طلبہ میں ایسی قوتِ فکر پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کی وجہ سے طلبہ میں ایجادی طاقتیں ظاہر ہوں اور اُن میں سائنسی اندازِ فکر پیدا ہو جائے۔ یہ خوبی صرف سائنس کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے ہی ضروری نہیں ہے۔ بلکہ یہ خوبی ہر شہری میں پیدا ہونا مستحسن ہے۔ انسان کی یہ خوبی اس کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ورنہ اس کی فکری سطح صحرائی جانوروں کے قریب قریب ہو جاتی ہے۔ مقصدِ تعلیم ہی یہ سمجھا جا رہا ہے کہ انسان میں صحیح استدلالی قوتِ فکر پیدا ہو سکے۔ محض حصولِ علم ایک شخص کو عقلمند اور صحیح الدماغ انسان نہیں بنا سکتا۔ اِس لیے مدرسین سائنس کے لیے ضروری ہے کہ وہ طلبہ میں سائنسی اندازِ فکر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس مقصد کی تحصیل کے لیے طریقۂ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

امریکہ کے مشہور ماہرینِ تعلیم جان ڈیوی (JOHN DEWEY) کلپاٹرک (KILPATRICK) اور جیمز کانینٹ اپنی تصانیف میں طلبا میں سائنسی طریقۂ فکر کی تربیت پر بہت زور دیتے ہیں اور مشورہ دیتے ہیں کہ سائنس کے استادوں کو اپنی روزانہ کی تدریس میں ایسے مسئلے پیش کرنے چاہئیں جن سے سائنسی طریقۂ فکر پیدا ہو۔ اور اِس امر کی مسلسل کوشش کرنا چاہیے کہ طلبہ خود کوئی سائنسی مسئلہ پیدا کریں اور اس مسئلہ کا حل معلوم کرنے میں سائنسی طریقۂ تحقیقات اختیار کریں۔ مثال کے طور پر ذیل کا تجربہ کیا جاتا ہے۔

وارنش رکھنے کا ایک خالی ڈبہ لو اور اُس میں تقریباً ایک چوتھائی حصہ پانی بھر دو اور پانی کو گرم کرو۔ جب پانی اُبلنے لگے اور خوب بھاپ نکلنے لگے تو ڈبہ کو کس کر بند کر دو کہ بھاپ باہر نہ نکل سکے اور گرم کرنے والا لیمپ علیحدہ کر دو۔ ہوا میں ٹھنڈا ہونے دو، اور پھر ٹھنڈا پانی اس پر ڈالو ڈبہ پچک جائے گا اور بدشکل ہو جائے گا۔

یہ تجربہ کر کے طلبہ کو غور کرنے کا موقع دیا جائے اور اس کی وجہ بیان کرنے کے لیے تیار کیا جائے حسب ذیل چھ باتوں کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا جائے:

(۱) ڈبہ میں کم پانی کیوں رکھا گیا

(۲) پانی کو اتنا گرم کیوں کیا گیا کہ خوب بھاپ نکلنے لگے ؟

(۳) ڈبہ کے منہ کو اس وقت بند کیا گیا جب بھاپ نکل رہی تھی کیوں ؟

(۴) لیمپ کو فوراً کیوں ہٹا لیا گیا جب ڈبہ کو کس کر بند کر لیا گیا ؟

(۵) ڈبہ کو کیوں ٹھنڈا ہونے دیا ؟

(۶) ڈبہ کیوں پچک گیا ؟

طلبہ کو تجربہ کرنے سے پہلے اس کی وجہ ہرگز نہ بتائی جائے۔ نیز تجربہ کرنے کے بعد بھی استاد وضاحت نہ کرے۔ بلکہ طلبہ خود ہی وجہ معلوم کرنے کے لیے غور و فکر کریں اور ان کے جوابات کو بالترتیب تختہ سیاہ پر لکھ کر نتیجہ اخذ کیا جائے۔ اس طریقۂ تدریس سے طلبہ میں غور و فکر کی عادت پیدا ہوگی۔

مثال نمبر ۷ : حسب ذیل فہرست پر غور کیجیے :-

ایک متوسط صحت والے شخص کے لیے ذیل کی توانائی (ENERGY) کی ضرورت ہوتی ہے :-

نیند کی حالت میں	حرارے فی گھنٹہ	۰٫۴۳
جاگتے میں لیکن خاموش لیٹے ہوئے	" "	۰٫۵۰
خاموش بیٹھے ہوئے	" "	۰٫۶۵
آواز سے پڑھتے ہوئے	" "	۰٫۶۹
آزادی سے کھڑے ہوئے	" "	۰٫۶۹
مستعدی سے کھڑے ہوئے	" "	۰٫۷۴
لباس پہنتے یا اتارتے ہوئے	" "	۰٫۷۷
گاتے ہوئے	" "	۰٫۷۸
ہلکی ورزش	" "	۱٫۱۰
چہل قدمی (۲٫۶ میل فی گھنٹہ)	" "	۱٫۱۸
سخت ورزش	" "	۱٫۸۸

چہل قدمی (۲ء ۳ میل فی گھنٹہ)	حرارے فی گھنٹہ	۱٫۹۵
بے حد سخت محنت	،، ،،	۲٫۹۲
تیرنا	،، ،،	۳٫۲۵
دوڑنا (۳ء ۵ میل فی گھنٹہ)	،، ،،	۳٫۹۰
بہت تیز چلنا (۴ء ۵ میل فی گھنٹہ)	،، ،،	۴٫۲۲

طلبہ کو غور کرنے کا موقع دیا جائے کہ دوڑنے اور بہت تیز چلنے میں جبکہ رفتار یکساں ہو یعنی ۳ء ۵ میل فی گھنٹہ تیز چلنے میں، توانائی کیوں زیادہ صرف ہوتی ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں جدید ترین نصابی کتابوں میں اس قسم کے تجربات درج کئے جا رہے ہیں جو سائنسی معلومات کو زندگی سے متعلق کرتے ہوئے طلبہ میں غور و فکر کی طرف متوجہ کریں، اور سائنس کی تعلیم کو محض مواد علمی کا حافظے میں محفوظ کرنا نہ قرار دیا جائے۔ سائنس کی صحیح تدریس، سائنسی طریقۂ فکر کا عادی بنانا ہے۔ اور جب یہ رجحان طبع پیدا ہو جاتا ہے تو یہ طرزِ فکر زندگی کے ہر مسئلے میں استعمال ہو سکتا ہے ؎

تعلیمی خبریں

بچوں کو باہمت بنانے کی تعلیم

برطانیہ، دولت مشترکہ نیز دیگر ممالک کے ہزاروں نوجوانوں کو اب اس ایک مختصر المیعاد مہینے کا خیال آ سکتا ہے جس میں نئے نئے ہمت آزما تجربوں نے ان کے کرداروں پر مہر ثبت کرنے میں مدد دی یعنی وہ مستقبل میں کس طرح سوچیں گے، محسوس کریں گے اور عمل کریں گے۔

یہ وہ لڑکے اور لڑکیاں ہیں جو بیرونی سیاحت کے کسی اسکول میں رہ آئے ہیں وہاں انھوں نے صعوبتوں اور خطروں کا مقابلہ کرنا اور ان کو شکست دینا اور تہذیب نفس کو ترقی دینا سیکھا ہے۔

ان چار ہفتوں کے کورسوں میں داخلہ لینے والے لڑکے کہر آلود پہاڑوں پر جفاکشی کی مہموں پر جانے طوفانی سمندروں میں موجوں کے تھپیڑے کھانے یا علی الصبح برف کے پانی میں نہانے کے بعد جواں مردوں کی خصوصیت رکھنے والے لڑکے بن جاتے ہیں۔

یہ کورس سخت ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کے لیے کورس تھوڑے ہی ہلکے ہوتے ہیں۔ ان میں زیادہ سے زیادہ محنت درکار ہوتی ہے۔ ان کے تیار کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک مدت تک تربیت کے وسیلے قوت برداشت اور صلاحیت کو تقویت دی جا سکے۔ اس کے بعد بتدریج بڑھتی ہوئی دشواری والی مہموں اور منصوبوں کے ذریعے کردار اور قوت فیصلہ کی پوری آزمائش ہو جاتی ہے۔

ان آزمائشی چار ہفتوں میں ان مقاصد کی پابندی ضروری ہے جن پر اسکولوں کی بنیاد قائم ہے یعنی وہ چیزیں جن کا اظہار بڑی عمدگی کے ساتھ بیرونی سیاحت کے اس موثر دستور العمل میں کیا گیا ہے "خدمت کرنا، جد و جہد کرنا اور شکست تسلیم نہ کرنا"

اسکولوں کا یہ بنیادی مقصد کہ مہم جوئی اور سخت ذاتی اور اخلاقی تربیت سے کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔ لندن میں عکسی تصویروں کی ایک نمائش میں ایک بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے

پی اے۔ رائٹرز فوٹوز کے دو نوجوان پریس فوٹوگرافروں، ٹام سمتھ اور پال جانسن واکر نے برطانیہ کے پانچوں اسکولوں کی مہموں میں کئی ہفتے صرف کئے۔ ان اسکولوں میں سے دو بحری اسکول مورے فرتھ (اسکاٹ لینڈ) میں برگ ہیڈ اور ایرڈووی (ویلز) میں ہیں۔ دو پہاڑی اسکول اسکڈیل، اور السواٹر، کمبرلینڈ (انگلستان) میں اور ایک ڈیون (انگلستان) میں ہے۔ جہاں لڑکیوں کو بھی تربیت دی جاتی ہے۔ اپنے ذوق وشوق اور پیشہ ورانہ مہارت کے ذریعہ نہ صرف انھوں نے کامیابی کے ساتھ دو سو سے زیادہ فوٹوؤں میں اسکول کی سرگرمیوں کا سیدھا سادھا ریکارڈ پیش کیا ہے، بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ وہ نوعمر لوگوں میں اپنے اوپر بھروسہ رکھنے اور دوسروں کے ساتھ کام کرنے کا مادہ کس طرح پیدا کرتا ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں نے کشتی کھینے، کوہ پیمائی کرنے، چٹانوں پر چڑھنے اور جان بچانے اور ورزشی کھیلوں کی صلاحیت کو ترقی دینے کے سلسلے میں جو کامیابی حاصل کی ہے اور جس عزم، قوت اور جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ نمائش ان کی ایک تصویر پیش کرتی ہے۔

بیرونی سیاحت سے متعلق پہلا اسکول ایرڈووی کا بحری اسکول تھا جو ۱۹۴۱ء میں گورڈنسٹاؤن اسکول کے ہیڈ ماسٹر کورٹ ہان اور بلیو فنیل اسٹیم شپ لائن کے لارنس ہولٹ نے قائم کیا تھا تاکہ لڑکوں میں تربیت کے ذریعے تجارتی جہازرانی کے لیے وہ اخلاقی اور جسمانی جرأت وہمت پیدا کی جاسکے جس کی جنگ کے زمانے میں ضرورت تھی۔ امن کے زمانے میں زندگی کے ہر میدان میں اس تربیت سے فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں لڑکوں کو مدد دینے کی غرض سے یہ ٹرسٹ ۱۹۴۶ء میں قائم کیا گیا تھا۔ آج کل برطانیہ میں اس قسم کے پانچ اسکول ہیں (جلد ہی چھ ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ ملایا، کینیا، نائجیریا، آسٹریلیا، اور دوسرے ممالک میں بھی ایسے اسکول موجود ہیں۔

آج کل برطانیہ میں ہر سال پانچ سو لڑکیاں اور چار ہزار لڑکے ان کورسوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ ان میں بہت سے سمندر پار ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر عقیدے اور ہر فرقے کے یہ لوگ جب ملتے ہیں تو ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔ ان کو تنہائی، وطن کی یاد کا ملال اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے چیلنج کا بھی مقابلہ

کرنا پڑتا ہے۔ یہاں انھیں پتہ چلتا ہے کہ ان کے ساتھی، ان کی قابلیت کا اندازہ، ان کے لباس یا لب و لہجہ سے نہیں بلکہ اس بات سے لگائیں گے کہ وہ کس حد تک اسکول کی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں۔ اکثر و بیشتر اس قابل لڑکے کے بجائے جو کم جدو جہد کی ضرورت محسوس کرتا ہے، سب سے زیادہ کامیابی وہ لڑکا حاصل کرتا ہے جو ترقی کرنے کے لیے سب سے زیادہ کوشش کرتا ہے۔

رخصتی کے وقت ان سب نے کچھ نہ کچھ سیکھ لیا ہے اور اکثر کے مزاج میں ایسی پختگی آگئی ہے جو زندگی بھر ان کی معاون رہے گی۔ (از لیونارڈ ماکس)

لندن میں دنیا بھر کی طالبات کا مرکز

لندن میں کروسبی ہال کی عمارت کے نئے بازو میں ایک نامکمل لائبریری واقع ہے جہاں سے دریائے ٹیمز کے چیلسی ریچ کا بے مثال منظر صاف نظر آتا ہے۔ اس لائبریری میں تیس ممالک کی مختلف نسلوں اور عقیدوں سے تعلق رکھنے والی گریجویٹ خواتین خاموشی سے متعدد علوم و فنون کا مطالعہ کرتی رہتی ہیں۔

یہ خواتین جن میں سے بہت سی اکیلی ہی پہلی بار برطانیہ آئی ہیں بڑی خوش قسمت ہیں کیونکہ ہال میں ایک الگ آرام دہ کمرہ اور کالج کی مثالی زندگی حاصل ہوئی ہے۔

وہ روزانہ پندرھویں صدی کے عظیم ضیافتی ہال میں کھانا کھاتی ہیں جو کسی زمانے میں بشپس گیٹ میں کروسبی پیلس جس کے ایک ایک پتھر کو اٹھا کر چیلسی میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ لندن کا ایک تاریخی مکان تھا۔

یہ طالبات ہال کے دو کمروں میں دنیا بھر کے فاضلوں سے تبادلہ خیال کیا کرتی تھیں۔ ۱۹۵۰ء میں یونیورسٹی کی خواتین کے برطانوی وفاق نے جو کروسبی ہال کا مالک ہے عمارت کے ایک نئے بازو اور لائبریری کی تعمیر شروع کی تھی تاکہ ہال کی چوکور شکل مکمل ہو جائے اور اس میں موجودہ چوراسی طالبات کے بجائے ایک سو اڑتالیس طالبات کی رہائش کے لیے گنجائش پیدا ہو جائے، لیکن روپے کی کمی کی وجہ سے کام روک دینا پڑا۔ اور جب تک ایک لاکھ دس ہزار پونڈ جمع نہ ہو جائیں اس وقت

دوبارہ کام شروع نہیں کیا جا سکتا۔ اِس رقم سے عمارت کے بازو کا دوسرا حصہ تعمیر کیا جائے گا جس میں مطالعہ کرنے اور سونے کے چوبیس کمرے شامل ہوں گے اور لائبریری اور دیسیع کامن روم کی تکمیل ہو سکے گی۔

کروسبی ہال کی آسائشوں کے لیے روپیہ کی اس قدر ضرورت ہے کہ اس کے حصول کے لیے عالمگیر پیمانے پر جدو جہد کی جا رہی ہے۔ امدادی رقم جمع کرنے والوں میں ۷۰ مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والی یونیورسٹی کی بارہ ہزار خواتین خاص ہیں جو ۱۹۲۷ء میں ہال کے افتتاح کے بعد سے وہاں قیام کرتی اور لندن کے عجائب خانوں۔ لائبریریوں۔ ہسپتالوں اور لندن یونیورسٹی کے کالجوں میں کام کر رہی ہیں ۱۹۶۳ء کے پورے سال برطانوی خواتین نے امدادی رقم حاصل کرنے کی مہم جاری رکھی۔ اس مہم کا خاتمہ سال کے آخر میں کروسبی ہال کا "ہفتہ" پر ہوا جس میں مخصوص تقریبات مثلاً لیکچر "فیشن شو" خوش الحانیاں اور بازار وغیرہ کا انعقاد کیا گیا تھا۔

پچھلے سال نومبر میں مادر ملکہ، ملکہ الزبتھ، لندن شہر کے گولڈ اسمتھ ہال میں گئیں۔ وہاں دولت مشترکہ اور دوسرے سمندر پار ملکوں کی بہت سی طالبات ان کی منتظر تھیں۔ چناں چہ ان کو امدادی اپیل کے جواب میں بٹوے پیش کیے گئے۔ جن کی مجموعی رقم پندرہ ہزار پونڈ تھی۔ اس رقم میں جو برطانیہ اور دوسرے سمندر پار ملکوں کی یونیورسٹی کی طالبات کے گروہوں، فرموں، تنظیموں اور افراد کی طرف سے پیش کی گئی تھی، حکومت ہندوستان کا ایک ہزار پونڈ کا عطیہ بھی شامل تھا۔

امدادی رقم کے لیے اپیل کے پورے سال کے دوران خواتین کی طرف سے یہ بتایا جاتا رہا کہ ایک چھوٹے سے عطیہ سے بھی کسی تصویر، آرام کرسی، یا مطالعہ کے نئے کمرے کے لیے ایک دیوان کا خرچ نکل سکتا ہے۔ سونے کے ایک کمرے کی مکمل تیاری پر دو سو پونڈ خرچ ہو جاتے ہیں۔ ان اخراجات میں عطیہ دینے والے کے نام کی پلیٹ کی قیمت بھی شامل ہے۔

ان خواتین میں سے جو کروسبی ہال میں گئی ہیں یا جائیں گی، بہت سی خواتین مختلف شعبوں مثلاً طب اور متعلقہ مضامین، تعلیم، آرٹس، کتب خانے کے انتظام، معاشیات، قانون، سائنس کی تمام شاخوں، فنون لطیفہ،

ڈراما، موسیقی، اور ایڈورٹائزنگ میں رہنمائی کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ وہ زیادہ تر اعلیٰ تحقیق کرنے یا پی ایچ ڈی کی ڈگری یا دوسری پوسٹ گریجویٹ تعلیمی اسناد حاصل کرنے جاتی ہیں۔

مسی برالیون سے آنے والی ایک طالبہ بی بی سی میں نشریات کے پیشہ ورانہ کورس کی تکمیل کر رہی ہیں۔ ٹورنٹو یونیورسٹی کی ایک گریجوایٹ لندن کے ایک اسٹوڈیو میں فلمیں بنانے کے فن کا مطالعہ کر رہی ہے۔ ایک دوسری گریجویٹ مکان کی اندرونی آرائش کے طریقے سیکھ رہی ہے۔ ایک انڈونیشی گریجویٹ طالبہ یونسکو کے وظیفہ کے تحت لائبریری کا کام سیکھ رہی ہے۔

کروسبی ہال میں مقیم خواتین مذہب، تمدن، رسم ورواج، لباس اور سیاسی عقائد کے سلسلے میں ایک دوسری سے بہت مختلف ہیں۔ بیس، بائیس سال کی بہت سی غیر شادی شدہ خواتین ہیں لیکن کچھ معمر یا شادی شدہ گریجویٹ خواتین بھی ہیں جو دنیا کی سیاحت کرنے یا کتاب لکھنے کے دوران ہال میں ٹھہر جاتی ہیں۔ کھانوں کے معاملہ میں زبردست تنوع پایا جاتا ہے لیکن ہال کا باورچی خانہ بڑے پرلطف اور آسان طریقے سے ان کی مخصوص ضروریات پوری کرتا رہتا ہے۔

یہ طالبات خواہ کوئی بھی ہوں یا ان کے مقاصد یا انداز نظر کتنے ہی مختلف ہوں، کروسبی ہال حقیقتاً ان کی زندگیوں کا مرکز ہے۔ یہاں ان کو نہ صرف تعلیم کے لیے ضروری یکسوئی، بلکہ اجتماعی زندگی کا ایک انوکھا تجربہ بھی حاصل ہوتا ہے۔

سرکاری جریدے کے اعلانات

صیغۂ رجال ——— شعبۂ سکول

۱۳۹۰ ADM ایم عصمت اللہ نامر ایم اے۔ بی۔ ایڈ عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پسرور کا استعفا
پریل ۶۳ ۲۹ اپریل ۶۳ء (بعد دوپہر) سے منظور کیا جاتا ہے۔

۱۴۰ م۔ ریاض حسین زیدی بی اے۔ بی ایڈ عارضی سینئر انگلش ٹیچر کو (جن کو گورنمنٹ ہائی سکول
ADI خیرپور جانے کا حکم جاری ہوا تھا۔ م محمد بشیر سلہری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر
پریل ۶۳ تاریخ حاضری سے عارضی سینئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملقروال متعرر کیا گیا۔

۱۳۸ م۔ غلام مصطفےٰ خاں سلہریا۔ ایف۔ ایس سی۔ ٹی۔ قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ مڈل
ADI سکول جبجر عباسیاں کو م۔ محمد انور ایف اے سی۔ ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ
پریل ۶۲ء پر اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے قائم مقام انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ مقرر
کیا گیا۔

نا م۔ محمد انور۔ ایف اے۔ سی۔ ٹی قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول گوجرانوالہ کو م غلام مصطفےٰ
خاں سلہریا کی جگہ اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں قائم مقام جونیئر انگلش ٹیچر گورنمنٹ مڈل سکول
جبجر عباسیاں مقرر کیا گیا۔

۱۴۱ م فیاض محمد جے۔ ڈی۔ پی۔ ای قائم مقام پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول فیروزہ کو م محمد اشرف
AD کی جگہ جو مستعفی ہو گئے ہیں۔ اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے قائم مقام
پریل ۶۲ء پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی سکول دیہوا ضلع ڈیرہ غازی خاں مقرر کیا گیا۔

۱۴۱ م۔ اعجاز حسین عارضی ورک شاپ انسٹرکٹر گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول ملتان کو م سردار محمد
AE کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے بمشاہرہ -/۸۵ روپے معینہ علاوہ الاؤنس و ایک اسسٹنٹ انسٹرکٹر

کی آسامی پر -/۹۰ — ۱۰ — ۱۵۰ کے گریڈ میں عارضی اسسٹنٹ ورک شاپ انسٹرکٹر گورنمنٹ
پائلیٹ سیکنڈری سکول سیالکوٹ مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ ڈر محمد خان پرویز عارضی اسسٹنٹ ورک شاپ انسٹرکٹر گورنمنٹ پائلیٹ سیکنڈری سکول
رحیم یار خان کو م۔ اعجاز حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے بشاہرہ -/۱۵۰ روپے (-/۱۵۰
— ۱۰ — ۲۵۰) علاوہ الاؤنس اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے عارضی ورکشاپ
انسٹرکٹر گورنمنٹ پائلیٹ سیکنڈری سکول ملتان مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ سردار محمد عارضی اسسٹنٹ ورک شاپ انسٹرکٹر گورنمنٹ پائلیٹ سیکنڈری سکول سیالکوٹ کو
م۔ ڈر محمد خان پرویز کی جگہ جو مستعفی ہو گئے ہیں۔ اپنی معینہ تنخواہ پر تاریخ حاضری سے اسسٹنٹ
ورک شاپ انسٹرکٹر گورنمنٹ پائلیٹ سیکنڈری سکول رحیم یار خان مقرر کیا گیا۔

۳۵۱۸-ای م۔ شہاب الدین ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول مظفر گڑھ کو (جو آج کل رخصت پر ہیں)
۲۷ اپریل ۱۹۶۳ء م۔ ظہیر الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے
ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول ملتان مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ ظہیر الدین عارضی ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول ملتان کو م۔ شہاب الدین کی جگہ جن کا
تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے عارضی ڈرائنگ ماسٹر
گورنمنٹ نارمل سکول مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

۳۵۱۴-ای م۔ محمد اجمل خان۔ بی اے۔ بی۔ ٹی۔ نائب ناظم مدارس رینالہ خورد کو م۔ اللہ دتا طارق کی جگہ جن کا
۲۷ اپریل ۱۹۶۳ء تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں تاریخ حاضری سے نائب ناظم مدارس
منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ اللہ دتا طارق۔ ایم اے۔ بی۔ ٹی۔ عارضی نائب ناظم مدارس منٹگمری کو م۔ محمد رمضان کی جگہ
جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اور اپنے گریڈ میں عارضی نائب ناظم مدارس شجاع آباد
مقرر کیا گیا۔